



سوانح مخمسی

یعنی سیرتِ شمسِ الاسلام

شیخنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم الہانا تووی قدس اللہ تعالیٰ سرہ
حصہ دوم

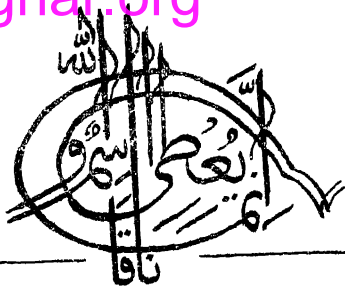


رئیس القلم حضرت مولانا شید مناظر حسین گیلانی عم فیوضہ

حسب ایت

حضرت مولانا محبت علی صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

دفتر دارالعلوم سے شائع کی گئی



سوانح مخدوم

یعنی

سیر سیدنا الامام الکبیرؑ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم النانوتی

قدس الله سره العزیز

جلد دوم

مؤلف

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی عم فیضہ

بایم

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

مرتب ہو کر

دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی

(نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند)

صفحہ	فہرست مضامین سوانح قائمی جلد دوم	نمبر
۱	داخلی اصلاحات	۱
۲	احیاء عقیدہ یوگان	۲
۱۳	حضرت نانوتوی رحمہ کی بیوہ بین کا عقد ثانی	۳
۱۴	لڑکیوں کے حق وراثت کا احیاء	۴
۲۳	مولانا محمد حسین ثنائی الجلیبیٹ سے تقلید وغیرہ پر بحث	۵
۲۶	شرعی مطالبات کی دو اہم قسمیں اور بدعت کی تعریف	۶
۲۹	سما ع موقی اور حضرت نانوتوی رحمہ	۷
۳۴	بزرگوں کے قریب مدفون ہونا موجب برکت ہے	۸
۳۹	اختلافی مسائل میں نرم اور معتدل روش	۹
۴۵	بدعت کی حکیمانہ تشریح	۱۰
۵۱	حرک بدعات پر اہل دیوبند سے عہد لینا	۱۱
۶۰	اہل تشیع کے بارے میں اصلاحی اقدامات	۱۲
۶۶	پور قاضی کے شیعوں کا واقعہ	۱۳
۷۰	الہامی طوطا پر مجتہدین کے اعتراضات کا علم اور ان کے مسکیت جوابات (حاشیہ)	۱۴
۷۵	تجزیہ داری کو ختم کرنے میں حضرت نانوتوی رحمہ نے سرکاری بازی لگا دی	۱۵
۷۷	دیوبند میں تجزیہ داری کا خاتمہ	۱۶
۷۹	دفاعی اقدامات	۱۷
۸۳	انگریز اور انگریزیت سے نفرت	۱۸
۸۴	انگریزیت سے نفرت کا اثر تلامذہ پر (حاشیہ)	۱۹
۸۶	انقلاب ۱۲۵۷ء کا پس منظر	۲۰
۹۰	جشن تاجپوشی ملکہ وکٹوریہ کے سلسلہ میں حضرت نانوتوی رحمہ کے تاخرات	۲۱
۹۴	مدرسہ دیوبند ۱۲۵۷ء کی تلافی کے لئے قائم کیا گیا	۲۲
۹۷	انقلاب ۱۲۵۷ء میں شرکت کا راز	۲۳
۱۰۰	انقلاب ۱۲۵۷ء کے بعض اجمالی پہلو	۲۴
۱۰۰	بارک پور کی سات پلٹنوں کی موقی	۲۵
۱۰۱	میسرہ ٹھجھاؤنی میں جوتاک انقلاب	۲۶
۱۰۱	لال قلعہ پر ہندوستانیوں کا قبضہ	۲۷
۱۱۱	۱۲۵۷ء کے جنگوں میں حضرت نانوتوی رحمہ کی شرکت کا اصل منشاء	۲۸
۱۱۵	ضلع سہارنپور میں انقلاب ۱۲۵۷ء کی آگ بھڑکنے کی وجہ	۲۹
۱۲۱	قاضی عبدالرحیم اور ان کے رفقاء کے چھانسی پانے کے بعد تھانہ بھون میں حضرت نانوتوی رحمہ اور ان کے اکابر و رفقاء میں باہم مشورہ	۳۰
۱۲۲	۱۲۵۷ء کی جنگ میں شرکت پر حضرت نانوتوی رحمہ کے قوی دلائل	۳۱

۲۴۲	قیام مدرسہ دیوبند کی تجویز	۶۱
۲۴۴	۱۲۸ھ میں "مدرسہ عربی" (دارالعلوم دیوبند) کا قیام	۶۲
۲۴۶	ابتدائی ارکان شوریٰ دارالعلوم دیوبند	۶۳
۲۶۰	مجلس الشیخہ مسجد چیتہ کے تین اساطین	۶۴
۲۸۱	حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے نزدیک دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد طلبہ کے لئے حصول علوم جدیدہ کی ضرورت	۶۵
۲۸۶	دارالعلوم کا نصاب	۶۶
۲۹۴	حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے نصب العین کے خلاف علوم جدیدہ کا اثر لے کر دارالعلوم میں آنے کے تلخ نتائج	۶۷
۳۱۴	منشی نوکثر صاحب مالک اخبار اودھ لکھنؤ اور دیگر حضرات کا ہدیہ درسی کتب دارالعلوم دیوبند کے لئے ارسال کرنا	۶۸
۳۱۶	منشی نوکثر صاحب لکھنؤ اور مالک اخبار "سفیر نوڈھانہ" کے اخبارات اور کارخانہ جات کی ترقی کے لئے دعا	۶۹
۳۱۷	بعض غیر مسلم حضرات کے اسناد دارالعلوم دیوبند کو چندہ دیتے تھے	۷۰
۳۱۸	پہلے سال میں دارالعلوم دیوبند کی آمدنی چھ سو اچاس روپے چار آنہ ہوئی	۷۱
۳۲۵	عمارت دارالعلوم کا سنگ بنیاد	۷۲
۳۳۸	دارالعلوم دیوبند میں علم طب کی تعلیم کا اجراء	۷۳
۳۴۳	غیر مسلم طلبہ کا دارالعلوم دیوبند میں پڑھنا	۷۴
۳۵۸	بادی تارا چند سے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا مناظرہ	۷۵
۳۶۴	واقعات میلہ خدائشناسی سال اول	۷۶
۴۲۱	واقعات میلہ خدائشناسی سال دوم	۷۷
۴۳۲	پادی نوس کفیلوس سے دعا کرنے کا مشورہ تاکہ حق و باطل واضح ہو جائے	۷۸
۴۵۰	حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا نظریہ کہ ہندو حضرات جنہیں اوتار کہتے ہیں ممکن ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے نبی یا ولی یا نائب نبی رہے ہوں	۷۹
۴۶۳	حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے بارے میں ہندو عوام کا خیال کہ "وہ کوئی اوتار ہوں تو ہوں"	۸۰
۴۶۳	حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے دل پر علم کی سرستی بول رہی تھی	۸۱
۴۸۴	اسلاف دارالعلوم کی کتب شائع کرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند میں ادارہ نشر و اشاعت کا اجراء	۸۲
۴۸۷	جنوری ۱۸۷۶ء میں رٹکی کے جلسہ عام میں اسلام پر پینڈت دیانند سرسوتی کے (حاشیہ)	۸۳
۴۸۷	اعتراضات اور حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا باوجود شدید علالت کے رٹکی جانا اور پینڈت جی کا مناظرہ سے فرار	۸۴
۵۰۲	پینڈت دیانند سرسوتی کے اعتراضات کا تحریری جواب شائع فرمانا	۸۵
۵۱۲	پینڈت دیانند سرسوتی کا میرٹھ میں درود، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا باوجود ضعف کے میرٹھ پہنچنا اور پینڈت جی کا میرٹھ سے فرار	۸۶

۱۲۵	حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ کا امیر جہاد منتخب ہونا اور سب کا بیعت جہاد کرنا	۳۲
۱۲۷	اکابر کے درمیان جہادی خدمات کی تقسیم	۳۳
۱۲۹	حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا اپنی والدہ ماجدہ سے شرکت جہاد کیلئے اجازت { طلب کرنا اور ان کا بخوشی اجازت مرحمت فرمانا	۳۴
۱۳۲	تھانہ بھون کے مستقر سے پہلا حملہ باغ شیر علی کی شرک پر	۳۵
۱۳۵	جنگ شالی	۳۶
۱۳۷	حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا نواب شیر علی خاں مراد آبادی کی معرفت { بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کو جہاد میں شرکت پر آمادہ کرنا	۳۷
۱۴۰	شرکاء جنگ شالی	۳۸
۱۴۱	حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی جرأت اور بے جگری	۳۹
۱۴۳	حضرت نانوتوی رحمہ اللہ اور انگریزی فوج کے ایک سپاہی میں مقابلہ اور حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی کامیابی	۴۰
۱۴۵	شالی کی گڑھی کا محاصرہ اور تھانہ بھون کی جہادی تحریک کا خاتمہ	۴۱
۱۴۸	حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا ایک چھپرے کے ذریعہ تحصیل کے کوڑا چلانا	۴۲
۱۵۱	حضرت حافظ ضامن شہید رحمہ اللہ کی شہادت	۴۳
۱۶۰	حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی کینچی پر گولی لگنا اور پھر کسی نشان کا نہ پایا جانا	۴۴
۱۶۳	دلی کے آخری بادشاہ کی گرفتاری	۴۵
۱۷۰	انگریزوں کے ہاتھوں تھانہ بھون کی بربادی	۴۶
۱۷۱	حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے نام وارنٹ گرفتاری اور متوسلین کے اصرار پر صرف تین یوم تک { آپ کی روپوشی	۴۷
۱۷۶	حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی مجانب اللہ حفاظت	۴۸
۱۹۱	۱۸۶۷ء میں حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا پہلے حج کے لئے روانہ ہونا	۴۹
۱۹۳	حفظ قرآن کی نعمت عظمیٰ	۵۰
۱۹۸	۱۸۶۷ء میں پہلے حج سے واپسی	۵۱
۲۰۳	حضرت گلگاہی رحمہ اللہ پر مقدمہ اور ان کی رہائی	۵۲
۲۰۹	خدمات جلیلہ کا شاہکار	۵۳
۲۱۴	دارالعلوم دیوبند اور اس کے آغاز و تاسیس کی داستان	۵۴
۲۱۵	انار و محمود	۵۵
۲۱۵	سب سے پہلے معلم محمود اور متعلم محمود	۵۶
۲۲۰	قدیم شخصی و انفرادی طریق تعلیم کی جگہ اجتماعی طریق تعلیم	۵۷
۲۲۱	دارالعلوم کا تعلق عام مسلمانوں سے نہ اندازہ ہونے کی تاکید	۵۸
۲۲۳	بقول حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں بقاء اسلام اور { تحفظ علم کا ذریعہ ہے	۵۹
۲۲۸	دارالعلوم کے قیام کے ذریعہ مسلمانوں کی ناکامی کی تلافی	۶۰

58012

سوانح قاسمی

جلد دوم



خدمات و اصلاحات

ذاتی و شخصی حالات، یا خانگی و عائلی تعلقات کے بعد سیدنا امام الکبیرؑ سے لینے والے لئے جو جو کام لئے، اور جن مہمات کی سرانجامی کے لئے آپ کا انتخاب فرمایا گیا۔ عقلی ترتیب کے ساتھ ہم ان کو چند حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یعنی ہندوستان کی اسلامی آبادی یا کہنے تو کہہ سکتے ہیں کہ خود اپنی ملت اور قوم کے لئے جو کچھ آپ نے کیا، ہم اس کی تعبیر داخلی اصلاحات کے عنوان سے کریں گے، اور غیروں کے مقابلہ میں اسلام اور مسلمانوں کی جن خدمات کا ظہور آپ سے ہوا، ”خارجی اقدامات و تحفظات“ کے عنوان کے نیچے ان کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ پیش کی جائیگی۔

داخلی اصلاحات

یوں تو سیدنا امام الکبیرؑ کا وجود باوجود ہی جیسا کہ آپ دیکھ چکے مسلمانوں کے لئے بجائے خود مجسم اصلاحی نمونہ تھا، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس عام قاعدے کا ذکر کرتے ہوئے کہ ”علماء ربانی کا وعظ تین قسم کا ہوتا ہے، قولی، فعلی، حالی۔ قولی ادنیٰ مرتبہ کا وعظ ہے اور فعلی متوسط، حالی اعلیٰ درجہ کا،“ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قولی وہ وعظ ہے جو محض زبان سے احکام خداوندی لوگوں کو سنا دیئے جائیں اور خود ان پر عمل نہ کرے،

اور فعلی وہ ہے کہ خود عمل کرے، بعد میں لوگوں کو ہدایت کرے، یعنی کر کے دکھلائے، اور حالی وہ ہے کہ حال غالب ہو جائے، یعنی نیکی کا کرنا بدی کا چھوڑنا عاد ہو جائے، اور اس کے کرنے میں تکلف کی حاجت نہ ہو؛

پھر وہی سیدنا الامام الکبیر کے متعلق اپنا یہ مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے اصول میں یہ تھا کہ جس فعل کو اول خود نہ کر لیتے تھے دوسروں کو اس کے کرنے کی نصیحت نہ کرتے؛

جس کا مطلب یہی ہوا کہ گفتار کے ساتھ آپ کا وجود سراپا کردار تھا، اور یہی نہیں آگے دہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ

”مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر حال غالب تھا۔“

جو کچھ اب تک آپ کے سامنے پیش ہو چکا ہے، بلاشبہ اس سے مصنف کے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے، دین ہی سیدنا الامام الکبیر کی زندگی تھا، اور ان کی زندگی دین کے سوا حقیقت اور کچھ باقی نہیں رہی تھی، اسی لئے ”مسلمانوں کی داخلی اصلاحات“ کے سلسلے میں تو گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ عمل کا پیغام بنا ہوا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے، کہ اس راہ میں ”گفت“ سے زیادہ آپ اپنی ”رفت“ اور ”روش“ ہی سے کام لیتے رہے جس کا اندازہ ان لوگوں کے بیان سے بھی ہوتا ہے، جنہوں نے آپ کی تقریریں سنی تھیں، مواعظ و خطبات کا بچا کچھ حصہ ہم تک جو پہنچا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عام مولویوں کی طرح مسلمانوں کی عملی کمزوریوں کا ذکر ان میں کم پایا جاتا ہے، بلکہ عموماً اسلام کی اصولی باتوں پر آپ کی تقریریں مشتمل ہوتی تھیں۔

گویا زبان سے تو ہمیشہ علم تقسیم فرماتے تھے اور عمل کا دعوہ بجائے قول کے عمر بھر صرف اپنے عمل سے کہتے رہے۔ تاہم مسلمانوں کی عملی زندگی سے تعلق رکھنے والی بعض خاص اہم باتوں کے متعلق اس کا پتہ چلتا ہے کہ ”کردار“ کے ساتھ ساتھ ”گفتار“ سے بھی ان کی تبلیغ و اشاعت میں کام لیا جاتا تھا، اس سلسلہ میں سوانح مخطوطہ کے مصنف نے مسلمانان ہند کے ان چند غیر دینی رسوم کا

تذکرہ کیا ہے، جن کی گرفت اب تو بھدا اللہ بہت کچھ ڈھیلی پڑ چکی ہے، لیکن سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں ان رسوم کی اصلاح پر آمادہ ہوئے تھے، جاننے والے جانتے ہیں کہ اسلامی گھرانوں میں ان کی پابندی کن حدود تک پہنچی ہوئی تھی، خوشی اور غمی، ولادت، شادی، موت کے مواقع پر اس ملک کے دوسرے باشندوں کی کچھ صحبت اور اس سے بھی زیادہ ثروت و دولت کی کثرت نے ان میں اتنی اہمیت پیدا کر دی تھی کہ اسلام کے قطعی مطالبات اور مکتوبات و فرائض سے بھی کہیں زیادہ ان کی پابندی پر سہ سائی نے ان کو مجبور کر دیا تھا، نکاح و تفریح کی محرکہ آرائیوں میں دیوانوں کی طرح لوگ مشغول و منہمک تھے۔ امیر ہویا غریب چونکہ ہر ایک اپنی حیثیت سے زیادہ اپنے آپ کو دکھانا چاہتا تھا۔ نتیجہ جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے خوشی کی تقریروں کے متعلق لکھا ہے کہ ”عمر گذشتہ کا سارا سرمایہ صرف کر دیں اور آئندہ عمر بھر کے واسطے قرض کر لیں۔“

اور موت کی غمی کے سلسلہ میں وہی لکھتے ہیں کہ مصارف کے لحاظ سے ”ایسی رسمیں مقرر تھیں جن سے نہ میت کو نفع، نہ اہل میت کو اور مثال یہ صادق آتی تھی ”گھر لٹا اور سر پٹا“۔ ص ۷۸

خلاصہ یہ ہے کہ ریاء الناس (لوگوں کے دکھانے کے لئے) بیہودہ مصارف کے ایسے ابواب کھلو ہوئے تھے کہ

جیسے وہ صاف پتھر جس پر ٹی پڑ جائے پھر اس پر	کمثل صفوان علیہ تراب فاصابہ
بارش برے اور وہ صاف کا صاف ہی رہ گیا۔	وابل فترکہ صلبدا

کی مصداق مسلمانوں کی معاشی زندگی بنی ہوئی تھی، حکومت کا زور جب تک موجود تھا، تلافی کی شکلیں کسی نہ کسی طرح جائز و ناجائز ذرائع سے چونکہ نکل آتی تھیں اسلئے جیسا کہ چاہئے کاروبار کے ان بیہودہ طریقوں کے برے نتائج کھل کر سامنے نہیں آتے تھے۔ لیکن حکومت کی ”جھول“ بھی جب اتر گئی تو نسلی پشت سب کے سامنے آ گئی۔ رسی جل چکی تھی، اینٹھن باقی تھی۔ ان عام ”رسوم قبیہ“ میں سے، جن میں سچی بات یہی ہے کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ کسی نہ کسی شکل میں دوسرے ممالک کے مسلمان بھی

بتلا تھے۔ خاص کر اس ملک کو وطن بنالینے کی وجہ سے مصیبت کا جو پہاڑ مسلمانوں کے سرخسریف گھرانوں کی خواتین مخدرات غنائ پر ٹوٹ پڑا تھا۔ ”عقد بیوگان“ کا مسئلہ تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ بنی نوع انسانی میں شریک ہونے کے باوجود عام انسانی حقوق سے عورتوں کی محرومی بنی آدم کی تاریخ کا کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ لیکن عرب اپنی جاہلیت کے تاریک دور میں جیسا کہ کہا جاتا ہے لڑکیوں کو زندہ درگور کر کے تلک کی بے رحمی کے مرتکب ہوتے تھے۔ ان کی اس بے رحمی ناخدا ترسی کی غیر معمولی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ قیام قیامت کی تباہیوں اور بربادیوں کا ذکر کرتے ہوئے اور اس کی اطلاع دیتے ہوئے کہ آفتاب کی روشنی ڈھانک دی جائے گی استارے ماند پڑ جائیں گے، ہمندر بھبھک اٹھیں گے، کائنات کے ان بادل حوادث کے ساتھ فرمایا گیا ہے، کہ زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کے متعلق پوچھا جائے گا کہ کس قسم میں ان کو قتل کیا گیا یعنی ”اذا الموائد فاستللت بای ذنب قتلت“ کا جو ترجمہ ہے۔ بظاہر اس خاص ترتیب کے سلسلہ میں جنس نازک کی اس مظلومیت کا تذکرہ بنانا ہے کہ قرآنی نقطہ نظر سے یہ واقعہ بھی ایام قیامت کے جاں گسل، روح فرسا حوادث کا ہم پلہ وہم وزن اور اہمیت میں ان ہی کے مساوی ہے، ”وہدیشہاد جرائم اور گناہوں کے مقابلہ میں اس موقع پر عرب جاہلیت کے صرف اسی ظلم کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے اور ایک یہی کیا، عرب کی جاہلی زندگی میں جن فریب کاریوں سے مرد عورتوں کے حقوق کو پامال کر رہے تھے ان کی فہرست یقیناً بہت طویل ہے۔

۱۔ خود قرآن میں بھی اس سلسلہ کی بعض چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں ایک دل چسپ چال یہ بھی تھی کہ جن جانوروں کا گوشت عرب کھاتے تھے مثلاً بھیر، بکریاں وغیرہ ان کے متعلق قرآن میں ہے کہ وہ کہتے تھے کہ زندہ بچے ان کے پیٹ سے جو پیدا ہوں وہ صرف مردوں کے لئے ہیں، ہاں! مردہ بچوں کے گوشت میں مانتے تھے کہ عورتوں کا بھی حق ہے کہتے تھے مافی بھونھنہ الا نعام خالصۃ لذن کو سنانا و عھرم علی اذواجنا (سورۃ الانعام)، اس جاہلی دستور کی جو تشریح تفسیر کی کتابوں میں کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ بچوں کے متعلق کہتے تھے کہ ان پر مردوں کا حق ہے، اسی لئے نہ بچوں کو ذبح کر کے صرف مرد کھاتا تھے، اور مادہ بچے جب پیدا ہوتے تو عورتوں سے کہیدیا جاتا کہ ان کو اگر ذبح کر دیا جائے گا تو موشیوں کا سلسلہ ہی گھر میں ختم ہو جائیگا۔ یوں زندہ بچوں کے گوشت سے عورتیں ہمیشہ محروم رہتی تھیں، اتفاقاً مردہ بچہ اگر پیدا ہوا تب اسکے گوشت

لیکن باوجود ان مظالم کے بیوہ عورتوں کو آئندہ نکاح کے قانونی حق سے قطعی طور پر محروم ٹھہرانے کا فیصلہ عرب کے ان جاہلوں نے بھی نہیں کیا تھا۔ ظلم کا یہ پہاڑ اس صنف نازک و ضعیف پر اسی ملک میں توڑا گیا، جہاں کی عورتیں مردہ شوہروں کے ساتھ جل کر اپنی غیر معمولی وفاداریوں کا ثبوت پیش کر رہی تھیں گویا ان ہی وفاداریوں کا صلہ یہ تھا کہ عرب کے جاہلوں کی زندہ درگور لڑکیوں سے بدتر حال میں اس ملک کے مردوں نے یہاں کی عورتوں کو ہزار ہا ہزار سال سے تڑپنے اور پھٹنے کے لئے چھوڑ رکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ قبر میں دفن ہو جانے کے بعد زندہ رہنے کی صورت ہی کیا باقی رہتی ہے، اسی لئے میں تو کہتا ہوں کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے حرم کے واقعی مجسمہ حقیقی معنوں میں درحقیقت ہمارے ملک کے باشندے تھے، اور ان میں کتنے اب بھی ہیں جن کو اپنے جرم پر اس وقت تک شرانت کا دھوکہ لگا ہوا ہے، اور تعجب اس امت پر ہے جو جاہلیت سے نکالنے ہی کے لئے برپا کی گئی تھی، اس ملک میں پہنچ کر اس نے بھی اپنی معیاری زندگی میں اسی کالے، بدترین کالے ظالمانہ گناہ کو شریک کر لیا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ہندی رسم درواج

لے سٹی کی رسم بھی شاید عقد بیوگان کی مانند کی طرح ہندوستان کی خاص ملکی رسم تھی۔ ہندی خواتین کے جذبہ بہرودفا کو اس رسم کا منشا ٹھہراتے ہوئے ایک صاحب اس ظالمانہ انسانیت سوز رسم کی داد دے رہے تھے، میں نے عرض کیا کہ "بہرودفا" کے لئے کیا صرف غریب عورت پیدا ہوئی ہے۔ محبت و انس ہی کا تقاضا یہ تھا تو چاہئے تھا کہ مرد بھی بیوی کے مرجانے کے بعد اس کے ساتھ جل جاتا لیکن ایک طرف معاملہ خود بتا رہا ہے کہ عرب کے جاہل دھوکہ دے کر عورتوں سے جیسے کھیلنے دیتے تھے۔ اسی قسم کی بازیگری مردوں کے جذبات نے ہندوستان میں عورتوں کے ساتھ روا رکھی تھی۔ ۱۲ (ازبندہ محمد طیب غفرلہ) یہ وفاداری نہیں تھی بلکہ اس مظلومیت اور ذلت آمیز زندگی سے چھٹکارے کے لئے جو بیوی کے زمانہ میں عورت کو گزارنا پڑتی تھی یہ جل جانا ایک مذہبی حرکت ہوتی تھی۔ عمر بھر کے جلاپے سے بچنے کیلئے وہ ایک ساعہ کا جلا پابست ہل بھتی تھیں۔ لے خود اس ملک میں بھی دختر کشی کی کب کی تھی۔ پیدائش ہر لڑکی کا گھونٹ کر اور بعض اوقات آون نال پیدا شدہ لڑکی کے منہ میں رکھ کر نہر سے ماری جاتی تھیں۔ برطانیہ کی حکومت نے سرکاری قوت سے ان رسوم قبیح کو بند کیا ہے۔ پس ہندوستان عورت کی تدریل و ترقی اور بچ کنی میں عرب سے کہیں آگے تھا۔ عرب میں عورت کی مظلومیت اور اس کی بچ کنی کی رسوم بد کو حضرت خاتم الانبیاء صلعم کی نبوت کی روشنی نے ختم کیا اور ہند میں نابھان بولی نے عورت کی گلو خلاصی کے لئے مساعی جلیلہ کاہن میں جنس حضرت خاتم العلوم قدس سرہ نے تو اس مسئلہ کو اپنی زندگی کے نصب العین کا جزو اعظم بنالیا تھا۔ ۱۳ محمد طیب غفرلہ

اور دوسری خصوصیتوں کو تو مسلمانوں نے آہستہ آہستہ اختیار کیا، لیکن جنوبی ہند میں مسلمانوں کی آمد کا تذکرہ کرتے ہوئے خانی خان نے جو یہ لکھا ہے کہ

”درشادی و کد خدائی بہ طور پیردی آن جماعت (یعنی ہنود) بہ عمل می آوردند“

پھر اس کی اطلاع دیتے ہوئے کہ اسلامی دنیا کے کسی حصہ میں اس رسم بدکار و راج نہیں ہے، بلکہ ”وارثان آہنا بزور عقد کفو می آرند“

اپنے زمانہ یعنی عہد محمد شاہی تک کے متعلق یہ خبر دی ہے کہ

”در ہندوستان کہ میان مشرفائے اسلام کہ مراد از اصل مشائخ عرب است این عمل

(عقد بیوگان) در ہندوستان قبیح و عجیب دانستہ ترک رویہ آباد اجداد را کہ موافق

حکم خدا و مطابق شرع محمدی است نموده اند“

مسلمانوں نے اس ملک میں آباد ہو جانے کے بعد اس طریقہ کو کیوں اختیار کیا۔ اسکی توجیہ کرتے ہوئے خانی خان نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوؤں کا حال یہ ہے کہ

”اگر دختر شیرخوارہ را بہ عقد احدی در آرند، و شوہر بہاں شب اول بمیرد باز بہ نکاح دیگرے

نمی آرند“

اور یہ بیان کر کے کہ شرافت و نجابت کا دار مدار ہندوستان میں چونکہ اسی رسم پر ہے، اور بقول خانی خان

کے عام قاعدہ ہے کہ

”چوں مشرفا ہر قوم را بہ اشراف ہر دیار ہم چشمی بہ میاں می آئند، بہ تقاضائے غیرت کہ ما

از چہ راہ کمتر ازین جماعت باشیم تبعیت این رسم را سرمایہ آبرو و غیرت و نشان شرافت

و نجابت دانستہ ترک رویہ بزرگان سلف نموده اند“

خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں شرافت و نجابت کا معیار چونکہ عموماً یہی قرار پا گیا تھا کہ بیوہ ہوتے

کے بعد کسی دوسرے مرد کا منہ عورت نہ دیکھے، اس لئے مسلمانوں نے بھی اپنی شرافت کا معیار اسی

کو ٹھہرا لیا، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خانی خان کی مدح میں تمامہ میں ظہور ہوتی تھی، اس وقت

اس مسئلہ کے متعلق دلوں میں کچھ اصلاحی خیالات ابھرنے لگے تھے۔ کیونکہ آخر میں اپنے تاثرات کا اظہار بھی ان الفاظ میں کیا ہے،

”اگرچہ اس طریقہ عقلاً و شرعاً محمود نیست و درین ضمن مفسدہ بسیار حاصل می گردد کہ بہ توضیح آن نہ پرداختن اولیٰ“ چھ

اور یہی وہ زمانہ ہے، جب مسلمانان ہند کو چونکاتے ہوئے منجملہ دوسری باتوں کے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

”یکے از عادت شنیعہ ہندو آنست کہ چون شوہر زن بے بئرد مگذارند کہ آن زن شوہر دیگر کند“

اور یہ بتاتے ہوئے کہ

”این عادت اصلاً در عرب نہ بود نہ قبل از آن حضرت و نہ در زمان آنحضرت و نہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم“

ان تہیدی امور کے بعد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مسلمانان ہند کو وصیت کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ یہ عبارت ان کے وصیت نامہ ہی کی ہے۔ مگر رسم و رواج نے مسلمانوں کے اند بھی اس بری عادت کو اس حد تک مستحکم کر دیا تھا کہ بجائے وصیت کے بے ساختہ اس موقع پر وہ دعائیں مشغول ہو جاتے ہیں، کچھ کہنے سننے کی جگہ فرماتے ہیں۔

”خدا تعالیٰ رحمت کنا و برآں کس کہ این عادت شنیعہ را متلاشی سازد“

جس سے یوں بھی شاہ صاحب کی بے بسی کا اندازہ ہوتا ہے، نیز آگے ان ہی کے ان فقرہ سے کہ	اگر ممکن نہ باشد کہ از عموم ناش مرتفع شود،
اور اگر عام مسلمانوں سے اس رسم کا ازالہ ممکن نہ ہو	در میان قوم خود اقامت این عادت
تو چاہئے کہ خود اپنے کسبہ میں عرب کی اس عادت	عرب باید کرد اگر این نیز ممکن نہ باشد
کو جاری کیا جائے، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو،	این عادت را قبیح باید دانست و بدل
تو اس عادت کو چاہئے کہ دل سے برکھجا جائے۔	

دشمن آں باید بود کہ ادنیٰ مراتب نہی مسکر
اور اس کا دشمن بن جانا چاہئے کہ بری بات کے
ہیں مست صلا وصیت نامہ
اسد اکاہی آخری درجہ ہے۔

میں نے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب سے ان کی پوری عبارت اسی لئے نقل کی ہے کہ
اس رسم بد کی گرفت کی سختی جس حد تک ہندوستان کے مسلمانوں میں پہنچ چکی تھی، اس کو ان کے مذکور
بالا الفاظ سے ہم سمجھ سکیں، ان کا دل تڑپ رہا تھا چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کو اس کے ترک
پر آمادہ کریں۔ لیکن حالات ان کے سامنے ایسے تھے کہ بظاہر کامیابی سے کچھ ناامید نظر آتے ہیں
اسی لئے آخر میں دل سے برا جاننے کی آخری تدبیر کے استعمال تک وہ اتر آئے ہیں، اور اسی
سے میر شاہ خان مرحوم کی ان روایتوں کی بھی تصدیق ہوتی ہے، جنہیں مسئلہ عقد بیوگان کی سلسلہ
میں ہم ارداح ثلاثہ میں پاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تانیہال قصہ بچلت کے مستند
بزرگوں کے حوالہ سے میر شاہ خاں یہ روایت کرتے تھے کہ مولانا اسماعیل شہید جیسا کہ مصلوم
ہے حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے ہیں، مولانا شہید کی ہمیشہ کا عقد گھر ہی میں مولانا رفیع الدین
ابن شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے مولوی عبدالرحمن صاحب سے ہوا تھا، لیکن کچھ ہی دن بعد
مولوی عبدالرحمن صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور مولانا اسماعیل شہید کی ہمیشہ صاحبہ بیوہ ہو گئیں،
اب سنئے خود شاہ ولی اللہ کے گھرانے کا یہ قصہ ہے، مولانا اسماعیل کا یہ بیان میر شاہ خان نے نقل
کیا ہے کہتے تھے کہ

”جب میں اپنی بہن کو مشکوٰۃ وغیرہ پڑھاتا تھا، تو نکاح ثانی کے فضائل قصداً چھڑا دیتا

تھا کہ مبادا میری بہن کو ترغیب ہو، اور وہ نکاح کر لے“ ۶۹۔ ارداح

عقد بیوگان کے مسئلہ میں خانوادہ ولی اللہی کے احساسات کی نزاکتوں کا یہ حال تھا، تو اسی سے
سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان کے عام مسلمانوں کی ذہنیت اس باب میں کیا رہی ہوگی، یا کیا ہو سکتی
تھی۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کراہتے ہوئے دل کی دعا قبول ہوئی اور

حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اس رحمت کے مستحق ہوئے جس کی دعا شاہ صاحب نے مانگی تھی، یہ قصہ کافی طویل ہے، سیرت سید احمد شہید میں اس کی تفصیلات پڑھئے، امیر شاہ خان کہا کرتے تھے کہ مولانا اسماعیل شہید سے کسی نے پوچھا کہ اپنے چچا شاہ عبدالعزیز اور شہید القادر سے زیادہ سید احمد صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ سے گرویدگی کی وجہ آپ کیلئے کیا ہوئی؟ تو جواب میں اسی کا حوالہ دیا کہ ان کی صحبت میں یہ جرات مجھ میں پیدا ہوئی کہ اپنی بیوہ بہن کا عقد زور دے کر میں نے خود کرادیا۔ جس کی تفصیل خاں صاحب ہی یہ بیان کرتے تھے کہ پھلت میں ”عقد بیوگان“ کی طرف سناؤں، گو ایک دن برسر منبر مولانا اسماعیل شہید توجہ دلا رہے تھے کہ مجمع میں کسی نے عرض کیا کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، مولانا شہید سمجھ گئے، اور منبر سے اتر گئے، فرمایا کہ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو، پھر بوجھنا، یہ کہتے ہوئے سیدھے پھلت سے دلی پہنچے، اور اپنی بیوہ بہن کے قدموں پر عمامہ ڈال دیا، اور گڑگڑا کر عرض کرنے لگے کہ

”تم چاہو، تو میں وعظ کہہ سکتا ہوں، ورنہ نہیں کہہ سکتا۔“

وہ بے چاری حیران تھیں کہ قصہ کیا ہے تب کھلے کہ تمہارے عقد نہ کرنے کی وجہ سے میری دختر بے اثر ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ مولانا شہید کی ہمیشہ صاحبہ حالانکہ بیمار تھیں، اور نکاح کی صلاحیت بھی ان میں باقی نہیں رہی تھی، لیکن بھائی کے اصرار سے راضی ہو گئیں، اور پھلت ہی کے مشہور عالم سید شہید کے رفیق مخلص مولانا عبداللہی سے ان کا نکاح کر دیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب، امیر شاہ صاحب کا یہ علم تھا، یا واقعہ یہی تھا کہا کرتے تھے کہ ہندوستان میں

”مولوی اسماعیل صاحب کی بہن کا نکاح ثانی سب سے پہلا نکاح ثانی تھا۔“ ۶۵

بظاہر اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ عقد بیوگان کی تحریک کا آغاز حضرت سید شہید اور ان کے رفقاء کی طرف سے ملک میں جب شروع ہوا تو اس سلسلہ میں مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ہمیشہ صاحبہ کا

لے بعینہ یہی صورت حال حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ کو بھی پیش آئی ہے اور انہوں نے بھی اپنی بڑی بہن کا نکاح اسی طرح کر کے اس دعوت (نکاح بیوگان) میں قوت پیدا کی تھی۔ (محمد طیب غفرلہ)

عقد ثانی پہلا عقد ثانی تھا۔ گویا اس رسم بد کے ازالہ کے سلسلے میں یہ پہلا تاریخی نمونہ تھا۔
 ارواحِ ثلاثہ وغیرہ کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کے زیر اثر علماء
 کا ایک طبقہ عقد بیوگان کی کوششوں میں مہمک اور مشغول ہو گیا تھا، کوئی بے چارے مولوی عبد الرحیم
 صاحب تھے وہ تو ”راندوں کی شادی دلے“ مولوی کے نام ہی سے مشہور ہو گئے تھے (دیکھو ارواح
 ثلاثہ ص ۱۷) اس سلسلہ میں مولوی محبوب علی دہلوی مرحوم کا نام بھی خاص طور پر لیا جاتا ہے مگر بایں ہمہ
 نسلہ نسل کی راسخ رسم جو دلوں کی گہرائیوں میں پستہ پست سے جاگزیں تھی، اس کی بڑوں کا نکالنا
 آسان نہ تھا، اور تو اور یہی دیوبند کا قصبہ جہاں آج دارالعلوم ہے، اسی کا ایک قصہ سوانح مخطوطہ کے
 مصنف نے اسی سلسلہ میں نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ پھلت کے ایک عالم باعمل مولانا وحید الدین
 مرحوم تھے، وعظان کا عام طور پر مقبول تھا، خصوصیت کے ساتھ دیوبند کے شیخ زادوں میں غیر معمولی
 احترام کے ساتھ دیکھے جاتے تھے، ان کی اصلاحی باتیں عوام نا لوگ مان لیتے تھے۔ ایک دن دیوبند
 ہی میں دعوئے کہتے ہوئے، مولوی وحید الدین بے چارے نے عقد بیوگان کے مسئلہ کا ذکر بھی پھیر دیا۔
 کہتے ہیں کہ ابھی تمہید ہی شروع ہوئی تھی، کہ مجلس سے قصبہ کے ایک رئیس شیخ زادے صاحب
 اٹھ کھڑے ہوئے، اور منبر کے پاس بے ساختہ دوڑتے ہوئے پہنچے، مولوی صاحب کا ہاتھ
 پکڑ لیا، اور برسر مجلس ڈانٹتے ہوئے بولے کہ

”بس مولوی صاحب اس مضمون کو مت بیان کرو“

۱۔ ابتدائیں حضرت سید شہید کی جہادی مہم میں یہ بھی شریک تھے۔ لیکن بعد میں اپنے بعض اختلافی نقاط نظر کی وجہ
 سے وہی واپس آ گئے تھے، ارواحِ ثلاثہ میں ان ہی کے کوفہ کے ایک غیر معمولی نمونہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ غدر کے ہنگام میں
 کہتے ہیں کہ مولوی صاحب کا فتویٰ تھا کہ حکومت قائمہ کے خلاف شورش و بغاوت جائز نہیں ہے جب ہنگامہ فرد
 ہوا تو اپنے اس فتوے کے صلہ میں انگریزی حکومت کی طرف سے گیارہ گاؤں کا وثیقہ پیش ہوا کہ تمہاری جاگیر
 میں حکومت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ لکھا ہے کہ وثیقہ کو لے کر اسی انگریز انسٹر کے سامنے مولوی صاحب نے
 پھاڑ دیا۔ جس نے وثیقہ پیش کیا تھا، غصہ میں کہہ رہے تھے کہ میں نے جو کچھ کیا تمہارے لئے نہیں کیا تھا، بلکہ میرے
 نزدیک مسئلہ کی شکل ہی وہی تھی۔ ۳۳ ارواح

بیان کیا ہے، کہ بے چارے مولوی صاحب مرحوم دم بخود ہو کر رہ گئے، کیونکہ مجلس میں کسی کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ شیخ صاحب یہ کیا کر رہے ہو، گو یا ساری مجلس شیخ صاحب ہی کی مویہ اور ہم نوا تھی،

بہر حال یہ اور اس قسم کے بیسیوں واقعات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ”عقد بیوگان“ کی اس تحریک کی مخالفت میں بد بخت مسلمانوں کی طرف سے کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا گیا تھا، حتیٰ کہ سید شہید کی جہادی مہم کی ناکامی تک میں معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ دوسرے اسباب کے ”عقد بیوگان“ کے سلسلے کی کش مکش کو بھی دخل تھا۔ تاہم حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی دعا، اندر ہی اندر اپنا کام کرتی چلی جاتی تھی، سید شہید اور ان کے رفقاء کے بعد جیسا کہ ہمارے مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، اضلاع سہارنپور و مظفرنگر وغیرہ میں سیدنا امام الکبیر کے استاذ حضرت مولانا ملک علی اور کا مذہلہ کے مشہور بزرگ مولانا مظفر حسین رحمۃ اللہ علیہ حسن تدبیر کے ساتھ اس تحریک کو آگے بڑھانے میں مشغول رہے، مولانا مظفر حسین کا مذہلوی کا ذکر اپنی کتاب میں کرتے ہوئے وہی فرماتے ہیں کہ

”بیواؤں کے نکاح کی بنیاد ان اطراف میں اولاً ان ہی سے ہوئی، اور دوسرے مولانا

ملوک علی صاحب، نے اس کو نہایت خوبصورتی سے اجر افرمایا۔“ ص ۳۱

اور ان بزرگوں کے بعد جیسا کہ مصنف امام ہی نے اطلاع دی ہے کہ

”ان دونوں بزرگواروں (مولانا مظفر حسین و مولانا ملک علی)، کے قدم قدم حضرت مولانا

(سیدنا امام الکبیر، نے اس کو پورا شائع کیا۔“ ص ۳۱

ان کی اس تاریخی شہادت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ”خدا رحمت کناد برآں کس کہ اس عادت شنیعہ را متلاشی سازد“ اس ولی اللہی دعا اور تمنا کی تکمیل بالآخر سیدنا امام الکبیر کی ذات بابرکات پر ہوئی۔ ”اس کو پورا شائع کیا۔“ ہمارے مصنف امام کی یہ شہادت تو اجمالی الفاظ میں ادا ہوئی ہے، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اس اجمال کی تھوڑی تفصیل بھی کی ہے، اس کا ذکر

کرتے ہوئے کہ

”نکاح ثانی بیوگان کو ایسا براہِ سختِ عیب سمجھتے تھے کہ کرنا تو کرنا، اگر کوئی نام بھی لے لیتا تھا، تو مارنے مرنے کو مستعد ہو جاتے تھے“

ان ہی حالات میں ان کا بیان ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے اپنے اتا و بزرگوں کے نقشِ قدم پر اس سلسلہ میں جدِ جدید شروع کی، مواعظ و خطبات میں مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلانے لگے، لکھا ہے کہ

”اولِ اوّل لوگوں کے کانوں میں جو نئی بات پڑی، تو چونکے، اور گھر گھر اس کا چرچا ہوا“

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ

”اور بعض بعض نے خلاف میں منصوبے لگائے تھے“

واللہ اعلم بالصواب یہ کون لوگ تھے اور اصلاحِ سہارنپور و مظفرنگر کے کن مقامات کے رہنے والے تھے، بظاہر دیوبند اور نانوتہ ہی کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر باوجود ان منصوبوں کے حضرت والا نے پوری استقامت کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھا، ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ مردوں کو سیدنا الامام الکبیر نے چمک چمک کر کرنا موس بنایا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مردوں کے خیال میں تبدیلی پیدا بھی ہوئی تو کیا۔ رسمِ درواج کی غیر معمولی تاثیرِ قوت کا نتیجہ یہ تھا کہ مردوں سے زیادہ خود عمورتوں میں ”عقد ثانی“ کا خیال عفت و ناموس کے لئے داغ بن چکا تھا، کسی عورت کے لئے اس کا سوچنا بھی اس کے نزدیک گناہ اور پاپ بنا ہوا تھا، مردوں کے بعد ضرورت تھی کہ عورتوں کے اندر رسمِ درواج کے پیدا کئے ہوئے غلط جذبات اور جھوٹے احساسات کا قطع کیا جائے، اور یہی حکیمانہ تدبیر حضرت والا نے اختیار کی۔ مردوں کے مجالس کی تقریروں کے بعد اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

”نوبت یہاں تک پہنچی، کہ مستورات میں وعظ ہونے لگے، اور بیواؤں کے کانوں تک

مضامین نکاح ثانی پہنچنے لگے۔

اور اس سلسلہ میں جدوجہد آپ کی اس نقطہ تک بقول ان کے پہنچ گئی کہ
 ”کوئی بیوہ، اور وارث بیوہ، ایسا نہ رہا جس کے کان تک نکاح ثانی کے نفع اُل نہ
 پہنچے ہوں۔“

الغرض آپ کی تبلیغ کا جو میدان تھا، اس میں اندر ہویا باہر اپنی آواز آپ نے پہنچا دی، ادویہ کوشش
 تو قول اور گفتار کے سلسلہ میں تھی، لیکن آپ سن چکے کہ کہنے سے پہلے جس کی عادت بھی تھی کہ جوابات
 دوسروں سے کہی جائے، پہلے خود کر کے دکھلا دی جائے خصوصاً اس مسئلہ میں نفسیاتی طور پر اس کی زیادہ
 ضرورت تھی، سوانح مخطوطہ کے مصنف ہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ
 ”جب مولانا نے اول اس کام کا بیڑا اٹھایا، تو کسی کو اس کی امید نہ تھی کہ یہ کام چل
 سکے گا۔“

پھر وہی اطلاع دیتے ہیں کہ چل سکنے کے لئے ترکیب یہ اختیار کی گئی کہ وہی دیوان جی حاجی محمد حسین
 مرحوم، حضرت والا جن کو اپنا ہاتھ پاؤں کہتے تھے، اور علاوہ برادری کے غیر معمولی محبت و اخلاص نے
 جنہیں آپ کے گھر کا رکن خصوصی بنادیا تھا۔ ان کی ایک بیوہ بہن تھیں۔ حضرت نے ان ہی کو آمادہ
 کیا کہ اپنی بہن کا عقد ثانی کر دیں۔ لکھا ہے کہ

”اول میاں محمد حسین صاحب کی بیوہ ہمیشہ کا نکاح ثانی ہوا۔“

اور صرف ہمیشہ ہی نہیں بلکہ دوسری جگہ وہی یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ حاجی حسین مرحوم کی
 ”ایک بھانجی بیوہ کا نکاح ثانی بھی کرایا۔“

سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے کہ حاجی محمد حسین مرحوم

”جو نکلہ اپنی قوم میں عالی نسب ہیں، اس لئے ان کا یہ فعل زیادہ مؤثر ہوا۔“

اور دیوان جی ہی کے پیش کئے ہوئے عملی نمونوں کو کافی قرار نہیں دیا گیا۔ سوانح مخطوطہ کے
 مصنف نے لکھا ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب عقد بیوگان کی تحریک زور شور کے ساتھ

جاری تھی، یہ اتفاقی واقعہ پیش آیا کہ سیدنا الامام الکبیر کی

”ہمیشہ اسی حصہ میں بیوہ ہو گئیں“

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ آپ کی یہ بیوہ ہو جانے والی ہمیشہ صاحبہ حالانکہ اولاد والی تھیں، لیکن قدرت کی طرف سے اپنے گھر کی طرف سے ایک عملی مثال کے پیش کرنے کا موقعہ سیدنا الامام الکبیر کے سامنے آگیا۔ اور ٹھیک جیسے حضرت مولانا اسماعیل شہید نے اپنی بہن کا عقد کر کے تول کو فعل کے مطابق کر کے دکھایا تھا۔ سیدنا الامام الکبیر نے بھی جو کچھ دوسروں سے فرما رہے تھے خود کر کے دکھایا اور آل و اولاد رکھنے والی اپنی بہن کو عقد ثانی کرتے پر آپ نے راضی فرمایا، اور ان کا نکاح ہو گیا،

اس کا تفصیلی واقعہ جو میں نے اپنے بزرگوں سے بکرات و مرآت سنا ہے بعینہ اسی انداز کا ہے جو حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت نافو تو ی رحمۃ اللہ علیہ دیوان میں نکاح بیوگان کا وعظ فرما رہے تھے، انشاء وعظ میں شبیہ و خ میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ حضرت انداز سے سمجھ گئے کہ وہ بطور اعتراض میری بہن کی بیوگی اور عدم نکاح کا ذکر کرینگے۔ فرمایا کہ آپ ذرا ٹھہریں مجھے ایک ضرورت پیش آگئی ہے میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت وعظ کی چوکی کو اتارے اور گھٹیں تشریف لے گئے مجلس اپنی جگہ جمی رہی۔ گھر میں پہنچ کر اپنی بیوہ بہن سے جو عمر میں بڑی تھیں اور کافی ضعیف ہو چکی تھیں پیر پکڑ کر بجا جت سے عرض کیا کہ آپ کی ایک ہمت سے ایک سنت رسول زندہ ہوتی ہے اور میں احیاء سنت کے قابل ہو سکتا ہوں۔ بہن نے گھبرا کر کہا کہ بھائی ایسی کیا بات ہے میرے پیر تو چھوڑ دو میں کہاں اس قابل کہ کسی سنت رسول کے احیاء کا سبب بنوں؟ فرمایا کہ آپ نکاح فرمائیں، اس پر بہن نے کہا کہ بھائی تم دیکھ رہے ہو کہ میں ضعیف ہو چکی ہوں سر سفید ہو چکا ہے نکاح کی عمر نہیں ہے۔ فرمایا یہ سب صحیح ہے مگر یہ نکاح محض عقد بیوگان کی سنت کے احیاء کے لئے ہوگا، کسی طبعی ضرورت کی بناء پر نہیں۔ اُس پر بہن راضی ہو گئیں اسی وقت گھر ہی میں حضرت نے نکاح پڑھا اور نکاح سے فارغ ہوتے ہی باہر تشریف لائے۔ مجلس وعظ اسی طرح جمی ہوئی تھی۔ حضرت نے بقیہ وعظ شروع فرمایا۔ وہ معترض تو اعتراض کی ٹھانے ہی ہوئے تھے پھر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ مجھے کہنا یہ ہے کہ آپ تو نکاح بیوگان کا وعظ فرما رہے ہیں اور آپ ہی کے گھر میں آپ کی بہن بیوہ بیٹھی ہوئی ہے؟ فرمایا کون کہتا ہے کہ وہ بیٹھی ہیں اُن کے نکاح کے گواہ تو اس مجلس میں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ گواہوں نے گواہی دی کہ ان کا نکاح تو ہماری موجودگی میں ہوا ہے اس پر تمام جلسہ متاثر ہوا اور اسی مجلس میں تقریباً پچاس ساٹھ نکاح ہوئے اور پھر یہ تحریک نہایت قوت سے آگے چلی۔

محمد طیب غفرلہ

ظاہر ہے کہ جہاں گفتار کردار کا قالب ان شکلوں میں اختیار کر رہا تھا۔ وہاں اگر یہ صورت پیش آئی ہو، جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے کہ

”پھر تو اس دھوم دھام سے نکاح (ثانی) ہونے لگے، جیسے کنواری لڑکیوں کے“

ہمارے مصنف امام نے سیدنا امام الکبیر کے متعلق جو یہ خبر دی تھی کہ ”عقد بیوگان کی عام اشاعت ان ہی کی بدولت ہوئی“ اس کا مطلب یہی تھا، کہ عزت و ناموس کے منافی بیوہ خورتوں کے عقد کو جو عموماً سمجھا جاتا تھا، اس غلط فہمائے خیال کا ازالہ ہو گیا، بقول مصنف سوانح مخطوطہ

”یہ تو نہیں کہ سب بیواؤں کا نکاح ہو گیا، مگر جو روگ دل کے اندر تھا کہ نکاح ثانی کو تنگ کٹی“

اور شرافت کے خلاف سمجھتے تھے وہ دور ہو گیا، اور عیب نہ رہا“ ص ۱۷۱

اس میں شک نہیں کہ بیان کرنے والوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ بیان کیا ہے، زیادہ تر اس کا تعلق اسی علاقہ کے مسلمانوں سے ہے، جس میں سیدنا امام الکبیر نے اپنی تحریک جاری کی تھی، لیکن دارالعلوم دیوبند کے قائم ہو جانے کے بعد سارے ہندوستان میں پڑھ پڑھ کر علماء جو پھیلے آگے ان کی امداد کے زیر اثر شخصیتوں کی بدولت ہمارے زمانے تک عقد بیوگان کے رواج میں کافی وسعت پیدا ہو چکی ہے۔

۱۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں اس رسم بد کے ازالہ میں جو کچھ کام ہوا، براہ راست دارالعلوم دیوبند امداد کے ہم خیالوں ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، بلکہ حضرت سید شہید کے ماننے والوں میں ایک طبقہ اہل حدیث کو جو پیدا ہو گیا تھا، اس کی طرف سے بھی کافی جدوجہد ہوئی۔ مولانا حالی کی مشہور نظم بیوہ کی مناجات وغیرہ کا بھی کافی اثر بڑا، عجیب بات ہے کہ مسلمان تو مسلمان پچھلے دنوں خود ہندوؤں میں بعض لوگ بدھوا بواہ کی تحریک کو لے کر کھڑے ہوئے اور گو مسلمانوں کی جیسی کامیابی تو ان کو نہیں ہونی ہے لیکن قدرت کا پھر بھی یہ تماشا ہی ہے کہ جن کو دیکھ کر مسلمان اس مسئلہ میں جکڑے تھے، خود ان ہی میں اس ظالمانہ رسم کے خلاف نوجو بڑے سوچے جانے لگیں، اور تھوڑا بہت عمل بھی ہونے لگا۔ بہر حال اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے زیر اثر حلقوں کا بھی اس اصلاح میں غیر معمولی حصہ ہے۔ بہار کے جن علاقہ میں خاکسار کا دطن ہے، یعنی ضلع پٹنہ کا مشرقی علاقہ جسے گدیالنگہ بھی کہتے ہیں، جہاں تک میں جانتا ہوں اس علاقہ کی سادات برادری میں سب سے پہلے موضع دستہ جو مولانا سید سلیمان ندوی کا مولد و منشا ہے، اسی گاؤں کے ایک بزرگ حافظ نجم حسین مرحوم نے (باقی صفحہ ۱۶ پر)

کچھ بھی ہو، آج "حقوق نسوان" کے نام نہاد مغالطی عنعان کی ماہوں سے احترام و اکرام کے پیدائشی حقوق سے صنف نازک کی محرومی کا جو عام کاروبار جاری و ساری ہے، جن نسوانی خصوصیتوں کا ذکر بھی انسانی مجالس میں عورتوں کے ناموس و عزت پر ناپاک حملہ سمجھا جاتا تھا، شریف، اخوں میں جن کا تصور بھی گناہ بن جاتا تھا۔ آج تصویروں اور محسوس میں ان ہی کو نمایاں کر کے بازار میں چیزیں فروخت ہو رہی ہیں، تجارت کی گرم بازاری کا واحد ذریعہ زراندوزی کا عام طریقہ صرف یہی رہ گیا ہے کہ اپنی ماؤں بہنوں، بیٹیوں، کی عریانیوں کا تماشا دکھا دکھا کر خریداروں کی توجہ مال کی طرف پھیری جائے۔ صابن کی ایک ٹکلیہ کے پیچھے کے سٹے، نسوانی عورت و ناموس کو داؤ پر چڑھانے والے چڑھا رہے ہیں۔

حرم عفاف کا ایک ایک سرمایہ لٹ رہا ہے، لٹا جا رہا ہے، لیکن رسوائیوں ہی میں سمجھا یا جا رہا ہے کہ عورتوں کی آبرو و احترام کی ضمانت پوشیدہ ہے، جو چیز بجز کثافتوں کے اور کچھ نہیں ہے باور کرایا جا رہا ہے کہ اُسی سے جنس لطیف کی لطافتوں میں لطافتوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے، ادنیٰ نوع انسانی کی پیدائش، نشو و نما کا سارا بار جو تنہا اٹھائے ہوئی تھی، اُسی غریب عورت پر شایید بھی چھا رہا جا رہا ہے کہ معاشی جدوجہد کا بوجھ بھی اُسی پر لا دیا جائے۔ مردوں کا بے غیرت طبقہ معاش کی ہلکی ذمہ داری کو بھی چاہتا ہے کہ اپنی پیٹھ سے جھٹک کر الگ ہو جائے۔

(گزشتہ صفحہ سے) عقد بیوگان کا عملی نمونہ اپنی بیوہ کی کا عقد کر کے پیش کیا، اور حافظ صاحب مرحوم سیدنا الامام الکبیر کے خاص وابستہوں میں تھے۔ ابتدا میں جیسا کہ اپنی کتاب کمالات رحانی میں انہوں نے لکھا بھی ہے، حضرت دلاوی سے شرف بیعت بھی ان کو حاصل ہوا تھا، بعد کو حضرت حاجی اہل اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی سے بھی مستفید ہوئے۔ اگرچہ حافظ صاحب مرحوم کا عملی نمونہ بھی اقامی جرات کے لئے کافی نہ ہوا، لیکن آج سے تقریباً پچیس تیس سال پہلے برادری کے ایک سربراہ مدد وکیل مولوی محمد حسین مرحوم جو حکومت بہار میں دواوت تعلیم کے عہدے سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی جوان بیوہ کی کا عقد کر کے دوسروں کے لئے راستہ صاف کر دیا، اور اب الحمد للہ کسی قسم کا محضہ اس علاقہ کے مسلمانوں میں عقد بیوگان کی طرف سے باقی نہیں رہا ہے، بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وقتاً فوقتاً اس کی مثالیں آئے دن پیش آتی رہتی ہیں سن سنہ حسنہ ۱۴۰۲ھ اجوہا واجوہ من عمل بها قانون ہر منزل پر کام کرنے والوں کو انشاء اللہ کام دے گا۔ ۱۲

خدا ہی جانتا ہے کہ حق کے لباس میں ”باطل“ کا یہ طوفان بنی آدم کے گھرانوں میں جو ہلچل مچائے ہوئے ہے اس کا آخری انجام کیا ہوگا؟

لیکن عورتوں ہی کے حقوق کا ایک پہلو یہ بھی تھا، جو تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے سرزمین ہند میں انتہائی ظالمانہ پامالیوں کا شکار رہنا ہوا تھا، کسی شور اور ہنگامہ کے بغیر اس بے زبان طبقہ کے حقیقی بھی خواہوں نے چہرہ دستیوں کے آئینے میں نہ دیکھا تھا، لیکن میں کالی بھائی کی، سچ پوچھتے تو عورتوں کے حقوق کے احیاء اور حفاظت کا صحیح طریقہ یہ یا اسی قسم کی باتیں ہو سکتی ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جنس نسوانی کے نجات دہندوں میں ہمارے سیدنا الامام الکبیر قدس اللہ سرہ العزیز کا وجود بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان آبرو باختوں کا غوغائی شیعہ تو آپ نے کبھی اختیار نہیں فرمایا، جو عورتوں، عورتوں کے حقوق کی چیخوں سے کانوں کو بہرا بنائے ہوئے ہیں لیکن قدرت کے عطا کئے ہوئے حقوق جن کا ہر طبقہ جائز طور پر حقدار تھا، ان کی پامالی آپ کے لئے ناقابل پروا شدت تھی ”عقد بیوگان“ کے مذکورہ بالا کارنامہ کے سوا آپ کو یاد ہوگا، کسی موقع پر اس کا ذکر کر چکا ہوں، جلال آباد جو ضلع مظفرنگر کا مشہور قصبہ تھا نہ بھون کے نواح میں ہے، اسی قصبہ کے مسلمان باشندوں کی اس بری رسم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

”وہاں لڑکیوں کا حق نہیں دیا جاتا“

سیدنا الامام الکبیر یہ فرمایا کرتے تھے کہ جلال آباد کے مسلمانوں کی جائیداد کا خریدنا اسی لئے جائز نہ ہوگا، یہ روایت حضرت مرشد تھانوی کی قصص الاکابر میں پائی جاتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے حضرت والا کے اس فتوے کی بدولت اپنے شرعی حصہ کے پانے میں کتنی غریب لڑکیاں کامیاب ہوئی ہونگی جہاں تک میں جانتا ہوں، کم از کم مظفرنگر سہارنپور وغیرہ روہیلکھنڈ کے عام اضلاع کی اسلامی بستیاں اس باغیانہ طرز عمل کی آلودگیوں سے پاک ہو چکی ہیں اور یہ دعویٰ مشکل ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے نقطہ نظر کو تطہیر کے اس عمل میں دخل نہ تھا، عرض کر چکا ہوں کہ وراثت کے مسئلہ میں بھی جب وہی بلکہ اس سے بھی زیادہ کر کے آپ دکھا چکے تھے، جسے مسلمانوں کی زندگی میں آپ دیکھنا چاہتے تھے،

تو جیسے ”عقد بیوگان“ کے قولی وعظ کے ساتھ آپ کا عملی نمونہ اثر انداز ہوا۔ اسی طرح وراثت کے باب میں بھی آپ کے طریقہ عمل کی پیروی لوگ کیوں نہ کرتے۔

بہر حال داخلی اصلاحات کے سلسلے میں جیسے عقد بیوگان کے مسئلہ میں سیدنا الامام الکبیر خانوادہ ولی اللہی کے تقاضے سے متاثر تھے اور ولی اللہی طریقہ کے بزرگوں ہی کے کام کی آپ نے تکمیل فرمائی تھی، اسی طرح جیسا کہ چاہئے تھی تھا دوسرے شعبوں میں بھی اسی خاندان کے دینی احساسات سے آپ کی اثر پذیری ایک قدر قی بات تھی، اسی خاندان کے تعلیم یافتہ بزرگوں کے حلقہ میں آپ کی علمی اور عملی صلاحیتیں بروئے کار آتی تھیں، قلب مبارک خانوادہ ولی اللہی کے اکابر کی عظمت و احترام سے معمور تھا خود شاہ صاحب رحمہ اللہ کا اور آپ کے مینوں صاحبزادوں، مولانا شاہ عبدالعزیز مولانا شاہ عبدالقادر مولانا رفیع الدین کا ذکر جس غیر معمولی عقیدت و ادب کے ساتھ آپ کیا کرتے تھے۔ اسی سے آپ کے دل کی کیفیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنی کتاب ہدیۃ الشیعہ میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا نام جہاں کہیں آپ نے لیا ہے، وہاں

”حجتہ اللہ فی العالمین، خاتم المحدثین والمفسرین عمدة المتکلمین، زبدة المناظرین مولانا

شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ“ ص ۱۷۰

یا قریب قریب اسی قسم کے الفاظ بے ساختہ آپ کے قلم سے نکلتے چلے گئے ہیں، اسی ہی حال ان کا دوسرے بھائیوں کے متعلق تھا۔ بقول امیر شاہ خان مرحوم جیسا کہ ارواح ثلاثہ میں واقعہ یہ ہے کہ

”ولی اللہی خاندان کے ایک ایک فرد سے محبت اور فدائیت تھی“ ص ۱۷۱

لیکن ان ولی اللہی بزرگوں میں آپ کی خصوصی محبت و عقیدت کا مرکزی محور جیسا کہ کچھ والدوں نے نقل کیا ہے، حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی مبارک ہستی تھی، امیر شاہ خان مرحوم تو کہا کرتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کو

”مولانا شہید سے عشق تھا“ ص ۱۷۲

اور مشہور قاعدہ من احب شیعہ اکثراً ذکر کر کے جس چیز سے آدمی کو محبت ہوتی ہے اس کا ذکر بھی وہ زیادہ کرتا ہے، کو پیش نظر رکھتے ہوئے عشق کے اس دعوے کے ثبوت میں خان صاحب مرحوم حضرت والائی اس عادت کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے کہتے تھے کہ حضرت نافونوی کا حال یہ تھا کہ مولانا اسماعیل فہیدہ کا آپ کی مجلس میں

”کسی نے تذکرہ چھیڑا تو اس کی بات کاٹ کر خود ان کا تذکرہ شروع کر دیتے تھے۔“ سچ پرچھے تو مولانا شہید کی علمی و روحی وسعت کے سوا اس غیر معمولی تعلقی میں جہاں تک میرا خیال ہے۔ قاعدہ مسند کہ مجلس الی الجناحیں

کا قانون بھی کار فرما تھا، سیدنا الامام الکبیرؑ کی رہنمائی زندگی کے حالات میں زیادہ تاکہ ایک سید نے زیادہ بزرگوں کو ایام مذہبیت ہی میں مل کر اس کے بلوے میں نہ لانا، ام الکبیر کے طالع اجماع میں چمکتے ہوئے نظر آئے تھے، خود آپ کے استاد مولانا مملوک علی ہمارے اساتذہ میں سے تھے، ان سے وہ فوٹو گوں کی باہمی مناسبت اور فطرتی تباہ کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

ایسی صورت میں مسلمانان ہند کے داخلی اصلاحات کی فہرست دونوں بزرگوں کی اگر ایک ہوتا تو یہی ہونا بھی پابہ تھا اور عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے لیکن قاعدہ یہ ہے کہ بعض نئے حالات اور خوشامدات نے جہاں تک میرا خیال ہے، اس سلسلہ کو سیدنا الامام الکبیر کے عہد میں زیادہ پیچیدہ اور دشوار بنا دیا تھا تفصیل کا تو موقع نہیں ہے لیکن اجمالاً اتنی بات تو کہلی ہوئی ہے کہ غیر اسلامی عناصر چپکے چپکے مسلمانوں کی دینی زندگی میں حدیوں سے جذب ہوتے چلے جا رہے تھے، تاہم ہندوستان میں پہنچ کر وہی مکروہ و مہیب قالب سامنے آچکا تھا جسے دیکھ کر بے ساختہ سیدنا الامام الکبیرؑ فرمانے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ

”کس منہ سے ہندوؤں کو برا اور اپنے آپ کو بھلا کہہ سکتے ہیں؟“ ام فیوض قاسم

در اصل یہی مسئلہ ”سنت و بدعت“ کا تھا اور کوئی شبہ نہیں کہ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى النَّبِيِّ وَالْحَمْدُ | آگاہ ہے کہ اللہ ہی کے لئے ہے دین فاضل

کے قرآنی نصب العین کی طرف واپس لے جانے کے لئے بیرونی آلائشوں سے مسلمانوں کے دین کو پاک کرنے کا سلسلہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے جو شروع ہوا تھا۔ تطہیر و تزکیہ کا یہ کاروبار بہ تدریج آگے ہی بڑھتا چلا جا رہا تھا حضرت مجدد کے بعد خافواہ ولی الہی نے اس راہ میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ تاہم نیکہ حضرت مولانا اسماعیل شہید نے اپنے شیخ طریقت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں اس تحریک کو ”ہند گیتھریک“ بنا دیا۔ سنت و بدعت کی کشمکش کے ان ہی دنوں میں یورپ کی ایک ایسی عیسائی قوم کی حکومت ملک پر قائم ہو گئی، جو صلیبی دین کے قدیم کلیسائی نظام کی تطہیر کا جو اپنی گردن سے اتار چکی تھی، بلکہ ایک طبقہ ان کا مذہب ہی مسلمات کے متعلق غیر معمولی طور پر بے باک ہو چکا تھا، اسی زمانہ میں مسلمانوں کے بعض ممالک میں بھی یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ اگلی نسلوں کے دین پر اعتماد کر کے پھلی نسلیں جن باتوں کو مانتی چلی آرہی ہیں ضرورت ہے کہ ان پر تنقید کی جائے۔ خصوصاً عرب جو مسلمانوں کا دینی مرکز ہے، اس تحریک کا وزن اسی کے بعض خاص علاقوں پر غیشہ معمولی طور پر پڑ رہا تھا۔ نجد کے باشندے، اور اسی علاقہ کے ایک عالم محمد بن عبدالوہاب اس تحریک کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔

یہی بیچ دربیچ تاثری اسباب تھے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید شہید جس جماعت کو چھوڑ کر احیاء علم و ادب یوزقون کی قدوسی صف میں مشرک ہوئے تھے۔ اس جماعت کے بعض افراد تطہیر و تزکیہ کے اس عمل میں حدود سے تجاوز کرنے لگے۔ مٹھے ہوئے گوشت کے ساتھ زندہ گوشت پر بھی عمل جماعی کرنے لگے، بے احتیاطیاں اس حد تک ترستی کر کے پہنچ چکی تھیں کہ مسلمانوں کی دینی زندگی کی شرائین اور شرک تک کو نشتر زنی کی دھکیاں دیو گئی تھیں، اور بقول سیدنا امام الکبیر

”علماء و فقراء جن کو خلاصہ امت کہتے“ مکہ فیوض کا سمیہ

اسی خلاصہ امت کو اپنے عمل جرمی کا تختہ مشق ان لوگوں نے چا ہا کر بنا لیا جائے۔ گور باسلام

کی سیرزدہ سالہ دینی و علمی تاریخ کے سارے اوراق ہی کو چاہتے تھے کہ بے دروی کے ساتھ پھاڑ دیا جائے۔

الغرض بدعت کے ساتھ ساتھ ایسی بے شمار چیزوں کو وہ بدعت ٹھہرانے لگے، جن کے بدعت ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہی دشواری اور پیچیدگی تھی جس سے سیدنا امام الکبیر کو دو چار ہونا پڑا، ایک طرف وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ”اسلامی دین“ کو غیر اسلامی آلودگیوں سے پاک کرنے کی کوششوں میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ ان کو سخت تکلیف ہوتی تھی، جب دیکھتے تھے کہ بے تمیزیوں سے کام لے کر نوچنے والے ان چیزوں کو بھی نوچ کھسوٹ رہے ہیں جن کے بغیر مسلمانوں کی دینی زندگی کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائیگا، اپنی کتاب توثیق الکلام میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہ ہندوستان کے مسلمان نمازوں میں امام ابوحنیفہ کی تحقیق پر بھروسہ کرتے ہوئے امام کے پیچھے سورہ فاتحہ جو نہیں پڑھتے ہیں، اُن کے اس طرز عمل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ٹھہرا کر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو مورد طعن جو بنایا جا رہا ہے، سیدنا امام الکبیر کے قلم سے اسی موقع پر یہ الفاظ نکل پڑے ہیں کہ

”اس پر بھی امام ابوحنیفہ پر طعن کئے جائیں، اور تارکان قرأت پر عدم جواز صلوٰۃ کا الزام ہو کرے تو کیا کیجئے، زبان قلم کے آگے کوئی آڑ نہیں، دیوار نہیں، پہاڑ نہیں۔“
توثیق الکلام ص ۱۱

اسی سے ان کے ذہنی اضطراب کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں چند سطروں کے بعد ارقام فرماتے ہیں :-

”جس وقت امام علیہ الرحمۃ کی توہین سنی جاتی ہے، دل جل کر خاک ہو جاتا ہے اور یوں جی میں آتا ہے کہ ان زبان دراویوں کے مقابلہ میں ہم بھی لہن ترانیوں پر آجائیں، اور دو چار ہم بھی سنائیں، پر آئیہ اذا خاطبہم الجاہلون قالوا سلاما، و اذا مزوا باللغو

مرد و اکو اما، اور احادیث منع زنا منع ہیں۔“

علم و تحمل صبر و ثبات کے جبلی جذبات کا سیدزاد امام الکبیر کے خیال کیجئے اور پھر سوچئے کہ دماغی کوفت کی وہ کیا کیفیت ہوگی جس نے ان الفاظ کے لکھنے پر آپ کو مجبور کیا۔

اپنے اساتذہ حضرت شیخ الہند اور مولانا عثمانی مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہم کی زبانی اسی سلسلہ میں بعض لطیفے حضرت دالا کے فقیر نے سنے ہیں، جن میں ایک مشہور لطیفہ یہ بھی ہے جو فقرہ الحدیث کے سرگرم رکن مولوی محمد حسین بٹانوی کے سوال کے جواب میں حضرت دالا نے ارقام سنرایا ہے۔ بہر حال لطیفہ یہ سننے میں آتا ہے کہ مولوی محمد حسین صاحب نے (حضرت دالا کو لکھا کہ مجھے تنہائی میں آپ سے بعض مسائل میں گفتگو کرنی ہے مگر شرط یہ ہے کہ آپ کا کوئی شاگرد بھی وہاں موجود نہ ہو۔ حضرت نے منظور فرما کر جواب تحریر فرمایا کہ تشریف لے آئیں۔ غرض یہ) چنانچہ مولانا موصوف حضرت دالا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر وہی عرض کیا کہ تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں اجازت دے دی گئی،

جہاں تک یاد پڑتا ہے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ ہی سے یہ بات فقیر نے سنی تھی، فرماتے تھے کہ حجرہ بند کر دیا گیا، ہم طلبہ باہر تھے۔ دونوں میں گفتگو ہونے لگی، ہماری طالب علمی کا زمانہ تھا، بے اختیار رچی چاہا کہ اس گفتگو کو کسی طرح سنا چاہئے (میں اسی دروازہ سے لگ کر بیٹھ گیا جس کے متصل ہی اندر حضرات بیٹھے تھے، حضرت دالا نے مولانا سے فرمایا کہ دیکھئے جس مسئلہ میں بھی گفتگو فرمائی ہو، اس میں دو باتوں کا خیال رکھئے۔ ایک یہ کہ مسئلہ زیر بحث میں حنفیہ کا مذہب بیان فرمانا آپ کا کام ہوگا اور دلائل بیان کرنا میرا کام ہوگا۔ دوسرے یہ کہ میں مقلد امام ابوحنیفہ کا ہوں، اس لئے میرے مقابلہ میں آپ جو قول بھی بطور معارضہ پیش کریں وہ امام ہی کا ہونا چاہئے۔ یہ بات مجھ پر حجت نہ ہوگی کہ شامی نے یہ لکھا ہے اور صاحب درختار نے یہ فرمایا ہے، میں ان کا مقلد نہیں۔ چنانچہ فاتحہ خلف الامام، رفع یدیں آئیں با پھر وغیرہ بہت سے مختلف ذیل مسائل زیر گفتگو آئے اور حسب شرائط طے شدہ مولانا محمد حسین صاحب مذہب اخلاف

بیان فرماتے اور حضرت دالادلائل سے اسے ثابت کرنے حضرت کی تقریروں کے درمیان مولانا محمد حسین صاحب جھوم جھوم جاتے اور بعض اوقات توجوش میں سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے کہتے کھڑے ہوتے کے قریب ہو جاتے جب گفتگو ختم ہو چکی تو، محمد طیب (مولوی محمد حسین صاحب کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا کہ

”مجھے تعجب ہے کہ آپ جیسا شخص اور مقلد ہو (یعنی بایں زور علم و فراست و قوت استنباط تقلید کے کیا معنی؟“

جواب میں حضرت شیخ الہند کہتے تھے میں نے سنا حضرت دالادارشاد فرما رہے ہیں،
”اور مجھے تعجب ہے کہ آپ جیسا شخص اور غیر مقلد ہو۔ یعنی مدعی اجتہاد ہو۔“

اسی طرح ”خلاصہ است“ کے دوسرے رکن ”فقراء“ کے طرز عمل اللہ طریق زندگی، ان کے خاص مشاغل اور احساسات و وجدانات، جن کی اجمالی تعبیر ”تصوف“ سے کی جاتی ہے، یہاں کی یہ ٹولی اس طبقہ پر جن حلقہ گریوں اور نکتہ چینیوں سے کلام لیکر غلط کے ساتھ صحیح عن اصر کو بھی ملایا میٹ کرنے پر تلی ہوئی تھی، لکھن کے ساتھ گہیوں کو بھی دینی بصیرت سے محرومی کی وجہ سے نہیں رہی تھی۔ گویا دین کی روح ہی کے قبض کرنے کی فکر میں مشغول تھی، سیدنا الامام الکبیر اس طبقہ کے ان رجحانات سے بھی غیر معمولی طور پر متاثر تھے۔ اپنی بعض تحریروں میں بڑی سوزیوں کے ساتھ اسی سلسلہ میں ”سنت و بدعت“ کی صحیح حدود کو سمجھانے کی آپ نے کوشش کی ہے حکیم ضیاء الدین مرحوم (راپور منہیاران والے) کے نام مطبوعہ مکتوب فیوض قاسمیہ کے مجموعہ میں جو شریک ہے، ہے تو چند صفحات ہی کا یہ خط لیکن ”سنت و بدعت“ کے متعلق جتنی بڑی چھوٹی کتابیں کم از کم فقیر کی نظر سے گذری ہیں، میرا احساس تو یہی ہے کہ شاید اتنی ”جاہلیت“ کے ساتھ مسئلہ کا تصفیہ کسی ایک کتاب میں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ اسی میں مجملہ دوسری باتوں کے یہ سمجھاتے ہوئے کہ

علاج میں بعض ایسے امور ہوتے ہیں، بعض اوقات وہ غمنا اور عرضاً مامور ہوتے ہیں

پر لکھنے یا کہنے میں نہیں آتے، کیونکہ عاقل اور بے وقوف سب ان کے مامور بہ ہوتے
کو سمجھ جاتے ہیں۔“

پھر مطلب کو مثال سے ذہن نشین فرماتے ہوئے ارقام فرمایا گیا ہے کہ
”جیسے شربت بنفشہ کہ بعض اوقات پنساری کی دوکان وغیرہ پر تیار نہیں ملتا اس
صورت میں اس کی ترکیب کا دریافت کرنا پھر اس کے اجزاء کا مثل بنفشہ و شکر
مار (پانی) وغیرہ اور اس کے سامان کا مثل دیگی و آتش دان، وغیرہ فراہم کرنا بھی
مامور بہ ہوتا ہے، اور اس مامور بہ کو لکھا پڑھا، ہر کس و نا کس سمجھتا ہے۔“

۲۵ فیوض تاسمیہ

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مریض یا مریض کے تیمار دار پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ تم نے
دیگی میں دواؤں کو کیوں ڈالا، دیگی کو چھ لے پر کیوں چڑھایا جو لمبے کے لئے ایندھن کا بندوبست
کیوں کیا۔ طبیب نے تو صرف ”شربت بنفشہ“ کے پینے کا حکم دیا تھا، اور یہ سارا کاروبار شربت سازی
کے سلسلے میں جو تم نے انجام دیا ہے اس سے طبیب کے غشاء کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔
تو بجز جنون کے اور بھی کچھ سمجھا جاسکتا ہے۔

سیدنا امام الکبیر نے اسی طبی تمثیل کو پیش کر کے سمجھایا ہے کہ

”ایسے ہی علاج قلبی میں بہت سے امور ہوتے ہیں کہ وہ صراحتاً مامور بہ نہیں ہوتے،
ضمناً و عرضاً مامور بہ ہوتے ہیں، اس وجہ سے ظاہر میں وہ بدعت معلوم ہوتے ہیں،
حقیقت میں بدعت نہیں۔“ ۲۵

حقیقت یہ ہے کہ حضرات صوفیاء کرام کے بعض مشاغل جن کا حقیقی مقصد ”تصفیہ باطن“
اور ”تصحیح نسبت“ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ان کے متعلق یہ شبہ کہ کتاب و سنت میں ان کا ذکر
نہیں ملتا، انصاف سے اگر کام لیا جائے تو بآسانی اس کا ازالہ ہو جاتا ہے، ہاں! بجائے
وسیلہ کے ان مشاغل اور مقدمات کو دین کے حقیقی مطالبات میں ان کو شریک کرنا، پھیال

یہ عقیدہ بلاشبہ بدعت بن جائے گا۔ خود سیدنا الامام الکبیرؑ نے یہی لکھا ہے کہ
 ”اگر ان امور کو کوئی مقصود بالذات سمجھ بیٹھے، تو ظاہر ہے کہ اس وقت ان کی بحال
 آدمی بوجہ ذریعہ ہونے امور مسنونہ کے نہیں، تو اس وقت میں یہی امور مایہ
 نہ رہیں گے۔“

اسی کے بعد فرماتے ہیں کہ

”تو اب لاریب یہ سب امور بدعت ہو جائیں گے۔“

اسی کے ساتھ آپ نے یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ شرعی مطالبات کی تکمیل کی صورت اگر ان
 امور کے بغیر کسی وجہ سے کسی کے لئے ممکن ہو جائے تو فرماتے ہیں کہ اس کی مثال یہ ہوگی کہ
 ”شریت بنفشہ کہیں تیار مل جائے تو پھر وہ امور جن کو ذریعہ تحصیل شربت بنفشہ قرار دیا
 ہے، مایہ بہ نہ ہے۔“

اور جیسے صوفیہ کے بعض مشاغل جن کا صراحۃً ذکر کتاب وسنت میں نہیں ملتا، لیکن امور مطلوبہ
 جیسا کہ خود ہی فرماتے ہیں کہ مثلاً

”توجہ الی اللہ، اور تحصیل محبت خداوندی، اور قلع قمع محبت دنیا اور اہل دنیا اور
 تہذیب اخلاق و ازالہ خصال ناشائستہ۔“

ان امور کے حصول میں ان مشاغل سے مدد ملتی ہے، اور بقول ان ہی کے
 ”اہل عقل و تجربہ کاروں پر پوشیدہ نہیں کہ امور مذکورۃ الصدقہ کو بیشک ان مقاصد
 کے حصول میں مداخلت تام ہے۔ اس لئے ضمناً اور عرضاً مایہ بہ ہوئے۔“

اسی طرح ابتدا و کتب میں اس قسم کی چیزوں کا مثلاً آپ نے ذکر فرمایا ہے کہ
 ”کون نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ کلام اللہ اس طرح من
 اولہ الی آخرہ ادراک میں لکھا ہوا تھا، نہ اس میں اس زمانہ تک زیر بحث یا جرم ایجاد
 ہوئے تھے، نہ کتب احادیث یوں تصنیف ہوئیں، نہ تہذیب کتب فقہ و اصول فقہ

اور تفسیر کا دستور تھا۔

طبقہ علماء کی مذکورہ بالا خدمات یا اسی نوعیت کی جو دوسری چیزیں ہیں سب کو آپ نے اسی میں شامل فرمایا ہے جو غنم اور غرضاً ماور بہ ہیں یعنی شریعت کے مطالبات کی تکمیل میں معاون مدد ہیں۔

اسی سلسلہ کا ایک حکیمانہ فیصلہ سیدنا الامام الکبیر کا وہ بھی ہے جسے آپ کی کتابوں میں تو میں نے نہیں پایا ہے، لیکن آپ کے خلف رشید مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حیدر آباد کی ایک مجلس میں اس کا تذکرہ فرمایا تھا، خاکسار بھی اس مجلس میں شریک تھا، جی چاہتا ہے کہ اسے یہاں درج کر دوں۔ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والا کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ شرعی مطالبات کو دو حصوں میں تقسیم کر کے فرمایا کرتے تھے کہ ایک حصہ تو ان مطالبات کا ایسا ہے جس کی روح اور قالب یا معنی اور صورت دونوں ہی کو شریعت نے متعین کر دیا ہے۔ مثلاً نماز کا جو حال ہے کہ روح اس کی ذکر اللہ ہے، اقمہ الصلوٰۃ لذکرہ ای قائم کرو نماز کو میری یاد کیلئے، مشرعیّت نے اس کی تصریح بھی کی ہے، اور اسی کے ساتھ نماز کے قالب اور ظاہری صورت کو بھی متعین کر دیا ہے، یعنی ہر رکعت میں قیام کے ساتھ طے کر دیا گیا ہے کہ ایک رکوع دو سجدے ہوں وغیرہ وغیرہ، پس اس قسم کے مطالبات میں تو روح اور معنی کے ساتھ شرعی مطالبات کی ظاہری شکل و صورت میں بھی کسی قسم کی ترہیم یا اضافہ کا حق کسی کو نہیں ہے، اسی کے مقابلہ میں شرعی مطالبات ہی کی ایک قسم ایسی بھی ہے، کہ اصل مقصد اور روح کا مطالبہ کر کے قالب اور شکل و صورت کے مستحق آزادی بخشی گئی ہے۔ مثلاً جہاد ہی کے حکم کو لیجئے، اعلیٰ کلمۃ اللہ اور کفر کی شوکت و قوت کا ازالہ اس حکم کی روح ہے، لیکن شریعت نے اس کا پابند لوگوں کو نہیں بنایا ہے کہ اس حکم کی تعمیل کا نہ قالب کیا اختیار کیا جائے، عہد نبوت میں صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جہاد کے فرض کو

لے سنت و بدعت کے بارہ میں اس حکیمانہ فیصلہ کی تفصیلات اور ائمہ لطیف مباحث مصباح التزاد میں موجود ہیں جو شوق رکھتے ہوں اس میں مطالعہ فرمائیں۔ محمد طیب غفرلہ

اور برچھے، ڈھال، تیر و کان وغیرہ آلات کے ذرائع کو اختیار کر کے ادا کرتے تھے، لیکن موجودہ زمانہ میں جنگ کے آلات بدل گئے ہیں، آج کل توپ، بندھن، نئے آلات حرب استعمال ہونے لگے ہیں، پس جہاد کے حکم کی تعمیل کی سعادت ان جدید آلات حرب کو استعمال کر کے جو حاصل کرنے کا یقیناً شریعت ہی کے مطالبہ کی وہ تعمیل کر رہا ہے، اس پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ جہاد میں خلاف مسنون چیزوں کا استعمال کر رہا ہے، اور بجائے سنت کے وہ بدعت کا مرتکب ہے۔

برسوں کی سنی ہوئی بات ہے، جہاں تک حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر سے بات سمجھ میں آئی تھی، اپنے الفاظ میں نے اس کو ادا کر دیا ہے۔ کچھ بھی ہو جو بھی تھوڑی بہت سمجھ رکھتا ہے، وہ حضرت والا کی مذکورہ بالا تقسیم کی واقعیت کا انکار نہیں کر سکتا، میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ جہاد کا جو حال ہے، تقریباً کچھ یہی صورت ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں ذکر اللہ کی بھی نظر آتی ہے۔ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوہہم (یعنی کھڑے بیٹھے لیٹے) ہر حال میں ذکر اللہ کو مشغلہ بنانے والوں کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے، اللہ کے ذکر کا حکم بھی دیا گیا ہے، اور اسم اللہ کے ذکر کا مطالبہ بھی قرآن ہی میں پایا جاتا ہے، لیکن ان ذکری مطالبات کی تعمیل کا کوئی خاص قالب نماز وغیرہ مطالبات کی طرح شریعت نے مقرر نہیں کیا ہے، پس جہاد کے حکم کی تعمیل حالات اور وقت زمانہ کے لحاظ سے جس شکل میں بھی کی جائے گی، جیسے وہ شرعی مطالبہ ہی کی تعمیل ہے، اسی طرح صدقہ کرام رحمۃ اللہ علیہم نے حالات کے لحاظ سے جو قالب اور جو شکل بھی ذکر اللہ کے لئے جس زمانہ میں ہی اختیار کی ان کے اس طرز عمل کے متعلق یہ سوال کہ شریعت میں ان خاص طریقوں کا پتہ نہیں چلتا، خود ہی سوچئے کہ کیا صحیح دینی بصیرت کا یہی تقاضا ہے؟

بہر حال سیدنا امام البخیر رحمۃ اللہ علیہ پہلے مسلمانوں کی دینی زندگی کی تطہیر و تزکیہ کا کام تو یک سوئی سے انجام پارہا تھا، مقابلہ میں صرف وہی طبقہ تھا جو

ما وجدنا علیہ اباؤنا الاولیٰ | ہم نے اپنے پچھلے باپ دادوں کو اس پر نہیں پایا
کو حق و باطل کا محیراٹھہراتے ہوئے اسی پر اصرار کر رہا تھا، لیکن تطہیر و تزکیہ کے اس اصلاحی

میدان میں سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں اترے تو دوسری ٹولی مسلمانوں میں ان لوگوں کی پیٹھا ہو چکی تھی جو

ان ہذا الاساطیر الاولین | یہ تو صرف پہلوں کی کہانیاں ہیں
کا حرب بے دردی کے ساتھ ہر اس چیز پر بے محابا چلا رہی تھی جو اگلی نسلوں سے منتقل ہو کر پھیلی نسلوں
تک پہنچی تھی، فقہ و تصوف کا سارا سرمایہ ان کے نزدیک

ان ہذا الافک قدیم | یہ محض وہی پہلی بہتان بندی ہے۔
سے زیادہ اور کوئی وقت نہیں رکھتا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ واقعی معیار حق و باطل کا نہ بانیست ہی
کا اول الذکر مسلک ہے اور نہ افلیت کا آخر الذکر طریقہ، ایسی صورت میں اس شخص کا کام و تدبیر
بہت زیادہ دشوار ہو جاتا ہے، جو ان دونوں مختلف ذہنیاتوں کے اثر سے آزاد ہو کر حق و باطل کے
واقعی معیار پر چیزوں کو پرکھنا چاہتا ہو، سچ پوچھے تو کچھ اسی قسم کی صورت حال سے مسلمانوں کی
داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر دو چار تھے، ان کی دینی بصیرت پارہی تھی کہ ان
دونوں متخالف ذہنیاتوں کے نتائج میں سچ کے ساتھ کچھ جھوٹ اور جھوٹ کے ساتھ کچھ سچ بھی
شریک ہے، جھگڑوں و رگڑوں کے اس طوفانی ہنگامہ میں حق و باطل کے انبار سے اصل
حقیقت کو کھینچ کر باہر لانا، اور آدمی خود جو کچھ دیکھ رہا ہو دوسروں کو بھی دکھانا، خود سوچنے کہ
یہ کتنا نازک کام ہے، لیکن اسی حد سے زیادہ نازک کام کو جہاں تک آپ کے امکان میں تھا
کمال حزم اور فائت احتیاط کے ساتھ آپ انجام دیتے رہے، اسی سنت و بدعت والے مسئلہ میں
یہ سمجھانے کے بعد کہ بہت سی باتیں جو بدعت نہیں ہیں،

”ان کو بدعت کہنا اپنا تصور فہم ہے“

لیکن احتیاط دیکھئے کہ صاف لفظوں میں ان امور پر ”سنت“ کے لفظ کے اطلاق کو بھی آپ
پسند نہیں فرماتے، بلکہ مذکورہ بالا تفسیری کو مششوں کے بعد آخر میں لکھتے ہیں تو یہ لکھتے ہیں کہ
”ہاں بسبب اس کے کہ ظاہر شرع میں یہ مامور نہیں، اس وجہ سے ان کو اگر

سنت نہ کہا جائے اور ملحق بالسنت کہا جائے تو مضائقہ نہیں“ ۲۵ فیوض قاسمیہ
اسی زمانہ میں لوگوں نے ”سماع موتی“ کے پرانے مسئلہ کو پھر نئے سرے سے زندہ کرنا
چاہا تھا، عام مسلمانوں کے قبری کار و بار کے ان قصوں کو دیکھ کر جن کے متعلق سیدنا الامام الکبیر
کایہ فقرہ نقل کر چکا ہوں کہ ”کس منہ سے ہندوؤں کو برادر اپنے آپ کو بھلا کہہ سکتے ہیں“ بعضوں
نے چاہا کہ موتی کے سماع ہی کا انکار کر دیا جائے مطلب ان لوگوں کا یہ تھا کہ بنیادی اڈے ہی کو
اڑا دیا جائے۔ نہ بانس رہے گا نہ بانسری بجے گی۔

پوچھنے والے نے سیدنا الامام الکبیر سے بھی اسی مسئلہ کو دریافت کیا۔ حضرت دالانے
چند اوراق میں سوال کا جواب دیا ہے اور ”جمال قاسمی“ نامی مجموعہ مکاتیب میں یہ جواب شریک
ہے، حاصل یہی ہے کہ سماع موتی کا آپ نے انکار نہیں فرمایا، لکھا ہے کہ جب

”قبرستان میں گزرے تو سلام سے در لے نہ کرے، اور من پڑے تو ہدیہ مناسب
وقت بھی پیش کرے، ورنہ سخت بے مردتی ہے، جو یوں آنکھیں چرائے چلا جائے“

اور یہ تو خیر قول ہے، آپ کے تلمیذ سعید مولانا منصور علی خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں آپ
کے مسلک کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہ

”بزرگوں کے مزار پر جایا کرتے، دعا کر کے چلے آتے۔“

آگے صراحت اپنی یہ شہادت قلم بند کی ہے کہ

”سماع اولیاء اللہ کے قائل تھے۔“

اور قائل ہی نہیں بلکہ آگے لکھتے ہیں کہ

”اگر کیسے کسی مزار پر جاتے، اور دوسرا شخص وہاں موجود نہ ہوتا، تو آواز سے عرض کرتے

کہ آپ میرے واسطے دعا کریں“ ۱۹۲

اسی سلسلہ میں حکیم صاحب مرحوم نے مکمل شاہ صاحب قدس اللہ سرہ کے مزار واقع مراد آباد
کے اس قصہ کا بھی تذکرہ کیا ہے، جسے شاید کسی جگہ میں درج کر چکا ہوں، حوالہ یہی ہے کہ

مکمل شاہ صاحب کے مزار کے پاس ایک دفعہ حکیم صاحب نے دیکھا کہ سیدنا الامام الکبیر تشریف فرما ہیں۔ حکیم صاحب بھی مزار کے قریب پہنچے اور بے خیالی میں ان کا پاؤں مزار شریف سے چوگیا، حکیم صاحب کا بیان ہے کہ حضرت والا کو دیکھا کہ بے ساختہ دونوں ہاتھوں سے میرے پاؤں کو کپڑے ہوئے مزار سے الگ کر رہے ہیں، حکیم صاحب کہتے تھے کہ مجھ پر تو لرزہ طاری ہو گیا اور زمانہ تک اپنی اس جرات بے جا پر دل نادم رہا۔

اور ایک حکیم صاحب ہی نہیں، مولانا طیب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی یادداشت میں ارقام فرمایا ہے کہ حضرت نانوتوی

”اپنے بزرگوں سے میں نے یہ سنا ہے کہ کلیر شریف تشریف لے جاتے تو رٹکی سے پیدل، ننگے پاؤں ہو جیتے، اور شب کو روضہ میں داخل ہو کر کراڑ بند کر دیتے تھے، اور تمام رات حضرت صابر صاحب کے مزار پر تنہائی میں گزارتے تھے۔“

اسی یادداشت میں مولانا طیب صاحب نے مولانا منظور نعمانی مدیر الفرقان (لکھنؤ) کے حوالہ سے روایت بھی درج کی ہے کہ سنبھل سے مراد آباد جاتے ہوئے راستہ میں ایک جھاڑی کے اندر اینٹوں کا ڈھیر سا نظر آتا ہے۔ ایک دفعہ سیدنا الامام الکبیر اسی راہ سے بیل تانگے پر گزر رہے تھے، جوں ہی کہ تانگہ اس جھاڑی کے سامنے پہنچا، تانگہ کو رک جانے کا حکم دیا، اور ترک اینٹوں کے اس ڈھیر کے قریب پہنچے، مراقب ہو گئے، مراقبہ سے فارغ ہو کر تانگہ کی طرف جا رہے تھے اور زبان مبارک پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری تھے۔

”اللہ اکبر بہت ہی جلالی آدمی ہیں۔“

مولانا منظور صاحب نے سنبھل کے رئیس نواب عاشق حسین صاحب سے یہ روایت سنی تھی، اس سفر میں حضرت والا کے ساتھ خود نواب صاحب موصوف اور ان کے مامول منشی حمید الدین مرحوم تھے، جن کا شمار سیدنا الامام الکبیر کے عشاق میں ہے۔

اور سچی بات تو یہ ہے، جس شخص کے متعلق اس قسم کے مشاہدات، مکار شفا، معجزات، عجاظ

پہنچے ہوئے ہوں۔ مثلاً امر دہرہ میں سادات کا جو خاندان شیخ آئین کی اولاد میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن ”شیخ“ کے لفظ کی وجہ سے آئین صاحب کی سیادت پر لوگ شک کرتے تھے، کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ان ہی شیخ آئین کے مزار پر سیدنا الامام اکبر مولانا احمد حسن امر دہوی کے ساتھ تشریف لے گئے جن کا نسب تعلق شیخ آئین سے تھا۔ مزار پر مرقبہ کے بعد سراٹھا کر مولانا احمد حسن کو خطاب کر کے حضرت والا فرماتے لگے، کہ

”مولوی احمد حسن اب شبہ نہ کر دینی سیادت میں“

یہ اور اسی قسم کی بہت سی باتیں لوگ جو نقل کرتے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے ”سماع موتی“ کے مسئلہ میں حضرت والائے جس پہلو کو ترجیح دی ہے، ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور وہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ کیا اپنے مشاہدے کا انکار کرتے؟ لیکن بایں ہمہ اسی مطبوعہ مکتوب میں جس میں ”سماع موتی“ کے متعلق اپنے نقطہ نظر کو نقلی و عقلی وجوہ کی روشنی میں پیش فرمایا ہے، اسی میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

”عوام اپنے خیال خام میں اولیاء کو قادر اور منصرف یعنی ”غنی محتاج الیہ“ سمجھتے ہیں،

تو اگر اس زمانہ میں اس امکان استماع کا بھی چرچا کیا جائے تو اس غل سے نفع دینی تو کچھ متصور نہیں، البتہ تقویۃ مضامین شرکیہ کا گمان غالب ہے۔“

اس لئے مصلحت کا تقاضا آپ نے ہی قرار دیا ہے کہ

”مناسب ہے کہ عوام کو فقط طریقہ مسنونہ زیارات قبور کا تعلیم کیا جائے اور اس سے

زیادہ کی اطلاع نہ ہونے دے۔“ ص ۱۱ جمال قاضی

یہی آپ کا خیال بھی تھا، دیکھنے والوں کا بیان بھی یہی ہے، کہ اسی کے مطابق آپ کا عمل بھی تھا،

۱۔ اس منکاشہ کا تذکرہ مولوی اظہار الحج بہ سبیل عباسی امر دہوی نے اپنے خط میں کیا ہے، اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ مولوی محمود احمد صاحب عباسی نے بعد کو تاریخ امر وہ کہ کتاب لکھی، جس میں شاہی دثائق، ادب پرانے کا مذاق پیش کئے ہیں جن سے شیخ آئین کی سیادت کی تاریخی شہادت بھی پائی ثبوت کو پہنچ چکی ہے ۱۲

حکیم منصور علی خاں نے بزرگان دین کے مزاروں کی حاضری کے متعلق مذکورہ بالا دستور کا جہاں ذکر کیا ہے کہ یہ دستور تو اس وقت تک تھا جب آپ تنہا ہوتے، لیکن بجائے تنہائی کے حکیم صاحب ہی کا بیان ہے کہ

”ہمراہیوں کے ساتھ آہستہ دعا اور سورتیں پڑھ کر چلے آتے“۔ ۱۹۲ مذہب منصور

”زیارت قبور کے طریقہ مسنونہ“ سے غرض یہی تھی، کہ سلام والی دعا کر کے قرآن پڑھ کر ثواب اس کا صاحب مزار کو پہنچا دیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف عام مسلمانوں کے غلط رجحانات کی تصحیح بھی کرنا چاہتے تھے، اور جہاں تک ممکن تھا مصالح کے اقتضاؤں کی بھی رعایت فرماتے تھے، لیکن یہی کو ساتھ اپنے نزدیک جس چیز کو حق جانتے تھے، اس کو چھپاتے بھی نہ تھے، مصلحت کا مطلب آپ کے یہاں نہیں تھا کہ کسی حقیقت اور واقعہ کا انکار کر دیا جائے خود اس کی مثال دین میں موجود تھی، اسلام سے پہلے شرک کی گرم بازاروں میں جیسا کہ دنیا جانتی ہے، ملائکہ کے عقیدے کو بہت زیادہ دخل تھا، یہ بات کہ خالق تعالیٰ جل مجدہ کے علاوہ بھی ایسی نادیدہ مخلوق زندہ ہستیاں ہیں جن کے ساتھ نظام عالم کے مختلف شعبوں کی تنظیم و نگرانی متعلق ہے۔ بعض ان میں پانی کے، بعض ہوا کے بعض پہاڑ کے بعض موت کے بعض حیات کے، فرشتے ہیں، اور قدرت ان ہی کو ذریعہ بنا کر کائنات کے سارے کاروبار کو انجام دے رہی ہے، سمجھا جاتا ہے کہ فرشتوں یا دیوتاؤں کی پوجا پاٹ اور عبادت کا رواج اسی عقیدے کے غلط استعمال کی پیداوار ہے۔ ایسی صورت میں شرک کے قلع قمع کی یہ ایک کارگر تدبیر ہو سکتی تھی کہ ”الملائکہ“ کے عقیدے ہی کو دین سے خارج کر دیا جائے۔ مصالح کی وجہ سے اگر کتمان حق جائز ہوتا، تو ”الملائکہ“ کا عقیدہ سب سے زیادہ کتمان کا مستحق تھا۔ لیکن اس عقیدے سے خاموشی تو بڑی بات ہے۔ کون نہیں جانتا کہ دینی دائرے میں داخل ہونے کے لئے جن امور پر ایمان لانے کا مطالبہ سب سے پہلے کیا جاتا ہے، اسی مطالبہ میں اعنت باللہ کے بعد ہی دھلاؤ لگتا ہے، کاجر، بھی شریک ہے، اللہ سمجھا یا بھی گیا ہے کہ ”الملائکہ“ کو منوا کر اس عقیدے

کے استعمال کا جو غلط اور مہلک طریقہ ہے اس سے لوگوں کو روکا جائے۔ اسلام کی تاریخ موجود ہے مسلمان ملائکہ کے وجود کو بھی اپنے دینی عقیدے میں شریک کئے ہوئے ہیں۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں مشرک کی دوسری قسموں میں چاہے مسلمان کتنی ہی تباہیوں کے شکار ہوئے ہوں لیکن ”ملائکہ“ یا دیوتاؤں کی عبادت کا مداح شاید ان میں کبھی واپس نہ ہوا، ایسی صورت میں سوچنا چاہئے کہ ”قبری کاروبار“ روکنے کے لئے قطعی طور پر ”سارع موتی“ کا انکار اور اسی کو دینی مصلحت کا اقتضا قرار دینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے

یہ دوسری بات ہے کہ شرعی نصوص کا نتیجہ ہی کسی کے نزدیک سارع موتی نہ ہو۔ لیکن یہ جانتے ہوئے کہ سارع موتی ہی شرعی نصوص کا اگرچہ اقتضا ہے، لیکن مصلحت کی بنیاد پر اس کا انکار کرنا چاہئے میرے نزدیک تو یہ اسی قسم کی بات ہے جسے قرآن میں

ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتُموا	حق دباطل کو مت رلاؤ اور جانتے بوجھتے
الحق وانتم تعلمون	حق کو مت چھپاؤ۔

کے الفاظ میں یہود کا شیوہ قرار دیا گیا ہے، زیادہ سے زیادہ مصالح کی رعایت جائز بھی ہو سکتی ہے تو اسی حد تک جیسا کہ سیدنا الامام الکبیر نے ارقام فرمایا ہے، کہ زیادہ چہ چا اس مسئلہ کا عوام میں مناسب نہ ہوگا، ان گز بسن قبروں کی زیارت مسنونہ کا طریقہ بتا دیا جائے۔

بہر حال جہاں تک سیدنا الامام الکبیر کے اقوال و افعال ہم تک پہنچے ہیں، ان سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف خالق کائنات کے ساتھ آپ چاہتے تھے کہ عبدیت خالصہ اور کامل بندگی کا رشتہ اسلام نے جو قائم کیا ہے، اس میں کسی قسم کی لچک پیدا نہ ہو، مسلمانوں کے قدم ٹھیک ”ایاتہ نعبد وایاتہ نستعین“ پر پوری قوت کے ساتھ چلے رہیں، تو دوسری طرف پوری نگرانی اس کی بھی فرماتے رہے کہ اللہ کے انعام یافتہ بندوں کے ساتھ بھی مسلمانوں کا احترامی ربط مصلح نہ ہو

۱۔ مکتوبات حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ میں حضرت ممدوح نے بھی اپنے ایک مکتوب میں تشریح فرمائی ہے کہ ہمارا اور ہمارے بزرگوں کا یہی مسلک ہے کہ سارع موتی ثابت ہے۔ محمد طیب غفرلہ

دوسرے لفظوں میں چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ

صراط الذین انعمت علیہم اُن لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام فرمایا

پر قائم و دائم رہنے کی جو آرزو قرآن ہی نے مسلمانوں میں پیدا کی ہے، چاہتے تھے کہ اس آرزو کا
زور بھی ان کے دلوں میں کم نہ ہو، ارواحِ ثلاثہ میں امیر شاہ خان مرحوم کے حوالہ سے یہ روایت
جو نقل کی گئی ہے کہ

”کسی عامی نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ حضرت یہ جو بزرگوں کے قریب
دفن ہونے کی تمنا کرتے ہیں اس سے کیا فائدہ؟ جب کہ نہ کسی کی برائی کسی پر پڑیگی،
نہ کسی کی نیکی کسی کے کام آئے گی۔“

شرکاء اولو دگیوں کے متعلق جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی پیدائش میں بزرگوں کے احترامی جذبات
کی حوصلہ افزائیوں کو زیادہ دخل ہے۔ ان کے لئے بڑا اچھا موقعہ تھا کہ اس عامی کے عامیانہ خیال
کی تائید کرتے ہوئے کہہ دیتے کہ ہاں تم سچ کہتے ہو، لیکن امیر شاہ خان مرحوم کا بیان ہے، کہ

لے یہ مسائل الدین نامی قصائی تھا جو دیوبند کا باشندہ تھا اس نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ کا دراپنی ابتدائی عمر
میں پایا تھا بعد میں حضرت الاستاذ علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ سے بیعت ہوا۔ اس نے یہ واقعہ مجھ سے بھی بیان
کیا تھا۔ محمد طیب غفرلہ

لے میرا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے قرآنی نصوص مثلاً لیس للہ انسان الاما سعی (یعنی نہیں ہے آدمی کیلئے مگر وہی جو
کچھ اس نے خود کوشش کی، یا لا توفد وادارۃ وادۃ اخری (ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا) کو پیش نظر رکھ کر اس قسم
کا فیصلہ کہ نہ شفاعت ہی سے کوئی مستفید ہو سکتا ہے، اور خواہ مانی ہو یا بدی کسی قسم کی عبادت کا ثواب دوسروں
تک نہیں پہنچا یا جاسکتا، ظاہر ہے کہ عامیانہ فیصلہ سے زیادہ اس کی کوئی وقعت نہیں ہے، کیونکہ شفاعت
کا قانون ہو، یا ایصالِ ثواب کا ان سب کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ آدمی پہلے ایمانی دائرے میں اپنے آپ کو داخل
کر چکا ہو، ورنہ جو مومن نہیں ہے یقیناً نہ اس کے لئے شفاعت ہی مفید ہو سکتی ہے اور نہ ایصالِ ثواب کے قانون سے
وہ مستفید ہو سکتا ہے، پس معلوم ہوا کہ ان ائمہ سے بھی فائدہ ایمانی دائرے میں داخل ہونے کی سعی اور کوشش ہی سے
آدمی کو پہنچتا ہے، پس ان صورتوں میں بھی یہی بات صادق آتی ہے کہ اپنی سعی اور کوشش ہی سے وہ مستفید ہوا۔ اگر
مومن ہونے کی سعی اور کوشش اس کی طرف سے نہ ہوتی تو یقیناً وہ ان قوانین سے مستفید نہیں ہو سکتا تھا۔

سیدنا الامام الکبیرؑ نے اس کے برعکس اس عامی کے اس غلط احساس کا انکار کرنا چاہا، چونکہ بے چارہ عامی آدمی تھا، عالمانہ طریقہ سے نہایت مناسب معلوم نہ ہوئی، بلکہ اس وقت وہ جس کام میں مشغول تھا، یعنی حضرت والا کو پنکھا بھل رہا تھا، پنکھا بڑا تھا، حضرت کے سوا اور بھی جو اس مجلس میں شریک تھے۔ پنکھے کی ہوا سے مستفید ہو رہے تھے۔ سامنے کی اسی مثال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پوچھنے والے سے دریافت فرمایا کہ ”بھائی! تم اس مجمع میں پنکھا کس کو بھل رہے ہو؟“ اس نے عرض کیا کہ ”حضرت آپ کو“ آپ نے پوچھا کہ ”ہو! اوروں کو بھی لگ رہی ہے؟“ اس نے کہا کہ ہاں۔ تب یہ کہتے ہوئے کہ ”یہ جواب ہے تمہارے سوال کا“ اس کو یہ سمجھانے لگے کہ

”حق تعالیٰ کی طرف سے جب رحمت و مغفرت کی ہوائیں چلتی ہیں، تو مقصود وہی

بزرگ ہوتے ہیں، مگر حسب قرب و بعد پہنچتی ہیں، سب آپس پاس والوں کو بھی“ ۱۸۱

کسی مولوی کے چپ ہونے کے لئے خواہ سامنے کی یہ مثال کافی ہو، یا نا کافی، لیکن پوچھنے والا غریب عامی آدمی تھا۔ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تسلی اسی مثال سے ہو گئی، اب مسئلہ کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو، جس پر تفصیلی بحث کا یہاں موقع نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا تھا کہ مشرکانہ آلودگیوں کے خطرات سے جو خود بھی چوکتا رہتا تھا اور چاہتا تھا کہ

۱۸۱ مسئلہ کی اصل علی حقیقت وہی ہے جس کی طرف اپنے نوٹ میں خاک رے اشارہ کیا ہے، بزرگوں کے مکانی بھار سے بھی فائدہ دینا ہی کو پہنچ سکتا ہے، اور نہ ابو جہل خواہ کبھی میں دفن ہوتا، اس غریب کو زمین کی پائی سے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ آخر دفن ہونے میں بزرگوں کے جوار اور قرب مکانی کا کوئی فائدہ اگر نہ ہوتا تو حضرت عمرؓ اور رضی اللہ تعالیٰ عنہ روضہ پاک میں دفن ہونے کی آرزو کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کیوں قرار دیتے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے شیر شاہ خان کی اس روایت پر ایک حاشیہ بھی ارقام فرمایا ہے، جس میں مشہور حدیث ”ہم القوم لا یشقی جلیسہم“ (اللہ دالے لوگ ایسی قوم کے لوگ ہیں جن کا ہم نشین ناکام نہیں ہو سکتا) کی عمومیت سے بھی مسلمانوں کے اس خیال کی تائیدی شہادت پیدا کی ہے کہ بزرگوں کے قریب دفن ہونا مردے کے لئے فائدہ بخش ہے، ایک ضعیف روایت کا بھی اس سلسلہ میں لوگ تذکرہ کرتے ہیں جس میں صاحبین کے منبر پر میں دفن ہونے کی ہدایت کی گئی ہے، اگرچہ محدثین کو اس روایت کی سند پر اعتماد نہیں ہے (باقی صفحہ پر)

اللہ کے معاملہ میں مسلمانوں کی پوری پوری نگرانی کی جائے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہی اللہ والوں کی رفاقت و معیت کے عقیدے کی حفاظت میں کتنی غیر معمولی بیدار دماغی سے کام لے رہا ہے مرنے کے بعد بھی جسمانی رفاقت اور مکانی معیت کی قدر و قیمت کے احساس کی کمی جس کے لئے ناقابل برداشت تھی، سمجھا جاسکتا ہے، کہ ان ہی بزرگوں کے معنوی حسن رفاقت کی فزائی آرزو کی اہمیت اس کی نگاہوں میں کیا ہوگی یا کیا ہو سکتی ہے۔

سچ پوچھئے تو ”کچ دار و مرز“ کا یہی مسلک جس میں جام شریعت کے ساتھ سندان عشق دونوں ہی کے حقوق اور اقتضاؤں کی تکمیل کا مطالبہ کیا جاتا ہے، عملی طور پر اس کو نباہنا، اور کر کے دکھادینا مسلمانوں کی داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر کا اپنے عہد خاص میں ایک ایسا کارنامہ ہے، جس سے جیسا کہ چاہئے تھا، مسلمانوں کا نہ تودہ رجعت پسند آبائی طبقہ ہی مانوس ہو رہا تھا۔ جو حق و باطل کی شناخت میں ہیشہ یہ دیکھنے کا عادی تھا کہ ان کے والد مرحوم کا خیال کیا تھا، اور نہ بیابا کوں کا وہ گروہ اس مسلک کو پسند کرتا تھا، جو مسلمانوں کی دینی تاریخ کے دباؤ سے آزاد ہو کر من مائے فیصلوں پر جبری ہو گیا تھا۔ کچھ دن غیر معمولی کش مکش کی

(سلسلہ گفت) علامہ سخاوی جنہوں نے مفاد حسنہ میں اس رویت کا ذکر کر کے محدثین کی تنقید کو نقل کیا ہے، اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں میں یہ خیال ہمیشہ مقبول رہا ہے و نہ یزید عمل السلف و الخلف علی ہذا اللہ والوں کے جو اہل دین ہونے کو اچھا سمجھتے رہے ہیں۔ ۱۲

۱۱۔ واقعہ یہ ہے کہ جتنے مبلغ پیرایہ میں ان دونوں تعلقات کا ذکر یعنی اللہ اور اللہ والوں کے ساتھ مسلمانوں کے ساتھ تعلق کی ضرورت کیا ہے چاہئے سورۃ فاتحہ میں کر دیا گیا، شاید دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی، خالص کائنات اللہ رب العالمین کے ساتھ ”ایاک نعبد و ایاک نستعین“ کے احساس کو پیدا کرنے کے بعد اگلے حکم دیا گیا ہے کہ ”انعمت علیہم (جن لوگوں پر خدا نے انعام کیا، ان کے صراط پر مجھے چڑھایا جائے) اسی کی دعا کی جائے اور سب جانتے ہیں کہ یہ نعمت علیہم اللہ والوں کا گروہ ہے جس کی تفصیل اولئک الذین انعم اللہ علیہم من الذین یؤمنون و الذین یقینون و الذین یتقون و الذین یتذکرون و الذین یتواضعون و الذین یتواضعون و الذین یتواضعون“ میں فرمائی گئی ہے ۱۳

۱۲۔ ہر برتن جھکاوے اور پانی گرنے نہ دے محمد طیب اشارہ ہے اس شرک کی طرف :- در کئے ہا شریعت در کئے سندان عشق :- ہر ہوشنا کے نماندہ جام و سندان ہا مقصد اس گروہ کی طرف بلانے کا ہے جو علم و عشق شریعت و طریقت اور حال و قال دونوں کا جامع ہو، یعنی عالم بالامر اللہ ہونے کے ساتھ ساتھ عالم باللہ بھی ہو جسے عارف کہتے ہیں۔ محمد طیب غفرلہ

صومریوں کے ساتھ پیش آئیں لیکن بتدریج آبائی جمود کا رنگ بھی اترتا چلا گیا، اور حد سے گزری ہوئی آزاد خیالی میں آہستہ آہستہ اعتدال کا رنگ پیدا ہوا، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانان ہند کی اکثریت ہر پھر کر دانستہ یا نادانستہ اسی کو مسلمانوں کی صحیح دینی زندگی سمجھنے یا ماننے لگی ہے۔ جسے سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے احباب و اصحاب نے قولا و عملا اپنے اپنے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا یا آج بھی پیش کر رہے ہیں۔ اور یہیں اس کا اعتراف کرنا چاہئے، کہ داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے رفیق الدین و الآخرہ حضرت قطب گنگوہی مولانا رشید احمد رحمۃ اللہ علیہ کی گرانمایہ خدمات بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، امام ربانی حضرت گنگوہی کو مختلف وجوہ سے اس راہ میں کام کرنے کے مواقع بہت زیادہ میسر آئے، اجمالی طور پر مسلمانوں کی دینی زندگی کے اس قالب کی عام تعبیر ”دیوبندیت“ سے کی جاتی ہے۔ اہل سنت و الجماعت کے عقائد کے ساتھ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقی تقلید اور اتباع سنت کے ساتھ صوفیانہ زندگی، اس جماعت کے اہل علم کی خصوصیت ہے۔ جس کی تفصیل کے لئے مجلّات کی ضرورت ہے، سیدنا الامام الکبیر کے تلمیذ سعید مولانا منصور علی خاں نے حضرت الامام کے عقائد اور طریقہ عمل کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

”عمل ان کا حنفی تھا، مگر ہر سنت کے اتباع میں بہت خیال رکھتے تھے، اور کبھی کبھی خلائی مسائل پر بھی عمل کر لیتے تھے اور حضرت امام اعظم اور حضرت شیخ محی الدین ابن عربی اور حضرت مجدد الف ثانی کے کمالات اور حالات کے نہایت معتقد تھے، اور بہت تعریف کیا کرتے تھے، اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے علوم کو سب بزرگان دین کے علوم سے اعلیٰ و افضل بتلاتے تھے“ ص ۱۹۲

اسی کے بعد حکیم صاحب نے اولیاء اللہ کے مزاروں کے ساتھ حضرت والا کے طریقہ عمل کو بیان کرتے ہوئے مکمل شاہ صاحب مراد آبادی کے مزار والے اس قصہ کا تذکرہ کیا ہے، جسے نقل کر چکا ہوں، حاصل ان کے بیان کا بھی وہی ہے، جو فقیر نے عرض کیا۔

”تاہم“ مسلمانوں کی داخلی اصلاحات“ کے سلسلے میں سیدنا الامام الکبیر کے طریقہ کار کے متعلق اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اپنی اصلاحی کوششوں کو چاہتے تھے کہ حتی الوسع فتنہ و فساد کی کودرتوں سے پاک رہے۔ ”فیوض قاسمیہ“ میں ایک فارسی مکتوب مولوی عبداللطیف نامی کسی صاحب کے نام ہے، اس زمانہ میں لوگوں نے ”علم غیب“ کے عنوان سے ایک مسئلہ مسلمانوں میں چھیڑ دیا تھا، یعنی حتی سبحانہ و تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف علم غیب کے لفظ کا انتساب شرعاً جائز ہے یا ناجائز۔ مولوی عبداللطیف صاحب نے حضرت سے اسی مسئلہ کو دریافت کیا تھا، اصل مسئلہ کی تحقیق آپ نے جو کی ہے۔ اس کا ذکر تو انشاء اللہ آپ کے علمی و فکری نظریات کے سلسلے میں کیا جائے گا۔ یہاں تو باہمی مشاجرات و منازعات کے متعلق حضرت کے رجحان طبع کو پیش کرنا چاہتا ہوں

جواب کی ابتداء ان الفاظ سے کرتے ہوئے کہ

”عنایت نامہ رسید انا باعث ملال گردید“

پھر اس قسم کے لاحاصل مباحث کے جھگڑوں و رگڑوں کے متعلق آپ کے دلی جذبات کا جو رنگ تھا اس کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

”یارب این زمانہ چہ پرشور است کہ بجائے محبت و اخوت اسلامی، عداوت ہا بر خاستند درآں مسائل کہ متفق علیہا بودند، اختلاف پدید آمد“

اسی قسم کے ایک دوسرے نزاعی مسئلہ کے متعلق اپنے ایک اردو گرامی نامہ میں ارسام فرماتے ہیں :-

”اس زمانہ میں یہ توقع بے جا ہے کہ اختلاف اٹھ جائے، اہد اتفاق پیدا ہو جائے۔ ہاں! بالعموم ابنائے روزگار میں ہم و انصاف ہوتا تو بعد نہائش ممکن تھا کہ یہ اختلافات اٹھ جاتے، مگر آپ جانتے ہیں کہ آج کل یہ دونوں باتیں نصیب اعداء ہیں کہ یہ اختلاف ہی موجب عداوت ہے، اور یہ عداوت باہمی موجب تنفر یک دگر ہے، کوئی کسی کی

نہیں سنتا، اور بے سمجھے دوسروں کی رسم و راہ کو غلط سمجھتا ہے۔“

الغرض نئے نئے عنوانات سے معمولی معمولی جزئی باتوں کا مسلمانوں میں چرچا کر کے افتراق و شقاق پیدا کرنے کی عام مولویانہ عادت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر فطرۃً کا رہ تھے، اور اس کو سخت ناپسند فرماتے تھے، اسی طرح فرعیات میں ایسے اختلافی مسائل جن میں سلفا عن خلف نقاط نظر کا اختلاف علماء میں رہا ہے ان کے متعلق آپ کا خیال تھا، اور کتنا پاکیزہ خیال تھا، اس قسم کے ایک مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے اور یہ فرماتے ہوئے کہ

”طرفین میں بڑے بڑے اکابر ہیں“

اور اپنے اسی خیال کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہوئے کہ

”اگر ایک طرف ہو رہے تو کسی نہ کسی طرف دالوں کو برا سمجھنا پڑے گا۔“

آگے ارقام فرماتے ہیں۔

”اسلئے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہو بیٹھیں کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں۔“ ص ۹۰ جال قاضی

آپ کا ایک طرز عمل اس نوعیت کے مسائل میں عموماً یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ اولاً ان پر بمشکل قلم اٹھاتے تھے، بد چھنے اور دیباقت کرنے پر کسی نے زیادہ اصرار کیا، تب مجبوراً جو ترجیحی نقطہ نظر اس خاص مسئلہ میں آپ کا ہوتا اس کو ظاہر تو کر دیا کرتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں تقریباً بالالتزام اس قسم کے الفاظ فرماتے چلے گئے ہیں، مثلاً جمعہ کی نماز کے متعلق علماء اہل السنۃ والجماعت کا ایک قدیم ”خلافیہ“ یہ چلا آ رہا ہے کہ دیرہاتی آبادیوں میں اقامت جمعہ جائز ہے یا نہیں۔ میر محمد صادق نے جو غالباً سہانپور کے رہنے والے تھے اپنے خط کے ساتھ حکیم عبدالسلام صاحب کا اسی مسئلہ کے متعلق ایک سوال بھی بھیجا تھا، اسی کا جواب دیا گیا ہے، ”فیوض قاسمیہ“ میں یہ بھی شریک ہے، جواب میں جن اجتہادی پہلوؤں کا اظہار فرمایا گیا ہے، ان کا ذکر تو اپنی جگہ پر کیا جائے گا، مگر ان کے سوا

مختلف عبرت آموز اجزاء پر یکتوب مشتمل ہے۔ حکیم عبدالسلام کا ذکر باوجود ”معاصرت“ کے سنئے کن الفاظ میں فرماتے ہیں،

”مجمع البحرین شریعت و طریقت، مخدوم و مطاع خاص و عام جناب مخدوم و مامولنا سید عبدالسلام صاحب دام برکاتہ“

واللہ اعلم بالصواب یہ مولوی عبدالسلام کون صاحب ہیں، کوئی بھی ہوں۔ لیکن پچھلی نسلوں میں ہم نے ان کی شہرت نہیں سنی ہے۔ لیکن دیکھ رہے ہیں حضرت والا کن غیر معمولی القاب و آداب کے ساتھ ان کا ذکر فرما رہے ہیں۔ اسی خط میں کتابوں کی کمی کے سوا اس قسم کی باتیں بھی پائی جاتی ہیں، یہ فرماتے ہوئے کہ

”میچ دانی، وایں بے سرو سامانی نہ جہرات ہم چو کار ہا بدل آئند نہ دل بدست کار فرمائد“

آگے لکھتے ہیں

”ذخیرہ ام، ہیں خیالات پر آئندہ من اند کہ یکے را اگر بدل می نشیند دیگر آں را از جملہ مضامین شعر یہ می بیند“

پھر یہ لکھ کر کہ حکم کی تعمیل کو ضروری خیال کر کے جواب تو دے رہا ہوں ارقام فرماتے ہیں۔

”اگر پسند خاطر خدام والا مقام افتادہ ہو المراد درہ کالائے زبوں بریش خاوند نامہ خود را باز خواہم گرفت“

یہ فقرے تو خط کی ابتدائی تمہید کے ہیں، مضمون کو ختم کر کے یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

”ایں است انچہ ذہن تارسلئے من ہاں می رسد“

اور خود اپنے متعلق اس مصرعہ کو یعنی

نہ قاضیم نہ فقیہم نہ مفتیم نہ امام

کو استعمال کر کے لکھا ہے کہ اجتہاد کا حق مجھے حاصل نہیں ہے۔ اس لئے خلق اللہ کو اپنی خیالات کے

ماننے پر مجبور نہیں کر سکتا اور یہ لکھ کر کہ

”اگر دیگر اہم صغیر من شونذ فہما“

اسی کے بعد تہید والے فقرے کا اعادہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ

”در نہ کلائے زبوں، بریش خاوند، این دفتر بے معنی را بر سر من زنند“

اور یہ تو اپنے متعلق ہوا، لیکن بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی ہے، علم کا باطل زعم دلوں میں تنگی نکا ہوں میں کو تلمہ ہی کے امراض کو جو پیدا کر دیتا ہے، ان امراض کے علاج کے لئے پڑھنے والوں کو چاہئے کہ سیدنا الامام الکبیر کے ان الفاظ پر غور کریں۔ یہ فرمانے کے بعد کہ ”میرے خیالات کو تو میرے

سر پر مار دیجئے۔“ بغیر کسی دغدغہ کے ارقام فرمایا گیا ہے کہ

”ہرچہ مناسب دقت داند، موافق اشارات علماء ربانی کہ اذ انباع قرآن وحدیث

دور نیفلند، اختیار فرمائند“

یہی نہیں آگے یہ بھی ہے کہ

”وایں نیازمند را ہم مطلع فرمائند“

اطلاع بخشی کی یہ درخواست کس لئے کی گئی ہے؟ کیا اعتراض و تنقید کے لئے؟ نہیں، سنئے فرماتے ہیں

”تا بہ پیردئی جم غفیر من ہم سر دہم، در پے تفرق کلمہ نشوم“ ۲۹

اور یہ مضمون کسی ایک جگہ آپ کے قلم سے اتفاقاً نہیں نکلا ہے۔ قاسم العلوم کے ایک مقالے میں بھی یہی ارقام فرمایا گیا ہے۔

”ہرچہ بدل می ریزند بر صفحہ می گذارم اگر راست آید از انطرف ست، در نہ من خود بر

بیج مدانی دنا لانی خود گواہم“

حضرت والا کے مضامین اور کتابوں میں بہ کثرت اس کی مثالیں آپ کو مسلسل ملتی چلی جائیگی۔

لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ دوست تو دوست، دشمن بھی سیدنا الامام الکبیر کا نام جب لیتے ہیں تو

احترام ہی سے لیتے ہیں۔ مشکل ہی سے اس کی نظیر پیش ہو سکتی ہے کہ مخالفوں نے بھی حضرت دالہ کی شان میں ان ناملات اور ناشائستہ الفاظ کو استعمال کیا ہو، جن کے استعمال کرنے کے عادی اس زمانہ کے مناظرہ باز مولوی عموماً ہو گئے تھے؟

مگر مجھے اس پر اس لئے تعجب نہیں ہوتا کہ حضرت دالہ نے جس طرز عمل کو اختیار فرمایا تھا، یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا، قرآن ہی میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ دشمنوں کو بھی دوست بنانے کا یہ قدرتی طریقہ ہے، مگر ہر ہوسناک کا یہ کام نہیں ہے۔

اور یہ مقام نہیں عطا کیا جاتا مگر انہیں کو جو صابر (دردبار) ہیں اور نہیں دیا جاتا مگر انہیں کو جو بڑے صاحب نصیب ہیں۔

وَمَا يُلْقُهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا
وَمَا يُلْقُهَا إِلَّا ذُو حُظٍّ عَظِيمٍ

یعنی ہر دل کو یہ وسعت اور ہر آنکھ کو فراخی کی یہ دولت کب نصیب ہوتی ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی دینی تربیت و اصلاح کا جو کام بھی آپ کرتے رہے، اس میں دل آزاری یا دوسروں کی تحقیر و توہین سے بچنے کی ممکنہ کوششوں میں بھی ہم آپ کو مشغول پاتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ”دراہنت“ یا بے جا اغراض و چشم پوشی بھی آپ کی عادت نہ تھی۔ اس کی متعدد مثالیں گزر چکیں کہ ادنیٰ درجہ کے عامی آدمیوں کی دعوت بھی سیدنا الامام الکبیر رد نہیں کرتے تھے، اور شاید کر نہیں سکتے تھے۔ دیوبند کے نور باف اللہ دیا کا قصہ گزر چکا ہے کہ برستے ہوئے پانی میں کمل کا چوٹا باندھ کر اس غریب کے گھرانہ چھری رات میں آپ پہنچے، اور ماش کی روٹی، ماش کی دال جو اس نے پیش کی، یہ جاتے ہوئے کہ انضمام اس کا دشوار ہوگا۔ محض اس کی دل دہی کے لئے نوش جان فرمایا۔ لیکن اسی کے ساتھ دعوتوں ہی کے سلسلہ میں مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب حیدر آبادی راوی ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کا یہ کلی دستور تھا کہ

”جاہلوں کی نذر و نیاز کا کھانا کبھی نہیں کھاتے“ ۱۹۷

یہ ”نذر و نیاز“ کا قصہ جو ہندی مسلمانوں کی دینی زندگی کا کسی زمانہ میں تقریباً کچھ لازمی جزو کی

حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ جس کا افسانہ طویل ہے، خانوادہ دلی اللہی کے مصنفین کی کتابوں میں خصوصاً حضرت شاہ عبدالعزیز اور مولانا شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما کی طرف فتوؤں کی کتابیں جو منسوب ہیں ان میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر آپ کو سیر حاصل بخشیں ملیں گی۔ اس زمانہ میں شیخ سعد کے نام کے بکرے، اور سید احمد کبیر و حضرت بوعلی قلندر کے نام کے گاؤ، حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اسم گرامی کے نام مرغ، کے چھوڑنے اور آخر میں ان کو ہار پھول پہنا کر ذبح کر کے دعوتوں کے اڑانے کا عام ذوق پھیلا ہوا تھا۔ مشکل ہی سے مسلمانوں کی کوئی آبادی شمالی و جنوبی ہند میں ہوگی، جس میں نذر کئے ہوئے مذکورہ بالا جانور کھوتے پھرتے نہ نظر آتے ہوں، اب تو مجز بیران پیر کے مرغ کے دوسرے قصے کم از کم شمالی ہند میں ختم ہو چکے ہیں۔ اسی خاندان کے بزرگوں کی جدوجہد سے تطہیر و تنزہ کی کایہ کام پورا ہوا۔ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کے نذر کئے ہوئے تمام جانوروں کو ماہل بہ لغیر اللہ کے تحت داخل کر کے فتویٰ دیا تھا کہ ان کے گوشت کا کھانا جائز نہیں ہے جس پر بڑے ہنگامے برپا ہوئے۔ سیدنا الامام الکبیر نے بھی ایک مضمون حضرت شاہ صاحب کے فتوے کی تائید میں ارقام فرمایا تھا، جو قاسم العلوم نامی ”مجموعہ مکاتیب“ میں شریک ہے، انشاء اللہ کتاب کے اگلے حصہ میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے گا، یہاں یہ کہنا ہے کہ خود حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جن کے فتوے پر طوفان برپا ہوا تھا، وہی زندہ جانوروں کے متعلق جہاں اس پر مصر تھے کہ خدا ہی کے نام پر ان کو کیوں نہ ذبح کیا جائے، جب بھی ان کے گوشت کا کھانا درست نہ ہوگا۔ وہیں یہ فتویٰ ان ہی کی طرف ان کے مجموعہ فتاویٰ میں منسوب کیا گیا ہے کہ حیوانی نہیں بلکہ مائیدہ شیرینج (کھیر) پلاؤ وغیرہ جیسے کھانے پر اگر فاتحہ دیا گیا ہو، تو ان کا حکم کیا ہے، کسی نے دریافت کیا، جواب میں لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے ارقام فرمایا کہ

”اگر فاتحہ بنام بزرگے دادہ شد پس اغیار را ہم خوردن ازان جائز است“ ص ۱۴

لے میرغ شمالی ہند سے بالکل پڑا کر چکا ہے، یہاں اس کا کوئی نام بھی نہیں جانتا محمد طفیل علیہ السلام (محلے صفحہ پرا حلقہ ہو)

میرے سامنے مسئلہ کی تفصیل نہیں ہے، حاشیہ میں حضرت شاہ رفیع الدین کے جن فتووں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے تفصیل کے لئے ان کو پڑھنا چاہئے۔ بلکہ کہنا یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز کی طرف یہ فتویٰ حالانکہ منسوب تھا، لیکن باوجود اس کے آپ دیکھ رہے ہیں اس احتیاط کو کہ سیدنا الامام الکبیر اس قسم کے مشتبہ کھانوں سے بھی پرہیز ہی فرماتے رہے، اور دعوت کرنے والوں کی دل شکنی کی پرواہ بھی اس راہ میں نہیں کی جاتی تھی حالانکہ آپ کی افتاد طبع کے لحاظ سے جہاں تک میں خیال کرتا ہوں یہ چیز ناقابل برداشت تھی۔

مگر عملی احتیاط کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کی دینی کمزوریوں خصوصاً ان کی دینی زندگی کی بیرونی آلائشوں یعنی ”بدعات“ کے مسئلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے نقطہ نظر کا صحیح اندازہ اس حکیمانہ تقسیم ہو سکتا ہے جسے اس مسئلہ میں آپ نے اختیار فرمایا ہے، یعنی یہ فرماتے ہوئے کہ جو حیثیت کسی جاہل مریض کی طبیب کامل کے مقابلہ میں ہوتی ہے، یہی حیثیت امت کے عام افراد کی اور اس کے رسول کے مقابلہ میں ہے، یہی نہیں بلکہ اسی کے بعد جو یہ فرمایا گیا ہے، کہ

”طبیب کامل اور بیمار جاہل میں اتنا فرق نہیں، جتنا خدا و رسول، اور امت میں فرق

(متعلقہ صفحہ گذشتہ) میں نے شاہ صاحب کے اس فتوے کے نقل کرنے میں قصداً ترجمہ یعنی پیرایہ بیان اختیار کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف بزرگوں سے کان میں یہ بات پڑی ہے کہ فتادی کا جو مجموعہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے شائع کیا گیا ہے، اس میں کچھ تغیرات بھی ہوئے ہیں والہ تعالیٰ اعلم بالعدوب۔ مطبع مجتہبی کے مطبوعہ نسخے سے مذکورہ بالا الفاظ نقل کئے ہیں چند خاص فتوے شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے بھی شائع ہوئے ہیں۔ اس زمانہ کی علماء کو خصوصیت کے ساتھ ان جوابوں کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ مذکورہ ذرا ذریعہ الفاظ ہندوستان میں جو استعمال ہوتے ہیں ”بمعنی شرعی امت کہ ایجاب غیر واجب است از جنس عبادات مقصودہ بطریق تقریبی اللہ فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں ان الفاظ کا استعمال بمعنی عرفی است چہ عرف آن ست کہ انجہ پیش بزرگان محامی برند مذکورہ ذرا ذریعہ گوئد“ لکھا ہے کہ شرعی معنی جو نذر کے ہیں ”برائے اولیاء اللہ حرام است“ اسی طرح فاتحہ میں بھی شاہ صاحب نے بڑی تفصیل سے کام لیا ہے اور لکھا ہے کہ بتوں اور شیطانیوں کے آگے بھینٹ چڑھانے کی جو نوعیت ہوتی ہے اگر فاتحہ دلائے والے کی نیت میں بھی کچھ اسی قسم کی باتیں شریک ہیں تو شرک کی حد میں فاتحہ داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایصال ثواب کا مطلب ہے توجائز ہے۔ مسلمانوں کو سمجھانا چاہئے کہ وہ چڑھائے یا بھینٹ کا اعتقاد اگر رکھتے ہوں تو اس کو اپنے اندر سے نکالیں۔ ۱۲۔

ہے۔“ (فیوض قاسمیہ ص ۱۲)

یہی حقیقت کی صحیح اور واقعی تعبیر ہے، اور یہ مان لینے کے بعد جیسا کہ وہی ارقام فرماتے ہیں، خود بخود یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ

”جیسے بیمار جاہل کو اطباء، متقدمین کے قواعد طب اور اطباء زمانہ کے نسخہ جات میں کمی و بیشی یا تغیر و تبدل نافذ ہے اور کرے تو اطباء سے دھتکار ملے، اور تمام خویش و اقربا دوست آشنا کی بوچھاڑ پڑے۔“

اسی طرح حضرت والا فرماتے ہیں کہ

”تمام امت (کے لوگ) کو عالم ہوں، یا جاہل، فقیر یا صفا ہوں، یا دنیا دار، خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں عقائد ہوں یا اعمال، قواعد کلیہ ہوں، یا صور جزئیہ، تبدل و تغیر مکی و عیشی کا اختیار نہیں، اور کس تو خداوند تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مغضوب اور خلافت کے نزدیک بحکم عقل مغلوب ہو گئے۔“

اس تمثیلی بیان کے بعد ارقام فرمایا گیا ہے کہ دین میں

”اسی تغیر و تبدل اور کمی و بیشی ہی کا نام بدعت ہے۔“

بدعت کی اسی حقیقت کو ذہن نشین کرانے کے بعد یہ بتاتے ہوئے کہ ”تمام بدعات“ کی

نوعیت ایک ہی جیسی نہیں ہے اپنی حکیمانہ تقسیم کو ان الفاظ میں پیش فرماتے ہوئے کہ

”عقائد کے تغیر و تبدل کو ہم اس البدعات کہتے ہیں، اور قواعد کلیہ کے تغیر و تبدل کو ہم ”بدعت کبریٰ“ قرار دیتے ہیں۔“

بدعت کی ان دونوں اہم شکلوں کے ساتھ آخری شکل اسی کی یہ ٹھہراتے ہوئے کہ

”اعمال جزئیہ کی کمی و بیشی کو ہم ”بدعت صغریٰ“ کہتے ہیں۔“

بعض تشریحی اشاروں کے بعد اپنے اس فیصلہ کو جو قلم بند فرمایا گیا ہے، کہ

”بالجملہ ہم، تغیر و تبدل عقائد کو جیسے سیدہ و حوارج و معتزلہ نے کیا ”اس البدعات“

اور قواعد کلیہ کو مثل ایجاد تعزیر و ماتم داری کو بدعت کبریٰ، اور کمی و بیشی صورتِ سیم کو بدعت صغریٰ کہتے ہیں۔

اور لکھا ہے کہ

”برائی کی کمی و زیادتی بدعات میں بغیر بڑائی و چھوٹائی بدعات کے سمجھتے ہیں۔“

حاصل یہی ہے کہ بدعت چھوٹی ہو، یا بڑی، بدعت ہی ہے، اور مگر ابی و ضلالت کے سوا وہ اور ہو ہی کیا سکتی ہے۔ لیکن ایک ہی لاشی سے بدعت کی ہر قسم کو ہانکنا ”شرعی حقائق“ کی صحیح یافت سے محرومی کی دلیل ہے، اردوں کا خیال خواہ کچھ ہی ہو، لیکن اس باب میں سیدنا الامام الکبیر نے اپنی احساس کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا ہے کہ

”وہ بدعتیں جن کو کبریٰ کہئے، بیش تر فرقہ بائے باطلہ مثل شیعہ و خوارج میں پائے جاتے ہیں اور کمتر بعض جماعت اہل سنت میں نظر آتے ہیں۔“

اور اہل سنت کے بعض جماعت جن میں ”بدعت کبریٰ کی بعض قسموں کی نشاندہی حضرت والائے فرمائی ہے، سمجھا آپ نے یہ کون لوگ ہیں؟ الحمد للہ کہ اب ہندوستان میں ان کا پتہ نہیں ہے۔ سیدنا الامام الکبیر جس زمانہ میں یہ لکھ رہے تھے، اس وقت تک ان لوگوں سے ملک پاک نہیں ہوا تھا، یہ بے قید و نقیروں کی مختلف ٹولیاں تھیں، جن میں بعض رسول شاہی بعض امام شاہی، بعض نوشاہی، بعض خلیفہ شاہی، وغیرہ وغیرہ بیسیوں ناموں سے نکل پڑی تھیں۔ بہر حال حضرت والائے بھی ”اہل سنت کے بعض جماعت“ جن کی بدعات کو آپ نے ”بدعات کبریٰ“ کے ذیل میں شمار کیا ہے، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی موقع پر یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

”اس زمانہ کے اباحیہ و بے قید و نقیروں کی تاریخ آپ کو کچھ تلخیص شاہ خان مرحوم کے ملحوظات (الراح ثلاثہ) میں ملے گی، خاکسار نے بھی جو کتاب ”اطلاق تصوف“ کے نام سے لکھی ہے، مقالات کی شکل میں اس کا اکثر شری بیش تر حصہ ”الحق“ نامی حیدر آباد کے ایک ماہوار رسالہ میں شائع بھی ہو چکا ہے، اس میں بھی کچھ ان ٹولوں کے حالات مل سکتے ہیں، ”مناقب العارفین“ صوفیہ ہند کا ایک تذکرہ راہپور کے ایک مصنف نے لکھا ہے، اس میں بھی کچھ چیزیں درج ہو گئی ہیں۔“

”ان کو اہل سنت والجماعت کہنا محض تکلف و محاذ ہے، فقط باعتبار اشتراک بعض علامات اہل سنت جن کے سبب سے اہل سنت فرقہ باطلہ مشہورہ سے متمیز ہیں، ان کو اہل سنت کہتے ہیں، در نہ یہ لوگ بھی مثل دیگر فرقہ باطلہ ایک مذہب باطل رکھتے ہیں“

آگے مدار یہ فقیروں کے ساتھ مثلاً رسول شاہی فقیروں کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ کہ
 ”ان کے یہاں وضو نماز اور حرمت شراب و بھنگ وغیرہ سے بالکل دست برداری اختیار کی گئی ہے تو سب اصحاب اور ماتم و تعزیہ داری وغیرہ میں شیعہ و خوارج کو متمیز ہیں“ ص ۱۷

بہر حال اس قسم کے دین باختہ طبقات کے سوا مسلمانوں کی عمومیت اور سواد اعظم سنی مسلمانوں کی جو ہے، ان کی بدعات کو ”اس البدعات“ یا ”بدعات کبریٰ“ کے مقابلہ میں حضرت دالا نے بدعت کی آخری قسم یعنی ”بدعت صغریٰ“ ہی کے ذیل میں عموماً داخل فرمایا ہے، جن کی برائی بدعت کی دونوں اہم قسموں کے مقابلہ میں جیسا کہ آپ پڑھ چکے۔ حضرت دالا کی نگاہ میں اتنی زیادہ سخت نہ تھی، جتنی شدت بدعت کی ان دو قسموں میں پائی جاتی ہے۔ آپ نے مثلاً بدعت صغریٰ کو سمجھاتے ہوئے لکھا ہے کہ

”جیسے اکثر اہل اسلام میں بعض مواقع پر رسم سلام مسنون موقوف ہو گئی، اور حضرت مسلا وغیرہ الفاظ و احداث شائع ہو گئے“

یہی رسم بدعات مسلمانوں میں جو مروج ہو گئی تھی، حتیٰ کہ عوام سے منتقل ہو کر، خواص کی مجلسوں تک اس کا اثر اس زمانہ میں پھیل گیا تھا، اس کا ذکر کر کے حضرت دالا نے لکھا ہے کہ
 ”سو یہ صمد جزئیہ کی کمی دہی ہے“ ص ۱۸

اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں میں جو بدعتیں پھیلی ہوئی تھیں ان کو بدعت تو آپ ضرور قرار دیتے ہیں، اور خود عمل حیثیت سے آپ کا اصرار اس باب میں جتنا شدید اور سخت تھا اس کا

پتہ اسی سے چلتا ہے، کہ جابلوں کے نذرو نیاز کا کھانا خود کبھی نہیں کھاتے، مگر نظری و فوری حیثیت سے ان کی نوعیت بدعت ہونے میں ان امور کے مانند تھی، جنہیں ”بدعات کبریٰ“ و ”راس البدع“ آپ سمجھتے تھے۔ علمی حیثیت سے اس سلسلہ میں حضرت والا کی تنقیحات کے تفصیلی جائزہ کا تو یہاں موقع نہیں ہے، اس کے لئے تو اگلے حصہ ہی کا انتظار کرنا پڑے گا، یہاں تو عام مسلمانوں یا کھٹے تو کہہ سکتے ہیں کہ اہل سنت و الجماعت یا سنی مسلمانوں کی داخلی اصلاحات کے سلسلہ میں آپ کے رویہ اور طریقہ عمل کا تذکرہ مقصود تھا، انشاء اللہ اس کے سمجھنے کے لئے اتنی بحث اس مسئلہ پر کافی ہو سکتی ہے۔

اصلاحی دائرے میں ”عقد بیوگان“ کے مسئلہ کے بعد دوسری چیز تطہیر و تزکیہ کا بھی کام تھا خانوادہ ولی اللہی سے اس تحریک کی ابتدا ہوئی تھی، حضرت مولانا اسماعیل شہید کے زمانہ میں پردان چڑھی، اور ولی اللہی خدمات کا جائزہ قدرت کی طرف سے سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے رفقاء کرام کے سپرد ہوا، تو ان بزرگوں نے بھی اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا، لیکن جہاں تک حضرت والا کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے عام مولویوں کی طرح اصلاح کے اس خاص پہلو کو نہ آپ سب کچھ خیال کرتے تھے اور نہ جیسا کہ آپ نے دیکھا بدعت کی تمام قسموں کی نوعیت بھی آپ کی نظر مبارک میں ایک ہی جیسی تھی، اور نہ اہمیت ہی میں سب کا درجہ مساوی تھا، سوانح مخطوطہ کے مصنف نے حضرت والا کی اصلاحی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقع پر یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

”مولانا کی نظر اصول پر تھی، نہ فروغ پر“

آگے جو یہ لکھا ہے، کہ

”خود تو مستحبات بھی ترک نہ کرتے تھے، اور مکروہات سے پرہیز فرماتے تھے، مگر اوروں (یعنی عام مسلمانوں) کے ترک و اختیار سے کچھ پروا نہ کرتے مگر فرض و واجب کے تارک پر صبر نہ کرتے اور اس کے روگ کو کمال حکمت سے دور فرماتے“ ص ۲۹

یہ بڑے بہتہ کی بات ہے اور قرآن و قیاسات، روایات و حکایات کی امداد سے فقیر جس نتیجہ تک پہنچا ہے اسی نتیجہ تک معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ذہنہ مشاہدات اور عملی تجربات سے وہ بھی پہنچتے حاصل وہی ہے کہ ”فرق مراتب“ کی جو قدرتی کیفیت شرعی مطالبات و منہیات میں پائی جاتی ہے، مسلمانوں کی ”داخلی اصلاح“ کے معاملہ میں یہ نکتہ حضرت والا کی حکیمانہ نظر سے کبھی اوجھل نہ ہوا، چاہتے تو آپ بھی یہی تھے کہ مسلمانوں کی دینی زندگی غیر دینی آلاتوں سے پاک ہو کر صحیح اسلامی قالب میں ڈھل جائے لیکن بنی آدم کی فطری کمزوریوں کی بھی رعایت فرماتے، فرض و واجب کی حدود میں جو چیزیں داخل نہیں ہیں، ان کے متعلق نسبت قول کے عملی درس آپ کے نزدیک بار آوری کا زیادہ ضامن تھا، سوانح مخطوط کے مصنف نے جو یہ لکھا ہے کہ ”مستحبات و مکروہات کے ترک و اختیار سے کچھ پروا نہ کرتے“ اس بے پروائی کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ زبان مبارک سے ٹوک ٹاگ کے عادی اس نوعیت کے امور میں آپ نہ تھے۔ اس باب میں کر کے دکھانا اسی کو کافی خیال فرماتے تھے۔ آپ کے قلمی ماثر میں ان کی سراخت کی کمی جو محسوس ہوتی ہے، جن کا تعلق آپ ہی کی اصطلاح کی رو سے ”بدعات صغیرہ“ سے ہے اس کا اثر بھی یہی ہے۔ قلم کا درجہ تو زبان کے بعد ہے، زبانی ارشاد سے ان امور میں جو احتیاط سے کام لیتا ہو، سمجھا جاسکتا ہے کہ وہی ان پر قلم اٹھانے کو کس حد تک مفید خیال کر سکتا تھا، کاش اہل علم کی عمومیت میں بھی شرعی مطالبات و ممنوعات کے ”فرق مراتب“ کی یہ تمیز پیدا ہو جائے، تو چھوٹی چھوٹی باتوں میں جھگڑنے بلکہ لڑ پڑنے کے الزام میں مولویوں کی رسوائیاں اس حد تک پہنچیں، جہاں تک وہ پہنچ کر وہیں۔ مستحبات و مکروہات کے سلسلے کے ایک ایک جزیر پر طومار تیار کر دیا گیا ہے، اور علمی مباحث سے زیادہ بسا اوقات پھکڑ باز یوں تک نوبت پہنچ گئی تھی،

غفر الله لنا ولهم فتلک امة قد خلت لہا ما کسبت وعلیہا ما اکسبت

لیکن اسی کے ساتھ سوانح مخطوط کے مصنف کے بیان سے ایک نئی آگاہی بھی حاصل ہوتی ہے، یعنی اخذ و ترک یا کرنا نہ کرنا جن باتوں کا استحباب و کراہت کی حدود سے تجاوز نہ کرنا

دوسرے لفظوں میں چاہیں تو حضرت والا کی اصطلاح کی رو سے کہہ سکتے ہیں کہ ”بدعات صغیرہ“ کے متعلق جہاں آپ کا یہ طرز عمل تھا، وہی ان ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اصلاحی نظام نامہ میں علاوہ ان کے اس قسم کی چیزیں بھی شریک تھیں جن پر بدعت کے اصطلاحی لفظ کا اطلاق تو نہیں ہو سکتا تھا، لیکن امتداد زمانہ سے بدعت کا رنگ ان میں پیدا ہو چلا تھا، یا بجائے بدعت کے اسلامی تعلیمات کے دوسرے واقعات کا اقتضا تھا کہ ان کی طرف بھی توجہ کی جائے۔

بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ اخروی ثواب و عقاب کے نتائج کن اعمال و افعال پر مرتب ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کا جاننے کا واحد ذریعہ صرف وحی و نبوت ہے، اسی لئے کسی قول و عمل حرکت و سکون پر یہ حکم لگا تا کہ خدا اس سے خوش ہو تا ہے یا ناخوش، یہ کام صرف پیغمبروں کا ہے۔ اسی لئے بدعت نام ہے اسی اشارہ کا جس کے متعلق اخروی ثواب و عقاب یا حق تعالیٰ کی خوشی و ناخوشی کا خیال شریعت کے توسط سے بنی قائم کر لیا جائے۔ ورنہ اس خیال کے بغیر کسی قسم کا کام اگر کیا جائے تو محض اس لئے کہ عہد نبوت و قرون مشہورہا بالغیر میں اس کا پتہ نہیں چلتا، ہم اس کو بدعت نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ الدین کے اس مجموعہ میں اضافہ نہیں ہے جس کے ساتھ خدا کی رضا مندی ناواقفان کا کیا تعلق ہوتا ہے۔ وہی احداث فی ما ہوا ہذا (جس نے ہمارے اس کام میں نئی بات کا اضافہ کیا، بدعت کی حقیقت کی طرف ان الفاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اشارہ فرمایا ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ دین میں اضافہ ہی بدعت ہے، حضرت الامام الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ اسی بنیاد پر فرمایا کرتے تھے کہ کثرت و بیاد وغیرہ جیسی چیزیں جس جن رسوم کا اضافہ مسلمانوں نے کر لیا ہے۔ مثلاً گشت کرنا، روضی اور بھی داہی تھا ہی باتیں تو ان رسوم کو بدعت کی مدین ہم اس لئے داخل نہیں کر سکتے کہ ان اعمال و افعال سے ثواب و عقاب کا مسلمانوں کے نزدیک تعلق نہیں ہے یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ دھڑا کو گھوڑے پر بیٹھا کٹر شہر میں گشت اگر نہ کر لیا جائے گا، تو گناہ ہو گا یا کرنے پر ثواب ملے گا، فرمائے تھے کہ ان رسوم کو بجا آئے بدعت کے اسراف ضلوع خروچی لغو یعنی اعمال وغیرہ کی مدوں میں ہم داخل کر سکتے ہیں کہ شریعت ان امور کو بھی پسند نہیں کرتی بلکہ چاہئے تو اس کو اٹھائی و حاکم کی مدین شریک کر دیکھئے۔ اپنے آپ کو احمق بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرنا یہ بھی غیر شرعی فعل ہے۔ اسی طرح فرماتے تھے کہ سبیت کے متعلقہ رسوم کی نوعیت فوراً مختلف ہے۔ موت کا تعلق عالم آخرت سے ہے، کرنے والے ثواب و عقاب کے خیال سے نہ بھی کریں۔ لیکن موت کی خصوصیت کیفیت میں اس کی صلاحیت ہے کہ رفتہ رفتہ اس خیال کو عوام میں پیدا کر دے کہ غلام و دم کے کرنے سے مردے کو آرام و سکون ملتا ہے نہ کیا جائے گا تو دکھ ہو گا، پھر وہی ثواب و عقاب کا خود تراشیدہ عقیدہ ہے جو اعمال و افعال میں بدعت کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ (دبائی اگلے صفحہ پر)

دیوبند کے مسلمانوں نے باہمی معاہدے کی شکل میں حضرت والا کے سامنے ایک صلاحی و شیعہ پر دستخط کئے تھے۔ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے اسی وثیقہ کا ذکر کرتے ہوئے، اس کے دوسرے مندرجات و مشتملات کے ساتھ لکھا ہے کہ حسب ذیل امور بھی اس میں تھے یعنی بیاہ شادی میں جو مسرفانہ فضول رسوم مقرر ہیں، اور ان کی پابندی سے بہت تکلیف اور زیر باری ٹھکانی پڑتی ہے، بالکل موقوف کر دیئے جائیں گے۔ اسی طرح عیادت (بیمار پر سی) کے سلسلہ میں سوم بڑھاتے ہوئے لوگوں نے اس نوبت تک ان کو پہنچا دیا تھا کہ علاج و معالجہ کے ناگہانی مصارف کے ساتھ ساتھ ایک مستقل مالی مصیبت اس خاندان پر ٹوٹ پڑتی تھی جس میں اتفاقاً کوئی بے چارہ مرض کا شکار ہو جاتا تھا۔ خصوصاً مستورات و بچوں میں کس کس کے بعد دیگرے بیمار کے گھر پر ملنا کر دیتی تھیں۔ ان کی خاطر و مدارات سواری شکاری کے قصوں سے لوگوں کا ناک میں دم آگیا تھا، لیکن رسوم کی انہیں زنجیروں کا ٹوڑنا آسان نہ تھا۔ دیوبند کے مسلمانوں کو اس پر راضی کر لیا گیا تھا کہ ”مستورات جو مریض کی عیادت کو جاتی ہیں، اور اس میں بیمار، اور تیماردار دونوں کو تکلیف ہوتی ہے“ اس رسمی دستور کو ترک کر دیں گے۔ مطلب یہی تھا کہ عیادت کے مسنون طریقہ پر مزید اضافے جو باعث گرافنی بن گئے ہیں، وہ چھوڑ دیئے جائیں گے

عیادت کے بعد پھر تعزیت اور پرسہ کے مراسم کے طول طویل قصے تھے۔ مرنے والے کے مرنے کے بعد ہر تھوڑے تھوڑے وقفے سے معاشی موت کی کش مکش میں پس ماندوں کو مبتلا ہونا پڑتا تھا، سوّم، چہارم، دہم، چہلم، چھ ماہی، برسی کے نہ ختم ہونے والے دعوتی مطالبات

(سلسلہ صفحہ گذشتہ) بدعت کی یہی روح جو اسے افترا علی اللہ والرسول کی حد میں داخل کر دیتی ہے۔ وہ مانو ہے جس کی وجہ سے مذہب نے اس کو غیر معمولی قرار دیا ہے۔ ۱۲ (حاشیہ کا مضمون بالکل جی ہے لیکن اگر اس کی تعبیر اس طرح کی جاوے کہ شادی بیاہ میں جو لائینی امور انجام دیئے جاتے ہیں انہیں تو رسوم سے تعبیر کیا جائے اور غریب میں جو فضولیات و خرافات برتی جاتی ہیں انہیں بدعات کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے حضرت نگاہی کی یہی اصطلاح تھی پس سوم کی دوئیں نہیں کہ ایک بدعت ہی ادبیک حماقت، بلکہ امر کی دوئیں ہیں ایک سوم ادبیک ہتھکا یہ اصطلاح زیادہ واضح و سبکی خصوصاً لائے اکثری قدس سرہ حضرت نگاہی کی اصطلاح کی تفصیل و تشریح فرمایا کرتے تھے جس کا مصنف سلسلہ نے حاشیہ میں حوالہ دیا ہے) خدیج غفرلہ

تھے، جو برادری والوں کی طرف سے مرنے والے کے پس ماندوں پر عائد ہو جاتے تھے، اور جس راہ سے بھی ہو، برادری کے ان مطالبات کی تکمیل پر غریب مجبور تھے۔ یہ طے کیا گیا تھا کہ تعزیت کے سلسلے میں بھی ساری غیر شرعی رسوم کو ختم کر دیا جائے گا، اسی کے ساتھ ایک دفعہ اسی ”باہمی معاہدے“ کے ذیقہ میں یہ بھی تھی، ”سوانح مخطوط کے مصنف کے بحسنہ الفاظ اس سے متعلق یہ ہیں کہ،

”مستورات کے لباس میں جو اسراف ہو رہا ہے اس کی اصلاح کی جاوے“

یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ مولویوں کے عام طبقہ کی نظر زیادہ تر ان ہی امور پر مرکوز ہوتی ہے جنہیں اصطلاحاً ”بدعات“ کہتے ہیں۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں سیدنا امام الکبیر کے اس اصلاحی نظام نامہ کی مذکورہ بالا دفعات کو، جیسا کہ میں نے عرض کیا ان میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن میں حالاً یا مآلاً ”بدعت“ بن جانے کی صلاحیت تھی، مگر اسی کے ساتھ ہم ان ہی میں ان اجزاء کو بھی پاتے ہیں، جن کے انداز کی طرف اسی کی توجہ ہو سکتی ہے جس کی نظر میں معاد کے ساتھ مسلمانوں کے معاش اور معاشی مشکلات کو بھی کافی اہمیت ہو۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھوکوں کو کھانے پر اور پیاسوں کو پینے پر آمادہ کرنے کے لئے آج کل ترقی و عروج وغیرہ کے عنوانوں پر وعظ فرمایوں کا درواج عموماً جو جاری ہے اور انسانی جبلت جو فطرتاً شیعہ (لا لہ) اور بلوغیت (بے صبری) کے تقاضوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ اسی کو آمادہ کیا جاتا ہے، کہ جس حد تک اس جذبہ کا بھڑکانا ممکن ہو، کوشش کا دقیقہ اس میں اٹھا نہ رکھا جائے لالچی بنو اور لالچی بنتے چلے جاؤ۔ حریص بنو اور حریص بنے چلے جاؤ، ان ہی عنوانوں پر دھواں دھار تقریریں کر رہی ہیں، خطبے دئیے جاتے ہیں، میز اور کرسیوں کے ساتھ ساتھ اب تو محراب و منبر تک حرجی آؤں گے ان ہی مواضع سے ہل رہے ہیں۔ العباد باللہ شاید میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ سیدنا امام الکبیر کا بھی کوئی حصہ وعظ و پند کے اس عجیب و غریب حصے میں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کے عہد مبارک ہی میں دعاء و ہدایہ کا ایک بڑا طبقہ حکومت مسلطہ کے زیر اثر مسلمانوں کو اسی قسم کے وعظ سناتے لگاتھا۔

خود رہتا تھا اور دوسروں کو رلاتا تھا۔ چھاتیاں پیٹی جا رہی تھیں۔ کپڑے پھاڑے جا رہے تھے۔ طبا
قوم تھی، اور نصب العین ترقی۔ "ترقی کا لفظ تھا، اکبر مرحوم جسے دیکھ دیکھ کہا کرتے تھے۔

ترقی کے بچے کیا کیجئے

کمیٹی میں چنڈے دیا کیجئے

ظاہر ہے کہ جس لاہوتی دانش اور ملکوتی فرزانگی سے سیدنا امام الکبیر فطرنا سرفراز تھے
اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس قسم کے انتساب کی جرأت کون کر سکتا ہے۔ میرا خیال تو ہے کہ
ان نئے عنوانوں پر وعظ کہنے والے غریبوں کو شاید غور بھی اس کا شعور نہ تھا کہ حقیقی مُعْنُون ان
عنوانوں کا بالآخر کیا ٹھہرتا ہے "دنیا کے جس حد تک لالچی بن سکتے ہو، بنتے چلے جاؤ" انسانیت
کا یہی سب سے بڑا کمال اور نقطہ عروج ہے۔ بھلا کوئی سنجیدہ آدمی اس موضوع پر وعظ کہنے کے لئے
بر ثبات عقل و ہوش ایک لمحہ کے لئے بھی آمادہ ہو سکتا ہے، مگر لفظی دل آویزیوں نے معافی
سے ان کی توجہ پھیر لی تھی۔ اپنے نزدیک وہ یہی سمجھتے رہے کہ مسلمانوں کے آگے کسی بڑے نصب
العین کو پیش کر رہے ہیں۔ اسی لئے میں ان بزرگوں کو قابل معافی سمجھتا ہوں جنہوں نے دنیا طلبی
کے مواعظ سے مسلمانوں کے کانوں کو بہرا بنا دیا تھا۔ غفر اللہ لہم۔ نیت بہر حال ان کی اچھی تھی
اور اب بھی ترقی و تعلیٰ کی ان ہی پرانی گھیردوں کو جو پیٹے چلے جا رہے ہیں، بجز اس کے کہ ان کی
عقلوں پر ترس کھایا جائے اور کیا کیا جاسکتا ہے۔

خیر میں کیا کہنے لگا، عرض یہ کر رہا تھا کہ سوانح محفوظہ کے مصنف کے بیان کے مطابق
دیوبند کے مسلمانوں کے راضی نامہ کے مذکورہ بالا دفعات کے پڑھنے سے اس کا اندازہ ضرور
ہوتا ہے، کہ محکومیت کے دور میں اپنی حاکمیت کے زمانہ کے رواجوں، اادامہ ستوروں کے
نہلنے کا جذبہ مسلمانوں پر جو مسلط تھا، جلنے کے بعد بھی رسی کی اینٹھیں باقی تھیں۔ اسی کی گرفت
سے دل تو سب ہی بے کل اور بے چین تھے۔ لیکن زبان سے اپنی زبوں حالیوں کے اقرار پر کوئی
آمادہ نہ تھا۔ حمیت اور غیرت کا مسلمانوں کے شاید یہی تقاضا تھا۔ مگر پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا،

جو کچھ دلوں میں تھا، جرأت کر کے سیدنا الامام الکبیر نے چاہا کہ عمل میں بھی اس کو دخل کر کے پھیلاؤ کو چادر کی وسعت کے مطابق کر دیا جائے اور گو بظاہر اصلاح کے ان شعبوں کا تعلق، اگرچہ معاش ہی سے تھا، لیکن عرض کر چکا ہوں کہ اسراف و تبذیر وغیرہ کے قوانین کو نافذ کر کے اسلام نے گویا اس حد تک مسلمانوں کی دنیا کو بھی دین اور دین کا ایسا جز بنا دیا ہے۔ جس کی خلاف ورزی سے معاش کے ساتھ مسلمانوں کا معاویہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ بلکہ بعض دفعات اسی راضی نامہ کی ایسی بھی ہیں، جن میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، دین میں خود تراشیدہ اضافہ بن جانے کی بھی کافی صلاحیت تھی، ایسی صلاحیت کہ دین کا کوئی سچا ہمدرد اور حنادم صادق اس سے قطع نظر نہیں کر سکتا، جیسا کہ میرٹ کے متعلقہ رسوم وغیرہ کے حال سے ظاہر ہے، خلاصہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی داخلی اصلاح کے سلسلہ میں بیان کئے والوں نے یہ اور اسی قسم کی باتیں نقل کی ہیں، یہ راضی نامہ جو دیوبند کے مسلمانوں کے درمیان حضرت والا کی تحریک سے طے ہوا تھا، سوانح محظوظ کے مصنف نے اس کا تذکرہ کر کے یہ اطلاع بھی دی ہے، کہ صرف ”کاغذی راضی نامہ“ بن کر نہیں رہ گیا تھا، بلکہ وہی لکھتے ہیں کہ اسی کی بدولت، ”شادیوں میں بھی فضول خرچی اکثر موقوف ہو گئی، اور رسوم کی پابندی باطل نہ رہی“ اسی طرح مسلمانان ہند پر خاندان کے کسی رکن کی موت جس نہ ختم ہونے والی مالی مصیبت کے طوفانی دہانے کو کھول دیتی تھی۔ اس کی طرف اشارہ کر کے وہی خبر دیتے ہیں کہ

”میرٹ کے رسوم بہت کم ہو گئے، اکثر جگہ سے سیٹوم و دہم و بستم و چلم موقوف ہو گیا“

لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ عمل کی دنیا سے منقطع ہونے والوں کو شرعاً عملی دنیا کے رہنے والوں سے جو امداد مل سکتی تھی فیض کا یہ دروازہ بھی بند ہو گیا تھا، بد قسمتی سے رسوم کے اسناد کے بعد بسا اوقات کچھ اسی قسم کی صورت حال پیش بھی آ جاتی ہے، اگرچہ سبھی قالب میں مرنے والوں کے نام سے جو کچھ کیا جاتا ہے۔ چونکہ زیادہ تر سوسائٹی کے دباؤ کا وہ نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے عموماً

مروجہ رسوم سے بھی سچ پوچھئے تو مرنے والے کی روح کو مستفید ہونے کا موقعہ نہیں ملتا تھا، بہر حال سیدنا الامام الکبیرؑ کی تحریک سے ایک طرف رداجی دستور کی زنجیریں جہاں کاٹی اور تھڑی جا رہی تھیں، وہیں دوسری طرف جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف ہی نے لکھا ہے کہ

”ایصال ثواب میت کا پورا پورا طریقہ شرع شریف کے موافق ہو گیا۔“

یعنی رسمی قیود سے آزاد ہو کر مرنے والوں کے نام جن ملنی اور بدنی عبادات کی راہوں سے ثواب پہنچانے کی شرعاً گنجائش تھی، اس کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ پوری قوت کے ساتھ باقی رکھنے کی کوشش کی گئی اور آج تک مجدد اللہ اس کا سلسلہ باقی ہے، چاہئے بھی کہ ان طریقوں کو شرعی حدود کی پابندی کرتے ہوئے باقی رکھا جائے۔ عمل کی دنیا سے رخصت ہو جانے والوں کے ساتھ حسن سلوک کی بھی ایک راہ کھلی ہوئی ہے اور اسی تدبیر سے زندوں اور مردوں کے درمیان گو نہ ایک قسم کا تعلق بھی قائم رہتا ہے، بہر حال اہل السنۃ والجماعت یا سنی مسلمانوں میں ایسے رسوم اور رواج جن کی کوئی بنیاد ہی نہ تھی، ان سے تو سنیوں کی دینی زندگی کو پاک و صاف کرنے میں جرأت اور کامل عزم و ارادہ کا اظہار آپ کی طرف سے ہوتا تھا، لیکن ایسے مسائل جن میں علماء اہل السنۃ والجماعت میں علمی اختلافات تھے۔ یعنی اپنے نقطہ نظر کی تائید میں ہر فریق کتب و سنت ہی کے شواہد پیش کیا کرتا تھا، سیدنا الامام الکبیرؑ ان مسائل میں اگرچہ خود اپنی ترجیحی رائے بھی دیکھتے تھے۔ پوچھنے والے پوچھتے، تو وجوہ کے ساتھ اپنی رائے سے لوگوں کو آگاہ بھی کر دیا کرتے تھے۔

لیکن اسی کے ساتھ آپ کا اصولی مسلک اس قسم کے اختلافی مسائل میں یہ بھی تھا جس کا ذکر اپنے بعض مکتوبات میں فرمایا ہے۔ یعنی امت کے اکابر اور سرور اور وہ علماء جن مسائل میں باہم مختلف ہیں ان کے متعلق یہ فرماتے ہوئے کہ

”اگر ایک طرف بالکل ہو رہے تو کسی نہ کسی طرف والوں کو برا سمجھنا پڑے گا۔“

اپنے منشاء کا اظہار حضرت والا نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ

”اس لئے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہونگے۔“

کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں۔“ ۹۰۔ جمال قاسمی

اور یہی ہے بڑے پتے کی بات، جس کی پروا مناظرہ اور مباحثہ کی مسافستوں میں مبتلا ہو کر لوگ بالکل نہیں کرتے، آخر جن بزرگوں کے ساتھ حسن ظن کا تعلق ان کے علم و عمل کی وجہ سے امت قائم کی چکی ہے ان کو اچھا بھی سمجھنا اور پھر ان ہی کی طرف یہ بھی منسوب کرنا، کہ کتاب و سنت کے اقتضاؤں سے بے پروا ہو کر انہوں نے فیصلہ کیا، خود ہی سوچئے کہ ذہنی تناقض کے سوا اور کیا ہو؟ اور جہاں ان اختلافی مسائل کے متعلق آپ کا یہ مشورہ تھا کہ ”خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہونگے، کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں۔“ اسی طرح تکفیر مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ لگانے کا جو رجحان مولویوں میں بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے متعلق حضرت دالا کے نقطہ نظر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، اپنے ایک فارسی مکتوب میں خاص مسئلہ جو اس زمانہ میں چھڑا ہوا تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے اور یہ فرماتے ہوئے کہ

”در مسلمانان کیست کہ قرآن دین و ایمان او نباشد“ ۹۱۔

اور اسی واقعہ کو بنیاد بنا کر عام مشورہ آپ نے یہ بھی دیا ہے کہ

”بناؤ علیہ تا مقدر کہے را کافر نباید دانست“ ۹۲۔ فیوض قاسمیہ

خلاصہ یہ ہے کہ رائے میں اختلاف کی آزادی کے فطری حق کو محفوظ کرتے ہوئے اہل علم کو مذکورہ بالا نوعیت کے مسائل میں ایک ایسے اسلم و احکم طریقہ کی طرف راہ نمائی فرمائی گئی ہو جس کی اگر پابندی کی جائے تو ایک بہترین شائستہ باادب و احول نزاعی مسائل کے سلسلہ میں پیدا ہو سکتا ہے۔ مقصد ہر حال میں یہ تھا کہ حتی الوسع لڑنے جھگڑنے میں مولویوں کا طبقہ عموماً اس زمانہ میں بہت زیادہ بدنام اور رسوا ہو رہا تھا۔ اس بدنامی اور رسوائی کو کم کیا جائے۔ اپنے بعض مکتوبات میں حضرت دالانے بڑے افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ

”یار اب این زمانہ چہ پرشود مست کہ بجائے محبت و اخوت اسلامی، عداوت ہا برخواستند“

اور یہ عداوتیں، جو محبت و اخوت کی جگہ اٹھ کھڑی ہوئی ہیں، فرماتے ہیں کہ بڑے اہم مسائل سے ان کا تعلق نہیں ہے، بلکہ

”دراں مسائل کہ متفق علیہا بودند اختلاف پیدا آمد“ ص ۱۱ فیوض قاسمیہ

اور ایک دوسرے خط میں جس کی زبان اردو ہے، بڑے انداز ہناک لہجہ میں ارقام فرماتے ہیں، ”یہ اختلاف ہی موجب عداوت ہے، اور یہ عداوت باہمی موجب تنفر یک دگر ہے۔“ فرماتے تھے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنا ہی بے معنی ہے، تیرہ سو سال سے امت جو کچھ مانتی چلی آ رہی ہے خواہ مخواہ اس میں شاخاٹے نکالے ہی کیوں جائیں، اور اختلاف کسی وجہ سے اٹھ کھڑا ہی ہو تو اختلاف سے عداوت کیوں پیدا ہو، باہمی منافرت کے بغیر بھی کیا مسائل کی علمی تحقیقات ممکن نہیں،

بڑی مایوسی کے لہجہ میں اپنے اردو زبان والے خط میں ارقام فرماتے ہیں۔

”اس زمانہ میں ہر توفیق بے جا ہے کہ اختلاف اٹھ جائے اور اتفاق پیدا ہو جائے“

پھر مرض کے سبب کی تشخیص خود ہی یہ فرمائی ہے کہ

”ابنار و روزگار میں فہم و انصاف ہوتا، تو بعد فہمائش ممکن تھا کہ یہ اختلافات اٹھ جاتے۔“

اور سچ پوچھنے تو ہماری یہ ساری رسوائیاں جو غیر قوموں کے سامنے ہوتی رہتی ہیں، ”فہم و انصاف کی کمی“ ہی کے نتائج ہیں، بلکہ فہم اور سمجھ لوگوں کی درست ہوتی، تو انصاف کا جذبہ خود بخود ابھر آتا مگر کیا کیجے، بقول سعدی

گر از بسبب ذہن عقل منعدم گردد

بخود گمان نہ بردیج کس کہ نادانم

اس زمانہ میں ہندوستان پر حاکمانہ اقتدار جس قوم نے اپنا قائم کر رکھا تھا، علمی تحقیقات کے سلسلے میں اس قوم کی عام روش اور طریقہ کا چرچا بھی یہاں پہنچنے لگا تھا، بظاہر میرا خیال ہے شاید اسی کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اردو زبان والے اسی خط میں حضرت والا کی نوک قلم

سے یہ الفاظ بھی ٹپک پڑے ہیں۔ مکتوب الیہ کو مخاطب کر کے ارقام فرمایا گیا ہے۔

”مگر آپ جانتے ہیں کہ آج کل یہ دونوں (فہم والنصاف) نصیب اعدا ہیں۔“

بہر حال باوجود ان مایوسیوں کے آپ کی طرف سے کوشش اسی کی جاری تھی کہ مسلمانوں میں جہاں تک ممکن ہو، اختلافات کی ناگوار اور مکر وہ شکل اگر کلی طور پر ختم ہو، تو ممکنہ حد تک ان کے دائرے کو کم کیا جائے۔

اسی قسم کے ایک مسئلہ کے متعلق اپنی ذاتی رائے کو درج کرنے کے بعد فارسی زبان کے ایک مکتوب میں مکتوب الیہ سے اس کی فرمائش کرتے ہوئے کہ دوسرے معتبر اہل علم و تقویٰ سے بھی استمراج کر لیجئے۔ اور جو کچھ ان سے معلوم ہو، مجھے بھی اس سے مطلع کیجئے۔ کس لئے مطلع کیجئے؟ کیا اس لئے کہ پھر جواب الجواب تیار کر کے بھیجوں؟ نہیں ان ہی سے سنئے، ارقام فرماتے ہیں۔

”اِس نیاز مند را ہم اطلاع فرمائند تا بہ پیروی جم غفیر مین ہم سر و ہم در پے تفوق کلمہ نہ شوم“ ۱۹ فیوض قاسمیہ

لیکن اپنی ذات کی حد تک ان ترمیموں کے باوجود، اصل دین کے ساتھ آپ کی سرگرمیوں کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، کہ ایک مسئلہ کے متعلق یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ شرعی اصطلاحات

لہ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ جگہ پو فرمایا گیا ہے کہ ”الغیب“ کا علم حق تعالیٰ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے، فقال انما الغیب للہ (یونس)، ان اللہ یعلم غیب السماوات والارض (حجرات)، لیکن اسی کے ساتھ قرآن ہی میں ہے کہ اپنے رسولوں میں جسے چاہتا ہے اللہ تعالیٰ غیب سے مطلع فرماتا ہے واما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبیٰ من رسلہ من یشاء (آل عمران)، اب سوال یہی ہے کہ غیر اللہ کو غیب کا علم جو عطا ہوتا ہے اس پر بھی ”علم الغیب“ کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں۔ حضرت دالانے ارقام فرمایا ہے کہ عام مسلمانوں میں یہی خیال پھیل گیا ہے کہ بالذات اور بالغیر غیب کے علم کی ان دونوں قسموں کو ظم بالغیب کہتے ہیں۔ پس غیر اللہ کی طرف علم غیب کو منسوب کرنے کا یہ مطلب کوئی نہیں سمجھتا کہ بالذات غیب کا علم ان کو حاصل ہے بلکہ یہی سمجھتے ہیں کہ غیب کے اس علم سے حق تعالیٰ نے ان کو سرفراز کیا ہے، ظاہر ہے کہ اسی صورت میں مسئلہ علم غیب کا اختلاف لفظی نزاع کی صورت اختیار کر لیتا ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے فیوض قاسمیہ ص ۱۹

سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو عوام کے احساسات کو پیش نظر رکھنے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ
 ”ایں نزاع لفظی برپا شد“

یعنی لفظی، سیر پھیر سے زیادہ مسئلہ کی نوعیت اور کچھ باقی نہیں رہتی۔ مگر باوجود اس کے فرماتے
 ہیں کہ،

”اگرچہ بمعنی مختصر عوم باشد بابل ایماں، ہیچو اطلاق دیگر کفریات اگرچہ بتاویل حسن باشد
 گمراہ باشد“ ۴۴

مطلب یہ ہے کہ شرعی اصطلاحات کا خواہ کوئی عامیانہ مطلب کیوں نہ تراش لیا جائے، اور اس
 عامیانہ مطلب کو پیش نظر رکھتے ہوئے بظاہر کسی قسم کا سقم بھی محسوس نہ ہو، لیکن اس
 دلچسپ مثال کو پیش کرتے ہوئے، یعنی

”اگر کسے نام فرزند خود اللہ یا رسول اللہ نہ نہد“

سیدنا الامام الکبیر نے پوچھا ہے کہ نام رکھ لینے والے کو اجازت دے دی جائے گی
 کہ اپنے بچے کو اللہ کے نام سے پکارے، یا رسول اللہ کے نام سے مخاطب کرے؟ ظاہر ہے
 جیسا کہ ارقام فرماتے ہیں

”اہل ایمان ایمان و اہل عقل و نقل را گوارا نتوان شد“

آپ نے اس کے بعد اس مسئلہ کی طرف بھی اسی سلسلہ میں توجہ دلائی ہے کہ گالی یا دشنام
 میں جن الفاظ کو لوگ استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ واقعہ نہیں ہوتا۔ لیکن لفظ میں بھی قوت ہوتی ہے
 تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے، کہ رد عمل گالیوں کا کیا ہوتا ہے۔ پس عوام اپنے باہمی تعلقات میں الفاظ
 کے لفظی تقاضوں کو بھی جب برداشت نہیں کر سکتے، تو اسی سے سمجھنا چاہئے کہ کتنا گزند، اور کتنی تکلیف
 ان الفاظ سے بھی ایمان والوں کو پہنچ سکتی ہے، جن کا مطلب خواہ وہ نہ ہو، جو ان الفاظ سے بظاہر
 سمجھ میں آتا ہے،

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک طرف رسولوں کو فہمائش کی جا رہی ہے کہ اپنے آپ کو جو مسلمان

کہتا ہو، اس کو خواہ مخواہ یہ کہنا کہ تم مسلمان نہیں بلکہ کافر ہو، یا مسلمان ہونے کے باوجود یہ باور کرنا کہ قرآن کو خدا کا کلام نہیں سمجھتا، جیسے حضرت والا چاہتے تھے کہ اس معاملہ میں مولویوں کو محنت ط رہنے کی ضرورت ہے، اسی طرح عوام کو سمجھا یا جا رہا ہے کہ جن الفاظ اور محاوروں کا ایک شرعی مطلب مقرر ہو چکا ہے، اس مطلب سے ہٹا کر اپنے خود ساختہ معنی یا مطلب کو انہی الفاظ کی طرف منسوب کر کے ان کو استعمال کرنے سے، چاہئے کہ اہل ایمان و ایمان کو گزند نہ پہنچائیں، آخر کوئی بد بخت مسلمان اپنے بچے کا نام ”رسول اللہ“ اگر رکھ لے اور کہے مراد اس سے یہ نہیں ہے کہ اس کا لڑکا اللہ کا پیغام پہنچالے والا ہے، بلکہ سب نام جیسے رکھے جاتے ہیں، اسی طرح یہی نام میں نے رکھ دیا ہے، تو خود سوچنا چاہئے کہ ایمانی جذبات کو وہ کتنی آزمائش میں ڈال دے گا

یہ تھے سیدنا الامام الکبیر کی ان خدمات کے نمونے جن کا تعلق مسلمانان ہند کی اکثر یعنی اہل سنت والجماعت کی عموماً دینی زندگی کی تطہیر و تزکیہ سے تھا، جب تک زندہ رہے تحریر و تقریر آپ مسلمانوں کو ان اصلاحی امور کی طرف متوجہ کرتے رہے، آپ کے بعد آپ کے تلامذہ اور آپ کے قائم کردہ دارالعلوم کے فارغ التحصیل علمائے ملک کے طول و عرض میں آئندہ بھی اسی سلسلہ میں اپنی کوششوں کو جاری رکھا، خدا کا شکر ہے کہ اب تک وہ جاری ہے۔

ان کے بعد باشندگان ہند میں جو طبقہ شیعوں کا آباد ہے۔ اہل السنۃ والجماعت کے بعد قدرتا نسبت دوسری قوموں کے وہی سامنے آسکتے تھے۔ مقدمہ میں عرض کر چکا ہوں کہ مغل حکومت کے آخری دور میں ملک پر زیادہ تر شیعوں ہی کا سیاسی اقتدار مختلف جہہ کو قائم ہو گیا تھا۔

لے اور کیا کہا جائے مسلمان تو یہ بھی کر گزرے، ہندوستان کے ایک مشہور بہرہ سمر گاہ میں مسٹر بی۔ اے۔ نامی رہتے تھے، اور رسول خان، بی خان تو گویا عام اعلام مسلمانوں میں مروج ہو گئے ہیں۔ حد یہ ہے کہ فقیر دارالعلوم دیوبند میں جن دنوں پڑھتا تھا، صوبہ سرحد کے ایک مولوی صاحب مدرسہ میں مدرس ہو کر تشریف لائے تھے۔ جن کا نام مولوی رسول خان

اکثر صوبوں کے بھی وہی مطلق الحان حکمران بن گئے تھے۔ اور مرکز بھی ان ہی کے زیر تسلط ہو چکا تھا، اورنگ زیب عالمگیر اناراد اللہ برہانہ کے بعد تخت پر جن نام نہاد بادشاہوں کو ہم پاتے ہیں، ان میں بعض تو علانیہ شیعہ عقائد اختیار کر چکے تھے۔ براہ راست عالمگیر کا جانشین بہادر شاہ اول آپ سن چکے کہ علماء اہل سنت والجماعت کو دربار شاہی میں بلا بلا کر خود منظرہ کر کے تشیع کی پشت پناہی کر رہا تھا، جمعہ اور عیدین کے خطبوں سے خلفائے ثلاثہ کے اسماء گرامی کو خارج کرنے کا فرمان بھی اس نے صادر کیا تھا، اور مغل حکومت کے ان شاہان شطرنج میں جو بظاہر شیعہ نہ تھے، بلکہ نام کی حد تک اپنے آپ کو سنی ہی کہتے اور سنی ہی سمجھتے بھی تھے۔ لیکن عملاً ان کی دینی زندگی میں بھی تشیع کے عناصر و اجزاء کچھ اس طرح گھل مل چکے تھے کہ ان میں اہل شیعہ میں بہت کم فرق باقی رہا تھا۔ حکومت کے اسی رنگ میں بتا چکا ہوں کہ مسلمانوں کی اکثریت بھی رنگ چکی تھی۔ خصوصاً سیدنا الامام الکبیر نے جس علاقہ میں اپنی آنکھیں کھولی تھیں، مختلف شہادتیں پیش کر چکا ہوں، کہ اس علاقہ میں جو شیعہ نہیں بھی تھے، ان کی دینی زندگی بھی تقریباً تشیع کی زندگی بن چکی تھی۔ سنیوں اور شیعوں میں شادی بیاہ کے تعلقات چونکہ قائم تھے، اس لئے سیاسی اقتدار

لے عالمگیر کے بعد لال قلعہ کا رنگ بدلتے ہوئے کہاں تک پہنچا تھا، ایک چشم دید شہادت اسکی ”ہزم آخر“ نامی کتاب ہے، جس کے مصنف کی زندگی کا بڑا حصہ لال قلعہ میں گذرا تھا، منجملہ دوسری باتوں کے اسی کتاب میں یہ اطلاع بھی دی گئی ہے۔ اکثر سلاطین (شاہی خاندان کے افراد) قلعہ میں تعزیر داری کرتے تھے، فقیر میک بنتے تھے، کوئی نشان چہ کوئی نقیب بنتا تھا، کوئی تاشہ کوئی ڈھول، کوئی جھانجھ، تعزیروں کے آگے بجاتا تھا، کوئی مرثیے پڑھتا تھا، مرثیے خوانوں کو درگاہ میں چار چادر فستریاں، چکنی ڈلیاں، بھنے ہوئے خرہ بوزے کے بیج اور دھننے کی ملا کرتی تھیں۔ بڑی دھوم سے علم اٹھاتے تھے۔ ۱۱۷۱ھ میں حال تو مغل شاہزادوں کا تھا، باقی خود بادشاہ سلامت سوا سی کتابیں لکھا ہے کہ ”بادشاہ حضرت امام حسن حسینؑ کے فقیر بنتے، مسبر کپڑے پہنتے، گٹھے میں سبز کفن بھرتی ڈالتے“ بادشاہ کے گلے میں زنجیریں ڈال کر سید کھینچتے تھے اور حضرت عباس علیہ السلام کے سقے بھی بادشاہ بنتے تھے۔ لال قلعہ کے ایک لنگی بانہ سے شربت کی بھری ہوئی ایک مشک کنڈھے پر رکھ کر مصوموں کو شربت پلایا کرتے تھے۔ ۱۱۷۲ھ میں عشرہ محرم میں جو کچھ شیعوں کے یہاں ہوتا تھا۔ لال قلعہ کے سنی بادشاہوں کے یہاں بھی ہر ایک کی نقل ہوتی تھی، ۱۲۰۱ھ

باہر سے اور معاشرتی تعلقات اندر سے اس رنگ کو پختہ سے پختہ تر کرتے چلے جا رہے تھے پانی جب سر سے ادنچا ہو چکا تھا، تب خانوادہ دلی الہی کو اس مسئلہ کی طرف توجہ ہوئی، حضرت مولانا گنگوہی کے حوالہ سے تذکرۃ الرشید میں یہ تاریخی بیان درج کیا گیا ہے، فرماتے تھے کہ شیعوں کے متعلق

”ہمارے اساتذہ توشاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وقت سے برابر تکذیب ہی

کے قائل ہیں، بعضوں نے اہل کتاب کا حکم دیا ہے اور بعضوں نے مرتد کا“ ص ۲۸۶

خود سیدنا امام الکبیرؑ نے اپنے ایک مکتوب میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ قاضی ثناء اللہ بانی پٹی مالا بدمنہ فارسی کے فقہی، متن کے مشہور مصنف نے کوئی ”سیف مسلول“ نامی ایک کتاب بھی لکھی تھی، جس میں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مشیعوں اور سنیوں میں ازدواجی تعلقات کا جو عام رواج تھا، اس کی مخالفت کی گئی تھی، (فیض قاسمیہ ص ۲) ظاہر ہے کہ قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے مرید اور خلیفہ تھے۔ بالکل آخر زمانہ میں مفاسد کی شدت کو دیکھ کر یہ کتاب تصنیف فرمائی ہوگی، خود میری نظر سے یہ کتاب قاضی صاحب کی نہیں گذری ہے۔

بہر حال حد سے زیادہ جو فتنہ بڑھ چکا تھا، اور سچے پوچھے تو فتنے کی اسی آگ میں وہ سب کچھ جل گیا جس کا جلنا مسلمانوں کے لئے اس ملک میں مقدر ہو چکا تھا۔ درد کی یہ داستان طویل ہے اور ہندوستان کیا واقعہ تو یہ ہے کہ اسلام کی پوری تاریخ کا یہ جاں گداز حادثہ ہو اب اس قصے کو تو چھوڑئیے، میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ گو تشیع کے ساتھ سختی اور تشدد کا یہ برتاؤ ابتداء میں مناسب معلوم ہوا، لیکن اشتباہ والقباس کا جو غبار حق پر چھایا ہوا تھا گوندہ ہٹ گیا، تسنن و تشیع میں جو فرق تھا، وہ عوام کے سامنے بھی آگیا تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ تشدد میں قدرتا نرمی پیدا ہو گئی، اور شیعہ جو بہر حال ہندوستان کی اسلامی آبادی ہی کے اجزاء تھے اور ہیں ان کے متعلق اور تو اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف جو فتویٰ منسوب

کیا گیا ہے، اس کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر شیعوں میں جو اصرار کرتے ہیں کہ قرآن اصلی قرآن نہیں ہے، بلکہ (العیاذ باللہ) یہ بیاض عثمانی ہے۔ اور یوں دین کی پہلی بنیاد اکتساب ہی کو مشکوک ٹھہرا رہے ہیں، اور صحابہ کی اکثریت جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی السنّت مسلمانوں تک پہنچی ہے، ان ہی کو ناقابل اعتماد ٹھہرا کر دین کی دوسری بنیاد السنّت کو مسترد کرنے کے مجرم ہیں۔ زیادہ تر اس قسم کے خیالات اور عقائد بجائے عوام کے چونکہ شیعوں کے خواص یعنی علماء ہی میں پائے جاتے ہیں، اس لئے ان کی حد تک تو شاہ عبدالعزیز اور ان کے بعد کے علماء کے فتوے کو برقرار رکھتے ہوئے، حضرت گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ ان کے (یعنی شیعوں کے)

”جہلا فاسق ہیں“ ۲۸۶

اور یہ بڑے پتے کی بات ہے، کہ جاہل مسلمان، خواہ سنی ہو، یا شیعہ، مسلمان ہونے کی وجہ سے قرآن کو بہر حال اللہ کی کتاب ہی مانتا ہے۔ اس غریب کو ان داہی تباہی قصوں سے کیا سر دکار۔ جو شیعہ علماء کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔

فیوض قاسمیہ نامی والے مجموعہ مسکاتیب میں سیدنا الامام المکبیر کا یہی ایک خط پایا جاتا ہے، جس میں شیعوں کے متعلق بعض دل چسپ حکیمانہ نکات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت الاسلامی شیعوں کے دین کو برزخی دین قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں،

”بلحاظ ان کہ کلمہ شہادت بر زبان و درجہ جنان است، بر صوم و صلوة و حج و زکوٰۃ و غیرہ اعمال اسلامیان کہ اعمال دین اسلام باشند“

یعنی نماز و روزہ حج و زکوٰۃ وغیرہ اسلامی اعمال کے ساتھ شیعہ بھی

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کی تصدیق کرتے ہیں، دل سے بھی مانتے ہیں، اور زبان سے بھی اسی کا اقرار کرتے ہیں، یہ پہلو تو شیعوں کا اسلامی ہے، اور اسی کے ساتھ

”مخلکہ اعمال و افعال شان و عقائد باطلہ و اہواء زائلۃ شعار شان است و بدعات شنیعہ و معمولات قبیحہ کردار شان“

ایک پہلو شیعوں کی دینی زندگی کا یہ بھی ہے کہ اس قسم کی باتیں چونکہ

”از آثار کفر چہ انجام کفر ہیں مخالفت قرآن و حدیث باشند“

ان ہی وجوہ کی بنیاد پر آپ نے لکھا ہے کہ شیعوں کا دین کفر و اسلام کے درمیان ایک قسم کا برزخی دین ہے کہ

”برزخ ہاں مست کہ از ہر طرف اثرے بخود کشد و منظر آثار اطراف خود گرد“ ۲

خلاصہ یہ ہے کہ غیر مسلم اقوام کے مقابل میں شیعوں کی مذکورہ بالا امتیازی خصوصیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سنیوں کے بعد شیعہ ہی اس کے مستحق تھے کہ ان کی طرف توجہ کی جائے اور اس سلسلہ میں بھی جو کچھ آپ سے ہو سکتا تھا کرتے رہے، تصنیفی سلسلہ میں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سیدنا امام الکبیر کی کتابوں میں سب سے زیادہ ضخیم کتاب آپ کی وہی ہے جس میں انتہائی دل سوزیوں کے ساتھ شیعوں کی غلط فہمیوں کے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے، سارے تین صفحات سے نامہ اوراق میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے۔ تقطیع متوسط اور لکھائی بھی اس کی گتھی ہوئی ہے۔ اپنے عام طریقہ تصنیف کے خلاف اس کتاب میں بکثرت دوسری کتابوں کے حوالوں کو بھی آپ نے پیش کیا ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ پر آپ کی کتنی اچھی نظر تھی، اس کا نام ”ہدیۃ الشیعہ“ ہے، کتاب کے خصوصی نقاط نظر کا ذکر تواتر اشارۃً اگلی جلد میں کیا جائے گا یہاں حضرت الاکلی ”داخلی خدمات“ کی دوسری منزل کا صرف تذکرہ مقصود ہے۔ بڑے دردناک ہجرت میں کتاب کو ختم کرتے ہوئے ارقام فرمایا گیا ہے کہ شیعوں کو چاہئے کہ

”اس عقیدہ بد سے باز آکر توبہ و استغفار سے تدارک مافات کریں آئندہ مانیں تو وہ جلیں“

ما نصیحت بجائے خود کر دیم روزگارے دریں بسر بردیم

ورنہ بار بگوش اندر کس بر رسولان یلاغ باشد و بس

ایک ہی کتاب نہیں، آپ کے خطوط میں بھی جو شائع ہو سکے ہیں شیعوں کے متعلقہ مباحث و مسائل ہی کو ہم زیادہ پاتے ہیں، آپ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے۔ پہلے بھی کہیں ذکر گذرا ہے کہ شیعوں میں وقت کے مشہور مجتہد مولوی حامد حسین صاحب لکھنؤی تھے۔ اپنی شان اور اپنے مقام کا خیال کئے بغیر سیدنا امام العباسؑ کے پاس پہنچ گئے، جس محل میں پہنچے تھے، اس کا ذکر اپنے ایک خط میں مولوی محمد حسین صاحب دہلوی نے ایسے الفاظ فرمایا ہے۔

”بے عمامہ در و مال چنانکہ حادث من سرت بر مکتلے کہ مولوی حامد حسین صاحب لکھنؤی شیعی..... فروکش بودند فرتم“

واللہ اعلم بالصواب صحیح طور پر اس کا پتہ نہ چل سکا، کہ یہ واقعہ کہاں پیش آیا۔ یہ خیال کہ لکھنؤ پہنچ کر مولوی حامد حسین صاحب سے حضرت دالانے ملاقات کی تھی، بظاہر کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا، زیادہ قریبہ اسی کا ہے کہ میرٹھ یا سہارنپور یا ممکن ہے دہلی ہی کسی وجہ سے مولوی حامد حسین آئے تھے، اور حضرت دالان کے پاس پہنچے۔ اس سلسلہ میں کچھ مناظرہ اور مکالمہ کی صورت بھی پیش آئی، اور مولوی حامد حسین صاحب کو اس کا پتہ نہ چل سکا کہ وہ مولانا محمد قاسم صاحب سے گفتگو کر رہے ہیں۔ اسی موقع پر بجائے مشہور نام کے تاریخی نام خورشید حسن آپ نے اپنا بتایا تھا، تحفہ اثنا عشریہ میں بھی شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنا تاریخی نام غلام حلیم ہی درج کیا ہے۔ اضطرابِ بزرگوں کی سنت کی پیروی کی سعادت سمجھنا چاہئے کہ آپ کو حاصل ہو گئی۔

اور مجھ ہی سے یاد ہو گا آپ یہ سن چکے ہیں کہ شیعوں کی طرف سے یہ مطالبہ پورنفاضی نامی قصبہ میں جب پیش ہوا کہ براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اگر مولوی محمد قاسم ہم لوگوں کو

۱۵ مولوی حامد حسین کے نام کے ساتھ مجتہد کا لفظ ہی تیار ہے کہ شیعوں میں غیر معمولی امتیاز ان کو حاصل تھا حضرت دالانے بھی ان کا تعارف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”در جواب فتویٰ الکلام کتابے مبسوطہ مسمیٰ باستقصاء الانجام نوشتہ اندوہ برعم شیعیات در میان زمین و آسمان نظیر نذرند آفتاب وقت و بدر منیر و بے نظیر اند“ ص ۱۵

۱۶ یہ واقعہ میرٹھ میں نواب محمد علی خاں کے مکان پر پیش آ رہا ہے۔ محمد طیب

کرا دیں تو ہم شیخ سے توبہ کر لیں گے، تو خلاف دستور حضرت کو جوش آگیا، اور ان کے مطالبہ کی تکمیل پر آمادہ ہو گئے، مگر مطالبہ کرنے والے ہی بھاگ گئے۔

اسی پور قاضی ہی کے شیعوں کے متعلق مولانا طاہر صاحب نے اپنے والد ماجد حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سیدنا الامام الکیب جس زمانہ میں پور قاضی پہنچے تھے تو اتفاقاً یہ محرم کا مہینہ تھا، حضرت والا کی تشریف آوری کی خبر پور قاضی کے شیعوں کو ہوئی تو ایک دفنان کے سر پر آدو دوں کا خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور یہ خواہش کی کہ ماتم کی مجلس میں شریک ہو کر پور قاضی کے شیعوں کو منون فرمایا جائے۔ خلاف توقع بجائے انکار کے حضرت نے فرمایا کہ میری ایک شرط بھی منظور کی جائے تو میں اس مجلس میں شریک ہو سکتا ہوں، جو شرط پیش کی گئی اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیعوں کے ساتھ حضرت والا کے قلبی تعلق کا کیا حال تھا؛ شرط یہ تھی کہ اسی مجلس میں

جو کچھ عرض کروں، اسے سن لیں۔“

دفن نے اس شرط کو تو منظور کر لیا، مگر اسی کے ساتھ ان کی طرف سے مزید مطالبہ پیش ہوا کہ آپ کے وعظ سے

”پہلے مجلس ہوگی، اس میں حلوا بھی تقسیم ہوتا ہے، وہ بھی آپ کو قبول کرنا پڑے گا۔“

آپ نے اس اضافہ کو بھی مان لیا اور حسب وعدہ ماتم کی مجلس میں حاضر بھی ہوئے، حلوا جو دیا گیا اسے بھی لے لیا، جب شیعوں کی پیش کردہ شرائط پوری ہو گئیں، تب ماتم کی اسی مجلس میں حضرت والا نے کھڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہد و صیت

تو رکعت فیکم الثقلین کتاب	میں تم میں دو بھاری چیزوں کو چھوڑتا ہوں، اللہ کی
اللہ و عترتی	کتاب اور اپنی اولاد

پر ایک مفصل و مبسوط تقریر فرمائی، سننے والے خلاصہ یہ بیان کرتے تھے کہ ہدایت کے لئے حضرت والا نے فرمایا علم و عمل دو ہی چیزوں کی ضرورت ہے۔ علم کے لئے تو اللہ کی کتاب ہے اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت پاک میں نسلی مناسبت کی وجہ سے عمل کی صلاحیت نسبتاً زیادہ ہونی چاہئے۔

الغرض ماتم کی اس مجلس میں اسی اجال کی تفصیل کچھ ایسے رنگ میں کی گئی کہ بجائے ماتم کے وہ تبلیغ کی مجلس بن گئی، روایت کے آخر میں مولانا طاہر صاحب نے اپنے والد ماجد کا حوالہ دیتے ہوئے یہ اطلاع دی ہے کہ

”اس وعظ کے بعد بہت سے لوگوں نے توبہ کی“

بظاہر اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ شیعہ عقائد سے تائب ہو کر لوگ سنی بن گئے۔

اس میں شک نہیں کہ علمی وقاد و عظمت کے رکھ رکھاؤ کے لئے عموماً مولویوں نے جن پابندیوں کی رعایت کو ضروری ٹھہرایا ہے۔ فطرتاً سید نلالام البکیر کی نظر میں ان کو چنداں اہمیت حاصل نہ تھی مولوی حامد حسین مجتہد شیعہ کے گھر میں جس شان سے آپ تشریف لے گئے، خود اس واقعہ سے بھی آپ کی افتاد طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک موقع پر یہیہ الشیعہ میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے یعنی خلیفہ سوم حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قرآن کی اشاعت و نشر میں چونکہ غیر معمولی حصہ تھا، گویا قرآن کے معلم اور استاد ہونے کی حیثیت ان کو حاصل ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مشیخہ باوجود غیر معمولی کدو کاوش کے قرآن کو زبانی یاد کرنے میں عموماً کامیاب نہیں ہوتے، یہ دلیل ہے کہ استاد کے باطنی فیض سے وہ محروم ہیں، اسی عام مشہور تجربہ کی تائید اپنے چشم دید مشاہدہ سے فرماتے ہوئے آپ نے شیعوں کے ایک عالم جن کا نام مولوی جعفر علی تھا، اور شیعوں کے دئی میں پیش امام تھے۔ اپنے زمانہ میں ان کی ہستی دلی کے شیعوں کی مرجع بنی ہوئی تھی، اہل مشہور تھا کہ مولوی جعفر علی صاحب قرآن کے حافظ ہیں۔ ان ہی کا ذکر کرتے ہوئے سید نلالام البکیر نے لکھا ہے کہ

”ان کے حفظ کی کیفیت ہے کہ رمضان شریف میں غدر سے پہلے مجتہد خود اس حقیر

نے دیکھا ہے کہ جلسہ تلاوت قرآن میں جو دن کو نواب حامد علی خاں کی مسجد میں ہوا کرتا

تھا، مثلاً دیگر حضرات شیعہ مذہب حائل میں دیکھ دیکھ پڑھتے تھے۔ نس پر بھی دو جگہ غلط پڑھ گئے۔ ”حک ہدیۃ الشیعہ

ظاہر ہے کہ حامد علی خاں کی مسجد میں یہ جلسہ جیسا کہ معلوم ہوتا ہے، خاص شیعوں کی طرف سے منعقد ہوتا تھا۔ اور گویہ واقعہ غدر سے پہلے کا ہے، عمر حضرت والا کی زیادہ نہ ہو گی، ممکن ہے طالب علی کے دنوں کی بات ہو۔ لیکن اس زمانہ میں خانوادہ ولی اللہی کی وجہ سے شیعوں اور سنیوں کی باہمی کش مکش جن حد تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے لحاظ سے میں تو اس کو بھی حضرت والا کی طبعی و راستہ فراجی ہی کا نتیجہ سمجھتا ہوں، کچھ بھی ہو، کہنا یہ جانتا ہوں کہ پور قاضی کے شیعوں کی ماتمی مجلس میں آپ کی شرکت اور اسی مجلس میں علوے کا قبول فرمانا ایک ایسا واقعہ تھا کہ پور قاضی کے سنیوں میں معلوم ہونا ہے جس کی وجہ سے کافی کھل بلی مچ گئی۔ عام سنی مسلمانوں پر علماء اہل السمیت والجماعت کی وجہ سے اس زمانہ میں قدغن تھا کہ شیعوں کی ماتمی مجالس میں شرکت سے بھی پرہیز کریں اور ان مجالس میں جو چیزیں تقسیم ہوتی ہیں ان کو نہ لیا کریں۔ مولوی طاہر صاحب کی روایت میں ہے کہ حضرت والا سے پوچھنے والوں نے جب پوچھا تو پہلے کچھ اعراض فرمایا گیا۔ لیکن جب زیادہ اصرار اس کی طرف سے بڑھا، تب لکھا ہے کہ واقعہ کو سمجھاتے ہوئے فرمایا گیا کہ ”بھائی اگر کوئی قوی آدمی کھوڑا سا زہر کھا لے تو اس کے حق میں وہ نقصان نہیں کرتا، لیکن اسی زہر کو ضعیف اگر کھا جائے تو مر جائے۔“

اور اسی کے بعد دل کی جو بات تھی اس کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا کہ ان کی مجلس میں شریک ہو کر ”اگر میں نے حلوٰ لیا، اور قبول کر لیا تو ان کی مجلس میں کلمہ حق بھی تو پہنچا دیا۔“

۱۔ حلوہ لینا ثابت ہے۔ کھانا ثابت نہیں، اور ہو بھی نہیں سکتا جو ذرا سے مشتبہ مال سے بھی اجتناب کر لینے کے عادی تھے وہ اس حلوہ کو کیسے کھا سکتے تھے۔ یہ قبول حلوہ محض تبلیغ کلمہ حق کی ضرورت سے کیا گیا گیا۔ جب کہ شیعوں نے کلمہ حق سننے میں قبول حلوہ کی شرط لگا دی تھی۔ یعنی اس کے بغیر وہ کلمہ حق سنا نہیں چاہتے تھے۔ پس حضرت نے اس قبول حلوہ کو ادائے فرض کے مقدمہ کی حیثیت سے گوارا فرمایا۔ محمد طیب غفرلہ

روایت جس طریقہ سے ہم تک پہنچی ہے، اعتماد کی کافی ضمانت اپنے اندر رکھتی ہے اور گو یہ ایک جزئی واقعہ ہے، لیکن تبلیغی فرائض سے صحیح معنوں میں سبک دوشی کی اثر آفریں اور نتیجہ خیز راہ یہی ہو سکتی ہے، اگر شرط اول اس راہ میں یہی ہے، کہ جبہ و دستار کے خود تراشیدہ احترامی و سادس سے دل و دماغ کو پاک کر کے فرض کے حقیقی احساس کو اپنے اندر زندہ اور بیدار کیا جائے۔

ایک مشہور و معروف بزرگ نے لکھنؤ میں فقیر سے ایک دفعہ کہا تھا، ان کی بات یاد آتی ہے، ذکر شیعہ اور سنی مباحثوں اور مناظروں کا ہو رہا تھا۔ اسی آسمان کے ایک نجم ثاقب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ کے اسی فقیر نے مجھ سے پوچھا کہ نصف صدی کی تحریری و تقریری کوششوں کا نتیجہ ان کے کیا ہوا؟ کیا تم نے سنا کہ کوئی شیعہ سنی ہو گیا ہو؟ اپنی معلومات کی حد تک نفی کے سوا غاکسار اور اس کا جواب کیا دے سکتا تھا۔ پھر بعض واقعات اپنے منائے، اور بتایا کہ فلاں فلاں آدمی کٹر شیعہ تھے لیکن تقریر و تحریر کی ہنگامہ آرائیوں کے بغیر محمد اسلم کی صادق اور سچی روح کے پانے میں وہ کامیاب ہو گئے ہیں۔

خود سیدنا الامام الکبیر بھی تقریری و تحریری کاروبار کی لا حاصلی سے واقف تھے۔ اپنی کتاب ہدیۃ الشیعہ میں شاید اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، ایک پہلو افادیت کا سولہویوں کے اس کاروبار کا بھی آپ نے پیدا فرمایا ہے۔ یعنی یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ حقیقی حق طلب تو اس رسالہ کے وہی لوگ ہیں، جو شیعہ عقائد رکھتے ہیں، اور بقول آپ کے یہ سالہ شیعہوں کے لئے

”اگر انصاف کریں تو ذریعہ حصول ایمان ہے“

لیکن اسی کے ساتھ آپ نے لکھا ہے کہ سنیوں کے لئے بھی ان مضامین کو غیر مفید نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ حضرت والا کے الفاظ میں ان کا

”یہ فائدہ ہے، کہ کچھوں کے لئے مفید یقین اور کچھوں کے لئے باعث اطمینان ہے“ ص ۳

اور کوئی شبہ نہیں کہ فائدہ کا یہ پہلو جس کا آئے دن تجربہ ہوتا رہتا ہے، کچھ کم قیمتی نہیں ہے، اسی لئے حضرت والا کی زندگی میں قصبہ پور قاضی کے واقعہ کی مثالیں جہاں ملتی ہیں، وہیں آپ اس کی کوشش بھی فرماتے رہتے تھے کہ ملک اور حکومت کے خاص حالات کے تحت خدمتوں کی دینی زندگی جو شیعی عقائد و اعمال کے جرائم سے مسموم ہو گئی ہے۔ اس زہر کو بھی جس طرح ممکن ہو، نکالا جائے۔

خدمتوں کے تائب ہونے کی مثالیں تو بجز پور قاضی کے اس قصبہ کے اور مجھ تک نہیں پہنچی ہیں لیکن سنیوں میں جو کچھ تھے، ان کے شکوک کو مشاکرتیں کی روشنی پیدا کی گئی، اور جو

لئے اس سلسلہ میں مجھ تک جو واقعہ پہنچا ہے وہ عرض کرتا ہوں۔ مجھ سے حکیم بنیاد علی صاحب مرحوم ساکن لاڈ ضلع میرٹھ نے بیان کیا بعد انہوں نے یہ واقعہ حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ ساکن پھلا دودھ ضلع میرٹھ سے سنا جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص تلامذہ میں ایک زبردست عالم تھے اور آخر میں قوت نسبت و متابعت سے اس دم پر پہنچ گئے تھے کہ چل ڈھال اور انداز گفتار تک حضرت والا جیسا بنا ہو گیا تھا۔ حضرت کے دیکھنے والے بعد سے انہیں دیکھ کر حضرت نانوتوی کا مشرب کرنے لگتے تھے حضرت شیخ البند محمد اشراق اپنے اسلو کے تقریبات میں سے کسی چیزیں ابھ جاتے تھے تو بعض اوقات سفر کر کے پھلا دودھ جاتے اور مولانا عبدالحق صاحب مرحوم سے فرماتے۔ ماتم الحروف کا تائیدی نام "خدمت شیعہ قائم" انہوں نے ہی ایک نظم کے ساتھ لکھ کر بھیجا تھا۔ جس میں حضرت نانوتوی کے علم داسم تاریخی دونوں کے اجتناب سے کر دیے گئے۔ حضرت مولانا عبدالحق صاحب نے فرمایا کہ جب حضرت نانوتوی درجہ شاہجہانپور کیلئے روانہ ہوئے تو شاہجہان پور کے قریب کسی گاؤں کے چند غریب سنیوں نے دو خمائی شیعوں کے اخراجات میں دے دیے ہمارے بے بس تھے۔ کیونکہ زندہ شیعوں ہی کا تھا، حضرت کو کھانا کھاتے یا آتے حضرت والا اس گاؤں کو اپنا قدم سے عزت بخشیں اور یہیں کچھ چند نصیحت فرمادی۔ تاکہ ہمارے لئے صلاح و نفع اور تقویٰ کا باعث ہو۔ حضرت والا نے بخوشی ان کی دعوت منظور فرمائی جیسا کہ غریبوں کی دعوت و پیشکش بطور رغبت قبول فرماتے کی عادت تھی بعد جاتے یا آتے ہونے اس گاؤں میں مائتے شیعوں میں اس سے کھلی ہچی۔ فکر یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ ان کے وعظ کا اثر شیعوں پر ہو جائے اور شیعہ دباؤ کی تعلیم ٹوٹ جائے تو انہوں نے یہی موقعہ اثرات کی کاٹ کے لئے کھنڈ سے چار شیعہ مجتہد تاریخ مقررہ پر بلائے اور ہر گرام یہ بے پایاں مجلس و عطا میں چاروں کو نوں برے چاروں مجتہد بیٹھ جائیں اور چالیس اعتراضات منتخب کر کے بحث و مناظرہ چاروں پر بانٹ دیئے گئے کہ انٹے و عطا میں اس طرح کئے جائیں کہ اول ظان سمجھ کا مجتہد اس اعتراض کر دیں اور دیکھ

پکے تھے ان کو اطمینان و سکینت کی خنکیوں سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے لئے تو اصلاح منظر نگار و سہارنپور وغیرہ کے قصبات اور دیہات سے مسلمانوں کی دینی زندگی جہاں تک میرا خیال

(بلسلہ صفحہ گذشتہ) اس سے حضرت نہیں، تو دوسرے کو نہ کا اور پھر اسی طرح تیسرے اور چوتھے کو نہ کا۔ اور اس طرح وعظ نہ ہونے دیا جائے۔ ان ہی اعتراض و جواب میں جتنا کر کے وقت ختم کر دیا جائے۔ سب غیبی مدد اور حضرت والا کی کرامت کا حال سنئے کہ حضرت نے وعظ شروع فرمایا۔ جس میں گاؤں کی تمام شیعہ برادری بھی جمع تھی اور وہ وعظ اسی ترتیب سے اعتراضوں کے جواب پر مشتمل شروع ہوا جس ترتیب سے اعتراضات نے کر مجتہدین بیٹھے تھے۔ گویا ترتیب کے مطابق جب کوئی مجتہد اعتراض کرنے کے لئے گردن اٹھاتا تو حضرت اسی اعتراض کو خود نقل کر کے جواب دینا شروع فرماتے۔ یہاں تک کہ وعظ پورے سکون کے ساتھ پورا ہو گیا اور شیعوں کے ان مقررہ شبہات کے مکمل حل سے گاؤں کے شیعہ اس قدر مطمئن اور متشرح ہوئے کہ اکثریت نے توبہ کر لی اور سستی ہو گئے۔

مجتہدین اور نمایاں شیعہ چودہریوں کو اس میں اپنی انتہائی سبکی اور خفت محسوس ہوئی تو انہوں نے حرکت مذہبی کے طور پر اس مشہور منہ کی کوٹھالی اور حضرت والا کے اثرات کا انزال کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ایک نوجوان لڑکے کا فرضی جنازہ بنایا اور حضرت سے آکر عرض کیا کہ حضرت نماز جنازہ آپ پڑھا دیں۔ پھر گرام یہ تھا کہ جب حضرت دتکبیریں کہہ لیں تو صاحب جنازہ اک دم اٹھ کھڑا ہو، اور اس پر حضرت کے ساتھ استہزاؤں تمسخر کیا جائے۔ حضرت والا نے عذرت فرمائی کہ آپ لوگ شیعہ ہیں اور میں سنی۔ اصول نماز الگ الگ ہیں۔ آپ کے جنازہ کی نماز مجھ سے پڑھوانے میں جائز تکب ہوئی؟ شیعوں نے کہا کہ حضرت بزرگ ہر قوم کا بزرگ ہی ہوتا ہے۔ آپ تو نماز پڑھا ہی دیں۔ حضرت نے ان کے اصرار پر منظور فرمالیا۔ اور جنازہ پر پہنچ گئے۔ مجمع تھا۔ حضرت ایک طرف کھڑے ہوئے تھے کہ چہرہ پر غصہ کے آثار دیکھے گئے۔ آنکھیں سرخ تھیں اور انقباض چہرہ سے ظاہر تھا۔ نماز کے لئے عرض کیا گیا تو آگے بڑھے اور نماز مشہور کی۔ دو تکبیریں کہنے پر جب طے شدہ کے مطابق جنازہ میں حرکت نہ ہوئی تو پیچھے سے کسی نے ”ہو غھ“ کے ساتھ صاحب جنازہ کو اٹھ کھڑے ہونے کی سنسکار دی۔ مگر وہ نہ اٹھا۔ حضرت نے تکبیرات اربعہ پوری کر کے اسی حصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ ”اب یہ قیامت کی صبح سے پہلے نہیں اٹھ سکتا۔“ دیکھ کر گینا تو مردہ تھا۔ شیعوں میں رونائیں پڑ گئیں اور بجائے حضرت والا کی سبکی کے خود ان کی سبکی اور سبکی ہی نہیں سبکی موت آگئی۔ اس کرامت کو دیکھ کر باقی ماندہ شیعوں میں سے بھی بہت سے تائب ہو کر مسلمان ہو گئے۔

محمد طیب غفرلہ

ہے، زندہ شہادت کی حیثیت سے پیش ہو سکتی ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ مغل حکومت کے آخری دور میں بارہہ کے جن سادات نے کنگ میکر (بادشاہ گری) ہونے کی حیثیت حاصل کر لی تھی وہ اسی اطراف و جوانب کے رہنے والے تھے جن کا اثر پھیلنا قدرتی تھا۔ ان کے سوا دوسرے اسباب بھی تھے، کہ اور تو اور ضلع سہارنپور کا یہی قصبہ دیوبند جو آج سنیوں کا سارے ہندوستان میں مادی و ملجی بنا ہوا ہے۔ کسی موقع پر میر شاہ خان مرحوم کی اس اطلاع کا ذکر کر چکا ہوں کہ میرٹھ یا پور گلاوٹھی بلند شہر کے ساتھ ساتھ وہی کہتے تھے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ

”دیوبند میں بھی سب تفصیلی تھے“ ملا ارواح ثلاثہ

اسی موقع پر اگرچہ خاں صاحب کا یہ بیان بھی درج ہے کہ حضرت سید شہید کی کوششوں سے ابتداً اس علاقے کے مسلمانوں کے تفصیلی رجحانات کے ازالہ میں غیر معمولی کامیابی ہوئی، لیکن صدیوں سے لوگوں میں جو ہر سرایت کئے ہوئے تھا۔ اسی کا کلی استیصال ظاہر ہے کہ اچانک نہیں ہو سکتا تھا۔ سیدنا امام الکبیر جن دنوں میں دیوبند کو وطن بنا کر یہاں مقیم ہو چکے تھے۔ اسی زمانہ کے ایک واقعہ کا ذکر لوگ کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند کے اچھے اچھے ممتاز گھرانوں میں تفصیل کا اثر موجود تھا، بلکہ سوانح محظوظ کے مصنف

لیکن جہاں ان کنگ میکر نے شیعیت کو اپنے اثر و اقتدار سے رواج دیا، وہاں حضرت والا کی تاثیر قوت خود ان کنگ میکر پر بھی اپنا کام کر گئی۔ ان سادات بارہہ میں سے خانجہاں پور۔ رتھیری۔ اور منصور پور کے خاندان حضرت ہی کے ہاتھ پر تائب ہوئے، اور سستی بنے اور اس قدر گردیدہ اور محب بن گئے کہ ان کی دیوبند کی آمد و رفت مثل اہل بیت کی آمد و رفت کے ہو گئی ہے۔ احقر کے یہاں جب پہلی لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام فاطمہ ہے (سکھیا) تو سید نور الحسن صاحب ٹرس رتھیری اُس کے لئے کپڑوں کے جوڑے اور چمکانہ زیور اسی انداز سے بنا کر لائے، جیسے اپنے خاندان میں کسی قریبی عزیز کے یہاں ولادت ہونے پر یہ چیزیں لائی جاتی ہیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مالٹہ جاتے وقت اپنے قبیلہ اور خاندان کو ہدایت فرما کر گئے تھے کہ مشکلات کے وقت مولوی سید محمد نبیہ صاحب رئیس خان جہان پور کی طرف رجوع کریں۔ یہ خاندان مجدد اللہ کے شتی اور دیاستوں کے باوجود نہایت متدین اور متشرع ہیں۔

محمد طیب غفر

نے بجائے تفصیل کے لکھا ہے کہ

”مادہ فرض کا غالب تھا“ ۳

اسی وجہ سے آپ کے زمانہ میں بلکہ آپ کے ساتھ کش مکش کی صورت اسی دیوبند میں جو پیش آئی وہ سننے کے قابل ہے، اس کا ذکر سوانح مخفیہ کے مصنف نے بھی کیا ہے۔ تفصیل اس واقعہ کی مولانا محمد طیب الشفیع کے مراسلہ سے معلوم ہوئی۔

واقعہ یہ ہے، یاد ہوگا کہ دیوبند میں سیدنا الامام الکریم کے گھر کی عام ضرورتوں کی سربراہی کا تعلق دیوان جی محمد حسین صاحب سے تھا، حضرت والا کے فرائضوں میں تھے، ان ہی کا قصہ ہے کہ مرید ہونے کی خواہش سیدنا الامام الکریم سے ظاہر کی۔ لیکن آپ نے حضرت گنٹوہی سے مرید ہو جانے کا حکم دیا۔ اسی وقت گنٹوہ جاکر حکم کی تعمیل کر کے سیدنا الامام الکریم کی خدمت میں حاضر ہو کر پھر مستدعی ہونے کہ اب تو مجھے اپنا مرید بنا لیا جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم تو مرید ہو چکے، بولے مرید کہاں ہوا۔ صرف آپ کے حکم کی تعمیل کی سعادت سے سرفراز ہوا ہوں۔ عرض کا یہ طریقہ تھا

۱۔ دیوان جی کے کچھ حالات کا ذکر پہلے کر چکا ہوں دریافت کرنے پر مولانا محمد طیب صاحب نے یہ اطلاع دی ہے کہ حسین نام کے دو صاحبوں کا خصوصی تعلق سیدنا الامام الکریم سے تھا، جن میں ایک تو یہی دیوان جی دیوبند کے رہنے والے تھے اور بقول مولانا طیب صاحب دیوبند میں حضرت والا کی خانگی اور ذاتی امور کا تعلق ان ہی سے تھا، لکھا ہے کہ صاحب نسبت بزرگ تھے۔ اپنے زمانہ مکان کے حجرے میں ذکر کرتے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانہ میں کشفی حالت دیوان جی کی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ باہر مڑ کر رائے جانے والے نظر آتے رہتے تھے۔ در دیوار کا حجاب ان کے درمیان ذکر کے وقت باقی نہیں رہتا تھا، ان ہی دیوان جی کے ایک مکافضہ کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے بھی بیان کیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ مشائی عالم میں ان پر متکشف ہوا کہ دارالعلوم کے چاروں طرف ایک سرسرخ ڈھیر آتا ہوا ہے، اپنے اس کشفی مشاہدہ کی تعبیر خود یہ کیا کرتے تھے کہ نصرائیت اور مجدد آزادی کے آثار ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم میں نمایاں ہوں گے۔ دارالعلوم کے کتب خانہ کے سب سے پہلے غور بھی یہی دیوان جی تھے۔ بقول مولانا حبیب الرحمن دارالعلوم کا یہ وہ زمانہ تھا کہ دربان سے لیکر مہتمم تک سب صاحب نسبت تھے۔ دیوان جی ٹپے تو نوش کے آدمی تھے۔ سیدنا الامام الکریم مجلس میں باہر سے آنے والوں کو اکثر یہ دھوکا ہوتا کہ یہی حضرت نانوتوی ہیں۔ دوسرے صاحب سی نام کے نانوتہ کے رہنے والے تھے۔ اور عجیب بات ہے کہ جب تک توطن کا تعلق نانوتہ سے محض کارہاں کا ہونا کے تمام خانگی کاموں کے متعلق ہی تھے۔

ایسا تھا کہ منظوری کے سوا دوسری صورت ہی کیا ہو سکتی تھی۔

بہر حال قصہ ان ہی دیوبند کے حاجی محمد حسین دیوان جی کا ہے، شمار اُن کا دیوبند کے سربراہ شیوخ میں تھا، مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ اُن کے نانیہالی رشتہ داروں میں تھے۔ مگر خاندان میں دیوان جی کے جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ

”ان کے ہاں کی تعزیرہ داری مشہور تھی“ ص ۲۲

اور خاندان پر جب رفض کارنگ چڑھا ہوا تھا تو تعزیرہ داری نہ ہونے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی بہر حال سیدنا الامام الکبیر کے فیض صحبت کی اثر پذیری نے اس فیصلہ پر جب دیوان جی کو مجبور کیا کہ اپنے اقتدار داری دائرے میں تعزیرہ داری کی رسم کو ختم کر کے رہوں گا، تو دیوبند کی تاریخ کا وہ ایک اہم واقعہ بن گیا۔ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

”محل کی مسجد جس میں آج کل مولانا حسین احمد صدر دارالعلوم دیوبند پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں۔“

یہی مسجد دیوان جی کے محلہ کی مسجد تھی۔ تعزیرہ اس مسجد میں بھی رکھا جاتا تھا اور محرم میں اسی مسجد سے وہ تعزیرہ اٹھتا تھا، مولانا طیب صاحب نے اطلاع دی ہے کہ

”اٹھانے والے سنی ہوتے تھے، کچھ شیعہ گھرانے بھی اس جگہ تھے“

دیوان جی نے سب سے پہلے اپنے محلہ کی اسی مسجد کو تعزیرہ کے قصہ سے پاک کرنے کا ارادہ کیا اور مردایت مولانا طیب صاحب

”اعلان کر دیا کہ اس سال اس مسجد سے تعزیرہ نہیں اٹھے گا“

یہ کوئی معمولی اعلان نہ تھا، دیوبند کی شیعہ آبادی ہی میں نہیں بلکہ تعزیرہ پرست سنیوں میں بھی اس اعلان سے کھلبلی مچ گئی۔ مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ پہلے تو

”اس محلہ کے شیوخ بگڑ گئے، اور کہا کہ سر قلم ہو جائیں گے، مگر تعزیرہ اٹھے گا“

یہ سن کر دیوان جی کی زبان سے بھی بے ساختہ یہ فقرہ نکلا کہ

”اگر گزرا تو میری لاش پر سے گزرے گا“

ادب بندرتج محلہ سے آگے بڑھ کر فتنہ کی آگ سارے قصبہ میں پھیل گئی۔ بقول مولانا طیب صاحب قصبہ دیوبند کی

”شیوخ کی برادری دیوان جی کے خلاف متحد ہو گئی“

ظاہر ہے کہ یہ سمجھنا فتنہ نہ تھا، اس وقت دیوبند کے شیوخ کی برادری میں کافی ہیکڑی والے لوگ تھے۔ استعمال غلط ہو، لیکن اس وقت مسلمانوں کے عزم و ارادہ میں کافی قوت تھی، دیوان جی کے خلاف قصبہ کے شیوخ برادری کے اس اتحاد کو کافی اہمیت حاصل ہو گئی، اندر ہی اندر جو کچھڑی پک رہی تھی، اس کی خبر سیدنا الامام الکبیر تک بھی پہنچی، مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

”حضرت (نانوتوی) کے علم میں جب یہ آیا، اور معلوم ہوا کہ موقعہ پر شہر میں عظیم ترین ہنگامہ بپا ہونے کا خطرہ ہے۔

تو ایک دن جب دیوان جی حضرت والا کی مجلس مبارک میں حاضر تھے، اور بقول مولانا طیب صاحب اسی مجلس میں

”شہر کے اکابر شیوخ اور دوسری برادریوں کے بڑے موجود تھے“

سیدنا الامام الکبیر دیوبند جی کو مخاطب بنا کر فرماتے گئے کہ

”بند خدا اگر ایسا ہی کرنا تھا تو کم از کم مجھ سے ذکر تو کر لیا ہوتا“

یہ بات تو دیوان جی سے کہی گئی، اور اس کے بعد اسی بھری مجلس میں سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے بھی عام اعلان فرمادیا گیا کہ

”لیکن خیر اب اگر ایسا کہہ دیا گیا ہے، تو دوسرا ستر قائم کالگا ہوا ہے“

مطلب یہ تھا کہ اپنی لاش پر دیوان جی نے اعلان کیا تھا کہ تعزیر گزرے گا“ اسی

لاش کے ساتھ دوسری لاش جسے تعزیر لے جانے والے اپنے قدموں کے نیچے پائیں گے وہ محمد قاسم کی لاش ہوگی۔

بھری مجلس کے اس خونی اعلان کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا، وہی سامنے آیا۔ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

”جب یہ جملہ (یعنی قاسم کا سر بھی رگا ہوا ہوگا) شہر میں مشہور ہوا، تو پیشہ درباردیاں متحد ہو کر تیار ہو گئیں، کہ اگر شیوخ نے دیوان محمد حسین صاحب کے ساتھ کوئی نازیبا برتاؤ کیا، تو یہ ساری برادریاں ان شیوخ کے درمقابل ہو جائیں گی۔“

جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں، علاوہ عثمانی شیوخ کے دیوبند کے مسلمانوں کی آبادی مختلف پیشہ مردوں مثلاً پارچہ بانوں، ردغنگروں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ پیشہ وردوں کی یہ ساری برادریاں حضرت دالا سے غیر معمولی عقیدت کا تعلق رکھتی تھیں، یہ سننے کے ساتھ ہی کہ دیوان جی کے سر کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر نے اپنے سر مبارک کو بھی باندھ دیا ہے۔ اس وقت اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس کا اثر ان عقیدت مند مخلص مسلمانوں پر کیا مرتب ہوا ہوگا۔ اود بات کچھ ان ہی پیشہ ور برادریوں تک محدود نہ رہی، بلکہ بقول مولانا طیب صاحب،

”خود شیوخ میں بھی دو گروہ ہو گئے، بڑا گروہ حضرت (نانا تووی) کی حمایت پر تل گیا۔“

ادیوں واقعہ اس رنگ میں لوگوں کے سامنے آگیا کہ مولانا طیب کے بیان کے مطابق،

”گویا پورا شہر ان شیوخ کے مقابلہ کیلئے تیار ہو گیا۔“

یوں بجائے ایک سر کے دیوان جی کے سر کے ساتھ دیکھا گیا کہ بے شمار سر لگے ہوئے ہیں، یہ صورت حال ہی ایسی تھی کہ اگر مولانا طیب صاحب یہ خبر نہ بھی دیتے کہ

”اس ایک جملہ ہی سے معاملہ ختم ہو گیا۔“

تو خود بخود اسی نتیجہ تک عقل بھی پہنچتی، سارے شہر کے مسلمانوں سے مقابلہ کی ہمت
آخر مخالفوں کا گردہ کیسے کر سکتا تھا، یوں ایک بڑے فرستہ کا بھی قلع قمع ہو گیا، باہمی
خون ریزی سے دیوبند والے بچ گئے، اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف
بقول مولانا طیب صاحب

”مسجد محل سے تعزیر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔“

اور جب ایک جگہ سے یہ قدیم رسم اٹھ گئی، تو ان ہی کی روایت ہے کہ

”شہر کی جن سنی مسجدوں میں سے تعزیر اٹھتے تھے وہ سب ختم ہو گئے۔“

سوانح مخطوطہ کے مصنف نے بھی جن کے سامنے یہ سارے قصے گزرے تھے، لکھا ہے کہ

”انہوں نے (دیوان جی نے) اس کا (تعزیر داری کا) استیصال کامل کر دیا ہے۔“

آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو۔“ ص ۲۳

ان کی اسی ہمت مردانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا طیب صاحب نے بھی لکھا ہے کہ،

”یہ واقعہ دیوان جی مرحوم کے حنات میں سے ایک بہترین حسنہ بلکہ سنت حسنہ

شامت ہوا۔“

کوئی شبہ نہیں کہ دیوان جی کی ہمت مردانہ یقیناً مستحق تحسین و آفریں ہے۔ لیکن طوطی کے ساتھ
آئینہ کے پیچھے چھپے ہوئے سکھانے والے استاد پر جب نظر پڑتی ہے، تو یہی کہنا پڑتا
ہے، کہ طوطی کی ساری گفتگو طوطی کی نہیں، بلکہ اس کی تھی، جو آئینہ کے پیچھے بیٹھ کر گفتگو
کر رہا تھا،

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند انچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

خلاصہ یہ ہے کہ شیعہ عقائد سے تائب ہو کر جو واقعی شیعہ تھے، وہ سنی ہوئے یا نہ ہوئے

لیکن سنیوں میں جو کچے تھے، ان کے پکے بننے میں اور جو پکے تھے ان کو زیادہ پختہ بنانے
میں سیدنا امام الکبیر کی طرف سے جو عملی اقدامات ہوتے رہے، ان کا اندازہ اسی قسم کی

مثالوں سے ہوتا ہے۔ گویا خانوادہ دلی الہی کی ساری محوری خدمات کو آگے بڑھانے اور ان کے دائرے کی وسعت میں ممکنہ حد تک جتنا آپ کے بس میں تھا، آخر عمر تک جدوجہد، سعی و کوشش کا سلسلہ آپ کی طرف سے مسلسل جاری رہا، اور قلب و قالب دونوں کو حساب سے اسلامی دین کو آلائشوں سے پاک کر کے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں نے مسلمانان ہند کے آگے پیش کیا تھا، عملاً و تقریراً و تحریراً اسی کی طرف آپ تمام مسلمانوں کو بھی دعوت دیتے رہے، اور درس و بیعت کی راہ سے چند چیدہ و برگزیدہ نفوس عالیہ کی تربیت و تعلیم خاص توجہ سے فرمائی، جو آپ کے بعد اسی نصب العین کے زیر اثر کام کرتے رہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ غیب سے کچھ اسباب بھی ایسے پیش آتے رہے، کہ جتنا زیادہ حسن قبول دلی الہی نصب العین کو ستیدنا الامام الکبیر کے ذریعہ سے حاصل ہوا، شاید یہ کیفیت ازل ہی سے آپ کے لئے مقدر تھی، بیوہ عورتوں کے عقد کا مسئلہ ہو، یا سنت و بدعت، تقلیدیت و غیر تقلیدیت، تصوف و تہذیب، تشیع و تسنن وغیرہ کے قعے ہوں، ان سارے مسائل میں دلی الہی مسلک اور نقطہ نظر کو ہند گیر عمویت جیسی آپ کی بدولت بیسر آئی، بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کام قدرت نے آپ ہی کی ذات بابرکات سے لیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دینی زندگی کے دلی الہی رنگ کا نام ہی اب دیوبندیت ہو گیا ہے، جو سچ پوچھئے تو "قاسمیت" ہی کے لفظ کی دوسری تعبیر ہے، رحمۃ اللہ علیہ و نور اللہ ضریحہ و اللہم اذقنا اتباعہ و احشرنا فی ذمۃ احبائہ آمین۔



”دفاعی اقدامات“

سیدنا الامام الکبیر کی مذکورہ بالا اصلاحی خدمات جن کا تعلق خود مسلمانوں اور ان کے مختلف طبقات کی دینی زندگی سے تھا۔ ان خدمات میں آپ کب سے مشغول ہوئے؟ صحیح طور پر اس کا متعین کرنا دشوار ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ دین کا علم حق و باطل راست و نارا راست کی امتیازی قوت جیسے جیسے نشوونما پاتی جاتی تھی، اس قوت کے اقتضائوں کی تعمیل و تکمیل کا ذوق بھی بڑھتا چلا گیا، اپنی موردی جائیداد کی تقسیم پر نظر ثانی غالباً اس راہ میں آپ کا پہلا نمایاں قدم تھا، گویا خود اپنے نفس سے چاہئے تو کہہ سکتے ہیں کہ اصلاح کی ابتدا ہوئی۔ اور عقد بیوگان کے مسئلہ کی نوعیت سمجھنا چاہئے،

وَاللَّهُ عَشِيرَتُكَ الْأَقْرَبِينَ | (اے پیغمبر! اپنے قریب کے رشتہ داروں کو (عذراۃ الہی) سے ڈراؤ۔

کے ربانی فرمان کی تمثیلی شکل تھی، بہت درج یوں ہی دائرے میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی، تاہن کہ سنیوں کے بعد اپنے احاطہ میں شیعوں کو بھی اس نے سمیٹ لیا۔ آپ نے جن بزرگوں سے تعلیم پائی تھی۔ خصوصاً حضرت مولانا ملوک العلی صاحب اپنے زمانہ میں خانوادہ دلی الہی کے دلی میں واحد نمائندہ تھے، ان کے علمی و عملی رجحانات سے آپ کا متاثر ہونا ایک قدرتی بات تھی، مصنف امام کے حوالے سے یہ بات گذر چکی ہے کہ عقد بیوگان کی مواعظ پذیری میں مولانا ملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی کافی حصہ تھا، لکھا تھا کہ

”والد مرحوم نے (یعنی مولانا ملوک علی نے)، اس کا (عقد بیوگان کا) نہایت خوبصورتی

سے اجرا فرمایا“ مل

ان کے ساتھ مولانا مظفر حسین کا ندھلوی کی کوششوں کا ذکر کر کے مصنف امام نے یہ

ارقام فرما کر کہ

”ان دونوں بزرگواروں کے قدم بقدم حضرت مولانا (ٹائٹلوی) نے اس کو پورا

شارع کیا“ ص ۲۱

خود اس سے بھی اسی کی تصدیق ہوتی ہے کہ علم کے ساتھ اپنے استاد مولانا ملوک العلی کے عملی ذوق سے بھی سیدنا الامام الکبیر غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ اسو اس کے سچی بات یہی ہے کہ آنکھیں حضرت والا نے جس ماحول میں کھولی تھیں، یہ سارا ماحول ہی حضرت مشاہد دلی اندادان کے جانشینوں کے اصلاحی ہنگاموں سے اس زمانہ میں گونج رہا تھا حضرت مولانا سید احمد شہید بریلوی، مولانا اسماعیل شہید ادان بزرگوں کا جو تعلق حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے تھا، خود سید شہید کی نانوتہ میں تشریف آوری، یہ اور اسی قسم کی بے شمار چیزوں کا ذکر ابتدائی تہذیب میں بھی اورد دوسرے مقامات پر بھی گذر چکا ہے۔ ان معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کیسے بتایا جاسکتا ہے کہ اپنی زندگی کی کس منتر میں اصلاحی کاروبار کے اس سلسلہ کی باگ سیدنا الامام الکبیر کے مبارک ہاتھوں میں آئی۔ بلکہ یہی سمجھنا چاہئے کہ ان امور سے دلچسپی لینے کی صلاحیت جب سے آپ میں پیدا ہوئی، اس میں مشغول ہو گئے اور جب تک زندہ رہے، اس راہ میں جو کچھ کر سکتے تھے کرتے رہے۔ آفتاب کے متعلق یہ سوال ہی بے معنی ہے کہ کب سے چمکنے لگا۔ اور کب تک چمکتا رہا۔ آفتاب نام ہی اس کا ہے جو نور روشن ہو اور دوسروں کو روشنی تقسیم کر رہا ہے۔

لیکن آپ کی ان ”داخلی خدمات“ جن کے متعلق پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر قدس اللہ سرہ کے ساتھ اقبیازی خصوصیت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا، آپ کے ساتھ دوسرے اہل علم و دین کا بھی، ان خدمات میں کافی حصہ ہے، جن میں خود آپ کے وفاء و خصلت صاحب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہے،

لیکن ”داخلی خدمات“ کے مقابلہ میں ”دفاعی اقدامات“ کے زیر عنوان سیدنا الامام الکبیر کی جن مخلصانہ مساعی، اور سرفروشانہ مجاہدات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں، یہ عجیب بات ہے کہ عمر کی منزل

جس میں داخل ہونے کے بعد کام لینے والے آپ سے یہ مہات انجام دلانے بہ شکل
 بیس تیس سال سے زیادہ مدت کی نہیں ہوتی۔ اسی محدود مدت میں حالات ہی کچھ ایسے پیش
 آئے کہ پے در پے، یکے بعد دیگرے، ایسے مہات کی سرانجامی کے لئے قدرت کی طرف
 سے آپ کا انتخاب ہوا، جن کے آثار و نتائج، ثمرات و برکات سے نہیں کہا جاسکتا کہ مستقبل کی
 کتنی صدیاں متاثر و مستفید ہوتی رہیں گی۔

تاریخ ہند میں شہہء کے ہنگامہ کے نام سے جو واقعہ مشہور ہے، کہنے والے اسی ہنگامہ
 کو غدر کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں، اور کچھ دنوں سے آزادی کی پہلی جدوجہد کے عنوان
 سے بھی اب لوگ اس کا چرچا کرنے لگے ہیں۔ حساب سے سیدنا الامام الکبیر کی عمر اس وقت
 ۳۷- اور ۳۸ سال کے درمیان ہونی چاہئے، جیسا کہ معلوم ہے کہ ایک کم پچاس یعنی ۴۹
 سال کی عمر میں پیامِ حیات آپ کا لبریز ہو گیا، اور یہ سارے کارنامے جن کی داستان اب
 سنائی جائے گی، چونکہ ان سب کا تعلق شہہء والے ہنگامہ اور اس کے بعد کے زمانہ سے
 ہے، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ بجائے خود ان کارناموں کی نوعیت کچھ ہی ہو، لیکن مدت اور زمانہ
 جس میں یہ ساری باتیں آپ سے بن آئیں، اور لینے والے نے جو کام آپ سے لیا، وہ یہی دین
 گیارہ سال کی محدود مدت اور محدود زمانہ ہے۔

قبل اس کے کہ کچھ آگے بڑھوں، بے ساختہ اس وقت بھی غل میں اصل کی زندگی کا
 عکس معلوم ہوتا ہے کہ جھانک رہا ہے۔ ۶۳ سال کی زندگی میں وہاں بھی دیکھا گیا تھا کہ
 انسانی تاریخ کے رخ کو پھیر دینے والے واقعات مدنی زندگی کے دس سال کی محدود
 مدت ہی میں پیش آئے تھے۔ گویا اسی دس سال میں قیام قیامت تک اسلام کی بلکہ کہنے
 تو کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے مستقبل کی تاریخ پوشیدہ تھی، صلی اللہ علیہ وسلم کھولنے والے جس
 کی راہ میں اپنا سب کچھ کھوتے ہیں، دیکھ رہے ہیں، کن ماہوں سے وہ کیا کچھ نہیں پاتے۔

علمِ اقتیاری اہل کتبانی امور میں جن کے لئے بیرونی سنت اور اتہارِ محبوب حقیقی کی دولت (باقی اگلے صفحہ)

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کی مقامی حکومت کو ختم کر کے بریڈنی
اقتدار کے سیاسی تسلط کا جو واقعہ اس ملک میں پیش آیا تھا، یعنی انگریزوں کی نئی حکومت اس
ملک میں جو قائم ہو گئی تھی، ان انگریزوں اور ان کی حکومت سے سیدنا الامام الکبیر کے احساسات کا

(گذشتہ صفحہ سے) معذور ہوتی ہے ان کے لئے نگہبانی اور غیر اختیاری امور میں بھی مطابقت و مشابہت کا دروازہ
پہلے ہی سے کھول دیا جاتا ہے، تاکہ ظل اور اصل میں خلطی اور اختیاری تطابق کی سوادت بہم پہنچادی جائے
اور اصل کا پورا پورا عکس ظل میں نمایاں ہو جائے۔ مثلاً تمہید میں حضرت مؤلف سوانح دایم مجید نے نانوتہ کی
جغرافیائی صورت کچھ روضوں کے جھنڈ کے جھنڈ نانوتہ کو ڈھانپنے ہوئے ہیں، مدینۃ النبوی سے مشابہ دکھلائی
ہے۔ دیوبند کی حالت قبل از ورود حضرت والا صاحب سوانح مخطوط نے انتہائی ظلم و جہل کی دکھلائی ہے
جس کا تذکرہ تاسیس مدرسہ دیوبند کے ضمن میں آ رہا ہے، جو شبہ ہے زمانہ جاہلیت کے۔ پھر حضرت
والا کے ورود سے علم و عمل کا ماحول بن جانا اور کمال کی روشنی پھیل جانا دکھلایا ہے جو شبہ ہے طلوع آفتاب
رسالت کے، یہاں حضرت مؤلف سوانح دایم مجید حضرت والا کی مدت اصلاح و تربیت دس سال دکھلا رہے
ہیں جو شبہ ہے مدنی زندگی کے دس سال کے، اور حضرت شیخ المشرق حاجی امداد اللہ صاحب نے
حضرت والا کے ایک خاص قلبی حال (انتہائی ثقل و بوجھ سے زبان کے منون و زنی ہو جانے) پر حضرت والا
کو فرمایا کہ مبارک ہو، حق تعالیٰ آپ کو علوم نبوت سے سرفراز فرمائے گا جو حسب ارشاد حضرت حاجی صاحب
اشبہ ہے ثقل و جی کے، پھر صاحب سوانح مخطوط نے نور نبوت کے زیر سایہ حضرت والا امدان کے تین ساتھیوں
مولانا محمد یعقوب صاحب مولانا رفیع الدین صاحب اور حاجی محمد عابد صاحب کو خلفاء اربعہ سے تشبیہ دیتے
ہوئے دینی اصلاح کے عناصر اربعہ سے تعبیر فرمایا اور لکھا کہ حضرت والا علم و کرم و رحمت و شفقت اور دوزخ و علم میں نسبت
صدیقی سے سرفراز تھے مولانا محمد یعقوب صاحب جلال و شدت میں نسبت فاروقی سے ممتاز تھے مولانا رفیع الدین
صاحب انکسار نفس اور حیا میں نسبت عثمانی سے مشرف تھے اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب قوت فیصلہ اور
اصابت رائے میں نسبت مرتضوی رکھتے تھے، نور نبوت کی تربیت کے زیر سایہ وزیر سرکردگی حضرت والا حق تعالیٰ
نے ان ہی عناصر اربعہ سے تجدید و احیائے دین کا کام اس مدرسہ کے راستہ سے لیا۔ اس طرح حق تعالیٰ نے ظل میں
اصل کا عکس ایک ہی جہت سے نہیں جہات متعددہ کی نمایاں فرمایا جو ثمرہ ہے عالم تکوین میں حضرت والا کے کمال تبلیغ و سنت اور کمال
محبت نبوی کا گویا اختیاری جناب چونکہ آپ کی سرشت میں خلقت و تربیت کر دیا گیا تھا جسے نمایاں ہونا تھا۔ اس لئے نگہبانی طور پر حضرت والا کی
طبیعت فطرت ہی نہیں بلکہ آپ سے متعلقہ زمانہ مکان اور احوال و سوانح نے بھی اصل کو متعلقہ زمانہ مکان اور احوال و سوانح کے عکس انداز
کی مسودت پائی۔ کوئی جاہل یا معاند اس سے مواذ اللہ حضرت والا کیلئے نبوت کائنات یا عبادا با شہر نبوی مسودت نہ سمجھے بلکہ نبوت کی انتہائی
غلامی اور محکومی کی اختیاری اور نگہبانی مشابہت صاف تصنیف کو نصیب ہوئی ہے یہی مسودت نہیں بلکہ انتہائی غلامی اور پیری نبوت کی دلیل ہوئی
محمد طیب عظیمی

جو تعلق تھا، مختلف موقعوں پر اس کا ذکر کرتا چلا آیا ہوں۔ بجائے ٹن کے گھنڈی اور تلمکہ کی استعمال پر زندگی بھر جو اس لئے اصرار کرتا رہا کہ ٹن لگانے کا طریقہ انگریزوں کا رواج دیا ہوا ہے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انگریز اور انگریزیت کے متعلق اس کی نفرت کے جذبات کی شدت کا حال کیا ہوگا۔ اپنی کتاب ہدایت الشیعہ میں ایک موقع پر لوگوں کے طبعی رجحانات کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اور یہ لکھ کر کہ مثلاً غذائیں

”کسی کو میٹھا بھاتا ہے، کسی کو نمکین، کسی کو ایک چیز کی طرف رغبت ہوتی ہے، کسی کو نفرت“

بے ساختہ تمثیل کے لئے آپ کے سامنے جو مثال آئی ہے، وہ یہ ہے،
”انگریزوں کو عطر نفیس سے تنفر، اور مچھلی کے اچار سے جسے سونگھ بھی لیجئے، تو دماغ چھوڑ جان کی خیر نہیں، رغبت“
آگے اسی کے بعد آپ کے الفاظ ہیں۔

”پاخانہ کے کیڑے گندگی میں خیرم دشا، عیش و آرام سے رہیں، اور خوشبو سونگھیں تو مر جائیں“ ص ۸

اور یہ تو خیر معمولی باتیں ہیں، مغل حکومت کے تابوت میں آخری کیل ٹھوکتے ہوئے انگریزوں کی طرف سے اس فیصلہ کا جب اعلان کیا گیا کہ لال قلعہ سے آلی تمیمہ کا آئینہ کسی قسم کا کوئی تعلق باقی نہ رہے گا، اور بہادر شاہ مرحوم کے بعد شاہی خاندان کے لوگوں کو قلعہ سے نکال دیا جائے گا۔ حکم دیا گیا کہ آئینہ مہرولی میں بہادر شاہ کا بیٹا مسکن پذیر ہو۔ یہ فیصلہ ۱۸۵۷ء میں کیا گیا تھا۔ یاد ہوگا، ٹھیک دس سال اسی دہائی کے محلہ کوچہ چیلان کے ایک مکان میں بھٹنگے پر سیدنا امام الکبیر کو جس حال میں پایا گیا تھا، مصنف امام نے اپنے الفاظ میں اس زمانہ کی تصویر آپ کی جو کھینچی ہے۔ یعنی بادیہ جو دشگشتہ مزاج ہونے کے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں ترش رو مغموں رہتے تھے بال بکھرے ہوئے کپڑے میلے کچیلے، جوئیں سر میں بھری ہوئیں، نہ کھانے کی خبر نہ پہننے کی ڈر

کئی کئی دن کی پکی ہوئی خشک روٹیوں کے ٹکڑوں کو پانی میں بھگو بھگو کر چاٹنا، اور پھر اسی جھنگلے پر پڑ رہنا، یہ اور اسی قسم کے دوسرے چشم دید مشاہدات مصنف امام کے جو نقل کر چکا ہوں، نیز اسی کے ساتھ انگریزی حکومت کی بغاوت کا الزام آپ پر مختلف موقعوں پر چولگایا گیا۔ پھر آپ کے بعد انگریزی حکومت کے ساتھ آپ کے تلامذہ اور خلفاء کے تعلق کی اسلئے مسلسل جو نوعیت ہی جس کے دیکھنے والے اور جاننے والے اس وقت بھی موجود ہیں۔ ان ساری باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ سیدنا امام الکبیر کے قلب مبارک میں انگریزوں کی حکومت

۱۵ حضرت اقدس کے تمام تلامذہ میں انگریزوں سے نفرت کا یہ جذبہ قدس ترک کے طور پر پیدا یا جاتا ہے۔ لیکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ چونکہ آپ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، اور آپ کے جذبات کا گہرا رنگ لئے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ حضرت والا کے اس جذبہ نفرت کے بھی منظر نامہ تھے۔ بالمشہ سے دایسی پر جب ترک موالات کا استفتاء حضرت شیخ الہند کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اپنے تین شاگردوں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا امجد حسین احمد صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہم کو جمع کر کے فرمایا کہ یہ فتویٰ آپ لوگ لکھیں۔ ان حضرات نے عرض کیا کہ حضرت آپ کی موجودگی میں ہم کیا لکھیں گے۔ فرمایا کہ مجھ میں انگریزوں سے نفرت کا جذبہ شدت لئے ہوئے ہے۔ مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے کہ حدود کی رعایت ہو سکے گی۔ اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے

وَلَا يَجْرِمَنَّ شَنَاٰنَ قَوْمٍ
اَنْ لَا تَعْدِلُوْا
کسی قوم کی عداوت تمہیں عدل سے
ہٹانے دے۔

اس لئے آپ ہی لوگ لکھیں۔ اس واقعہ سے جہاں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا انتہائی تقویٰ و تدبیر نمایاں ہے، وہیں اس جذبہ کا غلبہ بھی واضح ہے۔ میرے بھائی مولانا محمد طاہر مرحوم نے اس زمانہ میں حضرت سے پوچھا کہ حضرت ان انگریزوں کی کوئی بات (اچھی بھی ہے) فرمایا کہ ہاں ان کے کباب بہت اچھے ہوں گے۔ خود انگریز بھی اسے محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ سر جس میسٹن جو اس زمانہ میں یو۔ پی کے گورنر تھے، ایک موقع پر انہوں نے کہا تھا کہ اگر اس شخص (مولانا محمد حسن) کو جلا کر خاک بھی کر دیا جائے تو وہ بھی اس کو بچے سے نہیں اڑیگی، جس میں کوئی انگریز ہو گا۔ نیز یہ بھی ان ہی کا مقولہ ہے کہ اگر اس شخص کی بوٹی بوٹی کر دی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کی عداوت ٹپکے گی۔ یہ حقیقت وہی سیدنا امام الکبیر کے جذبات تھے جو حضرت شیخ کے دگ وپ میں سرایت کئے ہوئے تھے۔ جب مستعیدین کا یہ حال تھا تو اندازہ کر لیا جائے کہ اصل کا مقام کیا ہو گا۔ محمد طیب غفرلہ

کی طرف سے کس کس قسم کے خیالات پیدا ہوتے رہتے تھے۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ دنیا تو خیر ختم ہی ہو چکی، لے دے کر بچا کچھا سرسید یہ مسلمانوں کی پاس دین کا رہ گیا ہے۔ سو بقول اکبر مرحوم ۵

نئی نئی آنچیں لگ رہی ہیں، یہ قوم بکیں گھل رہی ہے
نہ مغربی ہے نہ مشرقی ہے عجیب سانچے میں ڈھل رہی ہے

خواص ہی نہیں، غدر سے پہلے ہی جیسا کہ سرسید مرحوم نے اپنے رسالہ بغاوت ہند میں لکھا ہے،
”رفتہ رفتہ یہ ذہنیت پہنچ گئی، کہ رعایا ہندوستان کی ہماری گورنمنٹ کو بیٹھے زہر
اور شہد کی چھری، اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی“ ۶ ضمیمہ حیات جاوید

”رعایا ہندوستان“ کے عوام کے تاثرات کے متعلق سرسید مرحوم کی جب یہ شہادت ہے
تو سمجھا جاسکتا ہے کہ حال سے مستقبل کے نتائج تک پہنچنے کی جتنی زیادہ بصیرت جن لوگوں میں
تھی، ان ارباب فکر و نظر کا حال کیا ہوگا، یوں بھی جب یہ سب کچھ دیکھا جا رہا تھا کہ اصلی اور مصنوعی
(یعنی دیسی) پادریوں کا بیڑی دل، ہندوؤں اور مسلمانوں کے دھرم اور دین کے چاٹ جانے
کے لئے ملک کے طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے۔ سرکاری حکام خفیہ اور بسا اوقات علانیہ
بھی، دام سے درم سے قدم سے ان پادریوں کی ہمت افزائیوں میں مشغول و منہمک نظر آ رہے
تھے، مسلمانوں اور ہندوؤں کے دینی پیشواؤں کی تحقیر و توہین کا بازار ہر طرف گرم تھا، دین کے
ان خطرات کے ساتھ ساتھ دنیا کا حال یہ تھا کہ بڑے بڑے راجہ اور والیان ملک نواب اور
رئیس نان شبینہ کے محتاج بن کر گلی کوچوں میں ٹھوکیں کھا رہے تھے۔ عوام کی غربت اس حد
تک پہنچی ہوئی تھی کہ بقول سرسید مرحوم ڈیڑھ آنہ یومیہ یا ڈیڑھ سیر اناج پر ہر ہندوستانی اپنی
گردن کٹوانے پر بخوشی تیار ہو جاتا تھا۔ ۷ ضمیمہ (بغاوت ہند)

یہ اور اسی قسم کے واقعات و حالات جن سے عام طور پر لوگ واقف بھی ہیں اور موقعہ موقعہ
سے اس کتاب کے مقدمہ میں بھی، اصل کتاب میں بھی، ان امور کا تذکرہ کر چکا ہوں۔

اب اسی کے ساتھ جب ہم یہ سنتے ہیں، کہ فوج کی بغاوت عام کے بعد آگے پیچھے ہندوستان کے

مختلف علاقوں کے باشندے ہنگامہ غدر کی آگ میں جیسے کود پڑے تھے، اسی طرح سیدنا الامام الحکیم بھی عملاً اس میں شریک ہو گئے تھے خود بھی شریک ہوئے اور آپ کے پیرو مشد، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ، نیز آپ کے رفیق الدنیاء الآخرۃ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کش مکش میں حصہ لیا، تو بظاہر اس پر کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ دلائل وعلوم دیوبند کے متوسلین عموماً اپنی مجلسوں میں اس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں

واقعات و حالات سے بھی اسی کا پتہ چلتا ہے، اور لکھنے والوں نے جو اس زمانہ میں موجود تھے، انہوں نے بھی لکھا ہے کہ کسی باضابطہ اسکیم، یا لائحہ عمل کے تحت غدر کا یہ ہنگامہ پیش نہیں آیا تھا، اور نہ ہندوستان کی کسی خاص قوم یا کسی خاص طبقہ نے بغاوت کئے، یا آزادی کی جدوجہد کا پروگرام بنایا تھا، بلکہ صحیح یہی ہے کہ ۱۸۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد، ہندوستان کی حکومت کا باضابطہ چارج لینے کا فیصلہ انگریزی قوم نے جب کر لیا اور سو سال کی طویل مدت میں ہندوستان کے باشندوں کو انگریزوں اور انگریزی حکومت کے طور و طریقہ، رنگ و ڈھنگ، کے تجربہ سے ان کے باطنی ارادوں کا پتہ جو کچھ بھی چلا، مجموعی طور پر سب سے ملک کے باشندوں میں بے زاری کے جذبات پرورش پاتے چلے جا رہے تھے، اس عرصہ میں انگریزی حکومت کا دائرہ بھی وسعت کی آخری حد تک پہنچ گیا۔ برہما سے سرحد کا بل و قدح ہار، اور نیپال سے اس کماری تک کا کوئی خطہ ایسا باقی نہ رہا جس پر بالواسطہ یا بلا واسطہ انگریز قابض و خیل نہ ہوں۔ فتوحات کی اس عجیب و غریب وسعت میں بجائے گوردوں کی پلٹن کے ہندوستان کی کالی پلٹن کے اخلاص و جاں نثاری اور بھی خواہی کے (یہی حیرت انگیز تجربات انگریزوں کو ہونے لگے گوری پلٹن کی گراں فوج کے مقابلہ میں کالی پلٹن کی اور زانی پر بھروسہ کر کے ہر فوج میں کالوں کو اکثریت حاصل ہو گئی، حتیٰ نمک جس سے گورے نا آشنا تھے۔ ہندوستانی فوج اسی نمک کی کان انگریزوں کو نظر آئی، دوسری طرف کالی پلٹن اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئی کہ جنگ کے جدید حربی آلات کی جگہ یہ سمجھنے لگی کہ اپنی کثرت تعداد سے انگریزوں کو

ہم لوگوں نے اتنے ممالک فتح کر کے حوالہ کر دیے ہیں، اور تو کچھ نہیں لیکن اس احساس نے کالی پلٹن کے نازخروں کے سمندر پر تازیانہ کا کام کیا۔ کالی پلٹن کا یہ بھی ایک نخرہ تھا کہ چربی ملے ہوئے کارتوس کو دانتوں سے نہیں کاٹیں گے۔ وہ تو خریداروں پر اپنا ناز دکھا رہے تھے، لیکن تقدیر نے اسی ناز کو ناز بنادیا۔ انگریز کچھ اڑ گئے، غرور تو کالوں کے دماغ میں بھر ہی گیا تھا، اٹھ کھڑے ہوئے، اور وہی ہندوستانی فوج جو خود مٹا یعنی بیچ پی کر اپنے گورے افسروں کو چادل کھلانے پر اصرار کرتی تھی، انگریزوں ہی کو نہیں، بلکہ ان کے بچوں، اور ان کی عورتوں کو اس طریقہ سے قتل کرنے لگی، کہ گویا وہ انسان نہ تھے۔ فوج جب باغی ہو گئی، تو ملک کے عام باشندے جو سو سال کے اس عرصہ میں انگریزی حکومت سے تنگ آچکے تھے۔ ان کے سامنے بھی نجات کی ایک صورت آگئی، مختلف علاقوں کے برباد اور تباہ ہوئے والے خاندانوں میں بھی کچھ ابال آیا، کچھ غنڈوں، شہدوں کو بھی لوٹ مار کا موقع مل گیا، یوں مل ملا کر وہ صورت پیش آئی، جسے چاہے آپ غدر و بغاوت کہئے، چاہے اس کا نام آزادی کی جدوجہد رکھ دیجئے۔ اس میں ہندو مسلمان اور دونوں قوموں کے چھوٹے بڑے عوام و خواص سب ہی طرح کے لوگ شریک تھے لیکن بایں ہمہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جیسے پہلے کوئی لائحہ عمل لوگوں کے سامنے نہ تھا، بعد کو بھی ضبط و نظم کے قائم کرنے کا عام طور پر نہ لوگوں کو خیال ہی ہوا، اور وقتی طور پر کہیں کچھ کیا بھی گیا تو حد سے زیادہ بے جان مضحل، گستہ و شکستہ تھا۔

جب سب سے بڑے مرکز، جسے فوجیوں نے بھی سب سے بڑا مرکز بنایا تھا۔ یعنی دہلی یہاں کا نظم و ضبط جس کے دل و دماغ کے سپرد کیا گیا تھا۔ یعنی سراج الدین ظفر شاہ مرحوم سید احمد خاں ان کے دربار کے خطاب یافتہ درباری آدمی تھے، میں نہیں سمجھتا ہوں کہ یہ الفاظ ظفر شاہ کے متعلق ان کے قلم سے جو نکلے ہیں، بے بنیاد ہیں، لکھتے ہیں کہ

”ہمیشہ خیال کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بن کر اڑ جاتا ہوں، اور لوگوں کے ملکوں کی خبر لے آتا ہوں، اور اس بات کو اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا، اور درباریوں سے

تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے۔“ ص ۱۶

یہی نہیں بلکہ وہی یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

”لوگ اس کے (ظفر شاہ) کے مرید ہوتے تھے، کسی فائدہ کی نظر سے: بطور اعتقاد“

۱۵ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی اہلبانہ معصومیت اس زمانہ میں سلاطین اور حکمرانوں کے کمالات میں شمار ہوتی تھی، خاکسار ٹونک میں جب پڑھتا تھا تو ریاست کے والی مرحوم ابراہیم علی خاں خلیل کے متعلق بار بار اپنے استاد مولانا برکات احمد صاحب کی زبانی اس قسم کی باتیں سن کرتا تھا کہ بیٹھے بیٹھے نواب صاحب کو خیال ہو جاتا تھا کہ نگاہوں سے لوگوں کے پوشیدہ ہو گئے۔ دربار والے جو تار جاتے تھے کہ اس وقت نواب صاحب اپنے غائب ہونے کے مایخو گیا میں لگن ہیں، ایک دوسرے سے اشاروں اشاروں میں پوچھتے کہ سرکار کیا ہوئے۔ دوسرا تعجب سے سر نہلاتا کہ خدا جانے کیا ہوئے۔ چند لمحہ بعد پھر نواب صاحب کا مکون کے بعد برافز ہوتا اور درباری کہتے کہ سرکار کے ساتھ کیا صورت پیش آئی، پوچھتے کہ کیا ہوا، تب درباری باور کراتے کہ گدی سے اچانک حضور ناپید ہو گئے، سرکار کو جواب دیتے کہ ان باتوں کا عوام سے چرچا نہ کرنا، حیدر آباد کے نواب افضل الدولہ مرحوم جو غدر کے زمانہ میں حیدر آباد کے حکمران تھے، سننا ہے کہ شکار میں حیدر آباد سے دو تین میل نکل جانے کے بعد کہتے کہ تم لوگ مجھے کہاں لئے جا رہے ہو۔ میں اپنے ملک سے باہر نہ جاؤں گا۔ لوگ کہتے کہ سرکار بھی تو سیکڑوں میل تک آپ کا علاقہ ہے۔ تب بگڑ کر فرماتے کہ تم مجھے دھوکہ دے کر انگریزوں کے علاقہ میں داخل کر دینا چاہتے ہو۔ مرشد آباد کی مسند پر سراج الدولہ کے قتل ہو جانے کے بعد انگریزوں نے نجم الدولہ نامی خاندان کے کسی فرد کو بٹھایا۔ معاہدہ یہ طے پایا کہ بنگال بہار اڑیسہ تینوں صوبوں میں حکمرانی کا اقتدار انگریزوں کو حاصل ہو گا اور نجم الدولہ کو سالانہ پچاس لاکھ روپے بطور وظیفہ دیئے جائیں گے شہر لاہور ڈکلاؤ جس سے یہ معاہدہ طے ہوا تھا، اس نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ نجم الدولہ اس معاہدہ سے بہت مسرور تھا اور رخصت کے وقت کہنے لگا کہ خوب ہوا اب تو جتنے چاہیں گے محل بنائیں گے (تاریخ راجہ شیو پرشاد سنگھ) نو عمر لڑکے تھے یہ حکمرانوں کو محال کر تحت پر قبضہ کرنے کے لئے عموماً اس زمانہ میں بے حیاں نظر آتے ہیں یہی بنگال کا سراج الدولہ جو ۲۲ سال کی عمر میں قتل ہی ہو گیا، اپنے حقیقی نانا علی وردی خان ناظم بنگال جس نے تنیم ہو جانے کی وجہ سے سراج الدولہ کو لڑکے کی طرح پالا تھا اور اپنے بعد باخدا بلطولی عہد بھی بنایا تھا لیکن سراج الدولہ کی عمر غالباً پندرہ سولہ کی ہو گئی کہ مرشد آباد سے بھاگ کر ٹیٹہ عظیم آباد آ گیا، اور اپنی خدائی نانا کے مقابلہ میں اعلان جنگ دے کر کھڑا ہو گیا۔ حضرت آصف جاہ دکن دکن کے وزیر اعظم ہو کر دکن سے تشریف لے گئے۔ دکن میں اپنی جگہ اپنے بیٹے ناصر جنگ کو نائب بنا دیا تھا لیکن وزارت چھوڑ کر پھر اپنے ملک کی طرف جب واپس ہونے لگے تو معلوم ہوا کہ صا جزاء والا تبار فوج لئے مقابلہ میں کھڑی ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

ان مریدوں میں ایک مرزا غالب بھی تھے جو چار شخص نسبتیں بادشاہ سے رکھتے تھے سید صاحب نے لکھا ہے کہ ظفر شاہ کو

”کوئی دلی اور مقدس نہیں سمجھتا تھا“ اس کے منہ پر لوگ اس کی خوشامد کرتے تھے، اور پیٹھ پیچھے ہنستے تھے۔ ص ۲۱

اور چال کچھ اسی غریب ظفر شاہ مرحوم کا نہ تھا، اس زمانہ میں ریاست دامارت کے لوازم میں منجملہ اور باتوں کے اس قسم کی اہلیاں بھی شریک تھیں۔

ایسی صورت میں عوام کے متعلق تو میں نہیں کہتا، لیکن خواص اور خواص میں بھی سیدنا الامام البکیر جیسے فہم و فراست، اور دینی ذمہ داریوں کے محسوس کرنے والی ہستیوں کے متعلق یہ دیکھتے ہوئے کہ آج کل فضل و کمال، بڑائی اور بزرگی کا سب سے بڑا معیار ٹھہرایا گیا ہے کہ سیاسی کاروبار میں سب سے زیادہ حصہ جس نے لیا، وہی سب سے بڑا آدمی ہے، اور دوسرے میدانوں میں خواہ کچھ ہی حال ہو، کسی مقام کا مالک ہو، لیکن سیاست کے میدان کا جو اپنے آپ کو کھلاڑی ثابت نہ کر سکا، وہ کچھ نہیں ہے۔ اسی عام سطحی معیار کو دیکھ کر بے دھڑک یہ مان لینا، کہ غدر کے ہنگامہ میں سیدنا الامام البکیر نے اسی طرح حصہ لیا تھا، جیسے اس ملک کے عام باشندے اس کی آگ میں کود پڑے تھے۔ سیدنا الامام البکیر کی شان ہی کے مطابق اس قسم کا عاجلانہ فیصلہ درست ہو سکتا ہے، اور نہ واقعات ہی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

یہ صحیح ہے جیسا کہ میں عرض کرتا چلا آ رہا ہوں، کہ یہ نئی قائم ہونے والی حکومت مسلسل پتھر اعلانیہ اور خفیہ طرز عمل سے ہندوستان کے باشندوں کو اپنی طرف سے بے زار اور حد سے زیادہ

(گذشتہ صفحہ سے) حضرت آصف جاہ کے بعد نظام علی خاں کوکن کے والی ہوئے۔ ان سے بھی ان کے صاحبزادی عالی جاہ باغی ہو گئے، اور زمانہ ملک ملک کے نظام کو درہم و برہم کرتے رہے۔ لکن میں بھی اسی قسم کی افراتفری پھیلی ہوئی تھی، ان قصوں کو کوئی لکھے تو بڑی کتاب بن سکتی ہے۔ حدیہ ہے کہ سکیموں کی تازہ دم قوم کے اہل کی ذہنیت جیسا کہ رائے شیو پر شاہ نے لکھا ہے یہ ہو گئی تھی کہ انگریزوں کے پیش خوار بن جانے میں بجائے حکمرانی کے ان کو زیادہ ہولت محسوس ہوتی تھی، تاہم تین جہاں ملاحظہ

بے زار بناتی چلی جا رہی تھی۔ جن لوگوں میں بصیرت و دانائی کی روشنی جتنی زیادہ تھی، اسی حد تک نفرت اور بے زاری کے جذبات بھی ان کے شدید تر ہوتے چلے جاتے تھے۔ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس باب میں سیدنا الامام الکبیر کے قلب مبارک کی گرائیاں جیسا کہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے، حد سے گزری ہوئی تھیں مولانا طیب الحنفیہ سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک یادداشت میں لکھا ہے کہ غدر کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی نقاب اتار کر براہ راست انگریزی قوم نے ہندوستان کی حکومت کا جائزہ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور ملکہ وکٹوریہ کو ہندوستان کی قیصر بنا کر دلی میں ملکہ کی تاج پوشی کا جشن منانے کا فیصلہ کر لیا، اس زمانہ میں سیدنا الامام الکبیر کا قیام دہلی میں تھا۔ لیکن جوں ہی کہ اس جشن کے انعقاد کا سامان ہونے لگا، دیکھا گیا، جیسا کہ مولانا طیب صاحب فرماتے ہیں۔

”حضرت نافو تو دہلی سے دیوبند چلے آئے، اور فرمایا کہ مجھ سے انکی (انگریزوں کی) شوکت نہیں دیکھی جاتی، اس لئے دہلی سے دیوبند چلا آیا کہ نہ دیکھوں گا، نہ کوفت ہوگی“ (سیاسی یادداشت ص ۷)

ظاہر ہے کہ کسی قوم اور حکومت کی طرف سے دل گرفتگی کی یہ آخری شکل ہو سکتی ہے لیکن اسی موقع پر آگے مولانا طیب صاحب کی اس روایت میں ایک اضافہ بھی ہے۔ اسی اضافہ کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں، لکھا ہے کہ

”نیز فرمایا کہ الحمد للہ اتنی طاقت تو ہے کہ سارا دربار درہم برہم کر دوں، مگر سنبھالنے والے نظر نہیں آتے، اس لئے دہلی چھوڑ کر چلا آیا، کہ نہ ان کا کردار دیکھوں گا، نہ کوفت و سوخت ہوگی“ ص ۷

حضرت والا کی طرف جس دعوے کو اس اطلاع میں منسوب کیا گیا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ دربار کے درہم برہم کر دینے کے جس امکان اور طاقت کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کیا دعا و ہمت کی روحانی اور باطنی قوت کے امکانات کی طرف اس دعوے میں اشارہ کیا گیا ہے؟

بطاہر اول دہلہ میں ممکن ہے ذہن اسی کی طرف منتقل ہو جائے۔ لیکن اس راہ میں اثر اور رسوخ
الکبیر کے ستر و اخفا کی غیر معمولی کوششوں سے جو واقف ہیں، اگر سوچیں گے، تو یقیناً ان حب
عجب نہیں تو یہ بات خلاف دستور ضرور معلوم ہوگی، جہاں تک میں جانتا ہوں یا دوسروں سے
سنا ہے، ناگزیر مجبوری کے بغیر اپنی زندگی کے اس باطنی پہلو کی ہوا بھی چاہتے تھے، کہ
کسی کو نہ لگنے پائے۔

اسی لئے میں تو سمجھتا ہوں کہ اپنے رسالہ اسباب بغاوت ہند میں سرسید مرحوم نے
انگریزوں کے دور از کار دوسو سوں کا ازالہ کرتے ہوئے اپنی اس رائے کا جو اظہار کیا ہے، کہ
”میری رائے میں کبھی مسلمانوں کے خیال میں بھی نہیں آیا، کہ باہم متفق ہو کر غیر مذہب
کے جاکوں پر جہاد کریں“

بلکہ فوج کے متعلق بھی اپنا ذاتی احساس انہوں نے ظاہر کیا ہے۔

”فوج میں بھی ہرگز مشورہ اور پہلے سے صلاح نہ تھی“

اور وہی جو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ ”جہاد کے فتویٰ“ کے نام سے باغیوں نے جس فتوے کو شہرہ
کیا تھا، اس پر علماء کے دستخط زیادہ تر جعلی تھے۔ حتیٰ کہ وہی لکھتے ہیں کہ

”ایک آدھ مہر ایسے شخص کی چھاپ دی گئی تھی جو قبل غدر مرچکا تھا“ ص ۱۹

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی مستند سوانح عمری تذکرۃ الرشید کے حاشیہ میں جو خبر

۱۷ مئی کے ہنگامہ کا قصہ جب سیدان کا نذرانے سے نکل کر سرکاری تحقیقات کا دن اور کالج کے پروفیسر ڈاکٹر اشادوں
کے سامنے آیا، تو کسی کو اس کی جرئت میں نظر آتی تھی۔ ایک صاحب کو دلی عہد ایران کے خیمہ میں کاغذ مل گیا
تھا، جس میں بیردنی تسلط کے مصائب کو بیان کرتے ہوئے ایرانیوں کو ہندوستان کے حال سے عبرت پذیر ہونے
کی وصیت کی گئی تھی، اسی کا غلط بنیاد بنا کر بعض کہتے تھے کہ سرختمہ بغاوت کا ایران میں تھا، خدا حبائے
ہندوستانیوں نے کسی دبا و غیرہ کے مقابلہ میں بطور ٹوٹکے کے گاؤں گاؤں میں روٹیاں بانٹی تھیں، سمجھا گیا کہ
ان روٹیوں پر بغاوت کا پیغام لکھا ہوا تھا۔ لوگ ان کو چٹ کر چکے تھے۔ یہ چپاتیاں ۱۷ مئی میں تقسیم ہوئی
تھیں، اور بھی طرح طرح کی بدخواہیاں تھیں، جن میں بد توں انگریز مبتلا رہے۔ تفصیل کے لئے غدر کے
طرز کا مطالعہ کیا جائے۔ ۱۲

دی گئی ہے کہ۔

”سنایا گیا ہے کہ ہمارے اکثر دینی حضرات نے اس کارروائی سے منع کیا“۔ ج ۲

یہ یا اسی قسم کی باتیں کتابوں میں جوتی ہیں، ان کو محض وقتی مصلحت اندیشیوں کا نتیجہ قرار دے کر خواہ مخواہ اس پر اصرار کرنا کہ کسی باضابطہ پروگرام کو طے کر کے آزادی کی یہ جدوجہد ہندوستان میں شروع ہوئی تھی، شاید درست نہ ہوگا، بلکہ واقعہ کی صحیح نوعیت وہی معلوم ہوتی ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جنگ پلاسی کے جیت لینے کے بعد سو سال تک انگریزی حکومت کے مسلسل تجربات ہندوستانیوں میں بے نادری کی آگ کو بھڑکاتی چلی جا رہی تھی، ایک اندرونی زخم تھا جو اندر ہی اندر شعوری و غیر شعوری طور پر پکنا چلا جا رہا تھا۔ تاہم ایک ٹھیک سنو سال کے بعد ۱۸۵۷ء میں چربی ملے ہوئے کار تو سوں کا قصہ منہ بن گیا، زخم پھٹ گیا، دبے ہوئے شعلے بھڑک اٹھے، چونکہ کسی باضابطہ نظام کے تحت اقدام نہیں کیا گیا تھا۔ افراتفری پھیل گئی۔ ایک علاقہ کی سن کر دوسرے علاقہ والوں میں تو جہل میں جہل کی کھل ملی جھج گئی، پھر جو کچھ ہونا تھا، ہوا، چاہے اسے نوشتہ تقدیر کہئے، یا زشتی اعمال کا قدرتی نتیجہ قرار دیجئے۔ ایک ہندو مورخ راجیشو پرشاد نے اپنی آنکھوں سے دہلی میں جو کچھ اس نے دیکھا تھا، اور کتابوں میں ”زشتی اعمال“ کی نادری صورت کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ دونوں ہی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ

”یہ سانحہ نادر شاہی سے بھی بڑھ کر ہو گیا“۔ ج ۲

خصوصاً روایت کے جو الفاظ ہیں ان میں بجائے اس باطنی پہلو کے کافی گنجائش اس بات کی بھی

۱۷ مگر عجیب بات ہے کہ نادر ہی بے چارہ اب تک بدنام ہے، یوں بھی تو سوچنا چاہئے کہ قتل عام جو نادر کے حکم سے دہلی میں ہوا، مورخین کا بیان ہے کہ نصف یوم سے آگے نہ بڑھا۔ سیر المتاضرین میں ہے ”چوں نصف روز بجز شرت، نادر شاہ اندائے امان یقیۃ السیف درد او دشگراں دست کو تاہ کردند“ ۱۷۵۷ء لیکن دہلی پر قابض ہو جانے کے بعد ایام غدر میں شیو پرشاد کا بیان ہے کہ ۱۷۵۷ء ۱۷۵۸ء ستمبر ۱۸۵۷ء یعنی چار دن تک مسلسل دہلی کی گلی کو چوں میں قتل عام کا بازار انگریزوں کی طرف سے گرم رہا۔ آدھا دن کے قتل عام اور چار دن کے قتل عام میں خود سوچنا چاہئے کوئی نسبت ہو سکتی ہے ۱۲

ہے کہ اس امکان کو ظاہری اسباب پر محمول کیا جائے۔ سیدنا الامام الکبیر اپنے اثر اور رسوخ کے لحاظ سے جو کچھ کر سکتے تھے، اس کو تو جانے دیجئے۔ اس قسم کے رنگ میں بھنگ جب مشاہدہ بتا رہا ہے کہ معمولی ہم پھینکنے والے ہنگامی دہشت پسند بھی ڈال سکتے تھے، اور لارڈ ہارڈنگ کے ساتھ اسی دہشت جہنم کے موقعہ پر درہی اور برہی کے جس تماشے کو دیکھا گیا تھا، اس کے دیکھنے والے تو اب بھی مل سکتے ہیں۔ یوں بھی اصولاً تعمیر کے مقابلہ میں تخریب کا مسئلہ چنداں دشوار بھی نہیں ہے۔ بلکہ آگے جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

”مگر سنبھالنے والے نظر نہیں آتے“

خود یہ بھی بتا رہا ہے کہ اسباب و علل کے جس عمومی نظام کے تحت دنیا چل رہی ہے۔ سیدنا الامام الکبیر کے سامنے اللہ کی یہی سنت اور قدتی کا فرمائیوں کا یہی عام پہلو تھا، حاصل گویا یہ سمجھنا چاہئے کہ حکومت مسئلہ کے ختم کر دینے یا کم از کم اس کے نظام کو الٹ پلٹ دینے کے امکانات کو پاتے ہوئے بھی، سیدنا الامام الکبیر یہ محسوس فرماتے تھے کہ اس تخریب کے بعد تعمیر کی دشواریوں پر قابو حاصل کرنے کے لئے عام سنت اللہ کی رو سے جن ناگزیر ضمانتوں اور اسباب و شروط کی ضرورت ہے ان سے اس زمانہ کا ماحول خالی اور مغفل نظر آ رہا تھا، اور یہی چیز تھی، جو تخریبی امکانات سے فائدہ اٹھانے میں مزاحم ہو جاتی تھی، ملک اس زمانہ میں جس جال میں تھا، عوام و خواص جس رنگ میں رنگین تھے۔ جس نے حکیمانہ بصیرت کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا ہے، وہ اسی نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے، ظفر شاہ اور اسی عہد کے بعض دوسرے حکمرانوں کے متعلق نوٹ میں جو معلومات درج کی گئی ہیں، کم از کم وہی اس دعوے کی توجیہ کے لئے کافی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مولانا طیب صاحب کی یہ روایت اگر صحیح ہے، اور نہ صحیح ہونے کی بظاہر کوئی وجہ معلوم بھی نہیں ہوتی، تو خود یہی اس بات کی قافی ثبوت ہے، کہ شہداء کے ہنگامہ میں آپ کی شرکت کسی باضابطہ سونچے ہوئے لائحہ عمل کا

نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ شہ ۶ سے پہلے تقریباً سو سال تک انگریزوں کے مقابلہ میں اصحاب علم و دین کی طرف سے جو خاموشی اختیار کی گئی، اور اسی کا یہ جواب کہ دینی ذمہ داریوں کا احساس علماء میں مردہ ہو چکا تھا کچھ عام حالات کے لحاظ سے ممکن ہے کہ کسی حد تک صحیح بھی ہو لیکن اسی زمانہ میں آخر سید شہید مولانا شہید اور ان کے راست باز مخلص رفقاء کی جاں بازیوں کو دیکھتے ہوئے پچھلیت کا دعویٰ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ ان بزرگوں کی جدوجہد کا رخ بھی بجائے انگریز اور انگریزی حکومت کے پنجاب کی سکھ طاقت کی ہی طرف اول سے آخر تک جو پھرا رہا، خود اس واقعہ کی توجیہ، نیز شہ ۶ کے ہنگامہ کے فرد ہو جانے کے بعد مدت تک سکوت اور خاموشی کی فضا جو قائم رہی، اس حال کو دیکھ کر جہاں تک میرا ناچیز خیال ہے یہ عاجلانہ فیصلہ اور بڑی بے باکی کی بات ہوگی کہ ایسا فی زندگی سے عوام کے ساتھ خواص بھی کلیتہً محروم ہو چکے تھے، اور کفر کی نہ ہی لیکن ان میں ہر ایک بخوشی و رضا جاہلیت کی زندگی پر قانع ہو کر بیٹھ گیا تھا، آخر میں پوچھتا ہوں کہ شہ ۶ میں جو کچھ بھی ہوا ہو، لیکن اس طوفان کے اتر جانے کے بعد خود سیدنا الامام الکبیر کی خاموشی اور سکوت

کو کوئی مشبہ نہیں کہ شہ ۶ کا فوجی ہنگامہ اور اس کی خبر پر انگریزوں کے نظام سے تنگ آئے ہوئے ہندوستانیوں کا جگہ جگہ کھڑے ہو جانا ایک وقتی جذبہ تھا جو اپنے اسباب کے لحاظ سے وقتی نہ تھا مگر ہفتہ (ادھ جانے) کے لحاظ سے وقتی تھا۔ لیکن ان بزرگوں کا اس میں کھڑا ہونا کسی وقتی جذبہ اور ہنگامی حرکت کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ ایک سوچے سمجھے لائحہ عمل کا ثمرہ تھا۔ حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کا مشن ہمہ وقت ان بزرگوں کے پیش نظر تھا، اس کے لئے یہ وقت اور وقت کا ہنگامہ انہیں سازگار نظر آیا تو اس متواتر مشن کی روشنی میں میدان میں اتر آئے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمان کہ مدرسہ دیوبند شہ ۶ کی ناکامی کی تلافی کے لئے قائم کیا گیا۔ جیسا کہ آئندہ اس کی تفصیل آئیگی اس کی واضح دلیل ہے کہ کوئی سوچا سمجھا لائحہ عمل تھا۔ جس میں شہ ۶ میں کامیابی نہ ہوئی تو اس کے لئے دوسرا راستہ سوچا گیا، اور بقول حضرت مولف سوانح کہ یہ ہنگامہ اگر اس وقت کی زمین ہند پر ختم ہو گیا تھا تو ان بزرگوں کے دل و دماغ سے ختم نہ ہوا تھا جو برابر مستعد رہے اور آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس ہنگامہ کی ناکامی پر سیدنا الامام الکبیر اور ان کے شیخ اور اس حلقہ کے دوسرے بزرگوں نے ان ایسا ناکامی کو تاڑ لیا تھا۔ ان ہی اسباب کا ازالہ اس دوسری صورت سے کرنا چاہتے تھے، یہ اسکی واضح دلیل ہے، کہ ان حضرات کی اس میں شرکت غیر شعوری یا جذباتی رنگ سے نہ تھی، بلکہ ایک مقصد کی روشنی میں تھی۔ محمد طیب غفرلہ

یقیناً بے معنی اور بلا وجہ نہ تھی۔ خدا جزا خیر دے مولانا طیب صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کو کہ
”مگر سنبھالنے والے نظر نہیں آتے“

ان حقیقت افروز الفاظ پر مشتمل روایت کو بہت سی ذہنی الجھنوں کے سلجھانے کا سامان انہوں
نے مہیا فرمادیا ہے۔

بلکہ سچ تو یہ ہے، کہ مصنف امام نے اسی غدر کے ہنگامہ کے متعلق اس کا ذکر کرتے ہوئے
کہ سرکار میں اس کی مخبری کی گئی تھی، کہ حکومت سے بغادت کے اس قصہ میں وہ بھی شریک
تھے، آگے جو یہ ارقام فرمایا ہے، کہ

”مولانا فسادوں سے کو سوں دوستھے، ملک دمال کے جھگڑے اگر سر رکھتے، تو یہ

صورت ہی کیوں ہوتی، کہیں کے ڈپٹی، یا صدر الصدور ہوتے“ ۱۹

اسی طرح حضرت گنگوہی بھی غدر ہی کے جرموں میں ماخوذ ہوئے تھے اور کچھ دن جیل میں گزارنے کے بعد رہائی
ہوئی تھی، اس واقعہ کی تفصیل کرتے ہوئے، مولوی عاشق الہی صاحب نے حضرت گنگوہی
کی سوانح عمری تذکرۃ الرشید میں مجنسہ ان ہی الفاظ کا تقریباً اعادہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”یہ مکمل پوش، فاقہ کش، نفس کش حضرات فسادوں سے کو سوں دور تھے،

ملک دمال کے جھگڑے اگر سر رکھتے، تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی، کوئی کہیں کا ڈپٹی

اور کوئی کسی جگہ کا صدر الصدور، کچہری کے عالی شان کمرے، اور عدالت کے

وسیع اور اونچی چھتوں والے مکانات کو چھوڑ کر قبر کی تنگی یاد دلانے والوں جبروں

اور کھڑے بوریا کے فرش والے تاریک گوشوں میں کیوں پڑتے“

۶۶ تذکرۃ الرشید

خصوصاً خط کشیدہ الفاظ دونوں حضرات کے ایک ہی ہیں۔ واقعات سے جو واقف ہیں، اور سچ
پوچھنے، تو ان حضرات کی عملی شرکت کا واقعہ کوئی راز و راز خانہ تھا بھی نہیں، ”مخفہا“ میں جو بات
طے ہوئی ہو، اور کی گئی ہو، راز بن کر وہ کیسے رہ جاتی، اسی کا نتیجہ ہے، کہ دونوں حضرات کے

اس بیان کو عموماً لوگ وقتی مصالح کا اقتضا قرار دے کر دل میں سمجھ لیتے ہیں، کہ واقعہ کی تعبیر میں ”توریہ“ کے اس طریقہ کو اختیار کیا گیا ہے جس کی شرعاً و اخلاقاً سمجھا جاتا ہے کہ اجازت ہے، ایک حد تک یہ صحیح بھی ہے، لیکن اگر غور کیجئے، تو واقعہ کی تعبیر کا عام پیرایہ بھی شاید یہی ہو سکتا تھا۔ سب سے زیادہ مستحق توجہ مذکورہ فقرہ میں

”فسادوں“

کا لفظ ہے۔ دونوں حضرات انکار اس کا کر رہے ہیں کہ ”فساد“ کی شرکت سے دونوں حضرات بری تھے۔ آخر قرآن مجید ہی میں جب فرمایا گیا ہے کہ

تلك الدار الاخرة نجعلها للذين لا	یہ دار آخرت ہم ان ہی کیلئے رکھینگے جو زمین میں
یوریدون علوانی الارض ولا فسادا	بگاڑا اور نکبر نہیں کرتے

اور ایک اسی ایک آیت میں کیا آپ قرآن پڑھئے، شروع سے آخر تک تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ایسی آیتیں آپ کو مسلسل ملتی چلی جائیں گی، جن میں زمین پر فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والوں اور ان کے مفسدانہ کاروبار پر زبرد تو بیخ انتہائی سخت اور کثرت لہجوں میں کی گئی ہے۔

پس ایسے بدترین قرآنی جرم، سے براہت کا دعویٰ اگر کیا گیا ہے، تو آپ خود سوچئے، کہ اس کے سوا اور کیا کیا جاتا، اسی لئے بجائے ”توریہ“ کے میرے نزدیک تو واقعہ کے اظہار کا یہ سیدھا سادہ طریقہ ہے، اور یہی سوچنے کی بات ہے، کہ ”فساد“ جس کی نفی کی گئی ہے، اس سے کیا مراد ہے۔ اور شرکت کا واقعہ جو یقیناً واقعہ ہے، اس کی صحیح نوعیت کیا تھی۔ اور اب میں اسی مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے رفقاء حاض نے اس ہم میں یقیناً حصہ لیا تھا۔

اس مسئلہ میں آئندہ جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اس سے پہلے ایک بات سن لی جنہ جن معلومات کی روشنی میں نتیجہ تک پہنچنے اور پہنچانے کی کوشش کروں گا، ان کا بڑا حصہ (یہی)

کتابوں سے ماخوذ ہے جو عموماً درست و خیر، دار و گیر کی اس قیامت کے بعد لکھی گئی ہیں، جسے غدر کے بعد انگریزی قوم کے مجنونانہ انتقامی جذبات نے اس ملک میں برپا کر رکھا تھا۔ ۶

بات پر یاں زبان کھنتی ہے،

صرف شاعری نہیں، بلکہ اس عہد میں واقعہ بھی یہی گزرا تھا۔ اس روح فرسا جہاں گداز حادثہ فاجعہ پر بیس کس سال بھی نہیں گزرنے تھے۔ جب ہمارے مصنف امام نے اپنی کتاب مرتب فرمائی تھی، ان کے بعد مولانا عاشق الہی صاحب مرحوم نے حضرت نگاہی کی سوانح عمری مدون کی، اب فقہ کافی ہو چکا تھا، اسی لئے بہت سی باتیں جو مصنف امام کی کتاب میں مجمل تھیں، مولانا عاشق الہی کی کتاب میں ان کی تفصیل کا موقعہ میسر آیا، سوانح مخطوطہ کے نام سے سیدنا الامام الکبیر کی جس غیر مطبوعہ ناقص سوانح عمری کا ذکر تاجپلا آیا ہوں، صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ مصنف امام سے پہلے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ یا اس کے بعد تصنیف ہوئی۔ تاہم اتنا یقینی ہے کہ بزین و یکش زو و برد، دھر پکر، کچ کھا، کا سلسلہ حکومت کی طرف سے ختم نہیں ہوا تھا، بظاہر اسی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں سرے سے اس واقعہ کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی ہے، صرف ایک موقعہ پر دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کے تذکرے میں

۱۵ سوانح مخطوطہ ۱۲۹۹ھ میں لکھی گئی ہے۔ جبکہ سیدنا الامام الکبیر کی وفات پر ایک سال گزر چکا تھا۔ چنانچہ بناء مدرسہ دیوبند کے سلسلہ میں خود سوانح مخطوطہ سے ہی یہ اقتباس پیش کر لیا ہے۔ جیسا کہ آگے آگے لگا، اور مصنف امام کی سوانح اس سے مقدم ہے جو سیدنا الامام الکبیر کے سن وفات ۱۲۹۹ھ ہی میں لکھی گئی ہے جیسا کہ اس سوانح کے اس قدیم نسخہ کے ٹائٹیل سے معلوم ہوتا ہے، جو مطبع صادق الانوار مجاہدپور میں طبع ہوا، اس نسخہ کے ابتدائی بوسیدہ اور دیدہ اوراق میرے پاس محفوظ ہیں۔

۱۶ جہاں تک احقر کا اندازہ ہے سوانح مخطوطہ میں اس سلسلہ سے خاموشی اختیار نہیں کی گئی۔ بلکہ صراحتاً و کناہاً اس کا تذکرہ بھی ہوا اتفاقاً میں کیا گیا ہے۔ صراحتاً جن اوراق میں حضرت والا کے مجاہدانہ کارناموں اور غر کا ذکر ہے۔ وہ اوراق غائب ہیں۔ مگر فہرست مضامین میں اس کا مستقل عنوان رکھ کر ان اوراق اور اس تذکرہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جسے سکوت نہیں کہا جاسکتا۔ پھر اس اقتباس میں بھی جو حضرت مولف سوانح دام مجدہ نے فرمایا ہے۔ یہ تذکرہ مثل صراحت کے ہے۔ کیونکہ اس اقتباس سے تاسیس مدرسہ کا زمانہ ہندوستان کی اس قیامت کبریٰ کا زمانہ ہے۔ جس میں ہنگامہ شہداء کے پس منظر کے طور پر دار و گیر اور زن و کس کے حوادث رونما تھے، اور جو حضرت مولف سوانح ہی کا بیان آگے آ رہا ہے (سلسلہ بنار دارالعلوم کے سلسلہ میں) باقی انکو صفحہ ۷

یہ لکھتے ہوئے کہ

”یہ وہ زمانہ ہے جس میں ملک ہندوستان میں ایک ہنگامہ سخت برپا ہوا تھا، جس کو عوام الناس غدر کہتے ہیں۔“

ضمناً اتنی بات ان کے قلم سے بھی نکل پڑی ہے۔

”اور یہ وہ معرکہ تھا، جس میں ملک ہندوستان میں شوکت اسلام بالکل زائل ہو گئی تھی، اور مغلیہ سلطنت کے جسم کی جان نکل گئی تھی، اور کارخانہ اسلام کا تہ و بالا ہو گیا تھا۔ مسلمان ہونا ہی جرم ہو گیا تھا۔ اکابر دین کا خاتمہ ہو گیا تھا، ہر مسلمان سرسبز ہال تھا، ہر مومن شکستہ بال تھا۔ ہندوستان میں ایسی گہری اندھیری چھائی تھی۔ نہ میں تجھ نہ تو مجھ کا حال تھا، یا نفسی نفسی کا مقال تھا۔ جتنا جو بڑا تھا، اتنا ہی بڑا اس پر صدر تھا۔ اکثر اکابر دین جنت الفردوس کو سدھارے، اور بعض بعض جو پیچھے اجل سے بچے، اس ملک سے ہجرت فرما گئے، ہندوستان میں اسلام پر قریب قریب اسی کے صدر عظیم واقع ہوا تھا، جیسے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف پر کل اسلام پر مسلمانوں کی قلت کفار کی کثرت، کفر کی شدت بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ دین لپٹا نپٹا ہو جائے گا“ ضل

اس میں شک نہیں کہ جس زمانہ میں وہ لکھ رہے تھے۔ اس وقت اتنا بھی لکھ دینا غیر معمولی ایمانی قوت، اور اسلامی حمیت کے بغیر آسان نہ تھا۔ مگر یہ بات کہ جس شخص کی سوانح نگاری کا

دگدگ شدہ صفحے گلان سے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا کہ صدر دیوبند کو استاذ و جتہ اللہ علیہ نے کیا محض تعلیم کے لئے قائم کیا تھا؟ نہیں، بلکہ مشہد کے ہنگامہ کی ناکامی کی تلافی کے لئے جس سے حضرت کا ان واقعات میں دفعہ نمایاں ہے۔ ہر حال سوانح مخطوط کی نہرست میں حضرت کے جہاد کا عقیدان اور واقعات جہاد کی سرخیاں اور اس اقتباس میں مشہد کا پس منظر اور اس میں تاسیس دہا العلوم کی صورت سے حضرت والا کا عزم مقصد اسی کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں کہ حضرت والا کی شرکت بھی اس میں اپنے مقاصد کے تحت ہوئی اور سوانح مخطوط کے مصنف نے اس کے اظہار و انداز سے سکوت و انغاض بھی نہیں کیا۔ محمد طیب غفرلہ

فرض وہ انجام دے رہے ہیں۔ اس کا بھی نفی یا اثبات اس ہنگامہ سے کسی قسم کا کوئی تعلق تھا، یا نہیں، نہ یہ سوال ہی اٹھا یا گیا ہے، اور نہ صراحتاً یا کنایہً جواب ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ البتہ ایک جگہ سیدنا الامام الکبیر کی غیر معمولی جامعیت کا تذکرہ کرتے ہوئے عالم عابد حافظ حاجی وغیرہ عنوانوں کے ساتھ

”غازی“

کے عنوان کو بھی ہم پاتے ہیں، لیکن غرار کے اس فرض کو کب کہاں، کس شکل میں، لیکن حالات میں انجام دے کر ”غازی“ کے اس لقب کے آپ حقدار ہوئے۔ کتاب کا جتنا حصہ میرے پاس ہے۔ اس میں تو اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا۔

بہر حال مصنف امام کی کتاب، اور حضرت گنگوہی کی سوانح عمری تذکرۃ الرشید جسے مولانا عاشق الہی نے مرتب فرما کر جماعت دیوبند کے ذمہ دار بزرگوں کی خدمت میں پیش کی، اور کافی تنقید و تحقیق کے بعد یہ کتاب شائع ہوئی، اس وقت تک کسی قسم کی تنقید اس کتاب کی روایتوں پر جہاں تک میں جانتا ہوں نہیں کی گئی ہے، ان دو مطبوعہ کتابوں کے سوا مولانا طیب صاحب اور مولانا طاہر صاحب سیدنا الامام الکبیر کے دونوں سعید و رشید ثقہ پوتوں کی قلمی یادداشتوں کی معلومات کو پیش نظر رکھ کر اس سلسلہ میں واقعات کی جو ترتیب میری سمجھ میں آئی ہے اسے قلم بند کرتا ہوں، واللہ هو الملمع للصواب والیہ المرجع والمآب تمہیداً آغاز خد کے بعض اجمالی پہلوؤں کا ذکر مناسب ہو گا۔

۱۲۴۹ھ میں مولانا طیب صاحب نے کابل کا مشہور سفر جب کیا تھا اور شاہ کابل ظاہر شاہ اندر اندر رہانہ کی ملاقات، بلکہ مصافحہ اور مذاکرہ کے بعد ہم کلائی کا موقع بھی مولانا کو میسر آیا تھا، بڑے بڑے و زمانے شہستان فارسی کے چشم و چراغ کو اپنے سرودن آدھ آنکھوں پر بٹھایا۔ ظاہر شاہ کے والد نادر شاہ مرحوم کے پاس سیدنا الامام الکبیر کی ایک ٹوپی بطور تبرک محفوظ تھی۔ یہ ٹوپی ان کے یہاں اس وقت پہنچی تھی جب ان کا خاندان ہندوستان ہی میں مقیم تھا، دستور تھا اور شاہیاد اب تک ہے کہ اس شاہی خاندان میں کوئی جب بیمار پڑ جاتا ہے تو شہانہ کی نیت سے یہ ٹوپی اسے پہنائی جاتی ہے۔ غالباً نادر شاہ کی والدہ یاد دہی سے (باقی اگلے صفحہ پر)

پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ شہداء کے ٹھیک ستو سال بعد جوں ہی کہ شہداء کا سال شروع ہوا، جنوری کا پہلا مہینہ تھا کہ کلکتہ کی چھاؤنی ڈم ڈم میں پہلی دفعہ کار تو سوں میں گائے اور سور کی چہرنی کے قصہ کا آغاز ہوا۔ وہی قصہ بڑھتا رہا، کار تو سوں کو دانت سے کاٹنے کے حکم کی تعمیل سے جن ہندوستانی سپاہیوں نے سرتابی کی تھی، ان کی پلٹن ہی کو گورنر جنرل نے برخاست کر دیا جس سے کالی پلٹن میں کافی خوف و ہراس اور آزدگی کے جذبات پیدا ہوئے، باکپور (کلکتہ) کی چھاؤنی میں اسی کا رد عمل اس شکل میں ہوا کہ ایک سپاہی نے افسر پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس سپاہی کی گرفتاری میں دوسرے ہندوستانی سپاہیوں نے کوئی دلچسپی نہ لی، اسی کو جرم قرار دے کر بارک پور کی سات پلٹنوں کی موقوفی کے ساتھ ساتھ گورنر جنرل نے ایک جمعدار اور ایک سپاہی کو تو پھانسی پر چڑھا دیا، اور دو کو کالے پانی کی سزا جس ددام کی شکل میں دی گئی۔ جرم کے مقابل میں سزائی سختی ہندوستانی فوجیوں کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوئی، جہاں جہاں کدو ٹمنٹ اور فوجی چھاؤنیاں تھیں، اندھ ہی اندھ سلگتے ہوئے

(گزشتہ صفحہ سے) خاص طور پر عرض کر کے سیدنا امام الکبیر سے یہ ٹوپی حاصل کی تھی۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ کابل میں مولانا طیب صاحب کو اپنے چھوٹی زاد بھائی سیدنا امام الکبیر کے نواسے مولانا محمد میاں جو عام طہ پر منصور انصاری مہاجر کاٹی کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے گھر میں قیام کا موقع ملا، منجملہ بہت سی باتوں کے ان ہی مولانا منصور انصاری نے اس ہم میں سیدنا امام الکبیر کے عملی اشتراک کی متعلقہ روایتوں کو ایسے ذریعہ سے مولانا طیب صاحب تک پہنچایا تھا کہ ان روایتوں کو چشم دید شہادتوں کی حقیقت حاصل ہو جاتی ہے۔ یاد ہو گا بچپن کے خاص رفقا میں سیدنا امام الکبیر کے ایک صاحب مولانا منیر نانوتوی بھی تھے۔ اس ہم میں اول سے آخر تک وہ شریک تھے اور شریک ہی نہ تھے بلکہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو حکم دے رکھا تھا کہ سیدنا امام الکبیر کے ساتھ ساتھ رہیں اور اس کی نگرانی کرتے رہیں کہ کسی خطرے میں مولانا اپنے آپ کو نہ رہنے کی وجہ سے نہ ڈال دیں۔ اس حکم کی تعمیل کی وجہ سے واقعہ کے ایک بہترین گواہ وہ بن گئے تھے۔ ان ہی مولانا محمد منیر صاحب سے مولانا منصور انصاری تک معلومات پہنچی تھیں۔ یہ ساری باتیں خود مولانا محمد طیب صاحب کی یادداشت میں درج ہیں۔ اسی طرح مولانا محمد طاہرہ کی یادداشت کے بلے میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ براہ راست اپنے والد مرحوم مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہوئی روایتوں کو انہوں نے قلم بند کر لیا تھا۔ ۱۳ -

یہ آگ پہنچتی رہی، تاہم ۵ مئی ۱۸۵۷ء یعنی ۱۰ رمضان ۱۲۷۵ھ کو میرٹھ کی چھاؤنی میں بھی آگ بھڑک اٹھی، گوروں کی تعداد میرٹھ کی اس چھاؤنی میں دو ہزار دوسو سے زائد نہ تھی، اس کے مقابلے میں کالی پلٹن والوں یعنی ہندوستانی فوجیوں کی تعداد دس ہزار کے قریب تھی، پھر غیر فوجی عملہ جو صرف ہندوستانی تھا، مزید بے براں۔ فوج کے چاروں طرف آبادی ظاہر ہے کہ ہندوستانیوں ہی ہندوستانیوں کی تھی، جیل خانہ بھی توڑ دیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں جو کچھ ہو سکتا تھا وہ ہوا، لیکن میں آگ لگا دی گئی، اور گورے چمڑے کا جو آدمی بھی سامنے آیا، مرد ہو، یا عورت، بچے ہوں، یا جوان بلا امتیاز سب کا صفایا شروع ہو گیا۔

انگریزی افسروں نے روک تھام کی کوشش کی، لیکن ان کی کچھ پیش نہ گئی، اتوار کا دن مئی کی دس حساب سے رمضان کی پندرہ ہوتی ہے۔ واقعہ اپنے انتہائی حدود کو پہنچ گیا۔ اتوار کا دن گزار کر کالی پلٹن والے کھلی ہوئی چاندنی میں دلی چل پڑے۔ دلی میں پہنچ کر لال قلعہ پر قبضہ کیا گیا، اور ظفر شاہ بے چارے کو فوج نے مجبور کیا کہ فرضی نہیں بلکہ واقعی ہندوستان کے بادشاہ بن جائیں۔ دلی میں اس کے بعد جو کچھ بھی گذر رہی ہو، لیکن باہر ملک کے طول و عرض میں قدرتا یہ خیال پھیل گیا کہ بجائے کلکتہ کے پھر دلی ہی ہندوستان کا پایہ تخت ہو گیا، اور ہندوستان کی حکومت پھر ہندوستانیوں ہی کے ہاتھ میں آگئی۔ یوں ہر علاقہ کو انگریزوں سے پاک و صاف کر کے کاٹا دیا گیا، صوبہ متحدہ اودھ کے ساتھ ساتھ بنیدل کھنڈ، اور صوبہ بہار کے بعض حصوں تک بغاوت کہنے، یا آزادی کی یہ تحریک پھیل گئی، دور دور کی چھاؤنیاں، مثلاً آٹھ منیج، نصیر آباد کے علاوہ بعض بڑی ریاستیں مثلاً سندھیا (گوالیار)، بمبئی اور وغیرہ بھی اسی پیمٹ میں آگئیں۔

ظاہر ہے میرٹھ جہاں سے یہ آگ اٹھی تھی، روہیل کھنڈ کے سارے اہم مقامات اسی کو اور گرد چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے نہ متاثر ہونے کی آخر وجہ یہ کیا ہو سکتی تھی، ظاہر ہے کہ اتنے طویل و عریض رقبہ کی بغاوت کا فرد کرنا آسان نہ تھا اور نہ چٹ منگنی پٹ بیاہ کی صورت کی توقع کی جاسکتی تھی۔ انگریز بھی جی جان چھوڑ کر مقابلہ کے میدان میں اتر آئے بعض

ہندوستانی طبقات کی طرف سے بھی کافی پشت پناہی کی گئی۔ آخر مئی ۱۸۵۷ء میں جو شہزادہ اڑا تھا، جلتے اور جلاتے ہوئے بقول راجہ شیو پرشاد

”۱۸۵۷ء کے آخر ہوتے ہوئے جہاں کا تہاں فرزند ہو گیا۔“

(تاریخ جام جہاں نمائش ۱۲۹)

اپنے موضوع سے ہٹ کر اجمالاً جو کچھ اس واقعہ کے متعلق مجھے عرض کرنا پڑا۔ اس کی غرض بھی یہی تھی کہ اس مدت کے بارہ میں پڑھنے والوں کو آسانی ہو، جس میں یہ واقعہ ہندوستان میں گذر اٹھا۔ یعنی مئی ۱۸۵۷ء سے مارچ ۱۸۵۸ء تک۔ جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے، کہ ڈیڑھ سال سے دو سال تک کم و بیش ملک اس ہنگامہ کا شکار رہا۔ خبریں جن کا کوئی باضابطہ نظام تو نہ تھا۔ لیکن بہر حال صحیح یا غلط خبریں پھیلتی ہی رہتی تھیں۔ مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ،

”خبروں کا اس وقت میں چرچا تھا۔ جھوٹی سچی ہزاروں گپ فب اڑا کرتی تھیں۔“

کبھی معلوم ہوتا تھا کہ نالایق مقام پر ہندوستان کا پلہ انگریزوں کے مقابلہ میں بھاری ہو گیا ہے۔ اڑانے والے زیادہ تر مزید مبالغہ اضافوں کے ساتھ اس قسم کی افواہیں زیادہ اڑایا کرتے تھے۔ اور کبھی یہ ماننے پر بھی لوگوں کو مجبور ہونا پڑتا تھا کہ انگریز غالب آگئے، عوام تو خیر، لیکن جہاں تک میلا خیال ہے، ملک کے ارباب فکر و بصیرت کی نظر زیادہ تر مٹی پر اوردتی کے بعد تازہ مردہ حکومت کے پایہ تخت لکھنؤ پر جمی ہوئی تھی، راجہ شیو پرشاد جو اسی زمانہ کے آدمی ہیں

۱۸۵۷ء کی اختریا کی اخترگری پھر ٹیلوں والا شہر لکھنؤ، واجد علی شاہ سے خالی ہو جانے کے بعد، چکا تھا لیکن شاہ مرحوم کی جلاوطنی پر سال بھر کا زمانہ بھی نہیں گذر اٹھا، یعنی مئی ۱۸۵۷ء کو انگریزی حکومت کی طرف سے ملک ۱۸۵۷ء کی ضابطی کا اشتہار جاری ہوا، ۱۸۵۷ء کی جنوری میں فوج کنوئیل بدلتے لگی، مئی تک فوج اور فوج کے ساتھ ملک باغی ہو گیا۔ دراصل یہی وجہ تھی کہ جاندار جیوٹ والے پتھلوں سے لکھنؤ کی طرف پر خالی نہ ہو پایا تھا، غدر کے بعد شہزادہ برجیس قند کو لوگوں نے واجد علی کی مسند پر بٹھا دیا۔ برجیس فوج پر تھا۔ اس کی ماں بیگم تانی نے حکومت کی باگ سنبھالی، انگریزوں کو لکھنؤ میں کافی دشواری پیش آئی۔ اگر نیپال کی امداد سات آٹھ ہزار فوج کی شکل میں (باقی اگلے صفحہ پر)

ان کی تاریخ کے اس فقرے کا معنی

”دہلی اور لکھنؤ کے ٹوٹنے ہی باغیوں کی کمر ٹوٹ گئی“ ۱۲۹ جام جہاں نما

جس کا مطلب بھی یہی ہے۔

یہ اتفاق کی بات تھی کہ مقابلہ سب سے زیادہ ان ہی دونوں مقامات میں ہوا، اور کش مکش بھی سب سے زیادہ طویل ان ہی دونوں مقامات کی تھی۔ کافی وقفہ اسی لئے سرچنے سمجھنے اور فیصلہ کر پانے کا ان لوگوں کو مل گیا۔ جو عوام کے بھیر یا دھسان میں ابتداء ہی سے شریک نہیں ہوئے تھے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس ہنگامہ میں شریک ہونے والوں میں ایک طبقہ تو ان لوگوں کا تھا، جن کے لئے ”ہو“ کی آواز بس تھی، ہندو اور مسلمان دونوں ہی طرح کے موزوں کی کتابوں میں اس قسم کی باتیں جو ملتی ہیں۔ مثلاً راجہ شیو پرشاد نے لکھا ہے کہ

”اس عرصہ میں ہزار ہا قیدی چھٹے، اور انہوں نے شہر اور چھاؤنی کے لچے بد معاش

(گذشتہ صفحہ سے) وقت پر انگریزوں کو میرزا آقے تو کہنے والے کہتے ہیں کہ لکھنؤ کا سقوط آسان نہ تھا۔ رزیدنسی کی کوٹھی بی بی گارڈ کے در و درواز میں بھی جدوجہد کرنے والوں کی نشانیاں محفوظ ہیں۔ اس موقع پر بے ساختہ جی چاہ رہا ہے کہ ایک سنی ہوئی بات کا ذکر کر دوں، اگرچہ اب نہ ان باتوں کے سننے والے ہی رہ گئے ہیں اور نہ ماننے والے! نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی صدر الصدور سرکار آصفیہ قدس اللہ سرہ سے ایک دفعہ نہیں مختلف موقعوں پر یہ بات فقیر نے سنی تھی کہ انگریزوں کے مقابلہ میں جو لوگ لڑ رہے تھے، ان میں حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ بھی تھے۔ اچانک ایک دن مولانا کو دیکھا گیا کہ خود بھاگے جا رہے ہیں اور کسی چودھری کا نام لے کر جو باغیوں کی فوج کی افسری کر رہے تھے کہتے جاتے تھے کہ لڑنے کا کیا فائدہ خضر کو تو میں انگریزوں کی صف میں پارہا ہوں۔ نواب صاحب ہی دوسرے واقعہ کا ذکر بھی فرماتے تھے کہ خضر کے بعد جب گنج مراد آبادی دیران مسجد میں حضرت مولانا جابر مقیم ہوئے تو اتفاقاً اسی راستہ سے جس کے کنارے مسجد ہے کسی وجہ سے انگریزی فوج گزری تھی، مولانا مسجد سے دیکھ رہے تھے، اچانک مسجد کی سیڑھیوں سے اتر کر دیکھا گیا کہ انگریزی فوج کے ایک سائیس جو جو باگ ڈور کھوٹے وغیرہ گھوٹے کالے ہوئے تھا اس باتیں کر کے بھڑک اٹھا، اب یاد نہیں ہا کہ پوچھنے پر یا خود بخود فرماتے لگے کہ سائیس جس کو میں لکھنؤ کی بیخبر تھی میں نے پوچھا کہ کیلئے آجوا ہیں کہا کہ کچھ بھی ہوا ہے یہ دایت نواب صاحب سے سنی ہوئی ہے۔ باقی خود خضر کا مطلب کیا ہے؟ نصرت حتی کی خالی شکل تھی اس نام کو ظاہر ہوتی ہے تفصیل کیلئے شاہ ولی اللہ وغیرہ کی کتابیں پڑھنے کو یا جو کچھ دیکھا جا رہا تھا اسی کے باطنی پہلو کا یہ پرکاش تھا ۱۲

قصاب، ڈوم چار فقیر بھک منگے، مہتر، سائیس گھسیارے، خدمت گار خاناماں اور جملہ کمین اور ذیلی سے جو چیر اس باندھ کر برقعہ بازی کرتے تھے، خواہ بڑا بڑا چھاپا تلک لگا کر گھنٹوں تک گھنٹہ ہلایا کرتے تھے شان ہوئے، ص ۱۶۱ عام جہاں نما

یا مسرید کے رسالہ میں ہے کہ شریک ہونے والوں میں

”ایسے خراب، اور بد رویہ، اور بد اطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور ترائے، یعنی اولاد ناچ اور رنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ ان کا نہ تھا“ ص ۱۹ ضمیمہ حیات جاوید

ممکن ہے کہ حکومت کو خوش کرنے اور ہندوستان کے عام باشندوں کے جرم کو ہلکا کر کے دکھانے کے لئے بھی اس قسم کی باتیں لکھی گئی ہوں۔ لیکن اس کا انکار مشکل ہے کہ جن لوگوں نے ہنگامہ میں حصہ لیا تھا، ان میں کافی تعداد اس قسم کے لوگوں کی بھی تھی، اسی ہنگامہ میں کیا ہر ہنگامہ میں اس قماش کے لوگوں کا پل پڑنا، ایک عام بات ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ دعویٰ بھی قطعاً غلط ہو گا کہ سنجیدہ، وفہمدہ طبقات کے افراد، بھی اس میں شریک نہ تھے۔ یہ حقائق اور واقعات کی تکذیب ہے، السبتہ فرقہ وروں گرد ہوں میں یہ تھا کہ عوام کا بے قید طبقہ تو ”ہو“ کے ساتھ کود پڑا، اور وہ یوں ہی کود پڑنے کا عموماً عادی بھی ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کوئی بڑی غرض ہوتی بھی نہیں، بے آئینی کے منافع سے فوری طور پر مستفید ہونا، کچھ پا کر نکل جانا، ان چھپورے مقاصد کے سوا مشکل ہی سے ان کا قدم کسی بلند نصب العین کے لئے اٹھتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ عقل و فراست اور اس سے بھی زیادہ دین کی عائد کی ہوئی ذمہ داریاں جن کی زندگی تھی، بلکہ دین ہی کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے جو اٹھے تھے ان کے متعلق ایک لمحہ کے لئے کسی حیثیت سے بھی یہ سوچا جاسکتا ہے کہ وہ بھی اس عامیہانہ ”ہو“ پر دوڑ پڑے۔ مالکوم کیف تحکمون

اور دلی پر بحث کرنے کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ لیکن سیدنا الامام الکریم کے متعلق محض حسن ظن ہی کی بنیاد پر میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ معلومات کا جو سرمایہ معتبر ذرائع سے مجھ تک پہنچا ہے،

جو بھی ان سے واقف ہوگا، وہ میری ہمنوائی پر انشاء اللہ اپنے آپ کو مجبور پائے گا۔ اب خاص ترتیب سے اپنی ان معلومات کو پیش کرتا ہوں۔

۱

آپ مجھ سے یہ سن چکے کہ میرٹھ میں کارروائی کا آغاز ۱۳۵۵ء کی ۵ مئی سے ہوا۔ رمضان کی دسویں تاریخ تھی۔ اسی لئے لکھا ہے کہ کھلی چاندنی میں لوگ میرٹھ سے دہلی روانہ ہوئے۔ خیر یہ بات تو تاریخ بتاتی ہے۔ اب سنئے، مصنف امام نے اپنی کتاب میں یہ خبر دیتے ہوئے کہ ”اسی عرصہ میں غدر ہو گیا۔“

آگے وہی سیدنا الامام الکبیر کے منقلی یہ اطلاع دیتے ہیں۔

”بعد رمضان احقر کو سہارن پور لینے کو تشریف لائے، چند آدمی اور وطن دار ساتھ تھے،

اس وقت راہ چلنا بدولت تھی اور سامان کے دشوار تھا۔“

جس سے حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) غدر کے زمانہ میں ہمارے مصنف امام اپنے وطن نانوتہ میں نہیں بلکہ سہارنپور میں تھے۔

(۲) لیکن سیدنا الامام الکبیر (بجائے دلی یا میرٹھ کے) معلوم ہوتا ہے کہ نانوتہ ہی میں قیام فرما رہے تھے۔

(۳) یہ رمضان جس کا مصنف امام نے اس موقع پر ذکر کیا ہے، یقیناً رمضان کا وہی مہینہ ہے،

جس میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میرٹھ کی فوج باغی ہوئی، ادب باغی ہو کر دلی پہنچی۔ قدرتی طور پر دلی سے

جو علاقے زیادہ متصل تھے جیسے مظفرنگر، سہارنپور وغیرہ معلوم ہوتا ہے کہ بے آئینی کے عام آثار سے

رمضان ہی میں متاثر ہو چکے تھے۔ راستہ کا امن و امان ختم ہو چکا تھا۔ اب خواہ عوام نے خود قانون

کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، یہ اس کا نتیجہ ہو، یا جیسا کہ مولوی عاشق الہی صاحب کا بیان ہے کہ

”گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھا لیا۔ اور بذریعہ اشتہار عام

اطلاع دے دی کہ اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہئے۔“ تذکرۃ الرشید ج ۱

لے جیہا کہ ختمی صدرالمدبوعہ نامی پریس گمنامز تہ مولانا ابوالحسنات قطب الدین احمد صاحب لکھنوی سے واضح ہے ۱۲

اس کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہو گئی ہو۔

(۴) سیدنا امام الکبیر کی جلالت اور پُر دلی (بہادری) کی شہادت کے ساتھ ساتھ مصنف امام کے مذکورہ بالا بیان کا کھلا ہوا اقتضا یہ ہے کہ غد کے شروع ہونے کے ساتھ ہی سیدنا امام الکبیر قطعاً اس ہنگامہ میں شریک نہ ہوئے۔ بلکہ نانوتہ سے سہارنپور آنے کے بعد بجائے اس کے کہ جن میدانوں میں مقابلہ ہو رہا تھا، ان میں سے کسی میدان کی طرف چلے جاتے، اپنے ساتھ مصنف امام کو لے کر وطن نانوتہ ہی تشریف لے آئے۔

یہ بدرہی نتائج ہیں جو مصنف امام کی مذکورہ بالا اطلاع سے پیدا ہوتے ہیں۔ آگے یہ سوال کہ نانوتہ میں آپ کا کب تک قیام ایام غد میں رہا؟ قطعی طبع پر تو اس کا جواب دینا مشکل ہے لیکن مصنف امام اسی سلسلہ میں جب سہارنپور سے سیدنا امام الکبیر کے ساتھ نانوتہ پہنچے، ادرانی دلوں بزرگوں کا قیام اسی قصبہ میں تھا۔ آگے جو یہ لکھا ہے کہ

”جب احقر وطن (نانوتہ) پہنچا، چند ہنگامے مفسدین کے پیش آئے جس میں لانا

کی کمال جرات و بہمت ظاہر ہوئی۔“ ۳۶

بظاہر اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ خود نانوتہ پر بھی لوٹ مار کرنے والے غارتگروں نے حملہ کیا، اور قصبہ والوں کے ساتھ مل کر ان کی مدافعت میں سیدنا امام الکبیر نے بھی امتیازی حصہ لیا۔ ایک نہیں بلکہ ”چند ہنگامہ کے پیش آنے“ کے لئے چاہئے تو یہی کہ ”کافی عرصہ“ تک مانا جائے کہ نانوتہ میں سیدنا امام الکبیر کا قیام رہا، افسوس ہے کہ ان ہنگاموں کی تفصیلات کے جاننے کی کوئی صورت باقی نہ رہی، یہ کون لوگ تھے، اور نانوتہ پر بار بار حملہ کیوں کرتے تھے، ان سوالوں کا کیا جواب دیا جائے۔

شاید ان ہی ہنگاموں کی وجہ سے بھی، اور جیسا کہ مولانا عاشق الہی کا بیان ہے کہ حفاظت کی ذمہ داری حکومت نے اپنے سر سے اتار کر خود ہندوستان کے باشندوں کے سر ڈال دی تھی کچھ اس وجہ سے بھی، یا یہ کہ مستقبل میں کیا صورتیں پیش آنے والی ہیں۔ کچھ اس کے امکانات کو بھی

سوج کر مصنف امام نے لکھا ہے کہ

”اس زمانہ میں (یعنی جب ملک میں غدر برپا تھا اور ان کا قیام نافوتہ میں تھا) ہمارے بھائی ہم عمر، اکثر بندوق اور گولی لگائے میں مشق کرتے رہتے تھے۔“

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نافوتہ میں شیوخ کی جو عام برادری تھی، اس میں نشانہ بازی وغیرہ جیسے جنگی مشاغل کی مشق کا غیر معمولی ذوق اور شوق پیدا ہو گیا تھا۔ کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ شاید آئندہ شریک ہونے اور شریک کرانے کی یہ تہید ہو۔ لیکن اب اسے کیا کیجئے۔ مصنف امام ہی نے اسی کے بعد جو کچھ لکھا ہے، اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان جنگی مشقوں سے کم از کم ذاتی طور پر سیدنا امام الکبیر کا نہ کوئی تعلق تھا، اور نہ کسی خاص قسم کی دل چسپی ہی معلوم ہوتی ہے، کہ ان مشاغل سے آپ لیتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں نافوتہ کے نوجوان چاند ماری کی مشق کر رہے تھے، کہ

”ایک دن آپ (سیدنا امام الکبیر) مسجد سے آئے، ہم گولیاں لگائے تھے، اور نشانہ کی جائے پر ایک نیم کا پتہ رکھا تھا، اور اس کے گرد ایک دائرہ کھینچا تھا، قریب سے بندوق لگاتے تھے۔ گولیاں مٹی کی تھیں۔“

جس سے پتہ چلتا ہے کہ چاند ماری میں مٹی کی گولیوں کے استعمال کرنے کا طریقہ ہندوستان میں مروج تھا۔ یا قلت سرمایہ کا یہ نتیجہ ہو، بہر حال وہی کہتے ہیں کہ مسجد سے نشانہ بازی کے اسی مقام پر پہنچ کر

”مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) نے فرمایا کہ بندوق کیونکر لگاتے ہیں، مجھے بھی دکھاؤ۔“

اس کے سوا اور مطلب اس کا کیا سمجھا جائے کہ غدر کے ہنگاموں میں کافی زور جس زمانہ میں پیدا ہو چکا تھا، اس وقت تک سیدنا امام الکبیر بندوق چلانا بھی نہیں جانتے تھے۔ بندوق کیونکر لگاتے ہیں؟ پہلی دفعہ اپنی پوری زندگی میں بندوق چلانے والوں سے یہ پہلا سوال آپ کی طرف سے شاید

پیش ہوا۔ اب یہ آپ کی عبقریت اور فطرت فائزہ کا نتیجہ تھا جیسا کہ مصنف امام لکھتے ہیں، کہ دریافت فرمائے پر

”کسی نے ایک فیر کی اور قاعدہ نشانہ کا ذکر کیا“ ۳۶

گویا کہ کئے بھی دکھایا، اور نشانہ پر گولی مارنے کا جو طریقہ ہے، اسے بھی زبانی بتا دیا۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ بس ایک دفعہ دیکھ اور سن لینے کے بعد دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر نے

”تب بندوق ہاتھ میں لے کر فیر کی“ ۳۷

لوگ نشانہ کی طرف دوڑے وہی لکھتے ہیں کہ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ

”صاف گولی نشانہ پر لگی“ ۳۸

اس کے بعد مصنف امام نے اس قسم کی باتوں کا ذکر کر کے کہ نافو تہ کے دوسرے نوجوان جو زمانہ سے نشانہ بازی کی مشق کر رہے تھے اور نیم کے پتہ کی جگہ اس دائرے میں گولی کو پہنچا دینے کو کامیابی سمجھتے تھے جو پتہ کے ارد گرد کھینچ دیا جاتا تھا، ان کے مقابلہ میں بغیر کسی سابقہ مشق کے محض ایک دفعہ دیکھ لینے اور سن لینے کے بعد پہلے فیر ہی میں ٹھیک نشانہ یعنی نیم کے پتہ کو اپنی گولی سے سیدنا الامام الکبیر نے جواڑا دیا تھا، ممکن ہے کہ اس کو ”برہدف زند تیرے“ کا اتفاقی واقعہ سمجھا جائے۔ مگر اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر اس خیال کی تردید کرتے ہوئے وہی لکھتے ہیں، کہ ”یہ بات اتفاقی نہ تھی، اپنی فہم سے حقیقت نشانہ بازی کی سمجھ کر بدن ایسی وضع پر سادہ لیا جو فرق ہو جانے کی وجہ نہ ہوئی۔ تیرا اندازوں کو دیکھا ہے کہ سر سے پا تک ایک خط مستقیم ہو جاتے ہیں“ ۳۹

اور جو بھی سیدنا الامام الکبیر کی فطرت فائزہ کی خصوصیتوں سے تھوڑا بہت واقف ہے۔ وہ مصنف امام کی رائے کی تائید ہی کرے گا۔ مگر مجھے اس موقع پر مصنف امام کے بیان کی روشنی میں یہ کہنا ہے کہ مقابلہ اور مقابلہ میں عملی شرکت کا فیصلہ سیدنا الامام الکبیر اگر پہلے سے کئے ہوئے ہوتے، تو اس زمانہ تک آپ کا جنگی آلات کم از کم بندوق کے استعمال سے اس درجہ ریگانہ رہ جانا کیا ممکن تھا،

کچھ بھی ہو، اتنی بات بہر حال یقینی ہے۔ اور ان ناقابل انکار چشم دید گواہیوں کا کھلا ہوا اقتضار ہے، کہ مالی خولیا سے زیادہ اس قسم کی افواہوں کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ غدر کے ہنگامہ کے پراکراتے میں دوسروں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے علمی و دینی رفقاء کے بھی ہاتھ تھے۔ بلکہ واقعہ وہی ہے جو مصنف امام نے لکھا ہے کہ

”مولنا فسادوں سے کوسوں دور تھے“

آخر حسب روایت مولنا طیب صاحب جب سنبھالنے والے حضرت والا کو نظر نہیں آ رہے تھے تو تعمیر سے پہلے تخریب کی یا خروج سے پہلے دلورج کا خیال ممکن ہے عامیوں کے نزدیک ضروری نہ ہو، لیکن سیدنا الامام الکبیر جیسے دین کی مثالی شخصیتوں کے متعلق اس قسم کے خود تراشیدہ ادہام بڑا سہول کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتے ہیں ؟

سیاست، جن لوگوں کے نزدیک صرف ماردھاڑ، اکھاڑ پچھاڑ کا نام ہے، وہ تو جو چاہے سوچیں، سوچ سکتے ہیں جو چاہے کریں کر سکتے ہیں۔ لیکن اسلام اپنے ماننے والوں کو جس قلب سلیم، ذہن سلیم، دماغ سلیم، فکر سلیم کا مالک بنادیتا ہے، ان لوگوں سے غوغائیوں اور خوشیوں، کی بہنگم حرکات کی توقع دلیل ہے اس بات کی کہ توقع کر لے والے اسلام کی روح سے قطعاً بے گانہ ہیں، ایک صحیح اسلامی وجود، امن کی حالت میں ہو یا جنگ کی حالت میں، کسی وقت اور کسی حال میں کسی کے لئے نہ دھوکا ہے اور نہ فریب، ہر حال میں آئین اور اصول کی پابندی بھی مسلمان کی زندگی کا سب سے زیادہ تمایاں پہلو ہے۔ اسی لئے اپنے ماحول میں رہنے والوں کے لئے امن و عافیت، طمانیت و سکینت، سلامتی اور خوش باشی کی وہ مجسم ضمانت ہوتا ہے۔ دوست تو دوست دشمن بھی اسی بھروسہ کو اپنے دل میں پاتے ہیں اور یہی ان کو پانا بھی چاہئے کہ غیر آئینی طریقے اختیار کر کے مسلمان کسی کے لئے کسی زمانہ میں کسی جگہ خطرہ نہیں بن سکتا۔ اس امتیازی خصوصیت سے جو جتنا زیادہ دور ہے، سمجھنا چاہئے کہ اسی حد تک وہ اسلام اور اسلامی تعلیمات کی روح سے دور ہے۔

بہر حال فسادوں سے قطعی دور ہونے کے باوجود پھر یہ سوال کہ آخر اس واقعہ کی صحیح نوعیت کیا تھی جس کی وجہ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ شیعہ والے ہنگامہ میں سیدنا امام الکبیر نے بھی عملی حصہ لیا تھا۔ جیسا کہ مسلسل کہتا چلا آ رہا ہوں، اصل واقعہ کا انکار تو واقعہ کا انکار ہو گا، ایسے سارے ذرائع جن سے غیر مشتبہ یقین کے سوا اور کچھ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ واقعہ پہلی نسلوں سے آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ قطعی طور پر ثابت ہے، کہ آپ لڑے بھی، زخمی بھی ہوئے الغرض سوانح مخطوطہ کے مصنف کے لفظ ”غازی“ کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان سب کے حاصل کرنے کے مواقع قدرت کی طرف سے آپ کے لئے آسان کئے گئے تھے۔ ایک چیز یعنی تاریخ وارتو ساری کڑیوں کا مرتب کر کے پیش کرنا مشکل کیا میرے لئے تو ناممکن ہے۔ جن وثائق اور کتابوں سے معلومات کی فراہمی میں مدد ملی ہے سبب کے سبب تاریخ کے ذکر سے خالی ہیں۔ واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن کب کس مہینہ میں کس تاریخ میں یہ واقعہ پیش آیا، اس کا ذکر کسی نے نہیں کیا ہے۔ تاہم ان ہی بزرگوں کا صدقہ ہے کہ تاریخ کی تعین کے بغیر وہی بھی لیکن واقعات تو بحمد اللہ معلوم ہو گئے۔

غدر کا ہنگامہ ملک کے طول و عرض میں برپا تھا۔ اور جیسا کہ آپ دیکھ چکے کافی عرصہ تک اس زمانہ میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ سیدنا امام الکبیر اپنے آبائی وطن نافو تہ ہی میں مقیم رہے۔ نافو تہ کے قیام کے ان دنوں میں بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ پر شورش پسند غوغائیوں کی طرف سے متعدد بار حملے ہوئے، باشندگان قصبہ کے ساتھ سیدنا امام الکبیر بھی مدافعت میں حصہ لیتے رہے۔ بقول مصنف امام

”جس میں مولانا کی کمال جرأت و ہمت ظاہر ہوئی“

مدافعت کی ان کاروائیوں کو بھی غدری ہنگامہ کی شرکت قرار دی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس حد تک قیام نافو تہ ہی کے زمانہ میں گویا آپ شریک ہو چکے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ

شرکت آپ کی تو فرمان نبوی

من قتل دون ماله فهو شهيد ومن
قتل دون عرضہ فهو شهيد الحلیہ
کی تعمیلی شکل تھی

جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتا ہو مارا گیا وہ شہید
ہر اور جو اپنی آبرو بچاتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے الخ

سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی مقامی حکومت کو ختم کر کے باہر کی جس قوم نے اس ملک پر
سیاسی اقتدار اپنا قائم کر لیا تھا۔ باہر سے مسلط ہونے والے اس بیرونی اقتدار کے ساتھ تصادم اور مقابلہ کی
صورت کہاں اور کیوں پیش آئی، کیونکہ مقصود اس مسئلہ میں مقابلہ اور مقابلہ کا یہی پہلو ہے۔
اس پر غور کرنے کے لئے اس مقدس جماعت کی تاریخ اعلا کلمۃ اللہ کو سامنے رکھ لینا
چاہئے۔ یہ تو ہندوستان سے مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو کر ایک بدیسی کے اقتدار کے سامنے آ جانے
کا مسئلہ تھا۔ ان حضرات کے سید الطائفہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے تو خود مسلم اقتدار میں
بھی ہر مذہبی اور سیاسی باطل کے خلاف علم جہاد بلند رکھا، تو ان کے تربیت یافتہ کفر کی شوکت
کے زمانہ میں اعلا کلمۃ الحق کے مقصد سے کیسے دست بردار ہو سکتے تھے اس لئے ان حضرات کے
سامنے سب سے پہلے تو یہ اعلا کلمۃ الحق کا مقصد سامنے تھا۔ ساتھ ہی قومی طور پر ہندوستان
کی بسنے والی اقوام میں کوئی قوم ایسی نہ تھی جو انگریزوں کے ابتدائی طرز عمل اور مظالم سے تنگ
آئی ہوئی نہ ہو، جس میں مسلمان خصوصیت سے زیادہ متاثر تھے۔ اس لئے ان بزرگوں کے سامنے
اعلا کلمۃ اللہ کے ساتھ ساتھ عام ہندوستانی اقوام کی بہبودی اور فلاح کا مسئلہ بھی پیش نظر تھا۔
جس کا حل اس کے سوا دوسرا نہ تھا کہ انگریزوں کا اقتدار اس ملک میں باقی نہ رہے۔

ساتھ ہی سیدنا امام الکبیر کے ان اکابر حضرت مسید احمد شہید اور حضرت مولانا اسماعیل شہید
جہاں اللہ کا قربی اسوہ بھی پیش نظر تھا۔ ان چند در چند وجوہات کے تحت ان اکابر میں یہ جذبہ بطور
قد مشترک کے موجزن تھا کہ اس ملک کی بہبود و فلاح انگریزوں کے قیام اور راج میں نہیں ہے
بلکہ ان کے یہاں سے ہٹنے اور باہر ہو جانے میں ہے۔ البتہ اس جذبہ کے ساتھ جس طاقت کی

ضرورت تھی، وہ مسلمانوں میں باقی نہ تھی اگر وہ ہوتی تو ملک ہی ہاتھ سے کیوں جاتا۔ اس لئے رات دن ان بزرگوں میں اس کا ذکر و فکر رہتا تھا، کہ یہ بھاری پتھر اس ملک کے سر سے کیسے اٹھایا جائے۔

اسی دوران میں مشہور عالم کا ہنگامہ پیش آیا۔ جب تک اس ہنگامہ کی صورت ایک غدر اور بلوہ کی رہی۔ ان بزرگوں کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن جب کہ اس نے طول کھینچ کر ملک کی رعایا کو راعی کے مقابلہ پر لاکھڑا کیا اور اب سوال ہندوستانی اور انگریز کا پیدا ہو گیا۔ جس میں اس کے امکانات نظر آنے لگے کہ انگریز کا پنجہ استبداد ڈھیلا پڑ جائے یا اس کے پیر ہی لاکھڑا ہوں تو یقیناً اس موقع سے فائدہ اٹھانا ان بزرگوں کے اصلی اور بنیادی نصب العین میں معادل ہو سکتا تھا اس لئے خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ بالخصوص جبکہ انگریزوں کے مظالم جو اس سلسلہ کے محرک تھے آخر کار اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے تو اب کون سی چیز رہ گئی تھی جو ان بزرگوں کے ارادوں میں حرکت پیدا نہ کرتی اور سیدنا الامام الکبیر کو جو اس سلسلہ کو بہت پہلے سے بچشم بصیرت و عبرت دیکھ رہے تھے اس میدان میں آنے سے روکتی۔

بہر حال جذبہ اعلا و کلمۃ اللہ مذہبی حمیت ملکی غیرت اور براداران ملک کی مظلومیت عامہ کے پیش نظر ان کے استحصال کا جذبہ وغیرہ اصلی بواعث تھے جنہوں نے ان بزرگوں کو خاک و خون کے تماشوں میں لاکھڑا کیا۔

اس سلسلہ میں انگریزی مظالم کے بعض ناگفتہ حوادث بھی ایسے پیش آئے جس سے ان بزرگوں کے عزائم میں جلد حرکت ہو گئی اور خود ان حوادث میں بھی بعض شرعی پہلو ایسے تھے کہ ان کی بناء پر ان کے عزائم کو جلد متحرک ہو جانا چاہئے تھا۔ جس میں سے مثلاً ایک یہ بھی ہے جس سے انگریزوں کی معاہدہ شکنی اور غداری کھلے طور پر واضح ہوتی ہے کہ

سب سے پہلے اس باب میں ایک اطلاع مولانا عاشق الہی مرحوم کی کتاب تذکرۃ المرشید میں ملتی ہے۔ مولانا عاشق الہی صاحب نے لکھا ہے، کہ تھانہ بھون جو سیدنا الامام الکبیر کے پیر و

حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا موطن پاک تھا۔ اسی تھانہ بھون کے قصبہ میں قاضیوں کا ایک اچھا خاصہ خوش حال رئیس خاندان بھی رہتا تھا۔ قاضیوں کے اس خاندان کے ٹوٹے پھوٹے مکانات خستہ اور بوسیدہ حال میں اب بھی تھانہ بھون میں موجود ہیں۔ سرسری نظر اس پر خاکسار کی بھی پڑ چکی ہے۔ مکانات کیا محل سراؤں کی شان ان سے اب بھی نمایاں ہے۔ بظاہر کافی آمدنی والی جاگیر حکومت مغلیہ سے قاضیوں کے اس خاندان کو ملی ہوئی تھی۔ جس زمانہ میں غدر کا فتنہ ملک میں شروع ہوا، قاضیوں کے اس خاندان کے رئیس قاضی عنایت علی خاں نامی تھے۔ مولنا عاشق الہی نے لکھا ہے کہ وہ

”تھانہ بھون کے نیک دل سرکاری ضمیمہ خواہ زمیں دار“ تذکرۃ الرشید ص ۱۱۲

تھے۔

بظاہر اس سے بھی بھی سمجھ میں آتا ہے کہ عام بغاوت سے بچھوٹ پڑنے کے بعد بھی سرکار یعنی حکومتِ مسلطہ کے ساتھ ہی خواہی اور صالحت پسندی کا رشتہ جن لوگوں سے قائم کر رکھا تھا ان میں تھانہ بھون کے قاضیوں کا یہ زمیندار رئیس خاندان بھی تھا۔ نیز تھانہ بھون کی شورش کے آغاز کے متعلق تذکرۃ الرشید ہی کے حاشیہ پر جو فقرہ درج کیا گیا ہے کہ

”اسی گھٹا ٹوپ اندھیاد میں جب کہ کئی جگہ غدر پڑ چکا تھا، اور دہلی اس کا آشیانہ تھا“

اس میں تو اس کی تصریح بھی کر دی گئی ہے، کہ عام بغاوت کی آگ ملک میں پھیل چکی تھی، اور میرٹھ وغیرہ چھاؤنیوں سے منتقل ہو کر دلی کو اپنی جدوجہد اور کشمکش کا مرکز جب لوگ بنا چکے تھے، تب کچھ دن بعد غلظتِ تاریکی ابتدا تھانہ بھون میں ہوئی۔

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ اور کہیں جو کچھ بھی ہو رہا ہو، لیکن جس قصبہ میں بتایا جاتا ہے کہ سیدنا الامام البکیر نے عملی حصہ لیا تھا، ظہورِ غدر کے کافی عرصہ کے بعد اس قصبہ کی ابتدا ہوئی۔ بہر حال مولنا عاشق الہی مرحوم کی تعداد کے مطابق ہوا یہ کہ تھانہ بھون کے ان ہی قاضی عنایت علی کے ایک چھوٹے بھائی بھی تھے، جن کا نام عبدالرحیم تھا۔ لکھا ہے کہ ریاست کے

بست و کشاد نظم و انتظام کا تعلق تو قاضی عنایت علی بڑے بھائی کے سپرد تھا، اور قاضی عبدالعظیم چھوٹے بھائی، جن کو قاضی صاحب گویا بیٹے کی طرح مانتے تھے۔ صرف امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، اب سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے زمانہ میں جب ملک میں عام ہدامنی پھیلی ہوئی تھی، بقول مولوی عاشق الہی صاحب مرحوم

”ہام رعایا میں برسوں کی دہائی ہوئی عداوت نکالنے اور خدا باغ بن کس کس زمانہ کے انتقام لینے کا وقت آگیا، جدھر دیکھو مار پیٹ، اور جس محل پر نظر کرو معرکہ آرائی و جنگ“ ص ۷۱

اس علاقہ روہیلکھنڈ میں جب سرسید احمد خاں کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ بجنور جہاں وہ حکومت کے ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اسی بجنور سے میرٹھ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن باہر قدم نکالنے کی سمیت نہیں ہوتی تھی یہ مشکل بجنور سے ہلدوڑ نامی مقام تک ڈپٹی رحمت خاں کی معیت میں پہنچ پائے۔ رات کو ہلدوڑ سے پیادہ پامیرٹھ کے ارادہ کر نکلتے، کہ موضع پلانہ کی سرحد پر بقول مولانا حالی

”دو ہزار گنوار مسلح ان کے لوٹنے اور مار ڈالنے کے ارادہ سے دوڑے“

سید صاحب کی زندگی باقی تھی، بخشی نامی ایک پدھان نے جاں بخشی کرائی، پلانہ سے گرتے پڑتے چاند پور پہنچے، چاند پور میں بھی

”کئی ہزار آدمیوں نے بندوقوں اور ہتھیاروں سے ان کو گھیر لیا“

یہاں بھی چاند پور کے رئیس میر صادق علی خاں فرشتہ رحمت بن کر آڑے آگئے اور سید صاحب کی جان بچ گئی۔ چاند پور بچھراؤں ہوتے ہوئے بہ ہزار غرابی اقبال و خیزاں جس وقت میرٹھ تک پہنچے میں سید صاحب کامیاب ہوئے تو مولوی حالی صاحب نے لکھا ہے، کہ

”ان کے (سید صاحب) کے پاس چھ پیسے اور اس پچھٹے ہوئے کرتے کے سوا جو

وہ پہننے ہوئے تھے اور کچھ نہ تھا“ ص ۶۱ حیات جاوید

الغرض حالات تو ایسے گندہ ہے تھے۔ لیکن قاضی عبدالرحیم قاضی عنایت علی خاں کے چھوڑے بھائی کو خدا ہی جانتا ہے ہاتھیوں کے خریدنے کا سودا مارا کیوں سمایا؟ سہارنپور ہی اس علاقہ کا مرکزی شہر تھا، وہیں اس شوق کی تکمیل کا امکان تھا، مولانا عاشق الہی صاحب نے لکھا ہے کہ ہاتھیوں کی خریداری کے شوق میں تھانہ بھون سے

”مع چند احباب کے سہارنپور گئے۔ اور سرائے میں کسی دوست کے پاس ٹھہرے“

یہاں تک تو واقعہ عام رنگ میں رہا۔ اب آگے تقدیر تدبیر کے جس پیچیدہ رنگ میں پیش ہوئی اور شرارہ کوہ آتش فشاں بن گیا، اس کی تفصیل سنئے، بظاہر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سہارنپور کا یا تو غدر کے قصوں میں کوئی حصہ ہی نہ تھا، یا کچھ تھا بھی تو بات دَب دبا چکی تھی، پنکھی صاحب نامی کوئی انگریز افسر قبول مولانا عاشق الہی

”باغیوں کی سرکوبی کے لئے حکم موت کا مجاز بنا کر انتظاماً ضلع سہارنپور میں معین کیا گیا تھا“ ص ۱۷۷

اتفاق کی بات کہ ایک بنیا جس کا نام تو معلوم نہ ہو سکا، لیکن مولوی عاشق الہی صاحب کے ان الفاظ سے کہ سہارنپور میں وہی بنیا

”کئی دن سے ٹھہرا ہوا تھا“

قیاس یہی چاہتا ہے کہ سہارنپور کا باشندہ نہ تھا، اب خواہ تھانہ بھون کا ہو، یا تھانہ بھون کے قریب کسی جگہ کا، تھانہ بھون کے قاضیوں کے اس خاندان سے وہ صرف اقف ہی نہ تھا بلکہ کسی وجہ سے وہ ان لوگوں سے کھنچا ہوا تھا، مولوی عاشق الہی نے جو یہ لکھا ہے کہ

”زمیندارانہ قصوں میں آدمی کے دشمن بہتر سے ہو جاتے ہیں“

اسی نوعیت کے کسی قصہ میں وہ قاضیوں کے اس خاندان کا دشمن بن گیا تھا۔ ایسے فتنہ اور فساد کے زمانہ میں تھانہ چھوڑ کر قاضی عبدالرحیم کا سہارنپور آنا اور یہ شہرت کہ ہاتھی خریدنے کے لئے آئے ہیں بات ہی ایسی تھی کہ انتقام کا معتمد موقع بننے کو محسوس ہوا کہ سارا منہ اُگیا ہے۔ یہ سچو سچو صاحب کی

کوٹھی پر پہنچ گیا اور یہ لگتی ہوئی بات اس انگریز کے کان میں پھونک دی کہ قاضی عبدالرحیم
تھانہ بھون سے،

”دہلی مکہ بھیجنے کے لئے ہاتھی خریدنے سہارنپور آیا ہوا ہے“

بنیئے کے ذریعہ سہری یہ خبر شکمبی صاحب تک پہنچی، نیز مولوی عاشق الہی صاحب کے حاشیہ
والے بیان میں یہ فقرہ جو پایا جاتا ہے کہ

”ادھر دشمنوں نے گلی کوچوں میں اس افواہ کو پھیلادیا“

جس کا بظاہر مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دہلی مکہ بھیجنے کے لئے قاضی عبدالرحیم تھانہ سے
سہارنپور ہاتھی کی خریداری کے سلسلہ میں آئے ہیں، یہ افواہ شہر میں عام طعیدہ کسی نہ کسی طرح
پھیل گئی یا پھیلا دی گئی تھی۔ نتیجہ ان ساری باتوں کا جو ہو سکتا تھا وہ ہوا، لکھا ہے کہ شکمبی صاحب
نے فوراً حکم دیا اور

”ایک گارڈ سرائے روانہ کیا گیا، اور عبدالرحیم خاں مع ہمراہیاں بالزام بغاوت جیل خانہ

بمبئی میں گئے“ ص ۷۲

کوئی شبہ نہیں کہ غلط ہو یا صحیح۔ لیکن واقعہ جس رنگ میں خود بنیئے کے ذریعہ اور شہر کی افواہ کی راہ کو
شکمبی تک پہنچا تھا، اس کے لحاظ سے اس حد تک شکمبی کی کارروائی شاید چنداں قابل اعتراض نہ
ہو سکتی تھی، بقول مولوی عاشق الہی،

”زمانہ تھا اندیشہ ناک اور احتیاط کا“ ص ۷۳

یہاں تک شکمبی نے جو کچھ کیا تھا، کہا جاسکتا تھا کہ اس وقت کے لحاظ سے احتیاط کا تقاضا
بھی شاید یہی ہو سکتا تھا۔

لیکن بات اسی حد تک پہنچ کر ختم نہیں ہو گئی، انگریزوں کا دماغ بوکھلایا ہوا تھا، اور حد
سے زیادہ اختیار بھی قدرۃ آدمی کو بد مست بنادیتا ہے۔ شکمبی نے جیل کے بعد نہ صبری سے
کام لیا اور نہ اصل واقعہ ہی کی تلاش و جستجو تفتیش و تحقیق کی زحمت گوارا کی اور اگر یہ صحیح ہے کہ

مولانا عاشق الہی کے حاشیہ والے بیان میں ہے کہ بعد کو حکومت نے پنکھی کے فیصلہ کو غلط ٹھہراتے ہوئے اقرار بھی کیا تھا کہ

”غلطی سے یہ حرکت سرزد ہو گئی“ ص ۷۷

جانتے ہیں حکومت کی یہ اعتراضی غلطی جس کا مرتکب حکومت کا نمائندہ پنکھی صاحب ہوا، کیا تھی؟ البتہ بے کسی و بے بسی ایک آدمی نہیں بلکہ قاضی عبدالرحیم ادران کے رفقاء جو تہانہ سے ان کے ساتھ آئے تھے، مولوی عاشق الہی کی اطلاع ہے کہ اس

”ناکردہ گناہ جماعت کو پھانسی کا حکم ہو گیا“

ایک ایسا مجہول الحال بنیا جس کا نام آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ کیا تھا، کہاں کا تھا، کس رتبہ کا آدمی تھا اس کی خبر اور بازاری افواہ کی بنیاد پر یہی سوچنے کی بات ہے کہ کسی فرد کو نہیں، بلکہ ایک پوری امن پسند، آئینی زندگی بسر کرنے والی جماعت کو صرف قید و بند ہی کی سزا نہیں بلکہ سب کو کسی تحقیق و تلاش کے بغیر پھانسی پر چڑھا دینا اور اس کا کچھ خیال نہ کرنا کہ جن لوگوں کو پھانسی دی جا رہی ہے ان میں علاقہ کا ایک صاحب اقتدار رئیس بھی ہے، پنکھی صاحب کا یہ مجرمانہ اقدام، اور قطعاً ظالمانہ فیصلہ قطع نظر اس سے کہ کتنا غیر مال اندیشانہ تھا، سوچنے کی بات یہ ہے کہ حکومت کے آئین اور دستور کی بے حرمتی اور رسوائی کی اس سے زیادہ بدترین شکل اور کیا ہو سکتی تھی، غدر کا لفظ جس کا انتساب اور اطلاق اس زمانہ کے ہندوستانیوں کے طرز عمل پر کیا جاتا ہے۔ خدا جانے بولنے والوں کی غرض کیا ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ وہی قانونی اصطلاح ہے، جو ہماری فقہ کی کتابوں میں مستعمل ہے تو مطلب اس کا جیسا کہ جانتے والے جانتے ہیں یہی ہو سکتا ہے کہ اس ملک کے باشندوں نے حکومت وقت سے یہ معاہدہ جو کیا تھا کہ اس کے نافذ کردہ آئین و دستور کی پابندی کریں گے، اس معاہدہ کو توڑ کر غدر یعنی قانون شکنی کے لوگ مرتکب ہوئے تھے۔

اگر غدر کا یہی مطلب ہے، تو میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں، کہ اور کہیں جو کچھ بھی ہوا ہو، لیکن

۱۷ پچھلے چند دنوں سے جیسا کہ شاید ذکر کر چکا ہوں۔ رشید کے ہنگامہ دار ہندوستانیوں کی پہلی (باقی اگلے صفحہ پر)

صنع سہارنپور میں غدر کے اس جرم کا مجرم انصاف سے بتایا جائے صحیح معنوں میں کون تھا؟ حکومت کے آئین کو کس نے توڑا۔ یقیناً پنکھی صاحب اس الزام کے ملزم ہیں، اور ان کی وجہ سے ہم غدر کے اس الزام کو اس حکومت پر بھی عائد کر سکتے ہیں جس کی نمائندگی سہارنپور میں پنکھی صاحب کرتے تھے۔ آئندہ حوادث و واقعات کے جلد جلد رونما ہونے میں بظاہر پنکھی صاحب اور پنکھی کی آمریت اور اس کی غدارانہ اور ظالمانہ چیرہ دستیوں کو بھی دخل تھا۔ اور قرآن کی سورہ شوریٰ میں اہل ایمان کے امتیازی اوصاف کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہوئے، یعنی

اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کا کہنا مانا اور نماز قائم کی اور ان کا کام باہمی مشورہ سے تھا اور جو ہمارے دئیے ہوئے میں سے خرچ کرتے تھے۔

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ وَاَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَاَرْزَقْنَاهُمْ يَنْفِقُونَ

آخر میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ

وَالَّذِينَ اِذَا اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِفُونَ (پارہ ۲۵ سورہ شوریٰ رکوع ۴)

اور جو ایسے ہیں کہ جب ان پر ظلم واقع ہوتا ہے، تو وہ برابر کا بدلہ لیتے ہیں۔

(گذشتہ صفحہ سے) جنگ آزادی وغیرہ کے عنانوں سے لوگ کرتے تھے ہیں۔ غدر کے لفظ کا اطلاق اس واقعہ پر ان کے نزدیک درست نہیں ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ غدر کے لفظ کو بلی بھی رکھا جائے۔ جب بھی سوال یہ رہ جاتا ہے کہ غدر یعنی آئین شکنی کی ابتدا کس کی طرف سے ہوئی۔ باشندگان ہند کی طرف سے یا حکومت کی طرف سے؟ میرے کو تفصیل کا یہ قد نہیں، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ کاروتوں میں چربی لگائے اور دانت سے ان کو کٹرانے کا حکم حکومت کی طرف سے دیا گیا، اور غلط ہو یا صحیح لیکن جن کو حکم دیا گیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ ان کے دین اور دھرم میں صراحتہً دخل اندازی تھی۔ احتجاج ان کا قانونی حق تھا۔ جس پر پھر دستور داد امن کے قطعاً برخلاف گورنر جنرل نے احتجاج کرنے والے سپاہیوں میں سے بعضوں کو پھانسی اور بعضوں کو غورور دیا۔ خور کی سزا دے دی، بارک پور میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ میرٹھ میں بھی جو کچھ کیا گیا، مارشل لا کے اعتبار سے بھی وہ درست نہ تھا۔ اسی طرح سہارنپور میں قاضی عید الرحیم اور ان کے رفقاء کا افواہ پر قتل بھی قطعاً قانون شکنی اور غدر تھا۔ پس اگر غور کیا جائے تو غدر کی صورت ضرور پیش آئی، لیکن ہندوستان کے باشندوں کے بجائے غدر یعنی معاہدہ کی خلاف ورزی اور آئین شکنی کی ابتدا جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے حکومت ہی کی طرف سے ہوئی۔ پس غدر کا کیوں اظہار کیا جائے۔ انکا اس کا کرنا چاہئے کہ ہم ہندوستانیوں نے غدر نہیں کیا تھا۔ اس جرم کی مجرم خود حکومت تھی۔

اسی ایمانی اقتضا کی تکمیل و تعمیل کے لئے کیا گیا تھا، جو کچھ کیا گیا تھا۔

بہر حال اس سلسلہ میں اس نقطہ نظر (انتصار) پر مقدم اٹھانا بھی بہر حال واجبات شرعیہ میں سے ایک واجب تھا، جس کی پیروی سیدنا الامام الکبیر اور ان کے رفقاء و اکابر نے اس موقع پر کی۔

نہد و ہیشاق کے اقتضاؤں سے لاپرواہی قطعاً لاپرواہ ہو کر توڑنے والوں نے آئین و دستور کو جو توڑا تھا، اور خود حکومت کے اعتراف و اقرار کے مطابق جو مجرم نہ تھے۔ ان کے ساتھ پیرو دقتی اور زیادتی، یعنی وعدہ و ان کا برتاؤ جو کیا گیا تھا، اس کے مقابلہ میں ”انتصار“ اور دادخواہی کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لئے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے، یہاں کامیابی اور ناکامی کے لئے فتح و شکست ہار اور جیت کے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ”انتصار“ کے لئے یعنی اس حالت میں جو کھڑے ہو گئے وہ کامیاب تھے، اور جس حد تک اس باب میں جتنا زیادہ پیچھے رہ گیا، اسی حد تک سمجھنا چاہئے کہ وہ ناکام ہوا۔

(۳)

حکومت وقت اور اس کے نمائندے کے غدر اور عہد شکنی کے اس فعل کے بعد یعنی جو مجرم نہ تھے، صرف جرم کے شبہ میں قطعاً خلاف آئین و دستور جن کو مجرم ٹھہرا کر موت کی آخری سزا جو کسی انسان کو کسی انسان کی طرف سے مل سکتی ہے دے دی گئی، اس یعنی کی انتصاری شکل جو سامنے آئیں، اب ان کی تفصیل سنئے، اس تفصیل میں دیکھنے کی چیز صرف یہی ہے کہ دینی ذمہ داریوں سے عہدہ براہوں نے میں ہر ہر قدم پر کن کن نزاکتوں اور دقیقہ سنجیوں سے کام لینے والوں نے کام لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ناکرہ گنہگاروں کے اس ”خون ناحق“ کی خبر سہارنپور سے جب تھا نہ بھون بھونچی اور معلوم ہوا کہ قاضی عبدالرحیم اور ان کے ایک ایک رفیق کو پھانسی دے دی گئی تو جن کے اعدا و اقربا مارے گئے تھے ان پر جو اثر چاہئے تھا وہ تو ہوا ہی۔ گویا سمجھنا چاہئے کہ سائے قصبہ ہی میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لیکن قاضی عبدالرحیم کی اصد بے کسی، بخلاف توقع موت اور اچانک اس کی خبر جب قاضی عنایت علی بڑے بھائی، ریاست کے امیر کے کانوں میں پہنچی تو بقول مولانا عاشق الہی۔

”اس صدمہ۔۔۔ یہ قاضی عسائیت علی پر رنج و غم کے پہاڑ تو ٹوٹ پڑے“

ریاست تور یا ست زندگی بھی بھائی کے پھانسی پا جانے کے بعد ان پر وہ بھر ہو گئی اور عیسا کہ کر کے بھی دکھا دیا، اب نہ ریاست ہی کا خیال، ان کے دماغ میں تھا نہ جان کی پروا اور نہ عزت و آبرو کا احساس ان میں باقی تھا۔ گویا جنون کی سی حالت ان پر طاری ہو گئی، مولانا عاشق الہی کا بیان ہے کہ

”جوشِ حزن میں بھائی کے انتقام کا خیال پختہ ہو گیا“

یہاں پہنچ کر مولانا عاشق الہی صاحب کا قلم خاص حالات کے لحاظ سے بہت زیادہ محتاط ہو گیا ہے۔ بیان ان کا انتہائی سنجیدہ ہے، کہ واقعات کی کڑیوں کے ملائے میں کافی دشواری پیدا ہو گئی۔ تاہم کچھ انہوں نے لکھا ہے، اور دوسرے بیانات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے سب کو سامنے رکھنے کے بعد واقعہ کی صحیح ترتیب میرے نزدیک حسب ذیل ہو سکتی ہے۔

یہ عرض کر چکا ہوں کہ شہر کا ہنگامہ چند دنوں میں ختم نہیں ہو گیا تھا۔ بلکہ سال بھر کے تقریباً بارہ مہینوں تک کسی نہ کسی شکل میں اس کی آگ ملک کے مختلف گوشوں میں بلند ہوتی رہی اور مرکزی مقامات دلی اور کھنویس تو کافی عرصہ تک مقابلہ و مقاتلہ کا بازار گرم رہا، صحیح طور پر اس کا پتہ نہ چل سکا کہ سہارنپور میں بے گناہوں کی پھانسی پانے کا واقعہ اس سال کے کس مہینہ میں پیش آیا۔ تاہم قرآن قیاس کا اقتضا یہی ہے کہ آغاز غدر کے چند مہینوں کے بعد یہ صورت سہارنپور میں پیش آئی۔ خبر تھانہ بھون پہنچی۔ قاضی عسائیت علی انتقام کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ یعنی اور عدوان کا معاملہ ان کے ساتھ پیش آیا تھا، انحصار اور داد طلبی کہئے، یا انتقام کے لئے تھانہ بھون اور تھانہ بھون کے اطراف و جوانب میں جو قصبات و قری تھے۔ وہاں کے باشندوں کو بھی انہوں نے پکارا۔ نانوتہ بھی منجملہ دوسری بستیوں کے تھانہ بھون ہی کے نواح کی ایک اہم اور بڑی بستی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ قاضی صاحب کے نمائندے وہاں بھی پہنچے۔

اور نانوتہ تو خیر تھانہ سے صرف چند میل کے فاصلہ پر تھا، مولانا علی صاحب نے اپنی

مخزنہ بھون میں قاضی عنایت علی خان کا محل جس کے صحن کے چوک میں جو سامنے ہے علم جہاد بلند کیا گیا تھا



سیاسی یادداشت میں ”تھانہ بھون“ کی جس مجلس شوریٰ کا تذکرہ کیا ہے۔ ابھی اس کا حال بیان کیا جائے گا۔ ہم اس مجلس میں سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا گنگوہی کو بھی پاتے ہیں۔ اسی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انتقام کا ارادہ جب پختہ ہو گیا تو گنگوہی تک لوگ بھیجے گئے، اور جن جن سے انتصار کی اس مہم میں صحیح راہ نمائی کی توقع ہو سکتی تھی ان کو تھانہ طلب کیا گیا۔ ان دنوں بزرگوں کے مرشد برحق حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا تو تھانہ وطن اور متقرہ ہی تھا، ان کے سوا حضرت حافظ محمد صنا من شہید اور مولانا شیخ محمد تھانوی بھی تھانہ ہی میں موجود تھے۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی عبدالرحیم کے پھانسی پانے کے بعد تھانہ بھون کے ردِ عمل پر چونکہ حکومت کی نظر بھی تھی، احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا، اس لئے قاضی صاحب کی طرف سے جو انتصاری کہنے یا انتقامی کارروائیاں ہو رہی تھیں، ان کی خبریں گوندوں کے ذریعہ حکومت تک پہنچتی رہتی تھیں۔ شاید اسی زمانہ کی یہ بات ہے جس کا ذکر مولانا عاشق الہی نے تذکرۃ الرشید کے حاشیہ پر کیا ہے، کہ قاضی عنایت علی کے پاس

”کمپنی کی طرف سے پیام پہنچایا گیا کہ تم فساد سے باز آ جاؤ، اپنے بھائی کو صبر کرو غلطی سے یہ حرکت سر نہ ہو گئی ہے، اگر تم انتقام سے باز آ گئے، تو تم کو تھانہ کا نواب بنادیا جائے گا“ ص ۷۷

مگر پیام کارگر ثابت نہ ہوا، جو بلا لئے گئے تھے۔ تھانہ بھون میں جمع ہو گئے۔

یہ بالکل ممکن تھا، کہ جمع ہونے کے بعد قاضی عنایت علی صاحب کی منشاء کے مطابق جیسے ہر جگہ مار دھاڑ اٹھا کر بچھاڑ کی اندھا دھند کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ تھانہ بھون میں اسی کو شریعہ کر دیا جاتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ قرآن کی مندرجہ بالا آیت میں جہاں یعنی کے بعد انتصار کو ایمانی زندگی کا امتیازی وصف قرار دیا گیا ہے۔ وہیں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ

وامرھم شورویٰ بینہم | اور ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے ہوتے ہیں۔

ایمانیوں کی شان ہے۔ مولانا طیب صاحب کی سیاسی یادداشت میں ہے کہ تھانہ میں مجلس شوریٰ

قائم ہوئی،

”جس میں حضرت گنگوہی، اور دوسرے علماء شریک تھے“

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ اس مجلس میں

”باہم علمی گفتگو چھڑی“

سوال یہی تھا کہ واقعات جس رنگ میں پیش آچکے تھے، یعنی اپنے قانون کو توڑ کر حکومت اور حکومت کا نمائندہ غدار اور قانون شکنی کا مرتکب ہو چکا تھا۔ اس بنی کے مقابلہ میں انصاف کے فرض کو محسوس کرتے ہوئے، جہاد و قتال پر آمادہ ہونے کا وقت کیا آگیا ہے؟ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

”اس موقعہ پر جہاد کے سب خلاف تھے، صرف حضرت نانوٹی رحمۃ اللہ علیہ مدعیاً

طریقہ پر اس میں پیش پیش تھے“

تذکرۃ الرشید کے حاشیہ پر مولانا عاشق الہی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

”سنایا گیا ہے کہ قاضی عنایت علی کو ہمارے اکثر دینی حضرات نے اس کا ردوائی سے

منع کیا۔ ص ۱۶۱

اس سے بھی مولانا طیب صاحب ہی کے بیان کی تائید ہوتی ہے اور مطلب ان کا بھی یہی ہے کہ ابتداء میں اس قاہرہ حکومت کے خلاف بغیر مؤثر اسباب جہاد کیلئے کھڑے ہونے کو مجلس شور کے ارکان کی اکثریت نامناسب ہی قرار دیتی رہی۔ واللہ اعلم بالصواب مخالفت کرنے والوں کی طرف سے جو نقاط نظر پیش کئے گئے تھے، وہ کیا تھے۔ مولانا طیب صاحب نے اجمالاً پس اتنا لکھا ہے کہ،

”سب نے جو حجتیں خلاف میں پیش کیں، حضرت (نانوٹی) نے جوش کے ساتھ

سب کا مسکت جواب دیا“

میرے سامنے نہ مخالفت کرنے والوں کی حجتیں ہیں اور ان جتنوں کا جو مسکت جواب دیا گیا تھا،

اس کے علم سے بھی محروم ہوں۔ بظاہر یہی خیال گزرتا ہے، کہ مخالفت کرنے والوں کے سامنے قوت و ضعف کا سوال ہوگا، مقابلہ میں ناکامی اور شکست کے سوا جیسا کہ ظاہر ہے اسباب کا افتضا تھا، کسی دوسرے احتمال کی مشکل ہی سے گنجائش پیدا ہو سکتی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ بغی کے بعد ”انقصار“ کو مومن کی شان قرآن قرار دے چکا تھا۔ اس کا جواب خود ہی سوچنے لگ دیا جاسکتا تھا۔

بہر حال تھانہ بھون کی ”اس مجلس شوریٰ“ کے مکالمہ و مباحثہ میں جو کچھ بھی کیا گیا ہو، لیکن آخری نتیجہ سامنے ہی آیا، کہ جس بات کی دعوت دی گئی تھی اس سے اعراض و تقویٰ کوئی وجہ وجہ ارکان کی طرف سے پیش نہ ہو سکی۔ صرف مجلس کے ایک رکن حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی جو حضرت شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے، اور سیدنا الامام الکبیر سے عمر میں بہت زیادہ بڑے تھے۔ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے، کہ انہوں نے آخری عذریہ پیش کیا، کہ

”اگر آپ کی جیتیں اور باتیں مان لی جائیں، تو سب سے بڑی شرط جہاد میں نصب امام کی ہو۔

امام کہاں ہے کہ اس کی قیادت میں جہاد میں کیا جائے۔“

سوال بالکل اسلامی روح کے عین مطابق تھا۔ جہاں تک واقعات سے پتہ چلتا ہے، مشہد کے ہنگامہ میں اسی روح کا خیال کم کیا جاتا تھا۔ ”ہو“ کے ساتھ لوگ اٹھ کھڑے ہوتے تھے، کثرت جب تک وحدت کے نظام میں جکڑی نہیں جاتی۔ صحیح نتائج کی امید مشکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔ حسین اور دنیا کے سارے اجتماعی کاروبار میں اسلام کو اس اصول پر جتنا اصرار ہے۔ اس کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ نماز جو ظاہر ہے کہ بندے اور خدا کے دعائی و عبادتی تعلق کا منظر ہے۔ لیکن اس میں بھی کثرت کو وحدت کے قالب میں ڈھالنے کے لئے امام بنایا گیا ہے۔ سفر میں بھی چند آدمی ساتھ ہوں تو حکم دیا گیا ہے کہ امامت اور امارت کا نظم اس میں بھی قائم کر دیا جائے۔

حدیثوں میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ غیروں کے مقابلہ میں چاہئے کہ مسلمان کبید واحدہ (ایک ہاتھ کی شکل میں) اپنے آپ کو پیش کریں، یا دیوار سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہر مسلمان کی

حیثیت اس دیوار کی اینٹوں کی سی ہے جس میں ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا لے رہی ہو۔ بہر حال ”جہاد“ جیسے اہم اجتماعی اقدام کے لئے امارت و امامت کا مسئلہ بدیہی ہے، صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ مولانا شیخ محمد صاحب کی طرف سے سوال جو اٹھایا گیا تھا اس کا صحیح مقصد کیا تھا؟ جس لب و لہجہ میں ان کا بیان ہم تک پہنچا ہے۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ تھانوی غالباً یہ خیال کئے ہوئے تھے کہ تھانہ بھون جیسے مقام میں اس شرط کی تکمیل آسان نہ ہوگی۔ بظاہر قاضی عنایت علی قصبہ کے رئیس بھی تھے۔ اور سچ پوچھئے تو یہ سارا ہنگامہ ان ہی کے انتقامی جوش اور دعوت انتصار کی بنیاد پر برپا ہوا تھا، میں صحیح طور پر ان کے شخصی حالات سے واقف نہیں ہوں، لیکن مسلمانوں کو ہندوستان کی حکومت سے محروم کر دینے کا فیصلہ قدرت جس زمانہ میں کر چکی تھی، اس زمانہ کے عام حالات کی بنیاد پر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ

”قاضی عنایت علی خاں پسر نجابت علی خاں رئیس اعظم زمیندار تھانہ بھون ضلع مظفر گڑھ“

کے الفاظ میں مولانا عاشق الہی صاحب اس زمانہ کی جس ہستی کو روشناس کراتے ہیں، وہ رئیس اعظم زمیندار ہی ہو کر رہ گئے تھے، یا قاضی ہونے کے لئے جن صفات اور خصوصیات کی ضرورت ہے، ان کی بھی نمائندگی کرتے تھے۔ عام حالت تو اس زمانہ کی یہی تھی کہ خاندان کی کسی پشت میں قاضی کا عہدہ جس کو بھی کبھی میسر آگیا تھا، وہ خاندان قاضیوں کا خاندان بن جاتا تھا، گویا سید و شیخ پٹھان وغیرہ جیسے خاندانوں کے ساتھ ساتھ اس ملک میں قاضیوں کی بھی ایک نسل ہی پیدا ہو گئی تھی، اور سید شیخ کے الفاظ کے ساتھ مسلمانوں کی اس نسل کے افراد اپنے نام کے آگے قاضی کے لفظ کے استعمال کو اپنا خاندانی حق تصور کرتے تھے۔ خواہ قضا و افتاد سے ان کو دور کا بھی تعلق نہ ہو، اب چاہے دل چسپ لطیف ہو یا دل گماز سانحہ جو چاہے۔ مگر واقعہ کی صورت یہی ہو گئی تھی۔ گویا جج یا ڈپٹی وغیرہ کی ملازمت حاصل کرنے کے بعد اس زمانہ میں، تجوں یا ڈپٹیوں کی نسل جس پر پیدا ہو جائے۔ کچھ اسی قسم کے مخالفہ کی فیکل تھی۔ سرکاری عہدوں، اور مناصب کے پشتینی ہو جانے کی مصیبت جس کا شکار مغل حکومت اپنے ایام سرکرات میں ہو گئی تھی۔ شاید اس قسم کی بعض نسلیں کے

پیدا کرنے میں اسی قطعاً غیر شرعی بلکہ غیر انسانی رواج کو زیادہ دخل تھا۔

کچھ بھی ہو، قیاس کا اقتضار یہی ہے، کہ قاضی عنایت علی صاحب میں شیخ تھانوی پارہے ہوں گے کہ امامت کی شرعی شروط نہیں پائی جاتیں۔ امام یا امیر ہو سکتے تھے تو وہی ہو سکتے تھے۔ خیال یہی ہو گا کہ شرط کے مفقود ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ مشروط یعنی جہاد کی فرضیت کا مطالبہ بھی مفقود ہو جائیگا۔ مجلس شوریٰ کی اکثریت کی جو رائے تھی وہی پاس ہو جائے گی، لیکن اچانک دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر جواب میں فرما رہے ہیں کہ

”نصب امام میں کیا دیر لگتی ہے“

گو یا ایسا معلوم ہوا کہ سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک مسئلہ سوچ بچار کا بھی مستحق نہ تھا، شاید لوگ سوچ ہی رہے ہوں گے، کہ حضرت والا آخر کیا کہنا چاہتے ہیں اور اتنا دشوار مسئلہ اچانک اتنا سہل و آسان کیسے بن جائے گا کون جانتا تھا کہ جس کے متعلق تصور بھی کسی کا گویا نہ ہو گا کہ جہاد کی امارت قیادت کی باگ اپنے ہاتھ میں لیں گے، اس کی طرف ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے سنا جا رہا تھا کہ سیدنا الامام الکبیر فرما رہے ہیں، (مولنا طیب کی روایت کے الفاظ ہیں)

”حضرت مرشد برحق حاجی صاحب موجود ہیں، ان ہی کے ہاتھ پر جمیعت جہاد کی جائے“

مسجد میر محمد صاحب کے حجرے میں بہمنہ والے ایک فقیر بے نوا، سیدنا و سیدالکل حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات مراد تھی۔ اس کے سوا کہ مجلس پر اس تجویز کے پیش کرنے کے ساتھ ہی سناٹا چھا جائے اور دوسری صورت ہی کیا تھی، کس کی مجال تھی کہ امامت کی تمام شروط کو پورا کرنے والی شخصیت کا ملہ پر قدح کی ہمت کرتا، کلام اور فقہ کی کتابوں میں امام کے لئے جو مشہد طیں ضروری قرار دی گئی ہیں، وہی نہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ مستحبات اور ادلی ہونے کی حیثیت جن امور کو حاصل ہے۔ حاجی صاحب کا وجود باوجود سب ہی کا جامع تھا۔ مولنا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ اسی لئے

”سب ساکت ہو گئے اور متفقہ طور پر سب نے حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی“

مولنا عاشق الہی مرحوم نے بھی تذکرۃ الرشید میں اسی واقعہ کا ذکر کرنا چاہا ہے، لیکن جس زمانہ میں اپنی کتاب وہ لکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اتنے کھلے الفاظ میں واقعہ کا تذکرہ نہ کر سکتے تھے، اور نہ ایسا کرنا مناسب تھا، انھوں نے لکھا ہے کہ ”لوگ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ کسی حاکم کی سرپرستی کے بغیر گزراں دشوار ہے، اور یہ عرصہ پیش کیا کہ ”آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں، اس لئے دنیاوی نظم حکومت کا بار بھی اپنے سر رکھیں

اور امیر المؤمنین بن کر ہمارے باہمی قسے چکا دیا کریں“

یہی مقام ہے، جہاں مولنا عاشق الہی کے پیرایہ بیان میں تو یہ کارنگ پایا جاتا ہے، کہنا وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ حاجی صاحب کے دست مبارک پر جہاد کی بیعت کرنے کا ارادہ لوگوں نے پیش کیا، اور اطلاع دیتے ہیں، کہ

”اعلیٰ حضرت کو ان کی درخواست کے موافق ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا“

مطلب وہی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے حاجی صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی تجویز پیش کی لوگ راضی ہو گئے، اور حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس تجویز کو قبول کر لیا، یوں وہ اس علاقہ کے مسلمانوں کے ”امیر المؤمنین“ اور دینی امام ہونے کے ساتھ ”سیاسی امام“ بھی بن گئے، گویا کثرت منشرہ کو شرعی حکم کے تحت پہلے وحدت کا قالب امام و امیر کا انتخاب کر کے کیا گیا، اب سائے پر آگندہ افراد ایک شیرازے میں منسلک ہو گئے، اور قصہ صرف اسی سرسری تنظیم کی حد تک ختم نہیں کر دیا گیا، بلکہ مولنا طیب صاحب نے مولنا منصور انصاری کے حوالے سے سیدنا الامام الکبیر کے رفیق مولنا منیر صاحب کی زبانی جو روادار سنائی ہے، اس سے مزید تفصیلات کا بھی پتہ چلتا ہے۔

گویا اجتماعی حیثیت جو ایک وحدانی جسد کے سیکڑ میں شکل پذیر ہو چکی تھی، چاہا گیا کہ اس کے

رئیسہ و مردسہ اعضاء کو متعین کر کے ہر ہر عضو کا خاص خاص وظیفہ بھی مقرر کر دیا جائے، سچ تو یہ ہے کہ کسی تنظیم کو مکمل کرنے کے لئے جو کچھ بھی اس وقت کرنا چاہئے تھا، سب کچھ کر لیا گیا تھا۔ مولنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ

”حضرت اقدس مولنا حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ مرکز بیعت جہاد تھے اور حضرت اقدس مولنا حافظ محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ سب سے بڑے علم بردار جہاد تھے، حضرت مولنا ارشدید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ جامع مجاہدین تھے کہ وعظ و پند و نصیحت و ترہیب سے مجاہدین کو مختلف مواقع دیہات و قصبات سے جمع کر کے میدان میں لائیں، حضرت نانوتوی قدس سرہ امیر عسکر تھے۔“

مولنا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ کابل میں مولنا منصور انصاری مولنا محمد منیر صاحب کی اس روایت کو نقل کرتے ہوئے، اسلامی ممالک خصوصاً کابل کی عصری اصطلاحوں میں تنظیم کے ان ہی پہلوؤں کی تبصیر ان الفاظ میں کرتے تھے۔ یعنی حاجی صاحب قبلہ کی حیثیت تو خیر امیر المؤمنین کی تھی، ان کے سوا،

”حضرت حافظ ضامن شہید، امیر جہاد گویا صدر مجلس جنگ تھے، مولنا محمد قاسم صاحب امیر الافواج چیف کمانڈر مولنا محمد منیر صاحب مولنا نانوتوی کے یاد دہری، فوجی سکریٹری حضرت مولنا گنگوہی وزیر لام بندی تھے۔“

الغرض تھانہ بھون میں جہاد کی اس انتظامی مہم کے لئے شرعی تنظیم کے مطابق جو کچھ بھی کرنا چاہا کرنا تھا، وہ سب کچھ جب کر لیا گیا، اور گو قاضی عنایت علی صاحب کو کوئی خاص عہدہ تنظیم کی اس اجتماعی ہیئت میں نہیں دیا گیا، لیکن ظاہر ہے کہ علاقے کے وہ رئیس تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مالی امداد کا بار زیادہ تر ان ہی پر ڈالایا ہوگا، اور جب اپنا سب کچھ اس ماہ میں قربان کرنے کیلئے وہ تیار ہو چکے تھے، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس ذمہ داری کو بخوشی وہ قبول نہ کرتے، مجاہدوں کے طعام و قیام آلات حرب کی فراہمی، اور ازین قبیل دوسرے جہادی مصارف کے متکفل جہاں تک میں سمجھتا ہوں،

تھانہ بھون کی اس ہم میں قاضی عنایت علی ہی کو ہونا چاہئے تھا، اگرچہ اس باب میں کوئی صریح شہادت مجھے نہیں مل سکی ہے۔

خیر جہاد کی شرعی تنظیم کا مسئلہ تو طے ہو گیا، لیکن شرکت جہاد کے بعض ذیلی شرائط کی تکمیل کا مرحلہ باقی تھا، مطلب یہ ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ والدین یا ان میں کوئی ایک اگر زندہ ہو تو ان سے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت بھی شرعاً ضروری ہے۔ فقیہما آجماہل (ان دونوں یعنی والدین کی خدمت گزاری میں جہاد کرو) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صاحب کو حکم دیا تھا، جن کے والدین زندہ تھے، اور جہاد میں شریک ہونے کی آرزو دربار نبوت میں پیش کی تھی۔

اس باب میں نہ اوروں کا حال ہی مجھے معلوم ہے، اور نہ اس کتاب میں ان کے متعلق ذکر کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ اس شرعی شرط کی تکمیل میں جو صورت پیش آئی، مختلف یادداشتوں میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شرعی تنظیم کے بعد جب طے ہو گیا کہ رزم کا بازار گرم ہو کر رہے گا اور ظلم کرنے والوں سے بدلہ بہر حال لیا جائے گا، تو سیدنا الامام الکبیر جن کے والدین اس زمانہ تک زندہ تھے، آپ کے دل میں یہ دینی تقاضا پیدا ہوا کہ والدین سے اجازت کے مرحلہ کو بھی طے کر لیا جائے اسی تقاضے کے زیر اثر تھانہ سے آپ نانوتہ تشریف فرما ہوئے۔ مولوی طاہر صاحب سلمہ نے اپنی یادداشت میں اپنے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد مرحوم کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ، ”شہدہ میں جب اس پر اتفاق ہو گیا کہ اس وقت جہاد فرض ہے، تو حضرت اپنے مکان (نانوتہ) تشریف لے گئے، چونکہ اپنی والدہ کے بہت ہی مطیع اور فرماں بردار تھے، روزانہ دونوں وقت پاؤں دبانان کا معمول تھا۔“

اس معمول کے مطابق ابھی بھی جیسا کہ آگے بیان کیا گیا ہے،

”اپنی والدہ ماجدہ کے پاؤں دباتے ہوئے (ماں کو مخاطب کر کے) فرمانے لگے کہ خدا کی

راہ میں جان اور مال کو فدا کر دینا ایسا ہے، اور جو خوشی سے اپنی جان خدا کے حوالہ کر دیتا ہے، اس کا ایسا درجہ ہے وغیرہ۔“

مطلب یہ ہے کہ اظہارِ دعا سے پہلے جہادِ راہِ حق کی جان فروشیوں، قربانیوں کے متعلق قرآن و حدیث میں جو فضائل بیان کئے گئے ہیں، پہلے اپنی ماں جان رحمۃ اللہ علیہا کو سمجھاتے رہے، روایت میں اس کے بعد ہے کہ

”اس قسم کی پر اثر تمہید بیان کر کے عرض کیا کہ جہاد فرض ہو چکا ہے۔“

اس سے مطلع کرنے کے بعد اپنے عزمِ ماسخ کا اظہار والدہ ماجدہ کی خدمت میں یس الفاظ فرمائے گئے کہ دین کا

”یہ مسئلہ ہے کہ اطاعتِ خالق میں والدین کی اطاعت اگر معارض ہو، تو وہ ساقط ہو جاتی ہے۔“

مقصد مبارک یہی تھا کہ والدین کو میری ذاتی خدمات کی ضرورت نہیں، نہ ذاتی خدمات کی حاجت تھی، نہ مالی امداد کی، ایسی صورت میں خدائی مطالبہ کی تعمیل میں بلا وجہ رکاوٹ اگر والدین کی طرف سے بھی ڈالی جائے گی تو شرعاً اس قسم کی بے بنیاد رکاوٹ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ والدہ ماجدہ سے یہ بھی فرمایا کہ

”میں چاہتا ہوں کہ آپ خوشی سے مجھے اس کی اجازت دے دیں، تاکہ آپ کو

بھی اجر ملے۔“

حافظ محمد احمد صاحب نے ان الفاظ کے بعد روایت کو جس پیرایہ میں ادا کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آگے کی تفصیل براہِ راست اپنے والد ماجد سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہوئی تھی، حافظ صاحب مرحوم کا بیان ہے،

”چنانچہ خود (سیدنا الامام الکبیر) فرمایا کرتے تھے کہ میری والدہ بڑی سمجھدار تھیں، فرماتے

لگیں کہ بھائی تم اللہ ہی کی چیز ہو، میں خوشی سے تمہیں اللہ کے سپرد کرتی ہوں۔“

اداسی کے ساتھ ایمان و یقین کے گھرانے کی اس پردہ نشین خاتون نے اپنے اکلوتے جوان

بیٹے کو خطاب کر کے یہی فرمایا کہ

”اگر تم زندہ آگے تو میں تم سے مل لوں گی، نہیں تو آخرت میں انشاء اللہ تعالیٰ جلد ہی

ملنا ہوگا۔“

عرض کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کی والدہ بی بی حبیبہ رحمۃ اللہ علیہا کو کتابی تعلیم کے حاصل کرنے کا موقع نہ ملا تھا، جو کچھ بھی علم و معرفت کی روشنی ان کے اندر تھی، اپنے بزرگوں اور ماحول کی پیداوار تھی۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں، سکینٹ کی اس خنکی اور طمانیت کی اس ٹھنڈک کو کہ مشاہدہ والی زندگی اور مرنے کے بعد آنے والی ایمانی زندگی، دونوں کی حیثیت میں بال برابر فرق ان کے احساس میں نہیں پایا جاتا، ایسا معجزہ ہوتا ہے کہ ان نیک دل مومنہ خاتون کی نظر میں شہادت و غیب دونوں ایک ہیں، سب سے زیادہ حیرت تو مجھے اس فقرے کے لفظ ”جلد ہی“ پر ہے، جس کی یافت باسانی بڑے بڑے صاحب علم و بصیرت کیلئے بھی دشوار ہے۔ عام خیال قیامت اور آخرت کے متعلق تاخیر اند درنگی ہی کا ہے۔ کون جائے کہ کروڑوں برس بعد آخرت کا میدان سامنے آئے گا، یا لاکھوں برس بعد۔ لیکن یہ تاخیر اور درنگی صرف ان ہی لوگوں کے لئے ہے، جنہوں نے اب تک سمجھا ہی نہیں ہے کہ تاخیر اور درنگی کا موصوف یعنی خود زمانہ کی اصل حقیقت کیا ہے لیکن

لے جنہوں نے قدیم یا جدید فلسفہ کا مطالعہ نہیں کیا ہے، ممکن ہے ان کے لئے یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہو، لیکن آٹھویں بہت بھی نظر فلسفہ میں جو رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ زمانہ جو عوام کے نزدیک سب سے زیادہ سمجھی اور بھی چیز ہے، لیکن کہتے ہیں کہ اس کے سامنے زمانہ کا مسئلہ حب آیا تو سوچ بچار کے بعد اس کو اعلان کرنا پڑا کہ اس سے زیادہ غریب فی السطریۃ کوئی حقیقت مجھے معلوم نہیں ہوتی۔ یعنی فنا زیادہ سرچئے اسی قدردہ جیتاں بنتی چلی جاتی ہے۔ زمانہ یعنی سال و ماہ اور گھنٹہ منٹ دقیقے پر جسے ہم تقسیم کرتے ہیں، ذرا سوچئے تو سہی کہ جو اس میں سے کسی عاصہ کا اس سے تعلق ہے، میں پوچھتا ہوں کہ جب دنیا جمرات کے دن کی شفا و نعمت کیا ہے؟ کیا وہ کوئی رنگین لال پتلی چیز ہے جسے ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ کیا چھو کر چکپک کر، سو گنگہ کر، سن کر ہم نے ان کو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نہیں کے سوا اس کا جواب اور کیا ہو سکتا ہے، پھر زمانہ کے جاننے کا دعویٰ آخر کس بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی زمانہ کو ہم اپنی مذہبی معلوماتیں شمار کرتے ہیں، اصل یہ ہرگز زمانہ کی حقیقت جب تک واضح نہ ہو اور اور سویرا یا تاخیر و تعیل کے متعلق ہمارے احساں کی بنیاد صحیح واقعہ پر قائم نہ ہوگی، تفصیل کیلئے موطا کا مطالعہ کرنا چاہئے، ممکن ہے سیدنا الامام الکبیر کے نظریات کی سلسلے میں کتاب کے دوسرے حصہ تک یہ بحث

سمجھے سمجھائے بغیر ان کے قلبِ مومن کا فیصلہ تھا کہ آخرت والی یہ گھڑی جلد ہی آنے والی ہے۔ بہر حال جلد ہی کے اس لفظ کو ان جیسی مومنہ غافلہ کی زبان کا شعوری لفظ سمجھے یا غیر شعوری، لیکن اپنے اکتوتے تحت جگر کو بغیر کسی جزع و فزع کے خندہ چینی کے ساتھ رخصت کر دینا، یقیناً کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ بالیک شاعر اباؤن کا تنخیں خدا جانے اسکو کس پیرزہ میں ادا کرنا۔

سیدنا الام الکبیر کے لئے ماں ہی کا مرحلہ سب سے بڑا مرحلہ تھا۔ لیکن آسان کر بنے والے نے اس کو آسان بنادیا۔ ان کے بعد دوسری منزل پدمہریان شیخ اسد علی صاحب مرحوم کی اجازت کی تھی، مولوی طاہر صاحب کی یادداشت میں ہے

”اس کے بعد (یعنی والدہ ماجدہ کی رضامندی حاصل کر لینے کے بعد) حضرت (نانوتوی) اپنے والد کے پاس تشریف لے گئے۔“

آپ کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب جیسا کہ مولوی طاہر صاحب نے لکھا ہے کہ ”نانوتہ میں ہمارا جو جدی مکان ہے، اس میں ایک چبوترہ بھی تھا اور حضرت مرحوم (نانوتوی) والد مغفور چبوترے پر کھڑے تھے۔“

غالباً اس وقت تک سیدنا الام الکبیر کے عزم اور ارادہ کی خبر شیخ اسد علی صاحب کو نہ تھی، جہاں وہ کھڑی تھے، وہیں پہنچ کر بیان کیا گیا ہے کہ

”نہایت عاجزی، اور نرمی کے ساتھ اپنے والد سے اس عزم کو ظاہر کیا۔“

شیخ اسد علی صاحب، آپ کے والد ماجد جن دنگ کے آدمی تھے، اس پر تفصیلی بحث کر چکا ہوں، مولوی طاہر صاحب نے اس موقع پر لکھا ہے کہ

”ہمارے پردادا (شیخ اسد علی صاحب) چونکہ پڑھے لکھے زیادہ نہ تھے، اس لئے

لے ہمارے وطن ہندوستان کی مقامی روایات کا مجموعہ جو رامائن کے نام سے مشہور ہے۔ بالیک اسی کتاب کے مصنف کا نام ہے، رام چندر جی روایت کے پیروانی ماں کو مشلیا سے بن باس ہونے کے لئے جس وقت اجازت طلب ہوئے ہیں، اور ماں سے بیٹا جس وقت رخصت ہونے لگا ہے۔ شاعر نے اس واقعہ کو جن ناک تعبیروں میں ادا کیا ہے۔ ان کی طرف میرا اشارہ ہے ۱۲

انہوں نے کھڑتا ہوا جواب اس طرح دیا کہ حضرت کی والدہ سے کہا کہ ذرا میری پگڑی لے آؤ، وہ لے آئیں، اسے باندھا۔

جہادی ہم میں اجازت طلبی کی درخواست کے جواب میں شیخ صاحب کا یہ طرز عمل یعنی پگڑی کا منگوانا اور اس کو باندھنا، ظاہر ہے کہ کچھ عجیب سی بات تھی، لکھا ہے کہ بجائے ہاں، نہیں کے شیخ صاحب کے اس طرز کو دیکھ کر سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا

”باداجی! یہ کیوں باندھ رہے ہیں“

تب اپنے دل کی کیفیت کا اظہار شیخ صاحب نے ان الفاظ میں کیا کہ

”تیرے ساتھ سرکٹانے آخرباؤں گا بھی“

مولوی طاہر صاحب کی روایت میں ہے کہ اپنے والد ماجد کی زبان سے یہ سن کر سیدنا الامام الکبیر نے والد کو مخاطب کرتے ہوئے،

”کسی قدر آواز سے یہ فرمایا کہ آپ میری وجہ سے کیوں سرکٹاتے ہیں۔ اگر آپ کو سرکٹانا ہے تو اللہ کے لئے کٹائیے اور میرے ساتھ چلئے“

مولوی طاہر صاحب کی یادداشت میں روایت سوال و جواب کے ان ہی الفاظ پر مشتمل ہے، اسی کے ساتھ مولانا طیب صاحب کی یادداشت کی اطلاع کو بھی جب ہم پیش نظر رکھ لیتے ہیں، یعنی انہوں نے والد کی اجازت طلبی کے مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”حاضری جہاد کی اجازت دینے میں کسی حد تک حضرت کے والد ماجد نے پس پیش کیا تھا“ (مدۃ مقالہ - حضرت نانوتوی کا جوش جہاد) ●

اس سے ہم اسی نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ پگڑی طلب کر کے باندھنے اور اپنے سرکٹانے کا ذکر شیخ اسد علی صاحب نے جو فرمایا تھا، غالباً لب و لہجہ میں ان کے طنز کی آمیزش تھی۔ یا ایک خیال یہ بھی ہے کہ حکومت قائمہ مسئلہ افرنجیہ کی دار و گیر کے اندیشہ کو شیخ صاحب نے اس طریقہ سے ظاہر کیا۔ گویا بیٹے کو سمجھانے لگے کہ تیری وجہ سے میں پھانسی کے تختے پر چڑھایا جاؤں گا۔ قبل

اس کے کہ حکومت مجھے پکڑے، پکڑی باندھ کر خود پھانسی پر چڑھنے اور گردن کٹانے پر طنز و لہجہ میں اپنی آمادگی وہ ظاہر کر رہے تھے۔ مطلب یہی تھا کہ جس چیز کی اجازت ان سے چاہی جا رہی تھی، اس سے وہ راضی نہ تھے۔ سیدنا الامام الکبیر کا یہ فرمان کہ میرے لئے سر کیوں کٹائیے۔ اشد کیلئے کٹائیے، اور میرے ساتھ چلئے“ اس سے کچھ یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔

بہر حال حاصل وہی ہے۔ جیسا کہ مولوی طیب حسنی لکھا ہے کہ اجازت دینے میں آپ کے والد حسنی پس و پیش سے کام لیا اور قبول ان ہی کے اس وقت

حضرت نے لا طاعة لمخلوق فی معصیۃ الخالق (یعنی خدا کی نافرمانی کا جہاں اندیشہ ہو، وہاں مخلوق کی فرماں برداری کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ شریعت کے اس علم دستور پر عمل فرمایا)“ ص ۷۷ مقالہ مذکور

اس اجمال کی تفصیل مولوی طاہر صاحب کی یادداشت میں یہ ہے کہ والد سے مذکورہ بالا گفتگو فرمانے کے بعد سیدنا الامام الکبیر ان ہی سے یہ کہتے ہوئے کہ

”بندہ رخصت ہوتا ہے“

”السلام علیکم“ کے ساتھ اپنے والد ماجد کے سامنے سے رخصت ہو گئے، جس سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ والد ماجد سے اجازت طلبی اور رضامندی میں آپ کامیاب نہ ہو سکے لیکن لانا طیب صاحب کی یادداشت میں جو یہ اطلاع دی گئی ہے، کہ

”مگر پھر والد بھی راضی ہو گئے“

اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ شیخ اسد علی نے شروع میں اپنے جس خیال یا احساس کا اظہار کیا، شاید وہ فوری جذبات کا نتیجہ تھا۔ لیکن ٹھنڈے دل سے جب تمام پہلوؤں پر غور و فکر کر کے واقعہ ان کو ملا، خصوصاً بیوی سے ملنے کے بعد جب ان کو معلوم ہوا ہوگا، کہ باوجود دعوت ہونے کے جب خوشی سے بیٹھ کر اللہ کی راہ میں سرفروشی کی اجازت دے چکی ہیں، تو مرد ہونے کا اقتضا جو کچھ ہونا چاہئے تھا، اس سے ان کا متاثر ہونا بعید نہیں ہے۔ اسی لئے مولوی طاہر صاحب نے واقعہ کی

توجیہ کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے کہ ”میرے پردادا صاحب زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے“ گویا اجازت دینے میں پس و پیش کرنے کی وجہ مولوی طاہر صاحب کے نزدیک کم علمی تھی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ شیخ صاحب کی تعلیمی و عملی زندگی کا ذکر کر چکا ہوں۔ کم از کم اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ اپنی اہلیہ محترمہ سیدنا الامام الکبیر کی والدہ ماجدہ کے مقابلہ میں ان کی تعلیمی سطح بلند اور بہت زیادہ بلند تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی توفیق کا تعلق بجائے علم کے ایمان سے ہے، اور اس موقع پر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عورت کا ایمان مرد سے زیادہ ذنی ثابت ہوا، اور یہ خدائی دین ہے، یوتیک من یشاء

خیر جس طرح بھی ہو، آگے پیچھے والدین کی رضا مندی کا قصہ ختم ہوا، اور سیدنا الامام الکبیر ناتو نہ ہی اپنے ”جہادی مرکز“ مستقر تھانہ بھون پہنچ گئے۔

اس کے بعد واقعات جس رنگ میں پیش آئے، ان کی کوئی تفصیلی روداد میرے پاس نہیں ہے۔ تاہم جنتہ جنتہ مختلف و شائق میں جو چیزیں ملی ہیں، ان کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کروں گا۔

اس واقعہ کا ذکر مولانا عاشق الہی صاحب نے تذکرۃ الرشید کے حاشیہ میں کیا ہے، واقعہ کی ابتدا مولوی صاحب کے بیان

**تھانہ بھون کے مستقر سے پہلا
حملہ باغ شیر علی کی سڑک پر**

کے مطابق یوں ہوئی کہ انگریزی فوج کے

”چند فوجی سوار کہاڑوں کے کندھوں پر کار تو سوں کی کئی ہتنگیاں لدوائے سہارنپور سے

کیرانہ کی طرف جا رہے تھے“ ۳۷

یہ وہی زمانہ ہے کہ جہاد کا مسئلہ تھانہ بھون میں تمام منزلوں سے گذر کر فیصلہ کی آخری صورت اختیار کر چکا تھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی فوج کے سوار جنگی ذخیرے یعنی کار تو سوں کو لئے ہوئے سہارنپور سے کیرانہ جا رہے تھے۔

یہ ایک ایسا واقعہ تھا کہ جس کی طرف مجاہدوں کی توجہ کا منعطف ہو جانا ایک قدرتی بات تھی، اور

”اس فساد (یعنی باغ شیر علی کی سڑک والے فساد) کی خبر منظر نگار (مستقر ضلع) پہنچی تو

حاکم ضلع کی طرف سے تھانہ پر فوج کشی کا حکم ہو گیا۔

مولانا عاشق الہی نے یہ اطلاع دی ہے، کہ حکومت کے اس ارادے سے یعنی تھانہ بھون پر فوج کشی کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس کی خبر جب تھانہ بھون پہنچی اور اسی کے ساتھ ”شاملی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کی جھوٹی خبر پکڑ (تھانہ بھون میں) تقارہ بجا دیا گیا، اور جتھے کا جھٹا شاملی پر چڑھ دوڑا، اور کیا جو کچھ کیا“ ۳۷

شاملی جو آج کل سہارنپور سے دلی شاہدہ جانے والی چھوٹی لائن کا ایک اسٹیشن ہے، اور شہرہ مردم خیز قصبہ کاندھلہ کے قریب ہے، اس قصبہ میں ایک چھوٹی سی گڑھی بھی تھی جو شاید کسی کسی شکل میں آج بھی موجود ہو، تھانہ بھون کے مجاہدوں نے اس گڑھی پر حملہ کیا، اور اس کو فتح کیا، اتنی بات تو حد تو اترا تک پہنچی ہوئی ہے، اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ اس ہم میں سیدنا الامام الکبیر اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما بھی براہ راست شریک تھے لیکن اس واقعہ کی تفصیلات کیا ہیں؟ مولانا عاشق الہی صاحب کا بیان تو حد سے زیادہ محل ہے۔ لیکن دوسرے ذرائع سے جو معلومات فراہم ہو سکی ہیں، ان کو میں پیش کر دیتا ہوں۔

مکن ہے کہ شاملی کی گڑھی پر حملہ کرنے کی ایک وجہ وہ بھی ہو، جو مولانا عاشق الہی نے بیان کی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ مولانا طیب صاحب کی یادداشت سے اس سے بھی زیادہ گہرے اسباب کا سراغ ملتا ہے۔ اپنے اسی چہادی میلہ میں ارقام فرماتے ہوئے کہ ”حضرت (نانوتوی) کے شاگرد خاص نواب محی الدین خان مراد آبادی کے والد ماجد نواب شہر علی خاں، حضرت (نانوتوی) کے معتقد اور بادشاہ دہلی کے مصاحب خاص اور معتد علیہ تھے“

بادشاہ دہلی سے مراد ابو ظفر سراج الدین خادم السلاطین المنعلیہ ہیں، نواب شہر علی خان مراد آبادی کے مشہور رئیسوں اور بڑے تعلقہ داروں میں شمار ہوتے تھے۔ عزت و جہاں کے جس مرتبہ پر تھے اس کے لحاظ سے شاہی دربار سے ان کا تعلق محل تعجب نہیں ہو سکتا۔ نواب شہر علی مراد آبادی

اور سیدنا الامام الکبیر کے مذکورہ بالا عقیدت متدانہ تعلق کے ذکر کے بعد مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ :

”حضرت (نانوتوی) نے ان کی (یعنی نواب شبر علی) کی معرفت بادشاہ دہلی کو جیتا اور استخلاص وطن و ملت کی جنگ پر آمادہ فرمایا“

یہ بھی مولانا طیب صاحب ہی کا بیان ہے۔ کہ

”غرض یہ تھی کہ بادشاہ انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت استعمال کر کے دلی کو ان بڑا انگریزوں سے پاک کرنے کی سعی کریں اور ہم تھانہ بھون اور شالی سے جہاد کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھیں۔ اگر صحیح اصول پر دوطرف سے یہ حملہ اور دفاع عمل میں لے آیا گیا تو دہلی کا آزاد ہو جانا عین ممکن ہے“

کن ذرا اُج سے اپنی اس روایت میں مولانا طیب صاحب مستفید ہوئے ہیں، سردست میں نہیں بتا سکتا

۱۵۔ اختر نے یہ واقعہ مولانا منصور دہلوی صاحب مرحوم مہاجر کا بل و رفیق خاص سیاسی حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ سے کابل میں سنا اور قلمبند کیا۔ مولانا مرحوم اختر کے حقیقی چھوٹی زاد بھائی اور حضرت نانوتوی قدس سرہ کے نوآئیں تھے۔ تحریکات آزادی ملک و ملت کے سلسلہ میں حضرت شیخ الہند کے خاص صاحبِ بمنز اور معتد علیہ تھے۔ انہوں نے جہاد تھانہ بھون کے سلسلہ میں بہت سے مفصل واقعات بروایت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی مرحوم مجھ سے بیان کئے، جو انہوں نے مولانا محمد منیر صاحب سے خود بلا واسطہ سنے۔ غالباً اس سے پہلے کسی موقع پر تذکرہ آچکا ہے کہ مولانا محمد منیر صاحب حضرت نانوتوی کے قریبی عزیز امدان کے فدائی تھے۔ حضرت حاجی امد اللہ قدس سرہ نے بحیثیت امام جہاد اُن ہی کو حضرت نانوتوی کے ساتھ لگا دیا تھا کہ وہ ان کی حفاظت اور نگرانی کرتے رہیں۔ کیونکہ حضرت نانوتوی اپنی قلبی شجاعت اور جوش جہاد میں جا بجا بے دھڑک صفوں میں گھس جاتے تھے اور اپنی جان کی کوئی پروا نہ کرتے تھے۔ اسی خاص حیثیت کی بنا پر مولانا محمد منیر صاحب کو حضرت نانوتوی کے جہاد کے واقعات بہت محفوظ تھے جو چشم دید تھے اور بہت سے ایسے واقعات ان کی روایت سے بھائی صاحب مرحوم سے میں نے سنے جو اردوں سے سننے میں نہیں آئے ہیں۔ ان تمام واقعات کی ایک تفصیلی روداد قلمبند کرتی تھی۔ لیکن دلچسپی کابل کے دقت مبصرین کا مشورہ یہ ہو کہ اسے ساتھ نہ رکھا جاوے۔ اس لئے یہ یادداشت بھائی صاحب مرحوم کے پاس امانت چھوڑ دی گئی کہ وہ کسی مناسب موقع پر بھیج دیں۔ لیکن ہندوستان کی آزادی سے تقریباً چھ ماہ پیشتر ان کا دھماکا ہو گیا اور موجودہ حکومت ہند کے بعض ذمہ داروں نے جب کہ یہ ارادہ کر لیا تھا کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

لیکن بہر حال وہ صاحب البیت ہیں، اور ان لوگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں، بلکہ ان ہی لوگوں میں پوسے پالے گئے۔ سن شعور و تیز تک پہنچے جو سیدنا امام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے براہ راست صحبت یافتہ اور آپ کے حالات و واقعات کے امین تھے۔

میرا خیال یہ ہے، کہ تمھانہ بھون میں تنظیم جہاد کے شرائط کی تکمیل کے بعد سیدنا امام الکبیر نے نواب شہر علی مراد آبادی کو اس ہم پر آمادہ فرمایا کہ بادشاہ کو وہ تیار کریں۔ اور ادھر تمھانہ بھون کے ارادہ کیا گیا کہ اقدام کرنے ہوئے، شاہ درہ کی راہ سے دلی پایہ تخت پہنچ جائیں۔ حملہ کے لئے شامی کا انتخاب جہاں دوسرے وجوہ سے کیا گیا تھا، منجملہ ان کے ایک بڑی اہم وجہ یہ بھی تھی۔

”ہم تمھانہ بھون اور شامی سے جہاد کرتے ہوئے دلی کی طرف بڑھیں“

مولانا طیب کی یادداشت کے اس فقرے کا یہی کھلا ہوا اقتضاء ہے۔

باقی مولانا عاشق الہی صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ شامی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کی جھوٹی خبر یا کہ تمھانہ بھون میں نفاذ جنگ بجا دیا گیا۔ اس میں ”جھوٹی“ کے لفظ کا صحیح مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ جس وقت شامی کی گڑھی پر تمھانہ بھون کے مجاہدوں پر حملہ کیا گیا۔ عام مشہور بلکہ متواتر بات ہے، کہ اس وقت انگریزی فوج کے سپاہی اس گڑھی میں قلعہ بند تھے۔ پھر شامی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کی خبر کو جھوٹی قرار دینے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں۔ ہاں! اگر یہ مراد ہو، کہ شامی کی گڑھی میں انگریزوں کی فوج جو رہتی تھی۔ یا اس زمانہ میں متعین کی جا چکی تھی۔ اس کے سوا بھی انگریزوں نے تمھانہ پر حملہ کرنے کے لئے مزید فوج شامی کی طرف روانہ کی ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ خبر جھوٹی ہو۔

(گزشتہ صفحہ سے) اس قسم کی مظلومانہ جلا وطنی کی زندگی گزارنے والوں کو جو برطانیہ کی جاہلانہ پالیسی کا شکار تھے، ہندوستان بلا لیا جائے، مرحوم اس سے پیشتر ہی دنیا سے نصرت ہو گئے جس سے وہ یادداشت بھی تقریباً لاپتہ ہو گئی، چند چند جہت جہت واقعات جو احقر کے حافظہ میں محفوظ رہ گئے تھے ہندوستان پہنچ کر انہیں قلمبند کر لیا گیا تھا جسے مصنف سوانح نے جہادی مقالہ کے نام سے اسی یادداشت کا جگہ جگہ حوالہ دیا ہے۔ میں نے اس یادداشت کا سلسلہ اس لئے تفصیل سے نقل کر دیا کہ آئندہ حوالوں میں اس کی سند پیش نظر رہے۔

محمود طیب غفرلہ

بہر حال ابتدائی اسباب کے لحاظ سے اگرچہ تھانہ بھون کی یہ جہادی تحریک جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، انتصار اور انتقام کی ایک مقامی تحریک تھی، حکومت نے ملک کے باشندوں سے جو آئینی معاہدہ کیا تھا، اس معاہدہ کو توڑ کر وہ عہد شکنی اور غدر کے جرم کی مرتکب ہوئی تھی۔ اسی چیز نے اس علاقے کے باشندوں کو انتصار و انتقام کے قرآنی حکم کی تعمیل پر آمادہ کیا تھا۔ اسی طرح جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، اپنے آثار و نتائج کے لحاظ سے بھی اس تحریک کا دائرہ جیسا کہ خدا کی مشیت تھی زیادہ وسعت حاصل نہ کر سکا، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے نواب شبر علی صاحب مراد آبادی کے توسط سے اس تحریک کا ربط ہندوستان کے موردی حکمران سراج الدین بہادر شاہ سے قائم کر دیا تھا، تو شامی کی گڑھی پر تھانہ بھون کے مجاہدوں کا حملہ یہی سمجھنا چاہئے کہ شامی کی گڑھی پر نہ تھا۔ بلکہ یہ اقدام درحقیقت پایہ تخت دلی تک پہنچنے کے لئے کیا گیا تھا۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا طیب صاحب نے اپنی جہادی یادداشت میں لکھا ہے کہ ”سرفروشان دین سروں کو، تحصیلوں پر لیکر ایک منظم طاقت سے ٹکرانے کیلئے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور تھانہ بھون سے شامی کی طرف مارچ شروع کیا، جس کا نصب العین دہلی تھا“ ۱۷ مقالہ جہادی

ظاہر ہے کہ ایسی صورت بجائے مقامی ہونے کے ایک ہندو تحریک کا قالب ”تھانہ بھون کا جہاد“ اختیار کر لیتا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن غیر معمولی، اولیاء الہی والابصار شخصیتوں کے مبارک ہاتھوں میں تھانہ کی جنگی ہم کی باگ تھی۔ ان کے فلک گیر حوصلوں اور سپر ہیرووں کا اقتدار چاہئے تو کہہ ہی ہو، لیکن قدرت کا فیصلہ کچھ اور تھا، مجاہدوں کی یہ فوج شامی کی گڑھی پر پہنچ کر ختم ہو گئی، ہم اس قصہ کو ان ہی معلومات کے ذکر پر ختم کر دینا چاہتے ہیں، جو شامی کی گڑھی کی اس مجاہدانہ یورش کے متعلق ہندوستان ہو چکے ہیں۔ کب، کس مہینے میں کتنے آدمیوں کے ساتھ شامی کی گڑھی پر حملہ کیا گیا۔ حالات کے لحاظ سے ان تفصیلات کے قلم بند ہونے کی صورت ہی کیا تھی، بس اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ خود امیر المؤمنین یعنی حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو تھانہ ہی کے قیام کا

مشورہ دیا گیا۔ اسی لئے سمجھنا چاہئے کہ بجائے غزوہ کے سریہ ہی کی شکل میں مجاہدوں کا فوجی دستہ شامی کی طرف سے روانہ کیا گیا تھا۔

اسی سریہ کی تعبیر مولانا عاشق الہی صاحب نے ان الفاظ میں کی ہے کہ

”جتنے کا جتنا تحصیل شامی پر چڑھ دوڑا“ ص ۷۲

تصریح تو نہیں کی ہے لیکن ان کے بیان کا اقتضاء ہے کہ تھانہ کے رئیس قاضی عنایت علی صاحب بھی اس جتنے میں کہئے یا سریہ میں شریک تھے۔ نیز تحصیل شامی کی اس یورش کے متعلق منتشر طور پر کتابوں، اور یادداشتوں میں جو روایتیں پائی جاتی ہیں، اور شہرت بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ دیوبندی حلقہ میں تو اتار کی حدود تک جو روایتیں پہنچی ہوئی ہیں، ان کی بنیاد پر اتنی بات بھی بہر حال یقینی ہے کہ دین کے یہ چار بار یعنی (۱) سیدنا الامام الکبیر مولانا محمد قاسم نانوتوی (۲) امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، (۳) حضرت مولانا حافظ محمد صامن شہید (۴) مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی بہ نفس نفیس اس یورش میں عمل شریک تھے، باقی ان ابطال رجال کے سوا اور کون کون تھے۔ ہم ان کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتے کہ ان کی کافی تعداد تھی۔ ”جتنے کا جتنا“ کے الفاظ مولوی عاشق الہی صاحب نے جو استعمال کئے ہیں، ان کا اقتضاء بھی یہی ہے، کچھ بھی ہو، مجاہدوں کا یہ فوجی دستہ خفا خفا و ثقلاً ان ہی آلات و اسلحہ کے ساتھ جو ان کے پاس تھے۔ یا بارغ شیر علی کی سڑک کی غنیمت کی شکل میں قدرت نے ان تک پہنچا دیا تھا وہ شامی کی طرف روانہ ہو گئے۔

تھانہ سے جس وقت یہ سریہ یا مجاہدوں کا دستہ شامی کے ارادہ سے روانہ ہونے لگا، تو اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وقت اور مقام کے امیر المؤمنین حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا محمد منیر صاحب جن کے متعلق مولانا منصور انصاری صاحب نزیل و دہین کابل کے حوالہ سے عرض کر چکا ہوں کہ اس جہادی تنظیم میں ”یاد حربی“ کا عہدہ ان کو دیا گیا تھا۔ ان ہی مولانا محمد منیر سے سنی ہوئی یہ روایت نقل کی جاتی ہے۔ مولوی طیب صاحب کی یادداشت

شمالی کامیوان جہاد اور شہیدان جس میں مجاہدین شمالی مدافعت ہیں

BY FAR
PENG-TA



www.kitabghar.org

میں ہے کہ خصوصیت کے ساتھ ان کو مخاطب کر کے حاجی صاحب نے مجاہدوں کو رخصت کرتے ہوئے وصیت کی تھی۔

”مولانا دین سیّدنا الامام الکبیرؒ بالکل آزاد اور جری ہیں، ہر صف میں بے محابا گھس جاتے ہیں، اس لئے آپ کسی وقت ان کا ساتھ نہ چھوڑیں۔“ ص ۶

خاص کر مولانا محمد منیر صاحب ہی کو یہ وصیت اس لئے کی گئی تھی کہ بقول مولانا طیب ”شدت محبت سے ان کو بھی بغیر (مولانا نو تو ی) کے قرار نہ آتا تھا“ گویا کام ایسے آدمی کے سپرد کیا گیا جو یہی کرنا بھی چاہتا تھا۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ بالا وصیت کا اقتضا یہی ہے کہ حرب و ضرب کروفر کے متعلق سیّدنا الامام الکبیرؒ کی افتاد طبع اور فطری رجحان کا تجربہ شاملی کی جنگ سے پہلے ہو چکا تھا، شیر علی کے باغ والی مشرک کی یورش میں سیّدنا الامام الکبیرؒ کی ذاتی شرکت کے دلائل میں ہم اسی امدادی وصیت کو بھی ایک دلیل قرار دے سکتے ہیں، آخر سیّدنا الامام الکبیرؒ کی ان فطری خصوصیتوں کے مشاہدے کا موقعہ اور کہاں مل سکتا تھا۔

چند میلوں سے زیادہ فاصلہ تحصیل شاملی اور تھانہ بھون میں نہ تھا۔ اب بھی ان دونوں مقاموں کے درمیان چند اسٹیشن پڑتے ہیں۔ مجاہدوں کے ”جھٹھے کا جھٹھا“ باسانی وہاں پہنچ گیا۔ مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ

”شاملی کے میدان میں رن پڑا“ اور انگریزی فوج سے (مجاہدین کا) مقابلہ ہوا، مفت باطلہ میں مجاہدین ہی کو غلبہ نصیب ہوا“

اگرچہ یہ ایک اجالی بیان ہے۔ لیکن اس سے اس کا تو پتہ چلا کہ جب شاملی تک مجاہدین پہنچ گئے، تو گڑھی میں جو انگریزی فوج کے سپاہی تھے، وہ مقابلہ کرنے کے لئے باہر نکل آئے۔ دونوں میں کافی کش مکش ہوئی۔ اس کش مکش میں کیا کیا صورتیں پیش آئیں۔ اب نہ ان کے دیکھنے والے موجود ہیں۔ اور سننے والے بھی ختم ہو چکے ہیں، مولانا منصور انصاری کی زبانی کابل میں مولانا طیب صاحب کو

جو باتیں معلوم ہوئیں۔ ان میں ایک ایمان افروز روایت یہ بھی نقل کی گئی ہے، جسے مولانا منصور انصاری نے براہ راست مولانا محمد منیر صاحب سے سنا تھا۔ اپنے امیر المؤمنین پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت کے مطابق مولانا محمد منیر فرماتے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کے

”پس پشت بطور محافظ اس طرح رہتا تھا کہ حضرت (نانوتوی) کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ

ان کی محافظت اور نگرانی کر رہے ہیں“

نہ پڑا ہوا تھا، دار و گیر بزن و کش کا ہنگامہ رست خیز ہر طرف برپا تھا، مولانا محمد منیر فرماتے تھے کہ

”اس ہنگامہ محشر خیز میں حضرت (نانوتوی) میدان جنگ کے ایک کنارے پر دم لینے کے لئے کھڑے تھے کہ (انگریزی فوج) کا ایک سپاہی جو صورتاً سکھ (معلوم ہوتا) تھا، اوڑھیل ڈول میں اتنا طویل و عریض تھا، کہ حضرت نانوتوی کے جثہ کے آدمی اس جیسے تن و توسل رکھنے والے سے چپا رہ سکتے تھے، (انگریزی فوج کے اسی سپاہی نے حضرت نانوتوی کو کنارے میدان کے کھڑا یا کر) دور سے تاکا، اور غصہ میں لپک کر اس طرف آیا“

اس کے بعد یہ الفاظ روایت میں اس کی طرف جو منسوب کئے گئے یعنی

”حضرت (نانوتوی) کو ڈانٹا، اور کہا کہ تم نے بہت سر بھارا ہے“

جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ حرب و ضرب میں سیدنا الامام الکبیر کی غیر معمولی سر بازانہ جدوجہد غنیم کی فوج میں کافی امتیاز حاصل کر چکی تھی، بہر حال مذکورہ بالا الفاظ سے مخاطب کرتے ہوئے انگریزی فوج کے اسی دیوبیکہ، عفریت قالب سپاہی نے کہا، کہ

”اب آ! میری ضرب کا جواب دے“

اسی کے ساتھ تلوار جو اس کے ہاتھ میں تھی اس کو بلند کرتے ہوئے چلا یا کہ

”یہ تیغ تیرے لئے موت کا پیغام ہے“

یہ فقرہ ابھی تمام نہیں ہوا تھا کہ دیکھا گیا

”دو دھارا تیغ پوری قوت سے اٹھا کر حضرت (نانوتوی) پر چلانا ہی چاہتا تھا“

کہ حضرت کی زبان مبارک پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری ہوئے، اسی فوجی گروہ سے فرما رہے تھے کہ

”باتیں کیا بنا رہا ہے اپنے پیچھے کی تو خبر لے“

کچھ ایسے لہجہ میں یہ بات اس کے کان میں ڈالی گئی، کہ

”اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا“

اس کا مڑنا تھا کہ سیدنا الامام الکبیر بجلی کی طرح تڑپے، مڑنے کے بعد آپ کی طرف رخ کرنے کا

موقعہ بھی اس کو نہ ملا کہ دیکھنے والوں کے سامنے یہ تماشا پیش تھا، مولانا محمد منیر کا بیان ہے، کہ

سیدنا الامام الکبیر نے

”جنیو کا ہاتھ اس کے داہنے کندھے پر مارا۔ دارا تنی قوت سے کیا گیا تھا کہ تلوار دائیں ہونڈ

کو کاٹ کر گزرتی ہوئی بائیں پیر پر آ کر رکی“

دیکھا گیا، تو اس سپاہی کا غصہ جتنی جلد اس طرح خاک پر بڑا ہوا تھا، کہ

”سر سے پیر تک دو پارہ ہو کر آدھا آدھا اُدھر گر اہوا تھا“۔ صلا جہادی مقالہ

و اتبعوھم باحسان کے قرآنی وصف کی تعبیر یوں ہی پوری ہوتی ہے، سعادت مندوں کو اسی

قسم کی سعادت مندوں سے نوازا جاتا ہے، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ہم مشاطی کے میدان

جنگ میں نہیں، بلکہ اس تاریخی خندق کے کنارے کھڑے ہیں۔ جہاں عرب کا سورما عمرو بن

طھیک اسی شکل میں دو پارہ ہو کر تڑپ رہا تھا۔ اس کا انجام تو یہ ہوا، اور سیدنا الامام الکبیر جو کچھ

صلہ سیرت کی کتابوں میں اس کی تفصیل پڑھنی چاہئے، ادیبوں بھی داغہ شہر ہے، کہتے ہیں کہ عمرو بن دو سو پہلوانوں

کو برابر قریش میں سمجھا جاتا تھا، جو زہر پہنتا تھا، حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ سارے عرب میں ایسی ذرہ کسی کے پاس

نہ تھی، سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے باوجود نوعمر ہوئے عرب کے اس شہر سورما کو دو پارہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ذرہ

کے متعلق دریافت کیا گیا کہ اس کی لاش سے اتار کیوں نہ لی تو فرمائی گئی کہ قتل ہوتے ہوئے باقی (اگلے صفحہ پر)

ماندگی محسوس فرما رہے تھے۔ اس غیر معمولی کامیابی نے جیستی اور چالاکی کی نئی قوت آپ میں بھری دکھا ہے کہ

”اسی بے جان لاشے پر پاؤں رکھتے ہوئے پھر صف قتال میں آ گئے“ ص ۷۱

نہیں کہا جاسکتا کہ شامی کے میدان کی یہ جنگ کبتنگ اور کتنی دیر تک جاری رہی۔

مولنا طاہر صاحب کی یادداشت جس میں اپنے والد حافظ محمد احمد صاحب سے سنی ہوئی روایت اسی سلسلہ میں انہوں نے درج کی ہے، جس کے بعض اجزاء کا ذکر متفرق طور پر کر چکا ہوں۔ اسی روایت میں یہ بھی ہے، کہ اپنے والد ماجد شیخ اسد علی سے رخصت ہو کر سیدنا الامام الکبیر تھان آئے اور تھانہ کے بعد جب میدان جنگ میں جو ظاہر ہے کہ شامی ہی کا میدان جنگ ہو سکتا ہے تشریف لے گئے، تو بیان کیا ہے، کہ تھانہ بھون میں میدان جنگ کی خبروں کے ساتھ ساتھ شہداء کی

”نعشیں بھی آتی رہتی تھیں“

اور تھانہ کے یہ قصبے اطراف وجوانب کی آبادیوں میں پھیل جاتے تھے۔ لکھا ہے کہ

(گذشتہ صفحہ سے) اپنی شرمگاہ کو کھول کر میرے سامنے اس کا فرے کر دیا مجھے شرم آئی اور چھوڑ کر چلا آیا۔ اس مبارزے کے دوسرے اجزاء کا کافی دل چسپ ہیں۔ خصوصاً حضرت علی اور عمرؓ کی باہمی گفتگو۔ اس موقع پر ایک سال کے حل کا سامان بھی ملتا ہے۔ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ اور خالد بن ولیدؓ امدان ہی جیسے نبرد آزما کشور کشا صحابیوں کی جنگی مہارتوں اور قتالی چابک دستیہ کا ذکر جس وقت کیا جاتا ہے تو دل میں خیال آتا ہے، کہ جن غیر معمولی کرتبوں سے یہ کام لیتے تھے ان کی تعلیم ان بزرگوں نے کہاں اور کب اور کن لوگوں سے حاصل کی؟ تاریخ و قوائیہ ان کے جواب سے سکت ہے۔ اصولاً آدمی ہی سوچ لیتا ہے کہ عرب ایک جنگ جو قوم تھی اگرچہ کتب علیکم القتال وھو کہہ لکھ“ کی قرآنی خبر سے اس کی بھی تصدیق نہیں ہوتی، لیکن مشہور یہی ہے۔ اسی بنیاد پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ عربوں میں جنگی فنون کے سیکھنے سکھانے کا عام رواج ہوگا۔ مگر سیدنا الامام الکبیرؓ کے مذکورہ واقعہ کو سوچ کر اگر ذہن ادھر منتقل ہو کہ اللہ والوں کے ساتھ غیبی تائید جو ہوتی ہے۔ یہ اسی کے مظاہر و آثار ہیں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ سیدنا الامام الکبیرؓ کی پچھلی زندگی میں کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ شمشیر زنی، یا بونٹ یا بانگ وغیرہ چیزیں آپ نے سیکھی ہوں۔ ہندوئیوں کے متعلق آپ کا موصوف امام کی شہادت سن چکے کہ فدر کے ایام میں پہلی دفعہ نشانہ بازی کا موقع آپ کو ملا تھا ۱۲

”چونکہ تھانہ نانوتہ سے زیادہ دور نہ تھا۔“

اس لئے نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ نانوتہ والوں کو میدان جنگ کی سرگزشتوں کے جاننے کا موقع مل رہا تھا، جن کو سن سن کر حضرت نانوتوی کے والد اجد شیخ اسد علی صاحب جیسا کہ مولوی طاہر صاحب نے لکھا ہے۔

”بہت دیر سے تھے اور فرماتے تھے کہو بھائی! میرا بیٹا کہاں ہے، میرا بیٹا کہاں ہے۔“

بطابق سے معلوم ہوتا ہے کہ شالی کے میدان کی جہادی کشمکش ایک درون میں ختم نہیں ہوئی تھی، لیکن پھر بھی وقت کی صحیح فہمیں کا کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں ہے۔ اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ فاش ہزیمت کے بعد انگریز فوج کے آدمی شالی کی گڑھی میں قلعہ بند ہو گئے، اجد مجاہدوں نے گڑھی کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔

انگریزی فوج شالی کی جس گڑھی میں پناہ گزین ہو گئی تھی، اس کے صحیح محل وقوع

شالی کی گڑھی کا محاصرہ اور تھانہ بھون کی جہادی تحریک کا خاتمہ

کا اندازہ تو دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے، جس سے افسوس ہے کہ لکھنے والا محروم ہے، جی تو یہی چاہتا ہے کہ کاش! خود اپنی آنکھوں سے اس گڑھی اور اس کے ماحول کا مشاہدہ کر کے جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں، اسے لکھوں لیکن موجودہ حالات میں میرے لئے یہ آسان نہیں ہے، تاہم پھر بھی میری آرزو اب بھی یہی ہے کہ یہ گڑھی اگر اب بھی موجود ہو تو اس کا فوٹو لے لیا جائے، اور اس کتاب کے ضمیموں میں اس فوٹو کو بھی شریک کر دیا جائے۔ سیدنا امام الکبیر کی سیرت طیبہ سے اس گڑھی کا خاص تاریخی تعلق ہے گڑھی کے چاروں طرف جو میدان تھا، کون کہہ سکتا ہے، کہ اس حال میں اب بھی ہوگا لیکن کہنے والوں سے معلوم ہوا کہ اس میں رد و بدل نہیں ہوا ہے۔ یا کم ہوا ہے۔ تو فوٹو لینے والے کو چاہئے کہ کسی ایسے نقطے سے فوٹو لے جس میں کچھ نہ کچھ میدان کا حصہ بھی آجائے۔

بہر حال کتابوں میں جو کچھ مل سکتا ہے، اس کی مدد سے نیز براہ راست اس خاکسار نے سیدنا

الامام الکبیر کے فرزند سعید، مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حیدرآباد میں جو روایت اس سلسلہ میں سنی ہے اس کو بھی پیش نظر رکھ کر تھانہ بھون کی جہادی تحریک کے اس وردناک خاتمہ کی تفصیل عرض کرتا ہوں۔

حافظ صاحب مرحوم نے جن دنوں آپ سلطنت آصفیہ کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کے رکن بحیثیت مفتی ہونے کے تھے۔ اسی زمانہ میں نواب عبدالباقر مرحوم کی کوٹھی حسینی علم میں ایک خانگی مجلس جس میں فقیر بھی شریک تھا، یہ بیان فرمایا تھا کہ شام کی یہ گڑھی جس میں انگریزی فوج کے سپاہی روپوش ہوئے تھے ایک ایسے کھلے میدان میں واقع تھی کہ گڑھی کے چاروں طرف کوئی ایسی جگہ نہ تھی، جسے گڑھی سے باہر والے آڑ بنا سکتے ہوں، الایہ کہ ایک مختصر سی مسجد اسی سمت میں تھی، جس طرف گڑھی کا پھانک تھا۔ محصوروں نے گڑھی کے پھانک کو بند کر دیا تھا، اور ”جتنے کا جتنا“ تھانہ بھون کے مجاہدوں کا جو گڑھی کے باہر والے بے پناہ میدان میں پٹنگوں کی طرح پھیلا ہوا تھا، ان پر بند قوتوں سے گڑھی والے انگریزی فوج کے بندوچی دیوار کی آڑ لے کر مسلسل فائر پر فائر کرتے چلے جاتے تھے۔ تاثر تو زکولیاں برسلسہ تھے۔ وہ دیوار کے پیچھے محفوظ تھے۔ لیکن اس مختصر سی مسجد کے سوا جو میدان میں بھی غریب مجاہدوں کو گڑھیوں سے بچانے والی کئی جگہ پناہ نہ تھی۔

اسی کا نتیجہ تھا، جیسا کہ مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ ”انگریزی فوج تحصیل شامی میں قلعہ بند ہو گئی، اور ادھر سے مجاہدوں پر بند قوتوں کی بارش ماری شروع کی، جس سے سینکڑوں مجاہدین شہید ہو گئے۔“

یہ وقت بڑا فرائضی کا تھا، زحف (گھسان والی جنگ) کی صورت باقی نہ رہی تھی، اس لئے بظاہر قرآنی حکم فلا تو لہوہم الا دبار پس نہ بھیرو تم پیٹھوں کو، کا مکلف بھی مجاہدین کا یہ سرا سہ گروہ باقی نہ رہا تھا، لیکن پھر بھی میدان سے پیٹھ پھیر کر ایسا معلوم ہوتا ہے بھاگنے پر کوئی آمادہ نہ تھا۔ گولیاں ان کے جسم میں اترتی چلی جاتی تھیں۔ روہیں پرواز کر رہی تھیں، لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، کسی نے

راہ گریز اختیار نہ کی، مولانا طیب نے لکھا ہے کہ

”اس وقت پریشانی یہ تھی کہ انگریزی فوج قلعہ بند اور محفوظ تھی، اور مجاہدین ان کے سامنے کھلے میدان میں تھے، ان کا (یعنی انگریز فوج کی بند و قیوں کا حملہ کار گرا در کا میاب ہوتا تھا، اور مجاہدین کے حملے غیر مؤثر ہو کر رہ جاتے تھے۔“

ظاہر ہے کہ مجاہدین زیادہ سے زیادہ بند و قوں کا جواب بند و قوں سے دے سکتے تھے۔ لیکن جو دیوار کی آڑ میں چھپے اور دیکے ہوئے تھے۔ ان پر دیوار سے باہر والوں کی بند و قوں کی گولیوں کا اثر یہ کیا مرتب ہو سکتا تھا، مولانا کا بیان ہے کہ

”اس طرح یعنی ایک طرف مار کی وجہ سے، مجاہدین کا کافی جانی نقصان ہوا۔“

تھانہ بھون میں لاشوں کے مسلسل پہنچنے کے جس قصہ کا ذکر گزر چکا ہے، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر یہ صورت حال محاصرہ کے بعد ہی پیش آئی۔

بس لے دے کر وہی ایک مسجد تھی۔ گھوم پھر کر اسی مسجد میں مجاہدین دم لینے کے لئے آجاتے، لیکن اس مسجد کی پناہ سے نکلنے کے ساتھ ہی ان پر گولیاں برسنے لگتیں۔ تدبیریں سوچی جاتی تھیں لیکن کوئی تدبیر اس وقت مفید اور کارآمد نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت اپنے ہمیش و حواس کے توازن کو قائم کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے ایک غیر معمولی جرأت آزا اقدام کا عزم بالجزم فرمایا۔ میں بتا چکا ہوں کہ یہ مسجد اسی سمت میں واقع تھی، جس طرف گڑھی کا دروازہ تھا۔ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ

”اسی دروازہ کے قریب چھپر کی ایک کٹی تھی، جو غالباً محافظ سپاہیوں کے سایہ لینے کے لئے بنائی گئی تھی،

مسجد سے سیدنا الامام الکبیر کی نظر مبارک دروازے کے اس چھپر پر پڑی، اور اچانک ایک ”حربی مکیدہ“ یا ”جنگی چال“ کا گویا آپ کو الہام ہوا، سمجھ میں یہ آیا، کہ اس چھپر یا تک پہنچنے کی صورت اگر کوئی نکل آئے، تو اس کو اکھاڑ کر دروازے کے کوڑوں پر رکھ دیا جائے۔ اور چھپر یا میں آگ لگادی جائے۔ جس سے

کو اڑ بھی جل جائیں گے اور گولیوں کی گڑھی میں گھسنے کا موقعہ مجاہدین کے لئے بآسانی نکل آئے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مسجد سے چھپر یا تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ بندوقیں چھتیاں انگریزی فوج کو سپاہی گڑھی کی دیواروں پر اودان کی آڑ میں پوری نگرانی کر رہے تھے کہ گڑھی کے دروازے تک کوئی پہنچنے نہ پائے، نظر پڑتے ہی اس پر گولیاں برسائے گئے تھے۔ چھپر یا تک پہنچنا اس کو اکھاڑا، اکھاڑ کر دروازے کے کواڑوں سے اس کا اتصال پیدا کر کے آگ لگانا، اتنا لمبا کاروبار تھا کہ بمشکل ہی اس کا موقع برستی ہوئی گولیوں کے درمیان نکالا جاسکتا تھا۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ اولوالعزموں کے عزم اور ارادے کا مظاہرہ ان ہی نازک مواقع پر ہوا کرتا ہے، تجویز بھی سیدنا الامام الکبیر کے دماغ میں آئی، اور تجویز عمل کرنے کا عزم بھی خدا نے آپ ہی کے نورانی قلب میں پیدا کیا۔ اس سلسلہ میں روایتیں جو مجھ تک پہنچی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر اپنی اس آتشیں تجویز پر عمل کرنے کے لئے تنہا آمادہ ہو گئے۔ کسی رفیق کو بھی رفاقت کی تکلیف نہ دی، اور دیکھا گیا کہ کوہنہ دتی ہوئی بلی کی طرح آپ گولیوں کی اسی بارش کے درمیان نکلتے ہوئے چھپر یا تک پہنچ گئے، اور حسب روایت مولنا طیب صاحب

”حضرت (نانوتوی) نے پھرتی سے بڑھ کر اس چھپر یا کو اپنی جگہ سے جلد جلد اکھاڑا اور اکھاڑ کر اسے تحصیل کے دروازے سے لالچایا، اور اس میں آگ دے دی۔“

خدا ہی جانتا ہے کہ گولیوں کی بوچھاڑ سے نکلنے میں اور چھپر یا تک صحیح و سالم پہنچنے میں وہ کیسے کامیاب ہوئے۔ مگر دیکھا ہی گیا کہ چھپر یا میں آگ لگی ہوئی ہے اور اس کے بعد بقول مولنا طیب صاحب۔

”آگ کا لگنا تھا، کہ گڑھی کے پھاٹک کے کواڑ بھی جل اٹھے۔“

صورت حال کچھ ایسی پیش آئی، کہ ان جلتے ہوئے کواڑوں کی آگ بجھانے کی ہمت گڑھی کے محصور فوجیوں کو نہ ہوئی۔ بجائے لکڑی کے صرف کوئلہ اور راکھ کے کواڑ بن کر وہ رہ گئے، مولنا طیب صاحب نے لکھا ہے، کہ یوں گڑھی کا

”بند دروازہ مجاہدین کے لئے داہو گیا، اور یلغار کرتے ہوئے تحصیل کے اندر مجاہدین جا گئے۔“

اس وقت چارہ کار ہی محصوروں کے لئے اس کے سوا اور کیا تھا، کہ نیا م سے تلواردوں اور کرچوں کو نکال نکال کر مجاہدین کے سامنے آجائیں۔ مولانا طیب کی یادداشت میں ہے کہ مجاہدین اور ”قلعہ بند فوج سے دست بدست جنگ ہونے لگی۔“

گر طعی کے اندر تو یہ دست بدست جنگ ہو رہی تھی، مجاہدوں کا وصلہ بڑھا ہوا تھا، گریہ کے سپاہی ان کے مقابلہ میں کیا ٹھہر سکتے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسا کہ مولانا طیب صاحب نے لکھا بھی ہے کہ

”پانسہ مجاہدوں کے حق میں پلٹ آیا، انگریزی فوج کو شکست ہو گئی، تحصیل شالی پر مجاہدوں کا قبضہ ہو گیا۔“

لیکن پردہ غیب کی لاہوتی سلیحتوں کا تقاضا کچھ اور تھا، اس موقع پر روایات میں کچھ اتنا اجمال ہے کہ واقعہ کے بعض اجزاء کی ترتیب میں الجھن سی پیدا ہو گئی ہے۔ تاہم جو معلومات مجھے تک پہنچے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے جو نقشہ میرے دماغ میں قائم ہو گیا ہے اسے پیش کر دیتا ہوں۔

مجاہدوں کا جو دستہ تحصیل شالی پر حملہ کرنے کے لئے تھانہ بھون سے روانہ کیا گیا تھا، اس دستہ کے امیر الجیش جیسا کہ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جن چار یا اردوں کی شرکت شالی کے اس وقت دھاوے میں قطعی طور پر ثابت ہے۔ عرض کر چکا ہوں، ان میں ایک یہ حافظ صاحب بھی ہیں، دیوبندی حلقہ کے واقف کاروں کیلئے تو کسی تعارف کی محتاج حضرت حافظ شہید کی شخصیت نہیں ہے۔ لیکن جو نہیں جانتے ہیں، ان کی عیارت بھی کرنی ہی چاہئے، حضرت حافظ شہید کا خاندانی تعلق تھانہ بھون کے فاروقی شیخ زادوں کو خاوانے سے تھا، ارواح ثلاثہ میں ان ہی کے متعلق جو یہ فقرہ پایا جاتا ہے کہ

”حضرت حافظ ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ سپاہی منش تھے۔“ ص ۱۵۱

بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ غالباً ابتدائی زندگی سے آپ کو مجاہدانہ اندسہ سپاہیانہ زندگی سے مناسبت تھی، اور گو حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد مرشدنیاں جی نور محمد جھنجھناوی رحمۃ اللہ علیہ

کی بیعت سے سرفراز ہو کر طریقہ صابریہ چشتیہ کے سیر و سلوک کی تکمیل میں کامیاب ہوئے، اور اس وجہ پر پہنچے کہ بقول مولانا طیب صاحب

”بوقت وفات حضرت میاں جی نور محمد صاحب نے حافظ صاحب کو وصیت فرمائی، کہ
دیکھنا اپنے چھوٹے بھائی امداد اللہ کا خیال رکھنا“

بہر حال آپ وقت کے خدارسیدہ اور برگزیدہ لوگوں میں تھے۔ لیکن فطری طور پر حد سے زیادہ وارثہ مزاج تھے، لیکن مزاج کی داسرنگی اور شگفتہ دلی کا حال یہ تھا، کہ سب کچھ ہو جانے کے بعد مرتے دم تک بلکہ شاید مرنے کے بعد بھی شگفتگی ان کی باقی رہی، بڑے دل چسپ لطائف ان کی طرف منسوب ہیں، میر شاہ خاں مرحوم کہا کرتے تھے کہ تھانہ بھون کی وہی مسجد جسے آخر میں حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے قیام نے ہندوستان کا ایک مرکزی مقام بنا دیا تھا، اسی مسجد میں ایک وقت وہ بھی گذرا تھا کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شیخ محمد تھانوی حافظ محمد ضامن شہید، ان تینوں بزرگوں کی بیٹھک قریب قریب ہی رہتی تھی۔ حضرت حاجی صاحب اسی مسجد کی متعلقہ سہ دری میں بیٹھتے تھے، اور مولانا شیخ محمد صاحب کی نشست بھی وہیں قریب تھی اور حافظ صاحب مسجد کے قریب لکھن تلے بیٹھا کرتے تھے۔ آنے والے جب آتے تو لکھا ہے کہ حافظ صاحب اس کو مخاطب کر کے فرماتے کہ

”بھائی کوئی مسئلہ پوچھنا ہو، تو وہ (مولانا شیخ محمد تھانوی) بیٹھے ہیں، ان سے پوچھ لے، مرید ہونا ہے تو وہ (حاجی امداد اللہ) بیٹھے ہیں، ان سے مرید ہو جا، اور اگر حقہ بینا ہو، تو یاروں کے پاس بیٹھ جا۔“ ۱۵۶

قصص الاکابر، ارواح ثلاثہ وغیرہ میں حافظ صاحب شہید کے تفصیلی حالات پڑھئے، اس اجمالی طے اطرح ثلاثہ میں اس لطیفہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ ایک صاحب کشف بزرگ حافظ ضامن شہید کے منہ پر یہ جالے بغیر کہ یہ کس کی قبر ہے فاتحہ پڑھنے گئے۔ فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں سے پوچھنے لگے کہ بھائی! یہ کون بزرگ ہیں بڑی دل گلی کی بات کی، میں جب فاتحہ پڑھنے لگا تو کہنے لگے جاؤ، فاتحہ کسی مردہ پر پڑھیو، یہاں زندہ پر فاتحہ پڑھو گئے ہو، ۱۵۷ لوگوں نے یہ اطلاع دی کہ شہید ہیں۔ تب اس لطیفہ کا مطلب ان کی سمجھ میں آیا۔

تھانہ بھولن بن ملکین کا درخت جس کے نیچے حضرت حافظ محمد سائیں صاحب شہید داماد جہاد شاملی کی نشست رہتی تھی



www.kitabqhar.org

تعارف کے بعد میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شامی کی گڑھی کے کواڑ کو کولہ اور رکھ بنا کر گرا دیا گیا اور مجاہدوں کو گڑھی میں گھس کر انگریزی فوج کے سپاہیوں سے دست بدست جنگ کرنے کا موقع ملا، تو جیسا کہ چاہئے تھا کہ امیر الجیش ہونے کی حیثیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حافظ شہید کو اندر داخل ہونے والے مجاہدین اور جو باہر تھے، دونوں ہی کی نگرانی کی وجہ سے اندر سے کبھی باہر اور باہر سے کبھی اندر مسلسل آمد و رفت جاری رکھنے پر مجبور ہونا پڑا، بیان کیا جاتا ہے، کہ آمد و شد کے اسی سلسلہ میں حافظ صاحب گڑھی کے باہر کھلے میدان میں گڑھی کی طرف رخ کئے کھڑے تھے۔ اب واللہ اعلم جان کہ مجاہدین کا فوجی انسر یہی ہے یا بے جانے انگریزی فوج کے کسی سپاہی نے گڑھی کی تفصیل کہنے یا دیوار پر سے تاک کر ایک ایسی گولی چلائی کہ بقول مولانا طیب صاحب

”گولی ناف پر پڑی“

مولانا عاشق الہی کی روایت میں ہے کہ ”گولی زیر ناف“ لگی تھی، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سینے پر نشانہ لگایا گیا تھا۔ ٹھیک نشانہ پر تو گولی نہ بیٹھی اور ناف یا زیر ناف پہنچ کر حافظ شہید کے شکم مبارک میں اتر گئی۔ مولانا طیب کی روایت میں ہے کہ گولی گنے کے ساتھ ہی

”حضرت (حافظ شہید) اکدم اچھل کر زمین پر گرے“

اتنا ہوش اس وقت بھی باقی تھا کہ گرتے ہوئے اس حد تک سنبھال لیا کہ دیکھنے والوں نے دیکھا، (جیسا کہ مولانا طیب کی روایت میں ہے کہ)

”بہ ہیئت تشہد زمین پر بیٹھے ہیں“

یہ بھی اسی روایت میں ہے کہ اس وقت یہ بھی دیکھا گیا کہ وہ قبلہ رخ ہیں، جیسے کسی نے نماز کے قعود میں آپ کو بٹھا دیا ہے۔“ ص ۷۷ جہادی مقالہ

آس پاس جو لوگ کھڑے تھے دوڑ پڑے۔ بیان کیا جاتا ہے، کہ اس وقت بھی اس زخم خوردہ بندہ حتیٰ کی زبان سے جو پہلا فقرہ نکلا وہ یہی تھا کہ

”مجھے مسجد لے چلو، مسجد لے چلو۔“

تلاز کے قعدہ کی ہیئت میں بیٹھے ہیں، اور آئندہ صرف اس کی ہے کہ مسجد (مجدہ کی جگہ) تک پہنچا دو! شاعر نے صرف شعر کہا تھا کہ

سر بوقت ذبح میرا ان کے زیر پائے ہے

لیکن کر کے دکھانے والا اسی کو آج کر کے دکھانا چاہتا ہے۔ اس کے دل کی آخری تمنّا صرف یہی ہے مولنا عاشق الہی نے تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ ”حافظ شہید“ نے حضرت لانا گنگوہی و شامی کو جہاد کے موقع پر با صراہہ وصیت کی تھی کہ

”میاں رشید میرا دم نکلے، تو تم میرے پاس ضرور ہونا“

واللہ اعلم مولنا گنگوہی بھی ان لوگوں میں شریک تھے۔ جو حافظ شہید کے گولی کھانے کے بعد ان کی طرف دوڑ پڑے، یا امیر الجیش کے زخمی ہونے کی خبر آگ کی طرح مجاہدوں میں قدرتِ ناحیث پھیلی اس وقت آپ مطلع ہوئے، کچھ بھی ہوا ہو، مگر جیسا کہ مولنا عاشق الہی صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے ”مسجد لے چلو، مسجد لے چلو“ کے حکم کی تعمیل کا موقع سب سے پہلے مولنا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو نصیب ہوا، تذکرۃ الرشید میں ان کے الفاظ ہیں کہ

”حافظ صاحب کا زخم سے چور ہو کر گرنا تھا، اور امام ربانی (حضرت گنگوہی) کا لپک کر ٹپتی

فخ کو کا ندھے پر اٹھانا، قریب کی مسجد میں لائے، اور حضرت (حافظ شہید) کا سر اپنے

زانو پر رکھ کر تلاوت (قرآن) میں (مولنا گنگوہی) مصروف ہو گئے“ ۵۷

آگے ان ہی مولوی عاشق الہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ ”دیکھنے والوں سے سنا ہے“ آئندہ کی سرگزشت کو ان الفاظ میں جو درج کیا ہے کہ

”حضرت مولنا (گنگوہی) کی اس مردانگی پر تعجب تھا کہ کس اطمینان کے ساتھ سنان مسجد

میں تنہا بیٹھے ہوئے اپنے نوریہہ چچا (پیر) کے سفرِ آخرت کا ساماں دیکھ رہی ہیں، اور اپنے

عاشق اور محبوب کے نزع کا آخری وقت نظارہ کر رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو تھے، او

زبان پر کلام اللہ۔ یہاں تک کہ حافظ (شہید) رحمۃ اللہ علیہ کا آپ (یعنی مولنا گنگوہی) کے

زانو پر سر رکھے رکھے وصال ہو گیا“ ۵۷

اس بیان میں ”تنہا بیٹھے ہوئے“ کے الفاظ کچھ عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ امیر الجیش کا زخمی ہونا، یقیناً ایسا واقعہ نہیں ہو سکتا، جو اس پاس کے مجاہدوں کی توجہ کو اپنی طرف منقطع نہ کرتا، خود مولانا عاشق الہی صاحب کا یہ فرمانا کہ ”دیکھنے والوں سے سنا ہے“ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے دیکھنے والے ایک سے یقیناً زیادہ افراد تھے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے دیکھنے والے مسلمان مجاہد تھے جن کا امیر زخموں سے چور ہے، خون میں مشرب اور ہے، لیکن وہ صرف دیکھتے رہے۔ اور اس کی توفیق کسی کو نہ ہوئی کہ جب حافظ شہید کے خستہ و نزار جسد مبارک کو حضرت گنگوہی اپنے کندھے پر اٹھا کر مسجد لے جا رہے تھے۔ ان کا ساتھ دیتے۔ حافظ شہید تو حافظ شہید ہی تھے۔ حدیث کے امیر بھی تھے۔ ایسے موقعہ پر عام انسانی فطرت ہے کہ لوگ دوڑ پڑتے ہیں۔ دیکھنے والوں کی یہ غیر فطری سنگدلی میری سمجھ میں نہیں آتی، اسی لئے میرا خیال ہے کہ مولانا عاشق الہی مرحوم سے بظاہر واقعہ کی تعبیر میں کچھ مسامتت ہوئی ہے، اور حافظ شہید حبیب مسجد میں لائے گئے ہیں۔ اس وقت کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ حضرت گنگوہی تنہا مسجد پہنچے ہوں۔ لیکن واقعہ کے ان ”دیکھنے والوں“ میں مسجد تک پہنچنے والے کون کون لوگ تھے، ان ناموں کی تفصیل کا تو مجھے علم نہ ہو سکا، تاہم اور کوئی ہویا نہ ہو یہ ماننا بہت دشوار ہے کہ امیر الجیش کے زخمی ہو کر گر پڑنے کی خبر جب مجاہدین میں پھیلی، تو اس کی خبر سیدنا الامام الکبیر کے گوش مبارک تک نہ پہنچی، یا پہنچی، لیکن دوسرے دیکھنے والے تو خبر سننے کے ساتھ دیکھنے کے لئے دوڑ پڑے لیکن ٹھیک اسی ساعت فرخ وقت سعید میں جس میں واقعہ یہ ہے کہ حدیث کے امیر کی زندگی کی سب سے بڑی آنند پوری ہو رہی تھی گویا ع

کہ بارے بر خود از وصل یا رہے

۱۵ حضرت مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست خود فقیر نے بھی سنا ہے، اور قصص الاکابر میں بھی حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی یہ روایت منسوب کی گئی ہے، یعنی اپنے سید و سوک کی آخری (باقی اگلے صفحہ پر)

کا جان نواز، روح پرورد قدوسی نظارہ پیش ہو رہا تھا، عین اسی مبارک گھڑی میں حضرت گنگوہی کے رفیق الدنیا والآخرۃ سیدنا الامام الکبیر نے رفاقت سے بلا وجہ اعراض کیا۔ اور زندہ ہونے کے لئے جو مر رہا تھا، اس کے بالین شہادت پر حاضر نہ ہو سکے، یا اللہ العزیز

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

خیر اس قصے کو چھوڑیے، مولنا عاشق الہی صاحب نے لکھا ہے کہ حافظ شہید رحمۃ اللہ علیہ کو

”گوئی کاری لگی، اور خون کا فوارہ بہنا شروع ہوا“ ۵۷ تذکرۃ الرشید ج ۱

فوارہ کی شکل میں خون جس کے اندر سے ابل رہا ہو۔ اس کا جو انجام ہو سکتا تھا، اسی مسجد میں وہ انجیام پیش آیا۔ مولوی عاشق الہی صاحب کا بیان ہے کہ

”حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا آپ کے (حضرت گنگوہی) کے زانو پر سر رکھے رکھے

وصال ہو گیا“ ۵۸

گذشتہ صفحہ سے منزلوں میں حافظ شہید رحمۃ اللہ علیہ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ جس کی تعبیر خود دہی ”تمنائے موت“ سے کیا کرتے تھے۔ خود اس کی شرح ان الفاظ میں فرماتے کہ موت کی تمنا اس قدر غالب ہے کہ خوف ہے کہ میں خود کشی نہ کر لوں، مولنا طیب صاحب کی یادداشت میں بھی اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید اضافہ یہ بھی ہے کہ ”شوق شہادت کا یہ عالم تھا کہ خود فرماتے تھے کہ میرے قریب کوئی ہتھیار یا پھری چاقو نہ رہے۔ کبھی اپنی مغلوب الحالی میں خود کشی نہ کر لوں“ ۵۹ حافظ محمد احمد صاحب فرماتے تھے کہ رات کو جس حجرے میں ہمیشہ سوتے اور ذکر و فکر و تہجد وغیرہ پڑھتے تھے۔ اس حجرے میں ممانعت تھی کہ کوئی آلہ جارحہ نہ رہ جائے۔ اندیشہ اسی کا تھا کہ غلبہ حال میں خدا جلے کیا کر بیٹھیں۔ حضرت حکیم الامت یہ بھی فرماتے تھے کہ اس حال پر ولایت کی بشارت بھی حافظ شہید کو ملی تھی، جب انہوں نے خود اس حال کو خلاف سنت ٹھہراتے ہوئے خوف کا اظہار کیا تھا، سمجھایا گیا تھا کہ موت کی تمنا مصیبت اور تکلیف کے موقع پر ممنوع ہے، لیکن لقاء اللہ کی آرزو میں موت کی تمنا ولایت کی دلیل ہے، یہی اقتناء النص ہے قرآنی آیت ان ذممت انکھ اولیاء اللہ من دون الناس فتمنوا الموت کا رد خاکسار نے بھی حیدر آباد کے غیر مشہور بزرگ مولنا محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تھا جن پر اسی ”تمنائے موت“ کی حالت طاری تھی۔ فرماتے تھے کہ خود کشی کو جواز کی کوئی شکل نہیں ملتی تو اپنا خاتمہ کر دیتا، اس فقرے کو اتنے جوش و خروش، نشاط و سرور سے معمر ہو کر ادا فرماتے، کہ تھوڑی دیر کے لئے سننے والوں میں بھی موت کی تمنائے مسرت افزا پیدا ہو جاتی تھی، ۱۲

یہ عجیب بات ہے کہ حافظ شہید کی شہادت کے بعد اسلامی دستور کے مطابق، جیسا کہ چاہئے تھا کہ کسی دوسرے امیر کا انتخاب مجاہدین کے جتھے سے کر لیا جاتا، خصوصاً جب مولنا طیب صاحب کی یادداشت سے نقل بھی کر چکا ہوں، کہ تحصیل کے کوڑ کو جلادینے کے بعد مجاہدوں کو گڑھی کے اندر گھس کر دست بدست جنگ کا مختتم موقعہ بھی میسر آ گیا تھا اور بقول ان ہی کے اس دست بدست جنگ میں

”پانسہ مجاہدوں کے حق میں پلٹ آیا، انگریزی فوج کو شکست ہوئی، تحصیل مشالی پر مجاہدوں کا قبضہ ہو گیا۔“ ۵

گو بظاہر صرف ایک آدمی خواہ وہ امیر الجیش ہی کیوں نہ ہو، اسکی شہادت کی وجہ سے اس صحتی ہوئی جنگ کے میدان کو چھوڑ کر مجاہدوں کے پراگندہ، یا تتر بتر ہونے کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی۔ لیکن بیان کرنے والے کو کچھ بیان کرتے ہیں اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے، کہ حافظ شہید رحمتہ اللہ علیہ کی شہادت کے ساتھ ہی مجاہدوں کی ہمت کچھ چھوٹ گئی، ان میں فشل اور بددی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ”فوجی اَرل“ کے زوال سے اس زمانہ میں فوجیوں کی جس نفسیاتی کیفیت کی تعبیر کی جاتی تھی، گویا سمجھنا چاہئے کہ کچھ اسی قسم کا حال ان پر بھی طاری ہو گیا۔ عموماً فوج کے کسی غیر معمولی افسر کے کام آجانے کے بعد ہی یہ صورت پیش آتی ہے۔ بظاہر خیال گذرتا ہے کہ حافظ شہید کے وجود باوجود، کا مجاہدوں کے حوصلوں اور ولولوں سے بھی شاید کچھ اسی قسم کا تعلق تھا۔ مولنا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں جو یہ خبر دی ہے کہ

”اس خبر یعنی حافظ شہید کی شہادت کی خبر نے مجاہدوں کی کمر توڑ دی، اور وہ امید جو مجاہدوں کی مشعل راہ تھی ٹوٹ گئی۔ جس سے قلوب میں سرد مہری کی کیفیات پیدا ہو گئیں۔“ ۶

ایسے موقعہ پر اپنے آدمیوں کو پراگندگی اور انتشار سے بچاتے ہوئے باہر نکال لینا، یہی سب سے بڑا فوجی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ حافظ شہید کے بعد مجاہدین کے اس جتھے کی ذمہ داریستوں کے لئے فتنل کا یہ لفظ قرآن سے ماخوذ ہے، سورۃ الافعال میں یہ فرماتے ہوئے کہ جب مسلمانوں کی مٹ بھیڑ باقی اگلے صفحہ پر،

کے سامنے سب سے بڑا اہم سوال یہی ہوگا۔ جہاں تک واقعات سے پتہ چلتا ہے، اس نازک موقع پر نزاکت کا صحیح اندازہ کیا گیا، جس طرح بھی ممکن ہوا، شکستہ خاطر فاتح مجاہدوں کو کامیابی کے ساتھ باہر نکال لینے میں وہ کامیاب ہوئے۔ مولوی عاشق الہی نے حضرت گنگوہی کے متعلق لکھا ہے کہ حافظ شہید کی آخری سانس جب ان کے زانو پر پوری ہوئی، تو لہو سے لت پت خون سے شراب و جسد مبارک کو اپنے زانو سے ہٹا کر انہوں نے لکھا ہے کہ

”باطلینان اٹھ کھڑے ہوئے“ ۵۷

”اطمینان“ کی کیفیت کا ایسے مواقع میں دلوں کے اندر باقی رہ جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ بہر حال کہنے والے اب خواہ کچھ ہی کہیں۔ لیکن میں کیا کروں۔ تحصیل شاملی کا یہ واقعہ جو اپنی قالب کے لحاظ سے مختصر اور معمولی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہاتھی کی سونڈ کو جس نے نہیں دیکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ چھڑ کے سونڈ کو دیکھ کر اس کا خیال جما سکتا ہے۔ ملاقات کے کمروں کی میز پر تاج محل کی عمارت کے نمونے آج کل جو رکھے جاتے ہیں۔ یقیناً وہ تاج محل تو نہیں ہوتے۔ لیکن نمائندگی تو تاج محل ہی کے روضہ کی کرتے ہیں، بہر حال دل میں جو بات ہے اسے کھل ہی کر کیوں نہ کہندوں۔ خواہ اسے میرا ذاتی مایخیو لیا ہی کیوں نہ ٹھہرایا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی کے جس مقدس دور کی گنجینوں میں جذب و فنا ہونے ہی کو جن لوگوں نے اپنی ہستی کا آخری نصب العین قرار دیا تھا، ان کو شاملی کے اس چھوٹے سے سریہ میں اس عہد پاک کے اہم معرکوں کا خواہ کسی پیمانے پر سہی مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید مشاہدہ اور تجربہ کر لیا گیا تھا، ذرا سوچئے گڑھی سے باہر والے میدان میں انگریزی فوج کے باضابطہ تعلیم یافتہ فوجیوں کے مقابلہ میں جو اس زمانہ کے جدید افرنجی اسلحہ سے لیس تھے، ان ہی کے مقابلہ میں جو کامیابی اور فتح کی مسرت ہوئی، اگر بدر کے (گذشتہ صفحہ سے) کسی جتنے سے ہو، تو ثبات و استقلال کے ساتھ ذکر اللہ میں مشغول ہیں۔ اسی کے بعد اعلیٰ اور ہم آہنگی کو کامیابی اور فتح کی کلید قرار دیتے ہوئے حکم دیا گیا ہے کہ واطیعوا اللہ والرسول لا تنازعوا فہم فاشلو و تذہبوا بحکمہ (اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ آپس میں جھگڑو موت اور بد دل ہو جاؤ گے اور ہوا تمہاری اکھڑ جائے گی۔)

تاریخی سرکر کی تصویر اس میں جھلکتی ہو، اور قلعہ بند ہونے کے بعد احد کا نقشہ ان لوگوں کی سامنے پیش ہو گیا، جو کھلے میدان میں قلعہ بند سپاہیوں کی بند دقوں کی گولیاں کھا کھا کر گر رہے تھے۔ پھر گڑھی کا پھاٹک جب توڑا اور اکھاڑا گیا، اس وقت ”خیبر“ کے قلعہ کا دروازہ اکھاڑنے والوں کی یاد تازہ ہو جائے۔ یا دیو پیکر انگریزی فوج کا سپاہی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، جب دیکھا کہ ہو کر گرا، تو دماغوں میں عرب کے اس سورما کا خیال اگر گھوم جائے جو کچھ اسی طرح دو ٹکڑے ہو کر خندق کے کنارے ٹرپ رہا تھا۔ اب خواہ اسے خوش اعتقاد ہی کیوں نہ قرار دیا جائے لیکن جس رنگ میں واقعات پیش آئے۔ قد شاذ ہنی انتقال میں ان ہی سے مدد مل رہی ہے۔ اپنے اس اضطرابی احساس کا کیا کروں، آخری انجام مجاہدوں کی جدوجہد کا شاملی کے میدان میں جو ہوا۔ بظاہر ہزیمت شکست کے سوا اسے اور کیا سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن عہد سعادت میں موتہ کے میدان میں جو واقعہ پیش آیا، یعنی یکے بعد دیگرے اسلامی لشکر کے افراد شہید ہوتے چلے جا رہے تھے، پہلے حضرت زید، پھر جعفر طیار، پھر عبداللہ بن رواحہ شہید ہوئے۔ آخر میں خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جھنڈا اٹھالیا، مگر بائیں ہاتھ میدان جنگ کے چھوڑنے پر مسلمانوں کو مجبور ہونا پڑا تھا، مگر باوجود پپائی کے چونکہ انتہی دیراگندگی سے بچاتے ہوئے دشمنوں کے زمرے سے ان مسلمانوں کو حضرت خالد بن خالدؓ کی لڑائی میں کامیاب ہو گئے تھے، ان کی اسی کامیابی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

فتح لہ (بخاری) | پس فتح خالد بن ولید کی ہوئی

جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کبھی کبھی پپائی بھی بجائے ہزیمت اور شکست کے ”فتح و ظفر“ قرار پانے کی مستحق ہوتی ہے۔ عہد نبوت کے اسی نمونہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاملی کے میدان سے تھانہ بھون کے مجاہدوں کی داپسی میں جنگ موتہ کی پپائی کی جھلک محسوس ہو، تو آخر اس احساس کو قطعاً بے بنیاد ٹھہرانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

آخر خود سوچئے، مجاہدین کی امنگیں مردہ ہو چکی ہیں، ولولے پست ہو چکے ہیں غنیم کی فوج

انتقامی جذبات میں بھری ہوئی۔ ان کے پیچھے ہے لیکن اس قیامت خیز وقت میں جیسا کہ مولوی عاشق الہی نے لکھا ہے کہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ شہید کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر ”یکے بعد دیگرے تھانے میں سمت مغرب، زمین کی گود کے حوالہ کیا“ ص ۷۷۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ مجاہدین کی یہ واپسی اس شان میں ہو رہی تھی کہ اپنے شہید امیرالحیش کے جسد مبارک کو چارپائی پر ڈالے، تعاقب کر لے والے دشمنوں سے مقابلہ و مقاتلہ کرتے لڑتے پھرتے تھانہ بھون تک پہنچ گئے، ایسی صورت میں مجاہدوں کی اس پسپائی کو بھی اگر فتح قرار دیا جائے، تو واقعہ جس رنگ میں پیش آیا ہے مثلاً اس کے لحاظ سے یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا۔ جو روایت حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی خاکساز تک پہنچی ہے، اسی میں یاد آتا ہے کہ اسی واقعہ کا ذکر فرماتے ہوئے حافظ صاحب نے فرمایا تھا کہ جس وقت مجاہدین حافظ صاحب کے جنازے کو لے کر تھانہ کے قریب پہنچے، خیران کی شہادت کی تھانہ پہلے ہی سے آجکی تھی، ہر گھر میں کہرام مچا ہوا تھا، قصبہ سے باہر نکل کر جنازے کے استقبال کے لئے باجشم گریاں، وقلب بریاں حاجی امداد اللہ دوسروں کے ساتھ انتظار میں کھڑے تھے۔ عاشق کا جو جنازہ مجاہدین کے کندھوں پر دھوم سے چلا آ رہا تھا، جوں ہی کہ حاجی صاحب کی نظر پڑی، بے ساختہ چیخ نکلی گئی، اور اسی حال میں یہ فقروان کی زبان پر جاری ہوا۔

”جس کے لئے یہ سب کچھ ہوا، وہ بات پوری ہو گئی، دیکھنا قصہ بھی ختم ہو گیا۔“

صحیح الفاظ یاد نہیں رہے، بطور روایت بالمعنی کہہ سکتا ہوں کہ حاصل یہی تھا۔ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں اسی موقع پر یہ فقرے جو پائے جاتے ہیں، یعنی مجاہدین کی اس آخری پسپائی کے ذکر کو ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں

”پابندان اسباب و وسائل نے تو شکست پر محمول کیا۔ اور عارفین اور ارباب باطن نے اپنے

غیبی ادراک سے بتایا کہ اس جہاد کا آخری نقطہ حافظ صاحب شہید کی شہادت تھی، تکمیل مقصد

کے بعد مبادی کی گرم بازاری ختم ہو جاتی ہے، اس لئے حضرت شہید کی شہادت پر یہ سارا

ہنگامہ رست و خیز ختم ہو گیا۔

سیری روایت کے اجمال کی گویا یہ تفصیل ہے۔

گو یا نگویری طور پر جہاد کے اختتام کا آخری نقطہ حضرت شہید کی شہادت تھی۔ جیسا کہ تشریحی اور اجتہادی طور پر اس جہاد کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ تھا۔ وہ رہا اور اختتام جہاد پر بھی اس مقصد میں کوئی فرق نہ آیا۔ بلکہ امن و سکون اور انقلاب کے بعد یہی اعلائی جذبات دوسرے رنگ میں نمایاں ہوتے رہے۔

بہر حال حافظ صاحب مرحوم سے فقیر نے جو کچھ سنا اور مولانا طیب صاحب نے جو کچھ ارتقا فرمایا ہے۔ سال سب کا یہی ہے کہ عالم تدریس میں واقعہ خواہ جس رنگ اور اسباب و علل کے جن پردوں سے بھی گذر کر رونما ہوا ہو، لیکن عالم تقدیر کے جو محرم اسرار تھے ان پر کھولا گیا تھا کہ تمنائی موت کا جذبہ جس میں ابھارا گیا تھا، اسی کی تمنائے تھانہ بھون کے اس طوفان کو پیدا کیا تھا۔ تمنائے والے کی تمنائے پوری ہو گئی تو طوفان بھی ٹھم گیا۔ یہی راز تھا جس کا افشاء و فور حزن و غم میں ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اسباب و علل کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہماری عقل کے لئے شاید اس قسم کی غیبی اطلاعیں چند قابل لحاظ نہ ہوں، مگر اسی سلسلہ میں ایک واقعہ جو تواتر کے رنگ میں اگلوں کو پچھلوں تک پہنچا ہے یعنی کہا جاتا ہے کہ ”زور برد“ ”بزن و مکش“ کے ان ہنگاموں میں جو شاعری میں برپا تھے۔ سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کو بھی گولی لگی تھی، اپنی جہادی یادداشت میں مولانا طیب صاحب نے بھی لکھا ہے۔

۱۵ حضرت الاستاذ الامام الکلبیری عالم تدریس و عالم تقدیر کے اس تعلق کو مثالوں سے سمجھا یا کرتے تھے فرماتے کہ مقصود مثلاً آدم کا پھل ہوتا ہے۔ اسی تقدیری فیصلہ کو قدرت عالم تدریس صرف ظاہر کرتی ہے کہ گٹھلی سے کھلے پھوٹتے ہیں، جڑ نکلتی ہے، شاخیں پیدا ہوتی ہیں۔ بالآخر ایک تناور درخت ہمارے سامنے آتا ہے۔ تنے ڈالیوں، شاخوں سے گزرتے ہوئے جو اصل مقصود تھا یعنی آدم کا پھل نمودار ہوتا ہے۔ یا فرماتے کہ تقدیری فیصلہ ہو چکا تھا کہ زمین کا خلیفہ آدم علیہ السلام کو بنایا جائے گا لیکن ظہور اس فیصلہ کا اس رنگ میں ہوا کہ سجدہ کا حکم فرشتوں کو دیا گیا۔ ابلیس نے انکار کیا بلکہ ٹھہرایا گیا آدم کو جو اس کے ساتھ جنت میں رہنے کا حکم اس شرط کو ساتھ دیا گیا کہ شجرہ (خاص قسم کا درخت) سے دور رہیں۔ مگر خدا کو اس حکم کی تعمیل نہ ہونے پر ہمتی تب حکم دیا گیا کہ زمین پر اتر جاؤ۔ یوں خلافت کا تقدیری فیصلہ سامنے آیا۔

”اسی سلسلہ میں حضرت (نانوتوی) کو کبھی گولی لگی تھی، اور وہ بھی پٹ پڑی پر، جو انتہائی نازک مقام ہوتا ہے، اس سے ڈارھی کے کچھ بال بھی جل گئے، لوگوں نے سمجھا کہ شہید ہو گئے، مگر ایک دم بہت سے اٹھے، اور چہرے پر ہاتھ پھیرا، تو ایسا تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔“ ص ۵

اسی واقعہ کا تذکرہ مولوی عاشق الہی صاحب نے تذکرۃ الرشیدیہ میں بایں الفاظ کیا ہے کہ
”حضرت مولنا قاسم العلوم ایک مرتبہ بیک ایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، بعض نے دیکھا کہ کنپٹی پر،
گولی لگی، اور دماغ پار کر کے نکل گئی۔“

مزید اضافہ ان کے بیان میں یہ ہے کہ
اعلیٰ حضرت (مراد حضرت مولنا لنگوہی سے ہے) انہوں نے لپک کر زخم پر ہاتھ رکھا، اور
فرمایا ”کیا ہوا میاں۔“

مولوی عاشق الہی لکھتے ہیں کہ اس کے بعد
”عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا، کہیں گولی کا نشان نہ ملا، اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام
کیڑے تر۔“ ص ۵

مولنا طیب اور مولنا عاشق الہی کی توضیحی روایت ہے لیکن ان سماعی روایتوں کے ساتھ ہم اپنے
مصنف امام حضرت مولنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب میں بھی یہ پاتے ہیں، فرماتے ہیں کہ
”ایک بار گولی چل رہی تھی، بیک ایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، جس نے دیکھا جانا گولی لگی۔ ایک بھائی
دوڑے، پوچھا کیا ہوا، فرمایا کہ سر میں گولی لگی، عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا، کہیں گولی کا نشان نہ ملا،
اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کیڑے تر۔“ ص ۳

ہمارے مصنف امام نے جبکہ اس وقت کلا قضا تھا، اسکی تصریح تو نہیں کی ہے کہ یہ واقعہ کہاں کس
موقعہ پر کیے پیش آیا، لیکن ظاہر ہے کہ شالی کے مہدان ہی کے اسی واقعہ کا ذکر کر رہے ہیں، جس کا
تذکرہ مولنا طیب اور مولوی عاشق الہی نے کیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مصنف امام کی شہادت کے بعد،

واقعہ میں شک کی گنجائش ہی کیسا باقی رہتی ہے، ان کے بیان میں ”ایک بھائی“ سے مراد حضرت مولانا گنگوہی ہیں۔ جن کے نام کی تصریح مولوی عاشق الہی نے کی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مولانا طیب اور مولانا عاشق الہی نے تو صرف ایک ہی واقعہ کی حد تک اپنے بیان کو اس سلسلہ میں محدود رکھا ہے۔ لیکن ہمارے مصنف امام نے اس واقعہ کے سوا یہ بھی لکھا ہے کہ

”انہیں دنوں ایک نے منہ در منہ بدوق ماری جس کے سنبھے سے ایک مونچھا اور ڈاڑھی

(مولانا نانو توئی) کی جل گئی، اور کچھ قدرے آنکھ کو سدھہ پہنچا، اور خدا جائے گوئی کہساں

گئی، اور اگر گوئی نہ تھی تو اتنے پاس کو سنبھ بھی بس تھا، مگر حفاظت الہی برسر تھی کچھ اثر نہ ہوا۔“

جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ غدر ہی کے زمانہ میں یہ دوسرا حادثہ بھی سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ پیش آیا تھا۔

بہر حال حاصل یہی ہے کہ گوئی کھانے کے بعد جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ نہ ہوا۔ یہی لوگوں کا مشاہدہ

ہے، اب اس کی توجیہ کچھ بھی کی جائے۔ خواہ سیدنا الامام الکبیر کے باطنی تصرف کا نتیجہ اس کو ٹھیکر یا جاکے

جیسا کہ مولانا طیب صاحب کی روایت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ یا حضرت مولانا گنگوہی کی توجیہ کو اس

میں ذخیل مانا جائے، جس کی طرف مولانا عاشق الہی کے بیان میں ایسا کیا گیا ہے۔ اب خواہ اسباب کچھ

بھی ہوں۔ لیکن واقعہ بہر حال پیش آیا، سوال یہی ہوتا ہے کہ حافظ شہید کے ساتھ بھی اسی طرز عمل یا معاملہ

لے گوئی لگنے کے بعد حضرت والا کے محفوظ رہنے اور محض قدرے خون نکل آنے اور داڑھی مونچھ کے کچھ بال اڑ جانے پر بس

ہو جانے کے ظاہری سبب کے بارے میں مختلف روایتیں بیان کی گئی ہیں۔ مصنف امام کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ گوئی

کا بے اثر رہ جانا خود حضرت الہی کا کرامت تھی میں نے اپنے متعدد بزرگوں سے سنا کہ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ نے

حضرت والا کو ارستہ مزاج آزاد اور جوش جہاد میں جان سے قطعاً بے پرواہ دیکھ کر جہاں مولانا محمد منیر صاحب کو ان کے

پیچھے پیچھے بطور محافظ ہٹنے پر مامور کیا، وہیں ایک تو بیڈ بھی دیا کہ اسے پکڑی میں رکھیں۔ بعض ثقافت سے متوسل ہوا کہ

حضرت حافظ صاحب شہیدؒ نے انگلی سے اپنا لواب دہن پیشانی پر لگا دیا تھا۔ مولانا عاشق الہی صاحب نے اس سلسلہ

میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کے تصرف کی طرف ایسا کیا ہے۔ بہر حال روایات مختلف ہیں۔ لیکن ان میں نہ غرض ہے نہ

ان میں سے کسی روایت کے انکار کی ضرورت۔ حاصل یہ نکلتا ہے کہ حضرت والا کے بڑے اور ہم عصر دوست سب ہی ان کی طرف متوجہ اور ان کی طرف سے فکر مند تھے اور چاہتے تھے کہ نصو صیت سے وہ محفوظ رہیں (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کی باطنی تدبیر کے اختیار کرنے میں کون سی چیز مانع تھی، جراحی یا دوسرے عام طبی ذرائع کی توجہ بدین کے اس بے سروسامان بے نواجہ کی طرف سے مہیا ہونے کی صورت ہی کیا تھی، لیکن سیدنا امام الکبیر کے متعلق دیکھنے والوں نے جو کچھ دیکھا، حافظ شہید کے ساتھ بھی چاہا جاتا تو یہی کر کے دکھایا جاسکتا تھا، یقیناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور شہید کے جنازے پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ جس راز کا افشا، حضرت حاجی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے ہو گیا اس کے سوا آپ ہی سوچئے کہ معقول جواب اس سوال کا اور کیا ہو سکتا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مرنے ہی کے لئے جو تڑپ رہا تھا، برسوں سے تڑپ رہا تھا، موت ہی کو جو اپنا مطلوب بنا چکا تھا جب اپنی اسی تمنا اور آرزو سے ہم آغوشی کا موقع اس کے سامنے آیا تو شاید اس میں خلل اندازی اگر بدبختی نہیں، تو سوراہی ضرور تھی، اسی موقع پر ہمیں، تاریخ کے مختلف قرون و ادوار میں اسی قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو کر حقیقت کی یافت سے لوگ محروم رہے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جینے کے لئے جو جیتے ہیں، اور مرنے کے لئے مرتے ہیں، ان کی حیات و موت کے قصوں کو مجرمانہ مغالطہ ہو گا، اگر ان لگوں کی حیات و موت سے ناپا اور جانچا جائے، جو جیتے بھی ہیں،

(سلسلہ صفحہ گذشتہ) کیونکہ ان کے علم و فضل اور قوت باطنی سے آئندہ کے بہت سے دینی و علمی مہات کی تکمیل محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے ہجرت فرمانے کے وقت جب یہ دونوں خلیفہ (حضرت نانوتوی اور حضرت لنگوہی)، آخری طور پر ملنے کے لئے پنجاب (پنجاب) پہنچے اور اصرار شروع کیا کہ حضرت ہم بھی آپ کے ساتھ اس ملک سے ہجرت کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں بھی ساتھ ہی لے چلئے تو شیخ نے فرمایا کہ نہیں تم ہندوستان ہی میں رہو تم سے حق تعالیٰ کو بہت کچھ لینا ہے۔ محمد طیب غفرلہ

لے شاؤ اگر بلا کے تاریخی فاجعہ ہی کو دیکھئے۔ حق و باطل کی کش مکش میں بظاہر دیکھا گیا، کہ باطل ہی کا سراپا بن چکا ہوا، امام حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور یزیدی کامیاب ہوئے۔ لیکن اب یہ کون بتائے کہ ایک دفعہ نہیں، تین تین دفعہ کلی تخلیہ کر کے جو کچھ اس کے پاس تھا، اللہ کی راہ میں لٹا چکا تھا، کربلا میں روکنے کے باوجود وہ کس آرزو اور تمنا کے ساتھ کس کے سامنے آیا تھا، ایمان والوں سے ان کے اموال و انفس جو خرید چکا ہے۔ اگر خریدنے والے کے سپرد اس کے خریدے ہوئے اموال و انفس کو بیچنے والے کر رہے ہوں تو خرید و فروخت کے معاملہ میں بتایا جائے کہ اندھونہ ہی کیا ہے۔ بہر حال جن کے بڑوں نے کربلائی مشاہدات پیش کئے، ان ہی کے چھوٹوں کی طرف سے شامی کے میدان میں جو کچھ دکھایا گیا اس پر تعجب کیوں کیا جائے۔ ۱۳

تو کسی مقصد کے لئے، اور مرتے بھی ہیں، تو اس سے بھی کسی نصب العین ہی کی تکمیل مقصود ہوتی ہے، سیدنا الامام الکبیر زندہ رکھے گئے، کہ جس مقصد کے لئے ان کی زندگی تھی ابھی وہ سامنے نہیں آیا تھا، اور حافظ شہید اٹھائے گئے کہ جس لئے وہ جی رہے تھے ان کی وہی تمنا بے نقاب ہو کر ان کے سامنے آچکی تھی، میں بہت دور نکلا جا رہا ہوں، مجھے واقعہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ مولوی عاشق الہی کی اطلاع کے مطابق میدان کارنار سے دوش بدوش ادا لیتے بدلتے تھے انھوں تک شہید کی لاش پہنچا دی گئی۔ شہید ہونے کی وجہ سے شرعاً کفن ہی کا سوال تھا، اور نہ غسل کا، نماز پڑھ دی گئی اور قصبہ کے باہر غالباً جہاں پر حافظ شہید کا جنازہ اتار لیا تھا، زمین کھود کر ان کو سپرد خاک کر دیا گیا، اب بھی میری کے ایک درخت کے پاس خام قبر شہید کی موجود ہے جس پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت فقیر کو بھی حاصل ہوئی ہے۔ وہ چاہیں یا نہ چاہیں۔ لیکن ان کے لئے نہیں لوگ اپنے لئے ان پر فاتحہ پڑھنے کے عادی ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ مولانا طیب صاحب اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ

”ادھر حضرت (حافظ شہید) کی شہادت ہوئی، اور ادھر دہلی سے خبر آئی کہ بادشاہ دہلی گرفتار ہو گئے اور دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔“

دلی کے آخری بادشاہ کی گرفتاری، اور ذوال اقتدار کے بعد دلی پر انگریزوں کا دوبارہ اقتحامی اقتدار و قبضہ کیا تھا، ہندوستان کے لئے عموماً، اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً قیام قیامت سے پہلے جاننے والے جانتے ہیں کہ گو یا قیامت قائم ہو چکی تھی۔

ان ناقابل بیان، جاں گداز، روح فرسا، ہوش ربا واقعات کی تفصیل سے تاریخ کے خویش ادراک

لے کشف قبور رکھنے والے صاحب دل سے لطیفہ کا ذکر کر چکا ہوں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا شہداء کے متعلق کچھ اسی قسم کا نقطہ نظر تھا، اسی لئے جنازے کی نماز کی بھی شہید کے لئے ضرورت نہیں سمجھتے تھے لیکن حدیثوں میں جب آیا ہے کہ جنازہ کی نماز کا فائدہ پڑھنے والوں کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ مغفرت کی بشارت بعض جانے کی نماز پڑھنے والوں کو دی گئی ہے اور پڑھنے والوں کیلئے اجمود خیر صاحب جنازہ بنتا ہے یہی میرا مطلب ہے کہ فاتحہ پڑھنے والوں کی غرض بھی کچھ یہی ہو سکتی ہے جتنی مذہب میں شہیدوں پر بھی جنازے کی نماز اسی لئے پڑھی جاتی ہے کہ پڑھنے والوں کا اس میں فائدہ ہے۔ ۱۲

لب ربز ہیں۔ کچھ نہیں اردوئے معلیٰ غالب مرحوم کے خطوط کا جو مشہور مجموعہ ہے۔ صرف اسی کتاب کے چند خطوط کے بعض فقروں کا پڑھ لینا کافی ہے۔ دلی میں بیٹھ کر شاہی خاندان کو جس حال میں غالب نے پایا تھا، اس کے ان فقروں کو نقل کرتے ہوئے قلم کا نپ رہا ہے۔ لکھا ہے کہ ”معزول بادشاہ کے جو بقیۃ السیف ہیں۔ وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناٹ جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں، اور جوانیں کسبیاں“ ص ۳۲۳ اردوئے معلیٰ

الخطبة للسلطان المسلمان کے دارالسلطنت کے متعلق دلی ہی میں بیٹھ کر یہ لکھتے ہوئے کہ ”جس شہر میں ہوں، اس کا نام دلی اور محلہ کا نام بلیماروں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست بھی اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔“

آگے قسمیں لکھا کہ غالب ہی کی گواہی یہ بھی ہے کہ

”وانتہ ڈھونڈھے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا“ ص ۶۵

ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کے لئے پاسپورٹ یا پرمٹ وغیرہ کے قصے تو سنے جاتے ہیں لیکن اس وقت دلی میں دیکھا جا رہا تھا، خود مرزا غالب دیکھ رہے تھے کہ ”یہاں (دلی) باہر سے اند کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔“ نگرانی میں تشدد اور قدغن کا حال یہ تھا،

”جو باہر کے گوروں سے آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں (تھانیدار) بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے یاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں، یادورو پیہ جرمانہ لیا جاتا ہے، آٹھ دن قید رہتا ہے، اور سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے، اور کون ٹکٹ رکھتا ہے“ ص ۲۱۶

کون اندازہ کر سکتا ہے ان مصائب و آلام کا کہ اپنے گھر میں بھی کوئی ٹکٹ یعنی پرمٹ کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا، اور شہر سے باہر جنگلوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں میں جھونپڑے ڈال ڈال کر جو پڑے ہوئے تھے ان کے متعلق بھی حسب اطلاع غالب

”کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں، جو مکان بن چکے ہیں انہیں ڈھا دو، اور آئندہ ممانعت کا حکم سنا دو“ ۲۱۷

اسی دلی میں جہاں مسلمانوں کا لال قلعہ اور جامع مسجد ہے، اسی کے متعلق غالب اپنے خط مورخہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء میں اپنے اس احساس اور اندیشہ کو قلم بند کرتا ہے،

”دیکھا چاہئے مسلمانوں کو آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں“ ۲۱۸

ان ہی خطوط میں دلی کے اسی ”شہر آشوب“ کے متعلق غالب نے اپنی ایک نامی نظم کے چند اشعار کا بھی تذکرہ کیا ہے،

بسکہ فعال مایرید ہے آج	ہر سلعہ شور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے	زہرہ ہوتا ہے آبِ انسان کا
چوک جسکو کہیں وہ مقتل ہے	گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر و ہٹی کا ذرہ ذرہ خاک	تشہہ خون ہے ہر مسلمان کا

(۳۷۵ اردوئے معلیٰ)

غالب نے جو کچھ دیکھا تھا دلی میں دیکھا تھا۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ان اشعار میں درحقیقت ملک کے اکثر حصوں کی تصویر کھینچ آئی ہے، دلی اور دلی والوں پر جو کچھ گذر رہی تھی تقریباً سارے ماؤف آسیب رسیدہ علاقوں کا حال یہی تھا، اس برپا ہونے والی قیامت کے ہنگاموں سے بچ نکلنے کی ایک مختصر راہ تو وہی تھی جو حافظ شہید کو میسر آئی۔ بندوق کی گولی، صرف ایک گولی نے سارے تصوں کو صرف ختم ہی نہیں کر دیا، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی وحی قرآنی سے علمی ربط قائم کر لینے کے بعد جو کچھ دکھا یا جاتا ہے اور دیکھنے والے جو کچھ دیکھتے ہیں، ان کی نگاہوں کے سامنے سے اس جاں نواز نظارے کو کون ٹہا سکتا ہے کہ مغلوں کی حکومت ہو، یا پٹھانوں کی، خلیجوں کی ہو، یا غوریوں کی، الغرض دنیا کی کوئی حکومت مشرقی ہو، یا مغربی، جباری ہو یا جمہوری، فرعون ہو یا اشتہر کی جسے مہیا نہیں کر سکتی، بلکہ مہیا کر لئے کا خیال بھی نہیں کر سکتی، حافظ شہید امن و عافیت کی ان ہی لازوال راحتوں کو لکھ اور بھین کی ان ہی نہ ختم ہونے والی

لذتوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اب کیا ہوگا؟ کے نہ حل ہونے والے سوال کا یہ قلندری جواب تھا، جسے حافظ شہید نے اپنے مقدس اور پاک خون سے لکھ کر بلوچھنے والوں کو دیا تھا۔ جسم کو چھید کر اور ہڈیوں کو توڑ کر نکل جانے والی گولیوں کی دشواریوں کو اپنے لئے حافظ شہید کی طرح جو بھی آسان بنا لے گا۔ اس لئے یہ قلندری راہ ہمیشہ کیلئے کھلی ہوئی ہے۔ لیکن کھانے سے پہلے ہچکچانے والوں کو بھی کیسے چھوڑا جاسکتا تھا، اور کن پر چھوڑا جاتا، دینے والے نے ان ہی کے لئے یقربانی دی کہ گولی کھانے کی دشواریوں کو آسان بنا لینے کو بعد بھی اس قلندری راہ کو چھوڑ کر وہ واپس آگیا، ہائے اگر وہ واپس نہ ہوتا، تو جس ملک میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو باہر نکل جانے کی دھمکی دی جا رہی تھی، کون کہہ سکتا ہے کہ چلے جانے کے بعد پھر اس ملک میں وہ واپس ہو سکتا تھا، صدق مولنا الکریم

من المؤمنین رجال صدقوا ما	ان مؤمنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات کا
عاهدوا اللہ علیہ فممنہم من قضی	اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے پھر بعضے دن ان میں
نحبہ ومنہم من ینتظر و ما بدّلوا	وہ میں جو اپنی نذر پوری کر چکے۔ بعضے ان میں (شہادت کے) مشتاق
تبدیلوا (البخاری)	ہیں اور (اب تک) انہوں نے ذرا تیر و تبدیل نہیں کیا۔

یقیناً جو چلے گئے وہ بھی سچے تھے، اور اپنے مالک کو جو عہد کیا تھا، اس میں پکے تھے لیکن انتظار کی سختیوں کو جھیلنے کے لئے جو رک گئے یا روک لئے گئے۔ انہوں نے بھی اپنی بات پوری کی، یہ حافظ شہید کے رفقا، سیدنا الامام الکبیر اور قطب ربانی حضرت گنگوہی قدس اللہ اسرارہم وغیرہم حضرات تھے۔ بہر حال جو چلے گئے، وہ چلے ہی گئے، لیکن منتظر بنا کر جو رد کے گئے، ان پر کیا گذری، جہاں تک معلوم ہو سکا ہے، اسے بھی سن لیجئے۔ مولنا عاشق الہی مرحوم نے تذکرۃ الرشید اور اس کے حاشیہ میں جو کچھ مصباح وقت کا خیال کر کے لکھا ہے سب کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ صحاح (ترمذی و نسائی) کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایچھ الشہید من مہل القتل الاکما یجول احدکھ من مس القرصہ (یعنی قتل کی تکلیف شہید کو اس سے زیادہ محسوس نہیں ہوتی جتنی تکلیف کھٹل چھرو وغیرہ جیسی چیزوں کے کاٹنے سے ہوتی ہے، ۱۲

شامی کی تحصیل کے کوڑا کوڑ کر جب گڑھی میں لیٹا کر کے مجاہدین پہنچے اور دست بدست جنگ انگریزی فوج کے سپاہیوں سے شروع ہوئی تو موقع کو غنیمت دیکھ کر بعض منچلوں کا ذہن تحصیل کے خزانے کی طرف منتقل ہو گیا۔ خزانے پر بھی ہلہ بول دیا گیا۔ اور جس وقت حافظ شہید کے جنازے کو کندھوں پر لٹے ہوئے باجٹم گریاں، ددل بریاں مجاہدین کا طبقہ تھانہ بھون کی طرف جا رہا تھا، اسی وقت ان ہی میں ملے جلے وہ لوگ بھی تھے جو تحصیل کے خزانے سے دست و برد کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ یہ مال جو تحصیل کے خزانے سے لوٹا گیا تھا، اس کا انجام کیا ہوا؟ مستقر تھانہ کے امیر بریڈش کر کے اس کو ”غنیمت“ کا قالب عطا کیا گیا، یہ مال صرف لوٹا ہوا مال ہی ہو کر رہ گیا، اس کا تو پتہ نہ چل سکا، لیکن نتیجہ اس کا سب ہی کو بھگتنا پڑا۔ مولانا عاشق الہی کا بیان ہے کہ

”جس وقت گورنمنٹ کو اہل کاران تحصیل کے مارے جانے اور خزانے کے لوٹ جانے

کی اطلاع ملی تو حاکم (غالباً مظفرنگر کا کلکٹر) مثالی پہنچا، اور چار طرف نشوون اور قصبہ کی ایرانی دہر بادی دیکھ کر غصہ سے تھرا اٹھا“

لکھا ہے کہ غنیمت و غصب کے اسی ارتعاشی حال میں زبان سے اسی انگریزی افسر کے یہ فقرہ نکلا کہ

”تھانہ بھون کو بھی اسی طرح مسمار کر کے چھوڑ دوں گا“ ۱۷۷

اس وقت تو صرف اسی قول کو ساتھ وہ مظفرنگر واپس ہو گیا۔ لیکن جوں ہی کہ (جیسا کہ مولوی صاحب نے لکھا ہے)

”دہلی کے فتح ہو جانے کی خبر مشہور ہوئی“

ہر ایک کے سامنے اس کا قول ”فعل“ کی دھمکیاں تھانہ بھون والوں کو دینے لگا، مولوی صاحب کا بیان ہے،

”تھانہ میں خبر گرم ہوئی، کہ علی الصباح انگریزی فوج یہاں پہنچا چاہتی ہے“

تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت علی تو حکومت کے نزدیک اس ہنگامہ کے بانی بیانی ہی تھے لیکن خود مولوی عاشق الہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ اسی عرصہ میں یعنی شامی کو دیکھ کر

منظر نگار کا حاکم واپس ہوا، اور دلی کی فتح کی خبر پہنچی، اس درمیانی وقفہ میں سرکاری گوندوں نے حکومت تک یہ خبر بھی پہنچائی، مولانا کے الفاظ یہ ہیں

”کہ تمھانہ بھون کے فساد میں اصل الاصول ہی لوگ تھے“

یہی لوگ سے مراد تمھانہ بھون کی جہادی ہم کے امیر المؤمنین حضرت حاجی اماد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء مسیدنا امام الکبیر و مولانا گنگوہیؒ وغیرہم حضرات تھے۔ لکھا ہے کہ رپورٹ میں مخبری کی گئی تھی کہ

”شالی کی تحصیل پر حملہ کرنے والا بھی یہی گروہ تھا، بستی کی دوکانوں کے چھپراہوں نے تحصیل کے دروازہ پر جمع کئے، اور اس میں آگ لگا دی، یہاں تک کہ جس وقت آدھے کو اڑھل گئے، ابھی آگ بجھ بھی نہ پائی تھی کہ ان نڈر ملاؤں نے جلتی آگ میں قدم بڑھائے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر خزانہ سرکار کو لوٹا تھا“ ص ۱ تذکرۃ الرشید ج ۱

ادھر مخبری کی یہ کارروائی سرکار میں جاری تھی کہ حاکم منظر نگار جو شالی کے انتقامی غصہ کی آگ میں جل چکا تھا، رہا تھا، دلی کی فتح کی خبر سننے کے ساتھ ہی، اس کے زیر اقتدار فوجیوں کا جو دستہ تھا، اسکو تمھانہ بھون

لے جیسا کہ پڑھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ تقریباً یہ وہی بات ہے جس کی تفصیل مولانا طیب صاحب کی یادداشت سے پہلے نقل کر چکا ہوں، بیان میں اختلاف صرف اسی حد تک ہے کہ مولانا کی یادداشت میں دو انے باہر کی کنیا کو چھپے کا ذکر کیا گیا ہے جو نوچ کر کوڑوں کو جلانے کیلئے آگ لگا دی گئی تھی، اور مولانا عاشق اہلبی بجائے کنیا کے فرماتے ہیں کہ بستی کی دوکانوں کے چھپروں سے یہ کام لیا گیا، خاکسار نے حافظ محمد احمد صاحب مرحوم سے شالی کی ہم کی جو داستان براہ راست سنی تھی۔ جہاں تک خیال آتا ہے، اس سے مولانا طیب صاحب ہی کی یادداشت والی روایت کے الفاظ کی تائید ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ چھپراہو تحصیل سے باہر پڑا ہوا تھا۔ اس میں تحصیل والوں کی عام ضرورتوں کیلئے لوگ دکان بھی لگاتے ہوں۔ یوں کوئی چاہے تو دونوں روایتوں میں تطبیق بھی دے سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ مخبری کی اس رپورٹ میں ان بزدلوں کی طرف خزانے کی لوٹ کو جو منسوب کیا گیا ہے۔ میرا خیال وہی ہے کہ مجاہدین میں بعضوں سے یہ فعل سرزد ہوا، جس سے مخبروں کو موقع مل گیا جو ان حضرات کی طرف اس کو منسوب کر دیا تاکہ یہ جنگ کے مواقع میں قانون حیات کی رو سے فہم کے مال کے ساتھ اس قسم کا تصرف غیر قانونی نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن بحث یہاں واقعات سے ہے، اس رپورٹ کے بارہ میں آج تک نہ کسی سے سننے ہی میں آیا نہ کہیں پڑھا کہ ان بزدلوں نے کوئی مالی استفادہ بھی کیا تھا۔ ۱۲

کی طرف مارچ کرنے کا حکم دے دیا۔ مظفرنگر سے تھانہ بھون کا فاصلہ ہی کتنا تھا، خبر میں تو پہلے ہی سے آرہی تھیں، مولنا عاشق الہی نے لکھا ہے کہ

”صبح صادق نمودار ہوئی، تو بلائے بے درماں اپنے ساتھ لائی، تھانہ بھون کو سرکاری فوج سے گھیر لیا گیا“

لکھا ہے کہ

”مشرقی جانب سے گولہ باری شروع ہو گئی“

مولنا کے بیان میں تو اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، کہ قصبہ والوں نے اس گولہ باری کے مقابلہ میں کیا کیا۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست خاکسار نے یہ سنا تھا کہ شروع میں تھانہ والوں نے سرکاری فوج سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، فیصل کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے، اور کوئی توپ جو تھانہ والوں کو کہیں سے مل گئی تھی، ممکن ہے کہ شاعلی ہی کی گڑھی میں ہاتھ آئی ہو، بہر حال حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ کسی بلند مقام پر اسی توپ کو چڑھا کر قصبہ والوں کی طرف سے جوابی فائر ہونے لگے، ایک دفعہ اتفاقاً یہ عجیب صورت پیش آئی کہ گولا جو قصبہ والوں کی توپ سے پھینکا گیا تھا، ٹھیک غلیم کی توپ کے دہانہ پر جا کر پڑا، انگریزی فوج کی یہ توپ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہاں یہ مشکل ایک آدھ توپ غریبوں کو میسر آ گئی تھی، گولہ بارود کی مقدار بھی ان کے پاس اتنی کہاں سے ہوتی، جو انگریزوں کی توپوں اور گولہ بارود کے ذخیرے کے مقابلہ کے لئے کافی ہوتی، مولنا عاشق الہی صاحب کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ والے چند گھنٹوں سے زیادہ نہ ٹٹ سکے، ان کے الفاظ ہیں

”دن نکلنے پر فوج قصبہ میں داخل ہو گئی“

پھر کیا ہوا؟ انتقام کی وہی جہنم جو مظفرنگر کے کلکٹر کے سینے میں دبی ہوئی تھی، ابل پڑی، مولنا نے لکھا ہے کہ

”قتل و قتال، لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا، اور رات کی تاریکی کے چھانے سے پہلے پہلے، شہر سپاہ کے چاروں دروازے اڑا دئے گئے، اور مکانات پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ دے دی گئی۔“

ان الفاظ پر اضافہ کی ظاہر ہے کہ ضرورت ہی کیلئے؟ تھانہ بھون کا سارا قصبہ وہی جہنم بن گیا جو منظر نگار کے کلکٹ کے اندر چھپی ہوئی تھی، ”ان زندہ انسانوں، جن کے گھروں سے باہر تو انگریزی فوج کی گولیاں برس رہی تھیں، اور گھروں کے اندر آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ عورتوں بچوں، بوڑھوں، معذوروں پر کیا گذری ہوگی یا ان حالات میں کیا گذر سکتی ہے، انسان تو اس کے سوچنے کی بھی تاب نہیں لاسکتا، لیکن منظر نگار کا انگریز عیسائی حاکم نہتوں اور بیکیوں کے ساتھ ہی کر رہا تھا اور کر کے دکھا رہا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ گھروں کے اندر آگ تھی، اور گھروں سے باہر بندو قوں کی باڑھ تھی، بلکہ مولنا عاشق الہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قصبہ چھوڑ کر جو بھاگنا چاہتے تھے، ان پر بھی راہ گیر اس لئے بند تھی، کہ ”عالم کس سپر میں نواح و حوالی کے دیہاتیوں کی لوٹ مار اور بے جا حرکتوں کا زیادہ موقع ملا۔“

گویا ع جا ئے ماندن ہمہ قتل شدہ، مسدود مفر

تاہم واقعات بتاتے ہیں کہ سب سے پہلے قصبہ کے رئیس بے چارے قاضی عنایت علی کو دیکھا گیا کہ وہ لاپتہ ہیں، مولنا عاشق الہی نے ان ہی کے متعلق یہ خبر دیتے ہوئے کہ ”خدا جانے کہاں گئے، اور کیا ہوئے کچھ پتہ نہ چلا۔“

کہنے والے کہتے تھے جیسا کہ مولنا ہی نے لکھا ہے کہ

”آدھی رات کے وقت قاضی صاحب نے چند ہمراہیان کے تھانہ بھون کو خیر باد کہی، اور

بسمت نجیب آباد روانہ ہوئے۔“

اگر یہ صحیح ہے، تو یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ ہمالیہ کے کوہستانوں میں قاضی صاحب نے اپنے آپ کو شاید گم کر دیا ہو۔ نجیب آباد جو دامن ہمالہ کی شہر آبادی ہے اس کی طرف روانگی کا مطلب بظاہر یہی ہو سکتا ہے مولانا علم بالصواب باقی تھانہ بھون کے جہاد کے امیر بیعت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

اور ان کے دونوں مرید عزیز سیدنا الامام الکبیر اور حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہم ان بزرگوں پر کیا گزری؟
معلومات جو ہم تک پہنچی ہیں، ان کی روشنی میں ان سوالوں کا صحیح جواب دینا، میرے لئے کافی دشوار ہی
مطلب یہ ہے کہ شامی سے واپس ہونے اور حافظ شہید کے دفن کروینے کے ساتھ ہی حضرت
منتشر ہو گئے، یا تھانہ ہی میں کچھ دن مقیم رہے، پھر حکومت کے نمائندے کی طرف سے جب تھانہ بھون
پر انتقام کی جہتم اٹی بلی گئی، اس وقت یہ حضرات کہاں تھے؟

مولانا عاشق الہی صاحب کی کتاب میں بھی کوئی واضح جواب ان باتوں کا نہیں ملتا، ان کے بیان سے جو کچھ
بھی معلوم ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ گونڈوں کی مخبری کے بعد

”ان تینوں حضرات کے نام، چونکہ وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے، اور گرفتار کنندہ کے
لئے صلہ تجویز ہو چکا تھا، اس لئے لوگ تلاش میں سامعی اور حراست کی ٹنگ دو میں پھرتے
تھے“ مکتذکرۃ الرشید ج ۱

اس سے بظاہر چھی سمجھ میں آتا ہے کہ تھانہ بھون میں حکومت کی رسائی ان لوگوں تک نہ ہو سکی، اور وارنٹ
جاری کر کے حکومت کے کارندے ان کی گرفتاری کی فکر دوں میں مشغول ہو گئے، ہمارے مصنف امام
نے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ سیدنا الامام الکبیر پر دوسری دفعہ بندوق کی گولی جب چلائی گئی،
جس میں موچھ اور دارمھی کا کچھ حصہ فائر کے سنپے سے جل بھی گیا تھا، اسی سلسلہ میں ان ہی کے حوالہ سے
یہ بھی نقل کر چکا ہوں کہ

”کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہنچا“

آنکھ کے اس ”قدرے صدمہ“ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف امام نے یہ اطلاع دی ہے کہ
”اس زخم کی خیر اجمالی، بعض دشمنوں نے جوٹھی، تو سرکاری مخبری کی کہ تھانہ بھون کے
تسلو میں شریک تھے“ مکتذ

گویا اس ”زخم چشم“ کو مجرم کی شناخت کی علامت بنانے والوں نے بتائی ہوگی۔ مخبروں کی سامعی گواہیوں
کے ساتھ اس ”عینی شہادت“ کے قصے نے قدرتا بہ نسبت دوسروں کے سیدنا الامام الکبیر کے مسئلہ کو

زیادہ اہم بنادیا، لیکن اس اہمیت کا حال سنئے، جو نہیں ڈھونڈے جا رہے تھے، مولنا طیب صاحب نے ”متوسلین و خدام“ کے عنوان سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”متوسلین اور خدام نے عرض کیا کہ احتیاط خلاف توکل نہیں، حضرت روپوش ہو جائیں“

مگر انتقام کے زہر سے ملو و معمور حکومت زہریلے، سانپ کی طرح بل کھانے والی جسے ڈھونڈ ہی تھی، خود اس کا حال کیا تھا مولنا طیب کی اسی یادداشت میں ہے کہ

”حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی فطری شجاعت اور ہمت قلب سے کھلے بندوں

پھر رہے تھے“

مگر ”روپوشی“ کے مشورہ دینے والوں کا اصرار حد سے زیادہ بڑھ گیا، تب جیسا کہ اسی یادداشت میں ہے،

”اپنی سسرال کے عالی شان مکان (دربان) میں روپوش ہوئے“

لیکن یہ روپوشی جو اصرار مبلغ کے بعد اختیار کی گئی تھی، جانتے ہیں اس کا سلسلہ کتنے دنوں تک جاری رہا، سال و ماہ نہیں، دنوں کے حساب سے لے دے کر حرب روایت مولنا طیب صاحب تین دن سے آگے نہ بڑھ سکا مولنا کے الفاظ ہیں

”تین دن پورے ہوتے ہی، اکدم پھر باہر نکل آئے، اور کھلے بندوں پھر نے چلنے لگو“

ظاہر ہے کہ روپوشی کے سوا، حفاظت و نگہبانی کا کوئی دوسرا ذریعہ جن بے چاروں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اچانک باہر نکلنے کی اس جسارت پر جتنے بھی سراہمہ ہوتے، اپنی یاقت و عقل کے مطابق اُن کی سرسراہنگی بالکل بجا تھی، مولنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ

”لوگوں نے پھر ہمت روپوشی کیلئے عرض کیا“

اس موقع پر سیدنا الام الکبیر کی طرف سے جواب میں جس عذر کو پیش کیا گیا تھا، اسی کی طرف توجہ

دلانا چاہتا ہوں، انصاف سے کام لینا چاہئے، شاعلی کے میدان کی سطح پر واقعات کا جو تن لکھا گیا تھا، اور فقیر نے عرض کیا تھا کہ تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال پیش تر، تاریخ کے پاک ترین عہد میں جو واقعات

سرزمین عرب میں پیش آئے۔ اسی کی شرح مجھے شامی کے میدان کا یہ متن نظر آتا ہے۔ اس کو سیری ذاتی غرض اعتقادی قرار دینے والوں کو چاہئے کہ سیدنا الامام الکبیر کے اس جواب کو ذرا غور سے پڑھیں دوبارہ روپوشی کی طرف توجہ دلائے والوں سے فرمایا گیا کہ

”تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنت سے ثابت نہیں“

دعوے کی وضاحت کرتے ہوئے یاد دلایا گیا کہ

”جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غار ثور میں تین دن ہی روپوش رہے ہیں“

یہ روایت مولانا طیب صاحب کی ہے، اور دارالعلوم کے حلقہ میں حضرت والا کے اس جواب کا چرچا تقریباً حد تو اترا تک پہنچا ہوا ہے، سوچنا چاہئے کہ اس جہادی ہم کے آغا زہی سے امارت، بیعت، والدین کی اجازت وغیرہ ہر موقع پر تاریخ کے اسی مقدس دور کی طرف مڑ کر مسلسل دیکھتا رہا ہو، تاہم جب ختم ہوتی ہے، تو دیوان کی ڈبڑھی کی روپوشی میں ”غار ثور“ کی تختی جس کی نظروں کو سامنے ٹرپ رہی ہو، الغرض غلام جو قدم بھی اٹھاتا ہو، یہ دیکھ کر اٹھاتا ہو، کہ اس کے آقا نے اپنا مبارک مسعود قدم کہاں کہاں رکھا تھا، کس طرح رکھا تھا، جس کے ادراک کی لطافت کا اس باب میں یہ حال ہو، کہ ”مطلق روپوشی“ کے جواز کا نتیجہ ”غار ثور“ کے واقعہ سے جو نکلتا ہے، نتیجے کے اس اطلاق پر اس کا دل راضی نہیں ہے، بلکہ جتنے دنوں تک غار ثور میں روپوشی کا یہ سلسلہ جاری رہا تھا، دنوں کی اس اتفاقی قید کو بھی اتباع سنت کا لازمی جز، کم از کم اپنی ذات کی حد تک قرار دے رہا ہو، ادجوں ہی کہ اس کی روپوشی کی مدت غار ثور والی روپوشی کے حدود سے آگے بڑھنے لگی، جاں گسل روح گداز خطرات کی پروا کئے بغیر اپنی روپوشی کو ختم کر کے باہر نکل گیا ہو، کہنے والے لاکھ سمجھا رہے ہوں، لیکن تین دن سے زیادہ روپوشی پر آخر وقت تک آمادہ نہ ہوا، الغرض جو کچھ کر کے دکھایا گیا تھا، اس کے سوا جو کچھ دیکھنا ہی نہ چاہتا تھا، اگر اسی کو شامی کے مختصر میدان میں وہ سب کچھ دکھایا گیا، جسے وہ دیکھنا چاہتا تھا، تو جزاء و نفا کا کے قدرتی قانون کا اقتضا اس کے سوا خود ہی سوچئے کہ اور کیا ہوتا، آخر جس راہ میں چلے والے

کو بشارت دی گئی ہو کہ ایک ہالشت جو آگے بڑھتا ہے، اس کی طرف بڑھنے والا ایک ہاتھ بڑھ جاتا ہے اور معمولی رفتار سے جو چلتا ہے، اس کی طرف آنے والا دوڑ کر (ہرولت) آتا ہے، ایک حسہ کو عارضہ میں دس تک، ایک جہہ (دوانہ) کو سات سو تک، بلکہ ایضا علف لمن لیشاء، (بڑھانا ہے اس کا معاوضہ جہاں تک چاہتا ہے) پہنچا دیتا ہے، وہاں جو کچھ ہوا لوگوں کو اس پر تعجب ہے۔ حالانکہ حیرت تو اس وقت ہوتی، جب سیرب کچھ نہ ہوتا۔

جہوہو سکتا ہے، اسے کر کے دیکھو، پھر لفظا ہر جو نہیں ہو سکتا ہے، وہ بھی دکھایا جاتا ہے، ادوں کو سوچ رہا ہو یا نہ سوچ رہا ہو، لیکن جہاں نہیں دیکھا جاسکتا تھا، دیکھنے والوں کو وہیں بدر بھی دکھایا گیا اور احد بھی، خندق بھی اور خیبر بھی، موتہ بھی، اور ثور کا غار بھی، بلکہ تھانہ بھون کے جہاد کے امیر حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ جو بالآخر افتار ررض میں ”مہاجر مکی“ کے نام سے مشہور ہوئے، اُن کے دل میں جو یہ ڈالا گیا، جیسا کہ مولنا عاشق الہی نے لکھا ہے کہ

”وطن کو خیر یاد کبھی، اور بہ نیت حریم گھر سے باہر نکلے“ ۱۱ تذکرۃ الرشید

صرف مکہ معظمہ نہیں بلکہ حریم کی نیت ہندوستان سے ہجرت کے وقت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہی تھی۔ تو مدینہ منورہ کی طرف تاریخی ہجرت تیرہ سو سال پیش تر ہوئی تھی، اس ہجرت کی پرچھائیں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت میں اگر دکھائی دے تو واقعہ نگاروں نے جو کچھ لکھا ہے، کیا اسے بھی ثابت یہی نہیں ہوتا،

بہر حال تھانہ بھون میں تو حکومت کی طرف سے آگ لگا دی گئی، قصبہ کے رئیس قاضی عنایت علی ہمالیہ کی فادیوں میں گم ہو گئے۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تھانہ کے جہاد کے امیر حریم کی نیت کر کے عرب کی سمت روانہ ہو گئے، مولنا عاشق الہی کا بیان ہے کہ حضرت مولنا گنگوہی گنگوہ کے سوا زیادہ وقت اس زمانہ میں رامپور منہیاران کے طیب اور اپنے مخلص دوست حکیم ضیاء الدین کے یہاں گزار رہے تھے، اور سیدنا الامام الکبیر قصبہ دیوبند کی دیوان والی ڈیوڑھی میں تین دن روپوش رہنے کے بعد باہر نکل آئے۔ کیوں باہر نکل آئے۔ اس کی وجہ تو خود ان ہی کی زبانی سن چکے۔ لیکن

جس طرح نکلے، وہ بھی کم دل چسپ نہیں ہے۔ ہمارے مصنف امام نے اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ کیا ہے، یہ لکھ کر کہ

”ایام روپوشی میں ایک روز دیوبند تھے۔ زمانہ مکان کے کوٹھے پر“ ۳۷

کہ اتفاقاً یہ صورت پیش آئی کہ گھر میں اس وقت

”مردوں میں سے کوئی نہ تھا، زمین پر آکر فرمایا، پردہ کمرلو، میں باہر جاتا ہوں“ ۳۸

ظاہر ہے کہ بے چاری عورتوں میں آپ کے اس خطرناک ارادے سے کافی کھلبلی مچ گئی، روکنے کی ممکنہ کوشش ان کی طرف سے کی گئی، لیکن کارگر نہ ہوئی۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ

”عورتوں سے نہ رک سکے، باہر چلے گئے“ ۳۹

آگے مصنف امام نے واقعات کا ذکر ایسے مبہم اور محمل الفاظ میں احتیاطاً کیا ہے کہ صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عورتوں نے جب دیکھا کہ حضرت تو باہر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے، تو کسی ذریعہ سے گھر کے مردوں تک آپ کے نکل جانے کی اطلاع عورتوں نے پہنچائی، سرکاری جاسوس گھومتے ہی رہتے تھے، ان کو سن گن جو کچھ لگی، تو دیوان کی ڈیوڑھی پر دھوا کر دیا۔ مصنف امام کے الفاظ ہیں کہ

”بعض مرد بازار میں تھے، ان کو اطلاع کی۔ وہ اتنے میں مکان پر پہنچے، دوڑ سرکاری آدیوں کی

پہنچ گئی تھی، انہوں نے آکر تلاشی لی“ ۴۰

لیکن ایسے وقت میں تلاشی اس مکان کی لی گئی، جب سیدنا الامام الکبیر اس مکان کے احاطہ سے باہر ہو چکے تھے۔ ناکامی اور نامردی کے ساتھ سرکاری دوڑ کو واپس ہونا پڑا، خدا نخواستہ باہر نکلنے کے بجائے حضرت مکان کے اندر رہتے، تو گرفتار ہو جانا آپ کا یقینی تھا، لیکن لطیف خیر کے لطف خفی کا اشارہ تھا کہ عین وقت پر اس مکان سے باہر ہو جانے کا خیال دل میں پیدا ہوا، اور مردوں کے نہ رہنے کی وجہ سے نکل جانے کا موقع بھی باسانی مل گیا۔

عسی ان تکرہوا شیدئا وھو خیر لکم | قریب ہے کہ تم کسی بات کو مکر وہ سمجھو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو

کی قرآنی خبر کی تجزیوں سے یوں ہی تصدیق ہوتی رہتی ہے۔

مصنف امام نے اس کے بعد لکھا ہے کہ

”اس کے بعد سے (یعنی دیوان والوں کا گھر سرکاری مخبروں کی نگاہوں پر جب چڑھ گیا تھا،

مسجد میں رہتے“

مسجد سے مراد بظاہر چھتہ کی مشہور مسجد ہی معلوم ہوتی ہے۔ مگر مسجد میں قیام کا یہ زمانہ بھی جس طریقہ سے گذرا، اس کا کچھ اندازہ مولانا طیب صاحب کی یادداشت کی اس اطلاع سے ہو سکتا ہے، لکھ کر کہ ”مخبروں کی خبروں سے کہیں نہ کہیں پولیس حضرت کو پالیتی تھی، لیکن منجانب اللہ حفاظت ہوتی تھی“

اسی سلسلہ میں چھتہ کی مسجد کے قیام کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے وہی رقم طراز ہیں کہ

مخبر نے خبر دی کہ حضرت (نانوتوی) چھتہ کی مسجد میں ہیں، دوش آئی، مسجد کا محاصرہ کر لیا،

کپتان پولیس مسجد میں آیا۔ حضرت ٹہل رہے تھے“

یوں کپتان کی نظر آپ پر پڑی اور آپ کی کپتان پر، مولانا نے لکھا ہے کہ

”کپتان نے خود حضرت (نانوتوی) سے پوچھا کہ مولانا محمد قاسم کہاں ہیں؟“

سیدنا الامام الکبیر کی طرف منسوب کر کے دارالعلوم دیوبند کے حلقوں میں ایک دل چسپ لطیفہ حاضر جوابی

کے متعلق جو مشہور ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر اس لطیفہ کا ظہور ہوا تھا۔ لطیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ

اگر سوچا جائے تو جہادی سنن میں ایک سنت کی تعمیل کی سعادت اس ذریعہ سے حاصل ہوئی، بہر حال ہوا

یہ کہ جسے ڈھونڈ رہا تھا، خود اسی سے اس کا پتہ جب کپتان دریافت کر رہا تھا، گویا غالباً الی بات ۵

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

کچھ بھی صورت جب پیش آئی تو جیسا کہ مولانا طیب نے لکھا ہے سیدنا الامام الکبیر نے

”ایک قدم ہٹ کر فرمایا کہ ابھی ہمیں تمہے دیکھ لیجئے“

حضرت ٹہل رہے تھے۔ ٹہلنے والے کا ہر دو سر اقدم ظاہر ہے کہ اس جگہ پر نہیں پڑتا، جہاں وہ پہلے

ہوتا ہے جس جگہ کو چھوڑ چکے تھے۔ اسی جگہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا گیا کہ ”یہیں تھے“ جو بالکل قلعہ کے مطابق بات تھی، ”دیکھ لیجئے“ یعنی جسے ڈھونڈ رہے ہو، اسے تم دیکھ بھی سکتے ہو، لیکن جہاں تراہم یظنون الیلک وہم | تو دیکھتا ہے کہ وہ تجھے دیکھ رہے ہیں لیکن انہیں لا یبصرون | سوچ نہیں رہا تھا۔

کپتان غریب دیکھ رہا تھا، لیکن جسے ڈھونڈ رہا تھا، وہ اسے سمجھائی نہ دیا، اور بقول مولانا طیب صاحب ”کپتان دیکھ بھال میں مصروف ہوا“

اور جو دیکھا ہوا تھا، اس کو کپتان کی نظروں سے اوجھل ہونے کا موقع مل گیا، اور یوں

”حضرت زانو توئی غایت اطمینان سے مسجد سے باہر نکل آئے اور پولیس کو گھیرے میں سے گزرتے ہوئے دوسری قریب کی مسجد شاہ رمز الدین کی طرف روانہ ہو گئے۔“

اس عرصہ میں کپتان بھی مسجد سے باہر نکلا، اب واللہ اعلم کیا صورت پیش آئی، اور کس علامت سے اس نے پہچانا، مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ

”کپتان مسجد سے باہر نکلا، اور حضرت کو جاتے ہوئے دیکھ کر بولا، کہ مولانا تو یہی معلوم ہوتے ہیں، جو جارہے ہیں، پولیس ادھر چلی، اور مسجد شاہ رمز الدین کا محاصرہ کر لیا۔“

آگے جو صورت پیش آئی، یعنی لکھا ہے کہ

”حضرت وہاں (مسجد شاہ رمز الدین) سے نکلے اور پولیس کے جتھے میں سے گزرتے ہوئے کسی اور مسجد میں پہنچ گئے۔“

کپتان کے یہ کہنے کے باوجود کہ ”مولانا یہی معلوم ہوتے ہیں“ پولیس کے جتھے سے گزرتے ہوئے نکل جانے کی توجیہ میں یحز اس کے کہ

وجعلنا من بین ایدیہم سدا
ومن خلفہم سدا فاغشیناہم
فہم لا یبصرون

اور ہم نے ایک آذان کے سامنے کر دی اور ایک آذان کے پیچھے کر دی
جس کے ہم نے (ہر طرف سے) ان کو (دردوں سے) گھیر دیا۔ سو
وہ (کسی چیز کو) نہیں دیکھ سکتے۔

اور کہتا کہتا جائے۔ اسلام کی تاریخ میں اس قرآنی حقیقت کا بحر پہلی دفعہ نہیں گرا گیا تھا بلکہ عرض کر چکا ہوں کہ غلام تولن ہی نعمتوں سے نوازا جا رہا تھا، جن سے آقا کو سرفرازی بخشتی تھی لیکن غلامی کر کے ترکوئی دیکھ پولیس والوں کے ساتھ آنکھ عچولی کا کھیل جو کھلایا تھا، اور مولنا طیب صاحب کی یادداشت میں آگے جو یہ الفاظ ہیں

”غرض پولیس کا چکر، اور حضرت کا یہ دور عرصہ تک جاری رہا۔“ بحفاظت الہی، پولیس حشر

پر قابو نہ پاسکی “ منا

ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایک آدھ بار ہی بصورت پیش نہیں آئی، بلکہ بار بار مخبری کرتے والوں کے اشارے سے پولیس بچھا کرتی تھی، لیکن یوں ہی تین چار چکروں میں اسے پیچھے چھوڑ کر چھڑانے والا اپنا پیچھا چھڑا لیا کرتا تھا، اور قصہ دیوبند ہی تک محدود نہ رہا۔ مولنا طیب صاحب کی اسی یادداشت میں ”چکوالی“ کے گاؤں کی سرگزشت کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ خیال آتا ہے کہ کسی موقع پر اجمالاً کسی دوسری صحرورت سے اس کا ذکر بھی چمکے، اسی اجمال کی اب تفصیل سنئے۔

مولنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ پولیس والوں کے بار بار تعاقب کی جھنجھٹوں میں تنگ آکر آخر سیدنا امام الکبیر کے نسبتی بھائی شیخ نہال احمد مرحوم رئیس دیوبند جن سے ہماری اس کتاب کچھ حصے والے کافی طور پر شناسا ہو چکے ہیں، ان ہی شیخ صاحب نے

”حضرت نانوتوی کو مجبور کیا کہ چند دن ان کے گاؤں موضع چکوالی میں قیام فرمائیں“

اصرار اناشدید تھا، کہ ان کے مشورہ پر عمل کرنا ہی پڑا، اور حضرت چکوالی پہنچ گئے، چکوالی کے محل وقوع کو بتاتے ہوئے مولنا طیب نے لکھا ہے کہ یہ گاؤں

”نانوتہ اور دیوبند کی درمیانی سڑک پر واقع ہے“

لیکن زیادہ دن تک اس گاؤں میں آپ کے قیام کا واقعہ پوشیدہ نہ رہ سکا، پتہ چلائے والوں کو خبر ہو گئی، یادداشت میں ہے کہ

”مخبر نے اس قیام کی گورنمنٹ میں اطلاع کر دی“

جیسا کہ چاہئے تھا،

”دوش چکوالی پہنچ گئی، پولیس نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا“

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام اکیبر کے ساتھ خود شیخ نہال احمد مرحوم بھی بطور رفاقت کے اسی گاؤں میں مقیم تھے۔ گاؤں کا محاصرہ پولیس والوں نے کر لیا ہے۔ اس واقعہ سے واقف ہونیکے ساتھ ہی جیسا کہ مولانا طیب صاحب کا بیان ہے۔

”شیخ نہال احمد صاحب کے نو چھکے چھوٹ گئے، سخت خائف اور ہراساں ہوئے“

لیکن خوف و ہراس کی اس کیفیت میں بقول مولانا طیب صاحب شیخ صاحب کے اس احساس کو زیادہ دخل تھا کہ

”مولانا (نانوتوی) کی گرفتاری میرے گاؤں میں ہو، جس میں میں ہی خود حضرت کو باصرہ لے کر آیا ہوں“

لکھا ہے کہ شیخ صاحب کی پریشان حالی کو دیکھ کر حضرت نانوتوی نے فرمودہشت لہجہ میں فرمایا کہ

”اس طرح خوف زدہ صورت بنا کر تو آپ مجھے پکڑو اگر رہیں گے“

اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا کہ

”آپ بالکل مطمئن رہیں، میں اپنا بچاؤ خود کر لوں گا“

چکوالی میں شیخ صاحب کا جو مکان تھا، اس میں بھی زنانہ مردانہ دو حصے تھے۔ حضرت ڈاکو لیکر شیخ صاحب اسی زنانہ حصہ میں رہا کرتے تھے۔ شیخ صاحب کو تو اسی زنانہ حصہ میں چھڑک دیا گیا تھا کہ

”حضرت نانوتوی، باہر نکل آئے“

سامنے پولیس کا کپتان کھڑا تھا، نظریہ پڑتے ہی، بغیر کسی اضطراب اور گھبراہٹ کے کپتان کو مخاطب بناتے ہوئے فرمانے لگے

”آئیے آئیے تشریف لائیے“

صرف یہی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ روایت میں یہ بھی ہے کہ کپتان صاحب کے لئے چاڑتیار کر کے
کا حکم بھی صادر فرمایا۔ چاڑتیار ہو کر آئی، یلائی گئی، کپتان بھی آپ سے مانوس ہو کر پوچھتا رہا کہ
”آپ مولانا محمد قاسم صاحب کے واقف ہیں؟“

جواب میں یہ کہتے ہوئے کہ

”جی ہاں میں ان کو خوب جانتا ہوں،“

مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ

”اپنی زبان سے اپنے مناسب وقت حالات بیان فرماتے رہے۔“

اس پر کپتان نے کہا کہ

”ہم زمانہ مکان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔“

ظاہر ہے کہ تلاشی جس کے لئے کپتان صاحب لینا چاہتے تھے وہ تو ان کو ملا ہوا تھا، زمانہ مکان ہوں تو

ان کا شکار کہاں ملتا۔ بخند چینی ارشاد فرمایا گیا

”شوق سے تلاشی لے سکتے ہیں۔“

لکھا ہے کہ کپتان زمانہ حصہ میں داخل ہوا، اور

کو نہ کو نہ چھان مارا۔“

لیکن جو کھویا ہوا ہوتا، اسے البتہ پاسکتا تھا۔ مگر جسے پائے ہوئے تھا، وہ اس کو کھویا ہوا سمجھ کر ڈھونڈ

رہا تھا۔ اس ڈھونڈ اور تلاش کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا، وہی ہوا، لطف یہ ہے، جیسا کہ مولانا طیب کی

یادداشت میں ہے کہ

”حضرت (نانوتوی) کپتان کے ساتھ ساتھ تلاشی دلانے میں مصروف تھے۔“

ناکامی اور نامرادی کے ساتھ غریب زمانہ مکان سے واپس ہوا، جب تلاش و جستجو کے سارے مراحل

ختم ہو گئے، اور کپتان چکوالی سے رخصت ہونے لگا، تو لکھا ہے کہ

”حضرت بھی اس سے رخصت ہو کر نانوتہ روانہ ہو گئے۔“

اتنی تنگ و دو کج و کاؤ کے بعد یہ ناکامی و نامرادی کپتان کے لئے کافی ہیجان انگیز اور تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ نزلہ کے گرنے کے لئے منجر کا ضعیف وجود اس کے ساتھ تھا، بیان کیا گیا ہے کہ اسی ”عضو ضعیف“ کو مشق کا تختہ بنا کر

”کپتان نے بہت ڈانٹا، کہ تو غلط خبریں دیا کرتا ہے“

مخبر نے اس وقت کپتان صاحب سے عرض کیا کہ

”آپ نے غور نہیں کیا، کہیں مولنا ہی صاحب تو نہ تھے، جنہوں نے تلاشی دلائی“

جب چُک کر چڑیا کھیت سے اڑ چکی تھی، اس وقت خبر صاحب بھی چونکے تھے، اور ان کی توجہ دلانے سے کہتے ہیں کہ

”کپتان نے وارنٹ جیب سے نکال کر حلیہ پڑھا تو حضرت نانوتوی کے چہرے ہرے

پر منطبق پایا“

مگر نانوتہ اور اس کے گرد و نواح کے گھپ اندھیرے گھنے نخل تانی جنگل کو جس نے دیکھا ہے وہی سمجھ سکتا ہے کہ چکوالی سے نکل جانے کے بعد راستہ میں گرفتار کرنا آسان نہ تھا۔ غصہ میں کپتان نے حکم دیا کہ دوش نانوتہ کی طرف مارچ کرے۔ مولنا طیب صاحب کا بیان ہے کہ لوگ پہلے ہی سے لگے ہوئے تھے، قبل اس کے کہ دوش نانوتہ پہنچے، سیدنا الامام الکبیر کو اطلاع ہو گئی اور بقول مولنا طیب

”دوسرے راستہ سے دیوبند پہنچ گئے“

پیدل چلتے پھرے کی عادت آج کام آ رہی تھی، ابھی چکوالی میں تھے، چکوالی سے نانوتہ پہنچے، ابھی سانس لینے بھی نہ پائے تھے کہ وہاں سے بھی روانہ ہو گئے، اور دم کے دم میں چوبیس میل کے دراز فاصلہ کو طے کر کے حضرت والد دیوبندیوں کی افروختہ

ہر پھر کر پولیس والوں نے پھر دیوبند ہی کی مسجدوں میں آپ کا سراغ لگانا چاہا۔ لیکن یہاں وہی ایک مسجد سے دوسری مسجد، دوسری مسجد سے تیسری مسجد کا چکر جاری رہا، پولیس بھی گھومتی رہی، لیکن گھومنے کے سوا جسے ڈھونڈ رہی تھی اس کے پانے میں آخر وقت تک کامیاب نہ ہوئی،

مولانا طیب نے لکھا ہے

”غرض پولیس کو چکر میں رکھا، اور گرفتار نہ ہوئے“

اس قسم کے قصوں کا سنا نا بھی آسان ہے اور سن لینا بھی آسان ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس کا قصہ سنایا گیا خود وہ جس آسانی کے ساتھ ان جان فرسا ہائلہ حوادث سے گزر رہا تھا، ہر شخص کے لئے گزرنا آسان نہیں ہے، بے پناہ قوت رکھنے والی ملوکیت کے سامنے سینہ تان کر انتہائی لاپرواہی کے ساتھ صحیح معنوں میں دہی ٹھہر سکتا ہے، جس پر السموات والارض کی ملکوت (بادشاہت) کا صحیح راز آشکارا ہو چکا ہو۔ پہاڑ بھی اس کے قدموں کے نیچے پانی بن جاتے ہیں۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسی کا تراش کیا نہیں دکھایا جا رہا ہے، کچھ ٹھکانا ہے اس سکینت قلب، جمیعت خاطر کا کہ وارنٹ جیب میں رکھے ہوئے گرفتار کرنے کے لئے جو آیا ہوا ہے، اسی کو چائے پلائی جاتی ہے اور جس کو گرفتار کرنا چاہتا ہے، دہی گرفتاری کی کارروائیوں میں گرفتار کرنے والے کی مدد کر رہا ہے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن بظاہر جس کا کوئی پشت پناہ نہیں ہے، اس کو گرفتار کرنے میں وہی قطعاً ناکام ثابت ہوا جسے ظاہر میں فی الارض اور ملک کی سب سے بڑی قاہرہ سیاسی قوت کی پشت پناہی حاصل تھی۔

خیر سیدنا امام الکبیر تو ادھر دیوبند، نالوتہ اور چکوالی کے لئے بے پھرے میں مصروف تھے لیکن آپ کے پیروم رشید امیر جہاد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ”حریم کی نیست سے گھر (تھانہ) کو باہر نکل چکے تھے“ بقول مولانا عاشق الہی

”چند ماہ انبالہ، ٹنگری، پنچلا سے وغیرہ مواضع و قصبات میں اپنے آپ کو چھپایا، او

آخر راہ سندھ کراچی عرب کا راستہ لیا“ تذکرۃ الرشید

یہی چند ماہ جو حضرت حاجی صاحب کے ان مقامات میں گزرے، اسی زمانے میں سیدنا امام الکبیر کے ساتھ پولیس کے تعاقب کے تذکرہ بالا قصے پیش آرہے تھے۔ ہمارے مصنف امام نے بھی ان ہی اوقات کی طرف اجمالی اشارہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

”اس زمانہ کی کیفیات عجیب و غریب گزری ہیں، لکھنا ان کا طول ہے“

”عجیب و غریب کیفیات“ غالباً وہی تھیں، جن کی تھوڑی بہت تفصیل مولانا طیب صاحب کی یادداشت کی مدد سے سنائی گئی۔

اسی سلسلہ میں مصنف امام نے علاوہ دیوبند، نانوتہ، چکوالی کے علیانامی عکاوں کا بھی ذکر کیا ہے جہاں سیدنا الامام الکبیر کا قیام وارنٹ کے ان دنوں میں رہا تھا۔ آگے انہوں نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ

”بوڑیہ، گتھلہ، لاڈوہ، پنجالاسہ، جہنا پار کئی دفعہ گئے آئے“

کئی دفعہ آنے جانے کا ذکر جن مقامات کے متعلق کیا گیا ہے، بظاہر یہ اسی راستہ پر واقع ہیں جس سے گذرتے ہوئے حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سندھ (کراچی) عرب جانے کے لئے پہنچے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس قسم کا جرم آپ کی طرف منسوب کیا گیا تھا، یعنی وہی جہاد کے امیر تھے۔ اور بیعت جہاد کی ان ہی کے ہاتھوں پر کی گئی تھی۔ ایسی صورت میں وارنٹ کے بعد کھلے بندوں تو ان کے کراچی تک پہنچنے کی صورت ہی کیا تھی، بلکہ بقول مولانا عاشق الہی ان ہی آبادیوں میں چھپتے چھپاتے حضرت اسماعیل سمندرمک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے، جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں، ان سے یہی معلوم ہوتا ہے، کہ حکومت ان کا تعاقب کر رہی تھی، جس جگہ پہنچ کر پناہ لیتے، حکومت کے نمائندہ وہیں پہنچ کر آپ کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہی ”حفاظت الہی“ گرفتار کرنے والوں کو ناکام بناتی رہی کہتے ہیں، اور یہ قصہ عام طور پر مشہور بھی ہے کہ مشرقی پنجاب کے قصبہ پنجالاسہ میں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام اپنے پیر بھائی پنجالاسہ کے رئیس راؤ عبد اللہ مرحوم کے مکان میں تھا، کہ پولیس کو خبر ہو گئی، لکھا ہے کہ اس علاقہ کا انگریز افسر درویش کو لے کر راؤ عبد اللہ کے مکان پر پہنچ گیا، راؤ صاحب نے حاجی صاحب کو بنظر احتیاط اپنے اصطلح کی ایک ایسی کوٹھری میں جگہ دے رکھی تھی جس میں کسی شخص کے رہنے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، جس میں گھوڑوں کا گھاس اور چارہ بھرا ہوا تھا مگر انگریز تک خبر اس تفصیل کے ساتھ پہنچی تھی کہ فلان کوٹھری میں جرم ٹھہرایا گیا ہے۔ اپنے آدمیوں کے ساتھ

ٹھیک اسی کوٹھری تک پہنچ کر انگریز نے کوڑا کھول دیا۔ راؤ عبداللہ کے تو ہوش اڑے ہوئے تھے لیکن کوڑا کے کھلنے کے بعد جب دیکھا گیا، تو مصطفیٰ بچھا ہوا تھا۔ پانی کا ٹوٹا بھی تھا۔ لیکن کوٹھری میں کسی آدمی کا پتہ نہ تھا۔ انگریز حیران تھا، اس نے پوچھا کہ یہ مصطفیٰ اور پانی کا ٹوٹا کیسا ہے؟ راؤ صاحب نے فرمایا کہ ہم لوگ فرض نماز مسجد میں پڑھتے ہیں اور نوافل گھر آکر پڑھتے ہیں۔ بہر حال انگریز راؤ صاحب سے معافی مانگ کر بعد نماز واپس ہوا، اس کی سمجھ میں کوئی صورت نہ آئی۔ راؤ صاحب انگریز کو نصحت کے کہ جب گھر میں لوٹے تو حیران تھے کہ حضرت حاجی صاحب اس عرصہ میں کوٹھری سے کیسے باہر ہوئے اور کہاں تشریف لے گئے۔ کوٹھری کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ حاجی صاحب بدستور اپنے مصطفیٰ پر تشریف رکھتے ہیں۔ عرض کیا کہ حضرت آپ ابھی تلاشی کے وقت کہاں تھے؟ فرمایا، میں تو یہیں بیٹھا ہوا تھا۔ عرض کیا کہ انگریز نے تو آپ کو نہیں دیکھا، فرمایا، وہ اندھا ہو جائے تو میں کیا کروں؟ یہ سب وہی حفاظت الہی کے کرشمے تھے جو ان واصلین کی کرامتوں کی صورت میں نمایاں ہو رہے تھے۔

بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ جن پار کے ان قصبات اور مواضع تک سیدنا الامام الکبیر کی اس زمانہ میں آمد و رفت اپنے پیروم و مرشد کی قدم بوسی و تفقد حال اور ان کی خیر و عافیت کی دریافت ہی کے سلسلے میں ہوتی رہتی تھی۔ کیونکہ اس کے سوا ان گناہ آبادیوں میں تشریف لے جانے کی بظاہر کوئی دوسری وجہ نہ تھی۔ روپوشی کے لئے جنہا کے اس پار کی آبادیوں میں کافی گنجائش تھی۔ نیز آپ چلے کہ حکومت کے نمائندوں سے بچنے کے لئے سیدنا الامام الکبیر زیادہ کنج و کاؤ سے کام بھی نہ لیتے تھے۔ زیادہ ترغہ ہوتا، تو اس مسجد سے اس مسجد کے چکر دوں ہی میں ترغہ والوں کا سانس پھول جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اسی بنیاد پر مولوی عاشق الہی صاحب نے یہاں تک لکھ دیا کہ دیوان دالوں کی حویلی میں روپوشی کے تین دن گزار لینے کے بعد جب سیدنا الامام الکبیر باہر نکل آئے۔

”تو مسجد میں رہتے، اور کوئی کسی قسم کا تعرض نہ کرتا۔“ تذکرہ ص ۹

باوجود وارنٹ اور تفتیش کے تعرض نہ کرنے کا مطلب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تعرض کرنے والے چشم پوشی سے کام لیتے تھے، بلکہ پنجلا سے کے اصطبل کی کوٹھری میں دیکھا گیا تھا کہ ڈھونڈھنے والا انگریز انکھیں

رکھتے ہوئے گویا آنکھوں سے محروم کر دیا گیا ہے۔ عدم تعرض میں یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ کچھ اسی قسم کی کڑھپیوں کو زیادہ دخل تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ ایک مسجد سے نکل کر جب بجائے کسی دوسرے مقام کے مسجد ہی آپ کی قرار گاہ ہوتی تھی، تو ”مسجد میں رہتے تھے“ اس کے سوا اور اس واقعہ کی تعبیر ہی کیا کی جاسکتی ہے؟ بہر حال میرا صرف یہ خیال ہی نہیں ہے کہ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضری کے لئے مذکورہ بالا مقامات میں سیدنا الامام الکبیر نے اپنی آمد و رفت کے سلسلہ کو جاری رکھا تھا۔ بلکہ حضرت مولانا رشید احمد

لنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولوی عاشق الہی صاحب نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ ”اپنے ہادی برحق (حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ) کی ہندوستان میں آخری زیارت کے شوق سے بے تاب ہو کر انبالہ تگری اور پنجلاسہ کے سفر کو اٹھے اور ستور الحال مخفی طور پر اس حق کو ادا فرما کر واپس وطن رنگلوہ ہوئے“؛ مثلاً

اس خبر سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ان مقامات کا سفر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے لئے اختیار کیا جاتا تھا، پیادہ پا چلنے کے حضرت لنگوہی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ زیادہ عادی نہ تھے۔ شاید اسی لئے آپ کو اس سلسلہ میں ایک ہی دفعہ سفری صعوبتوں کی زحمت برداشت کرنی پڑی۔ مشکلات راہ کو عشق کی کشش نے آسان کیا۔ اس سفر کی دشواریوں کا اندازہ اسی سے کیجئے۔ دوسری جگہ مولوی عاشق الہی نے لکھا ہے کہ

”راتوں کو چلتے، دنوں چھپتے، خاردار جنگل، پیدل قطع کرتے“؛ مثلاً

اور اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ جتنا پار کے ان ہی مقامات کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف امام نے سیدنا الامام الکبیر کے متعلق جو لکھا ہے کہ

”کئی دفعہ آئے گئے“

اس کئی دفعہ کے آنے جانے میں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا، مگر ابتدائے زندگی سے پیدل چلنے کے چونکہ آپ عادی تھے۔ کسی موقع پر لکھ چکا ہوں کہ پیادہ پا چلنے کی اسی عام عادت کی وجہ سے آپ کے والد ماجد شیخ اسد علی کے دل میں کافی گرانی بھی پائی جاتی تھی۔ لیکن اسی قسم کے نازک مواقع پر کام لینے

کے لئے قدرت شروع ہی سے انتظام کر رہی تھی۔ سواری رہتے ہوئے بھی اسی کا نتیجہ تھا کہ سپیدں ہی چلنے کو آپ پسند فرماتے تھے۔

بہر حال رات کو چلنا، اور دن میں جنگلوں میں چھپنا، اور یوں تن تنہا، جتنا پار کے ان گناں اور دشوار گزار مقامات کو طے کرنا جن سے ان آبادیوں یعنی پنجلا سے وغیرہ تک پہنچنے کے لئے گزرنا ناگزیر تھا، اور بار بار آمد و رفت کے اس سلسلہ کو قدرت کی غیبی نائید و نصرت کے بغیر کیا قابل تصور بھی کہا جاسکتا ہے، قرآن کا اقتضایہ بھی ہے کہ یہ سارے پیادہ پاسفر اس عرصہ میں جو کئے گئے، تنہا طریق کے کسی رفیق کے بغیر کئے گئے، رفاقت پر کوئی آمادہ بھی ہونا تو احتیاطاً اس ارادہ سے اس کو روک دیا جاتا تھا، سمجھایا جاتا تھا کہ ہماری وجہ سے تم اپنے لئے کوئی خطرہ کیوں خریدو، مولنا عاشق الہی صاحب نے حضرت مولنا گنگوہی کے سفر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ پنجلا سے جاتے ہوئے نگری نامی مقام میں جب آپ پہنچے، جو دیوبندی حلقہ کے مشہور روحانی مستجاب الدعوات صاحب دل بزرگ مولانا عبدالرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کا آبائی وطن تھا۔ رائے پوری میں بعد کو آپ نے قیام اختیار فرمایا تھا۔ اس زمانہ میں جب مولنا عبد الرحیم رائے پوری اپنی عمر کے تیسرے سال میں تھے، نگری کی نگری حضرت گنگوہیؒ کے قدمِ مینت لزوم سے مشرف ہوئی۔

اس گاؤں کے رئیس مولنا عبدالرحیم صاحب کے پد بزرگوار راؤ اشرف علی خاں مرحوم تھے۔ وہاں کے خوش حال زمینداروں میں گئے جاتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کو راؤ صاحب نے اپنا مہل بنایا اخلاص و مودت کا ظہور غیر معمولی طور پر ان کی طرف سے جب ہوا، تو حضرت گنگوہیؒ نے سفر کے نصیب العین کو تاتے ہوئے جو کچھ گذری تھی، اس سے ان کو آگاہ کیا۔ راؤ صاحب حالات کو سن کر اس درجہ متاثر ہوئے کہ! وجودِ نوجوانی کے بوڑھے راؤ صاحب حضرت گنگوہیؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے آرزو مند ہوئے، لیکن حضرت کے یہ فرمانے سے کہ میرے پیر و مرشد تو آپ کے قریب ہی پنجلا سے میں مقیم ہیں، بیعت کی تنہا ہے تو بجائے میرے اپنی آرزو ان ہی سے بیعت کر کے پوری کر سکتے ہیں۔ راؤ صاحب اس پر راضی ہو گئے، اور خواہش ظاہر کی کہ اپنے ہاتھ مجھے پنجلا سے لے چلو،

سفر اش کر کے مرید کر دیجئے لیکن مولنا عاشق الہی کا بیان ہے کہ اپنی
 ”اندیشہ ناک حالت ظاہر فرما کر سمجھایا کہ معیت قرین مصلحت نہیں، البتہ اگلے دن
 آپ آئیں، اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) سے سفارش کا میں ذمہ ابرہوں“
 صلے تذکرۃ الرشید

الغرض اصرار مبلغ کے باوجود رفیق سفر بنانے پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔
 اور جیسے اب تک تنہا سفر کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے، پختلا سہ بھی تنہا ہی پہنچے۔ حالانکہ نگری سے
 پختلا سہ کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ غالباً ایک منزل کا سفر تھا۔ لیکن ایک دن کیلئے بھی رفیق طریق بنانے کو
 خلاف مصلحت جب قرار دیا گیا، تو سمجھا جاسکتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر جن کے
 آنے والے کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلسل جاری تھا، اس میں کسی دوسرے کو رفیق بنانے پر کیسے
 آمادہ ہو سکتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہوئی کہ اس زمانہ میں جبنا پا حضرت والا نے جو سفر کئے، ان سفروں
 کے حالات اور تفصیلات سے کوئی دوسرا واقف نہ ہو سکا۔ اسی لئے کہیں اشارۃً و کناۃً بھی ان کا تذکرہ
 نہیں کیا گیا ہے حالانکہ کافی دلچسپ اور عبرت آموز حالات ہوں گے۔

بہر حال اب واقعہ کی صورت یہ تھی کہ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تو حجاز کو منزل مقصود بنا کر
 کراچی تک پہنچنے کے لئے ایک آبادی کو چھوڑ کر دوسری آبادی اور دوسری آبادی سے تیسری آبادی
 کی طرف منتقل ہو رہے تھے، اور آپ کے دونوں دفائیش خدام، راست باز اور جاں باز مرید سیدنا
 الامام الکبیر اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما انتقام کے غصہ سے بھری ہوئی حکومت کے نشانہ بنے ہوئے
 جس طرح ممکن تھا، دن کاٹ رہے تھے۔ مولوی عاشق الہی صاحب نے حضرت گنگوہی کے متعلق لکھا
 ہے کہ پختلا سہ پہنچ کر اپنے پیر و مرشد حاجی صاحب کی خدمت میں
 ”اصرار کیا کہ بندے کو ہر کام لے چلیں“

مگر ہندوستان سے جو خود تو ہجرت کا فیصلہ کر کے اسی کی نیت سے سفر کر رہا تھا، مولوی صاحب کی
 شہادت ہے کہ اسی نے ہجرت ہی کی اس درخواست کو جو مرید رشید کی طرف سے پیش ہوئی تھی،

صاف لفظوں میں مسترد کر دی، لکھا ہے کہ

”اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) نے نہ مانا، اور فرمایا کہ جاؤ تمہیں خدا کے سپرد کیا“

صرف یہی نہیں بلکہ جس الہی الہام کے تحت حاجی صاحب نے ہجرت کا تہیہ فرمایا تھا۔ حضرت گنگوہی کے متعلق اپنے اسی لاہوتی احساس کے زیر اثر رخصت کرتے ہوئے اس راز کا بھی افشاء فرمایا کہ

”اسی طرح خدا کا حکم ہے“

اور فرمایا کہ

”میاں رشید احمد تم سے حق تعالیٰ کو ابھی بہتیرے کام لینے ہیں گھبراؤ مت“

ایک دفعہ حاضری کے بعد جو واپس کیا گیا تھا، جب خدا کے حکم کا اظہار اس کے متعلق ان الفاظ میں فرمایا گیا، تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بار بار حاضری کے بعد مختلف مقامات سے جسے واپسی کا حکم دیا جاتا تھا، اور وہ واپس ہی ہوتا چلا گیا۔ میرا اشارہ سیدنا الامام الکبیر کی طرف ہے۔ سمجھنا چاہئے کہ ان کی واپسی بھی کیا صرف عقلی مشوروں اور ذہنی وسوسوں کی بنیاد پر ہو رہی تھی مالکھ کیف تحکمون؟

رہا یہ کہ تھانہ بھون کے جہاد کے امیر بیعت حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تو راہی عرب ہوئے اور اس کے سوا بظاہر ان کے لئے کوئی چارہ کار بھی عالم اسباب میں نہ تھا۔ صحیح طور پر اس کا معین کرنا تو دشوار ہے کہ حاجی صاحب کب ہجرت کے اس سفر پر روانہ ہوئے، اتنی بات تو یقینی ہے کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ حافظ ضامن شہید کی شہادت کے بعد ہی ہو گیا، اور تھانہ پر اس کے بعد جو مصیبت ٹوٹی۔ درد کی اس داستان کو بھی آپ سن چکے۔ تھانہ کو تو حاجی صاحب جہاں تک قیاس چاہتا ہے، اسی زمانہ میں چھوڑ چکے تھے۔ اس کے بعد کہاں کہاں رہے، پس اس سلسلہ میں ان ہی مقامات کا لوگ ذکر کرتے ہیں جن کا تذکرہ سیدنا الامام الکبیر کی آمد و رفت کے سلسلے میں گذر چکا ہے، کراچی تک اس طریقہ سے پہنچنے میں چاہئے تو یہی کہ کافی مدت گذری ہوگی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ براہ راست ہندوستان پر بلکہ وکٹوریہ کے قبضہ کا اعلان انگریزی پارلیمنٹ کی طرف سے

۲۔ اگست ۱۹۵۷ء کو ہوائیہ میں پہننے کے بعد یکم اکتوبر ۱۹۵۷ء میں بمقام الدہ آباد لارڈ کیننگ نے ملکہ وکٹوریہ کے اس ”عام معافی نامہ“ کو پڑھ کر سنایا، جس کے بعد عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ غدر کے مجرموں کو بخش دیا گیا۔ ہنگامے میں جو شریک تھے، حکومت کے داروغہ گیر کا کھٹکا ان کے لئے باقی نہ رہا لیکن واقعہ یہ ہے کہ معافی نامہ باوجود عام ہونے کے عام نہ تھا، بلکہ اس میں ان خاص امور کا استثناء بھی تھا کہ

’انگریزی رعایا کے قتل میں بذاتہ جو شریک ہوئے، ان کو حکم کا مستحق نہیں قرار دیا جائے گا۔ مزید بہ چند قیدیں بھی تھیں۔

(۱) جن لوگوں نے جان بوجھ کر قاتلوں کو پناہ دی ہو۔

(۲) یا جو لوگ باغیوں کے سردار ہوئے ہوں۔

(۳) یا جنہوں نے ترغیب بے نادت دی ہو۔

ان کے متعلق ملکہ وکٹوریہ کے اس معافی نامہ میں یہ الفاظ درج کئے گئے تھے کہ

”ان کی نسبت صرف وعدہ ہو سکتا ہے کہ ان کی جان بخشی ہوگی، لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں ان سب احوال پر جن کے اعتبار سے دے اپنی اطاعت سے پھر گئے کامل غور کیا جائے گا۔“

اسی زمانہ میں ملکہ کے اس معافی نامہ کا انگریزی سے اردو میں جو ترجمہ ہوا تھا، یہ مجسمہ اسی کے الفاظ ہیں، مطلب یہی تھا کہ جان کی حد تک، مندرجہ بالا تینوں جرائم کے مجرموں کو مطمئن کر دیا گیا تھا، لیکن اس کے سوا حکومت اندر جو کچھ بھی کر سکتی تھی، اس کا خطرہ موجود تھا، اور حکام کی صوابدید پر ان کی سزا کی نوعیت معلق کر دی گئی تھی۔

تھانہ بھون کی جہادی ہم میں جیسا کہ آپ پڑھ چکے، انگریزی رعایا ہی نہیں بلکہ انگریزی فوج کے ملازمین بھی شامی میں قتل کئے گئے تھے۔ خود حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ شامی کے سر پہ میں موجود نہ تھے، لیکن اس کا ثبوت آسان نہ تھا۔ اس لئے جان تک کے خطرے سے وہ محفوظ نہ تھے۔ کم از کم

قاتلوں کے پناہ دینے، باغیوں کی سرداری، بغاوت کی ترغیب ان الزاموں سے بری ہونے کی صورت کیا تھی، خود ان پر بھی یہ سارے الزامات تھے، اور جو فرد جرم آپ کے جاں باز دست گرفتوں سیدنا الامام الکبیر اور محدث روشن ضمیر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی پر لگائی گئی تھی، اس کی فہرست بھی بجنسہ یہی تھی۔

ایسی صورت میں مان بھی لیا جائے کہ عرب روانہ ہونے سے پیش تر اس ”ہام معافی نامہ“ کا اعلان ہو بھی چکا ہو، جب بھی نہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے مطمئن ہونے کے لئے کافی تھا اور نہ ان کے دونوں نوجوان خدام رفیقوں کے لئے۔ اسی لئے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی نگاہوں سے ہٹے اور ٹلے رہنے کا سلسلہ تینوں صاحبوں کے لئے معافی نامہ کے اعلان کے بعد بھی جاری رہا۔ حاجی صاحب تو کسی نہ کسی طرح کراچی سے بادبانی جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے، مولوی عاشق الہی صاحب نے بغیر کسی تعین تاریخ کے صرف یہی لکھا ہے کہ

”اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نے چند ماہ انبالہ بنگری پنجلاسنہ غیر مامواضع

و قصبات میں اپنے آپ کو چھپایا، اور آخر براہ سندھ و کراچی عرب کارائتہ لیا ہندوستان

کو خیر باد کہی، اور ہوائی جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچے۔“

ہوائی جہاز بادبانی جہاز کی عاشقانہ تعبیر ہے۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم تھا کہ پانی سے تعلق ہو کر صرف ہوا پر چلنے والا جہاز بھی سامنے آنے والا ہے۔

بہر حال، جہاں تک میرا خیال ہے حاجی صاحب کی روانگی حین خاص طریقہ سے اس زمانہ کی سست فتا سولایوں پر ہوئی تھی اور جن حالات میں ہوئی تھی چاہئے تو یہی کہ ہند کے ان مختلف مقامات سے گذرتے ہوئے عرب تک پہنچنے میں مدت صرف ہوئی ہو۔ سال ڈیڑھ سال بھی یہ مدت اگر فرض کی جائے، تو قیاس کا اقتضا یہی ہے کہ زیادہ نہ ہو۔

رہے ان کے صاحبین (حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ) تو ان میں سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اگرچہ عام طور سے یہ مشہور ہے کہ امن عام کے اعلان کے بعد ہی حکومت نے اپنی

نگرانی آپ سے ہٹائی تھی، غدر کے ہنگامہ کے فروہو جانے کے بعد حضرت دالاحین خدمات کی طرف متوجہ ہوئے، ان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں جو یہ الفاظ پائے جاتے ہیں کہ

”یہاں تک کہ ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے امن عام کا مشہور اعلان ہو گیا، اور ہر شخص آزادی سے چلنے پھرنے لگا۔“ ص ۱۱

بظاہر اس سے بھی ہتھی نہیں آتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کو بھی آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے کا موقعہ گویا مل گیا تھا، ادویوں بغیر کسی روک ٹوک کو ان مہمات میں مشغول ہوئے جن کی باگ بندے بعد آپ کے مبارک ہاتھوں میں آئی۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مصنف امام نے حضرت دالاحین سوانح عمری میں آپ کے حج اول کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس سے قطعی طور پر اس کی تردید ہوتی ہے، مگر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ لوگوں میں یہی بات کیوں پھیلی رہی، کہ ملکہ وکٹوریہ کے اس اعلان کے بعد ان خطرات سے محفوظ رہے تھے جنہیں حکومت کے وارنٹ نے آپ کے لئے پیدا کر دیا تھا۔

میرا مطلب یہ ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے پہلے حج کے متعلق یہ بیان کرتے ہوئے کہ اس سفر میں وہ بھی آپ کے ساتھ تھے مصنف امام نے ہندوستان سے روانگی کی تاریخ ۱۲۷۶ھ ماہ جمادی الثانی بتائی ہے۔ گویا سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۶۰ء دسمبر کا مہینہ تھا، حساب کریں کہ دیکھ بیٹھے اب اسی کے ساتھ وہ یہ بھی اطلاع دیتے ہیں کہ حج کے اس سفر کی

”ردپوشی کی بلا کے سبب دالاحین نے پنجوشی اجازت دے دی۔“ ص ۱۹

جس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ۱۲۷۶ء کے آخری مہینہ دسمبر تک ”ردپوشی کی بلا“ سیدنا الامام الکبیر کے پیچھے لگی ہوئی تھی، اگرچہ تین دن کی اختیاری ردپوشی کے بعد آپ کی ردپوشی بھی سوائے نام تھی، اور وہ بھی بقول مصنف امام جیسا کہ اس موقع پر بھی انہوں نے لکھا ہے کہ

”مولانا کی ردپوشی محض عزیز و اقارب کے کہنے سے تھی، ورنہ ان کو اپنی جان کا کچھ خیالی نہ تھا۔“

کچھ بھی ہو، مصنف امام کی اس تحریری شہادت کی بنیاد پر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جیسے معافی نامہ کی استثنائی دفعات کے زیر اثر اس عام معافی نامہ سے مستفید ہونے کا موقعہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نہ ملا، اسی لئے امن عام کے اعلان کے بعد بھی آپ کا سفر عرب کی طرف جاری رہا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی صورت پیش آئی تھی۔

اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ امن عام کا اعلان جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، لارڈ کیننگ کی طرف سے ۱۸۵۶ء کی پہلی نومبر کو ہو چکا تھا، لیکن سیدنا الامام الکبیر کا نام ان مجرموں کی فہرست میں ۱۸۵۶ء کے آخر تک باقی تھا، جن کو حکومت کے رحم و کرم کو سلوک کا مستحق نہیں ٹھہرایا گیا تھا۔ اسی لئے میرا خیال تو یہ بھی ہے کہ حج کا یہ پہلا سفر گو حضرت ولایت نے تو خاص حج ہی کی نیت سے فرمایا تھا، لیکن آپ کے اعزاء و اقرباء خصوصاً والدین کے سامنے مصلحت بھی تھی کہ حکومت کی داد و گیر سے بچنے کی بھی محفوظ ترین شکل یہی ہو سکتی ہے۔ ہمارے مصنف امام نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے۔ کم از کم اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے

مصنف امام بھی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے، لکھا ہے کہ،
”کشتیوں کی راہ پنجاب ہو کر سندھ کی طرف کو گئے، کراچی سے جہاز میں بیٹھے۔“ ۳۵

دیکھئے اور پڑھئے میں تو یہ چند الفاظ ہیں۔ لیکن حکومت اور حکومت کے نمائندوں، اور جن خورگوں سندوں، کی تجسس نگاہوں سے بچتے ہوئے براہ پنجاب کراچی تک پہنچنے کی دشواریوں کا صحیح اندازہ وہ نہیں کر سکتے، جن کو اس قسم کے اسفار کا اور وہ بھی خاص حالات میں سابقہ نہیں پڑا ہے۔ اسی رستے سے کئی سال بعد حضرت قطب ربانی مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حج ہی کے لئے تشریف لے گئے تھے، ان کے سفر نامہ کی تفصیلات کو درج کرتے ہوئے مولوی عاشق الہی صاحب نے لکھا ہے کہ
”فیروز پور تک چھکڑے میں بیٹھے، اور وہاں سے کشتیوں میں بھاو پور کے نیچے گزرتے ہوئے حیدر آباد سندھ پہنچے، وہاں سے بنگلہ میں سوا ہو کر کراچی بندر آئے،“ ۳۶ تذکرۃ الرشید

لے بنگلہ کی تشریح مولانا عاشق الہی صاحب نے یہ کی ہے کہ بنگلہ میں چالیس آہی کی اس ٹرکی بنگلہ نامی میں دباؤ لگو صفحہ ۱

فیروز پور تک چھکڑے کی سواری میں مسافروں پر کیا گذرتی تھی۔ مولوی صاحب نے لکھا ہے کہ
 ”بچکوں سے ہڈیوں کا چوراہا ہوتا ہے“

اور ہڈیوں کو چور کرنے والی اس سواری میں بقول ان ہی کے ”ہفتوں بیٹھا پڑتا تھا“ حیدر آباد سندھ سے کراچی تک پہنچنے کے لئے بغلہ کی بحری سواری میں کیا ہوتا تھا، مولوی صاحب ہی نے اطلاع دی ہے کہ

”مرطوب ہوا کے جھونکوں سے دوران سر میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے پر جا جا پڑتے تھے، اٹھتے تو چکر اور استفرغ بے ہوش بناتا، اور پڑتے تو غشی کا بادل چھاتا چلا جاتا تھا“

ص ۲۰ ج ۱ تذکرۃ الرشید

سفر کی ان صعوبتوں سے تو ان کو بھی دوچار ہونا پڑتا تھا، جو آزادی کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ لیکن ہر چار طرف سے حکومت کی دارو گیر کا خطرہ جس کے لئے ہو بکھا جاسکتا ہے کہ ان کی دشواریوں کا کیا ٹھکانہ ہو گا؟

لیکن شیخ ادیبیر (حضرت حاجی صاحب رح) نے جس راہ سے عشق کی یہ وادی طے کی تھی اسی راہ سے سعادت مند مرید (حضرت نانوتوی) بھی اللہ کے گھر پہنچا، مصنف امام نے لکھا ہے،
 ”کراچی سے جہاز بادبانی میں سوار ہوئے تھے“

یعنی ۱۳۵۷ء سے ۱۳۵۹ء تک ہندوستان میں حکومت کی اسی نیز نظر کے نیچے گذار کر منہ عین آپ جج کے لئے روانہ ہوئے، اور اس طرح ۱۳۵۷ء کے بعد ۱۳۵۸ء تک کے تمام سنیں حضرت دالا کے لئے حقیقت اعلان آزادی سے مستفید ہونے کے نہ تھے۔ اور گویا سمجھنا چاہئے کہ جہاد کی جس مہم کا آغاز ۱۳۵۷ء میں ہوا تھا، سیدنا امام الکبیرؒ شاہن، اٹھاؤں، اٹھ، اٹھ بلکہ بقول مصنف امام
 ”بعد زیارت حرمین شریفین ایک برس کچھ کم زیادہ میں وطن آئے“ ص ۳۱

(گذشتہ صفحے) گنجائش ہوتی ہے۔ بادبانوں کے ذریعہ ملاح ہوا کے رخ پر چلا تے تھے۔ دن بھر جلا کر شام کے وقت کسی بستی کے قریب کنارے پر باندھ دیا کرتے تھے ۱۲

یعنی ۱۶۷۷ء میں واپسی ہوئی گویا پانچ سال تک مسلسل بغیر کسی انقطاع کے جہاد ہی میں مشغول رہے۔ اور جہاد کے ساتھ ساتھ فریضہ حج سے بھی سبکدوشی اسی مدت میں آپ کے لئے حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے آسان کی گئی۔

صرف حج ہی نہیں، بلکہ انزواء یعنی فی الجملہ روپوشی کے ان ہی مبارک و مقدس ایام میں جب

حفظ قرآن کی نعمت عظمیٰ

حکومت کھلے ہوئے مشاغل میں حصہ لینے سے مانع تھی، فریضہ حج کے ساتھ ایک ایسے عمل کی توفیق میسر ہوئی جس کا وجوبی مطالبہ تو بندوں سے ان کے پیدا کرنے والے نے نہیں کیا ہو لیکن سید الانبیاء و الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کے توفیق یافتوں کو بشارت سنائی ہے کہ

کانما ادرجت النبوۃ فی جنبہ | گویا کہ اس کے (یعنی حفظ قرآن کرنے والے کے) پہلو میں نبوت پلیٹ دی گئی۔

یعنی قرآن پاک کے حفظ کی دولت گر انما یہ سے بھی ان ہی جہادی دنوں میں آپ سرفراز ہوئے اگرچہ آپ کے حفظ قرآن کے متعلق یہی مشہور بھی ہے کہ آپ اسی پہلے حج کے موقع پر جہاز میں روزانہ ایک ایک پارہ یاد کر کر کے تراویح میں سنا دیا کرتے تھے۔ خاکسار نے بھی بعض کتابوں کے حوالہ سے اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں یہی نقل بھی کر دیا ہے۔ لیکن واقعہ کی صحیح اور تفصیلی شکل وہی ہے جس کا ذکر مصنف امام نے فرمایا۔ انہوں نے براہ راست حضرت کا بیان نقل کیا ہے۔

”فقط دو سال رمضان میں میں نے یاد کیا ہے، پھر جب یاد کیا، پاؤں سپارہ کی قدر، یاد کچھ

اس سے زائد یاد کر لیا۔“

بظاہر رمضان کے یہ دنوں پہنچنے اسی زمانہ کے ہیں جب حکومت کے وارنٹ کی وجہ سے انزوائی زندگی کا موقع آپ کو مل گیا تھا۔ اس زمانہ کا بہترین مشغلہ ہی ہو سکتا تھا کہ جس کی راہ میں یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا اس سے مکالمہ و مذاجات کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ اسی عرصے میں حج کا سفر پیش آگیا۔ جہادی الثانی میں گھر سے روانہ ہوئے، مصنف امام نے یہ لکھتے ہوئے کہ کراچی میں بادبانی جہاز میں ہم سب سوار ہوئے

خبر دی ہے کہ ہم لوگوں کا سوا رہونا

”رمضان کا چاند دیکھ کر“

ہوا تھا۔ گویا یکم رمضان کو جہاز میں داخل ہوئے، اور وہی قرآن جو دو سال سے یاد کیا جا رہا تھا۔ تراویح میں اسی کے سنائے کا پہلا موقعہ اسی جہاز میں ملا تھا۔ مصنف امام کے الفاظ ہیں

”مولوی صاحب نے قرآن شریف یاد کیا تھا، اول وہاں (جہاز میں) سنایا۔“ ۳۵

ختم تراویح کے موقع پر مٹھائی کی تقسیم کا جو عام دستور ہے، ظاہر ہے کہ جہاز میں اس کا کیا سامان ہو سکتا تھا، لیکن یہ بادیانی جہاز عرب کے ساحلی مقام حضرموت کی راج دھانی کے سامنے جس کا نام مکہ ہے کچھ دن کے لئے ٹکرا انداز ہوا، تو مصنف امام راوی ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر نے

”بعد عید مکہ پہنچ کر حلوائے مسقط خرید فرما کر (بطور) شیرینی ختم دوستوں کو تقسیم فرمایا۔“ ۳۸

انزوا اور عام لوگوں سے علاحدگی کے ان دنوں میں حفظ قرآن کا یہ پاک مشغلہ حضرت دالاکا جو جاری تھا، اس کے متعلق یہ خبر دیتے ہوئے کہ

”مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کا اس سے پہلے (یعنی جہاز میں قرآن سناتے سے پہلے)

قرآن یاد کرتا۔ کسی کو ظاہر نہ ہوا تھا، آہستہ آہستہ پڑھنے اور یاد کر لیتے۔“ ۳۹

اسی کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ

”حافظوں کے نزدیک ٹھہرا ہوا ہے کہ (قرآن) بلند آواز سے یاد ہوتا ہے۔“ ۴۰

لیکن سن رسیدہ ہوئے اور آہستہ آہستہ یاد کرنے کے باوجود ان کی یہ شہادت ہے کہ

”جب سنایا، ایسا صاف سنایا، جیسے اچھے پرانے حافظ۔“ ۴۱

قرآن آپ نے کس لئے یاد کیا تھا، قطع نظر دوسرے اسباب و وجوہ کے فقیر نے جو یہ عرض کیا تھا کہ

۱۵ دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا ہے کہ قرآن شریف یاد دو رمضانوں میں کیا ہو جو مفاد ہے، مصنف امام کی روایت کا اظہار نہ ایک ایک پارہ صاف کیا ہو، اس رمضان میں جس میں تراویح جہاز میں سنائی ہو مفاد ہے مشہور روایت کا۔ محمد طیب غفرلہ

جس کی راہ میں یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا، اسی سے مکالمہ اور مناجات کا رشتہ قائم کرنا بھی مقصود تھا۔ یہ کوئی میرا صرف خیالی حسن ظن نہیں ہے، بلکہ ”القرآن العظیم“ کا جو تعلق سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک سورہ فاتحہ سے تھا، جس کا تفصیلی ذکر تو انشا اللہ ان کے تحقیقی معارف اور لدنی مواہب کے ذیل میں آئے گا۔ لیکن اسی موقع پر مصنف امام نے اس واقعہ کا جو ذکر کیا ہے، یعنی یہ لکھتے ہوئے کہ

”پھر تو (قرآن) اکثر بہت بہت پڑھتے“ ۳۵

آگے یہ دل چسپ کہئے، یا دل دوز اطلاع دی ہے کہ

”ایک بار یاد ہے کہ تائیس پارے ایک رکعت میں پڑھے“ ۳۶

یہ یاد تو مصنف امام کی ہے۔ اور فقیر نے یاد پڑتا ہے کہ اپنے اساتذہ میں سے کسی استاد گرامی سے سنا تھا کہ پہلی رکعت میں تائیس پارے اور باقی تین پارے دوسری رکعت میں پڑھ کر سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا تھا کہ ”ایک دفعہ تو اھدنا الصواط المستقیم کے کامل جواب کو ایک ہی دہلیز میں سن لو“ دل کی اسی تمنا کی تکمیل اس طرز عمل سے مقصود تھی۔

ایک ہی دو گانہ میں کامل تائیس پاروں کو ختم کرنے کے سوا، مصنف امام ہی کی جو یہ اطلاع ہے کہ

”اکثر بہت بہت پڑھتے“

اس سے بھی مراد ان کی نظر ہر یہی ہے کہ قرآن کی کافی مقدار نمازوں ہی میں حفظ کے بعد پڑھنے کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا، کیونکہ اسی کے بعد انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

”اگر کوئی اقتدار کرتا تو رکعت کر کر اس کو منع فرما دیتے، اور تمام شب تنہا پڑھتے پڑھتے“ ۳۷

شایدات کے پچھلے حصہ میں تہجد کے وقت ”بہت بہت“ پڑھنے کا طریقہ اختیار کیا گیا تھا، اور کوئی شخص مذہب میں بھی تداعی کے بغیر نوافل یعنی تہجد وغیرہ میں جماعت کی ضمانت نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص بلا اطلاع آپ کے ساتھ شریک ہو جاتا تو یہ خیال کر کے کہ ہر شخص کیلئے اتنی طویل قراۃ اور طویل قیام کا تحمل نشاط کے ساتھ آسان نہیں ہے اس رکعت کو مختصر کر کے نماز کو ختم کر دیتے اور اقتدار کر نیوالے کو شرکت سے منع فرما دیتے۔ ۳۸

۳۵ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دیوان محمد سلیم صاحب مرحوم نے ایک دفعہ حضرت کی دبیہ لکھے صفحہ پر

بہر حال خلقت سے علمی و ادبی موقوعہ دارنٹ کے زمانہ میں آپ کو جو اتفاقاً میسر آیا تھا، بذات خود تو آپ کے جہاد ہی کا وہ نمونہ تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ حفظ قرآن اور فریضہ حج و عمرہ کی بھی ان ہی دنوں میں ارحم الراحمین کی طرف سے آپ کے لئے آسان کی گئی۔

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ معاشی حیثیت سے آپ کی جو حالت تھی اس کو دیکھتے ہوئے یوں ہی سفر حج کے مصارف کی فراہمی دشوار تھی، خصوصاً ان دنوں میں تو ”معاشی مشاغل“ کا وہ قصہ بھی ختم ہو چکا تھا، لیکن باایں ہمہ اسی زمانہ میں بادیانی جہاز والے سفر کو آپ نے پورا کیا، اور جس طرح یہ سفر پورا ہوا، مصنف امام جو اس سفر میں حضرت کے ساتھ تھے، خود اپنے متعلق یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

”اقتربے سامان تھا، قلیل سا زاد راہ بہم پہنچایا تھا۔“

اسی کے بعد اپنا مشاہدہ ان الفاظ میں درج کرتے ہیں، کہ
 ”مگر مولوی صاحب (مسیدنا الامام الکبیر) کی بدولت وہ سب راہ بخیر و خوبی طے ہوئی۔“
 حالانکہ وہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ

”ہر چند مولوی صاحب بھی بے سامان تھے۔“

پھر یہ طویل طویل سفر اور بقول ان ہی کے جمادی الثانی میں جو شروع ہوا تھا، اور جب شعبان و رمضان شوال کے کامل چار مہینوں کے بعد جیسا کہ وہی لکھتے ہیں کہ
 ”آخر ذیقعدہ میں مکہ معظمہ پہنچے۔“ ۳۸

گویا کم و بیش چھ ماہ میں یہ سفر پورا ہوا، سواری کے کرائے، خورد و نوش کا انتظام اس لمبی اور دراز مدت میں (گذشتہ صفحہ سے) اقتداء کرتے ہوئے نیت باندھی جب پانچ چارے ہو گئے تو انہوں نے ٹانگیں بدلنی شروع کیں اور آخر کار سات آٹھ پاروں پر بیٹھ گئے۔ دم لیکر پھر کھڑے ہوئے اور چند پارے سن کر پھر بیٹھے اور پھر بیٹھے ہی بیٹھا اقتداء کرتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت والا نے ۲۵-۲۶ پاروں پر ایک رکعت کی اور پھر دوسری رکعت ذرا مختصر کر کے سلام پھیر کر ان سے فرمایا، تمہیں کس نے کہا تھا کہ اقتداء کرو؟ یہ سنتے ہی دیوان جی صاحب خفیف ہو کر پہاں سے اٹھے۔ محمد طیب غفرلہ

کیسے ہوتا رہا۔ افسوس ہے کہ بجائے تفصیل کے مصنف امام نے اس کے جواب میں صرف یہ اجمالی الفاظ درج کئے ہیں کہ

”بدولت توکل سب راہ بخیر خوبی پوری ہوئی اور سب کام انجام ہو گئے۔“ ص ۳۸

اپنے اس توکل میں بنائے والے نے جسے اپنا وکیل بنایا تھا، اس نے اپنی وکالت کا حتیٰ طرح پورا کیا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ کافی ایمان افراد واقعات ہوں گے، لیکن دیکھنے والوں ہی نے جب بیان نہیں کیا تو جس نے نہیں دیکھا وہ کیا بتائے۔ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے، کہ کافی خوشی اور حرمی انبساط و نشاط ہی کے ساتھ یہ سفر پورا ہوا تھا۔ جہاز میں تراویح کا سنا، مکمل پینچر قلعی حلو خرید کر احباب میں ختم تراویح کی شہیرہ بنی کے طور پر تقسیم انبساط و انشراح قلب کی غمازی کر رہی ہے پرانگندہ دلی و افسردگی میں ان باتوں کی بھلا کیا گنجائش؟ بلکہ اسی موقع پر بے ساختہ یہ جملہ معترضہ ان کے قلم سے جو ٹپک پڑا ہے، یعنی ”جہاز میں کیا سیر تھا؟“ ص ۳۸ خود اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کافی سرور و نشاط کے ساتھ سفر پورا ہوا تھا۔

بہر حال جیسا کہ مصنف امام کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ حج و زیارت کے اس مقدس سفر میں کم و بیش ایک سال کی مدت صرف ہوئی، شہرہ کو فتنہ پرگنیا سمجھنا چاہئے تقریباً چار پانچ سال گزر چکے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں حضرت کی روانگی ہندوستان سے ہوئی تھی اور ۱۹۶۷ء میں واپسی ہوئی۔ اس عرصہ میں ہندوستان کی سیاسی حالت روز بروز بدلتی چلی جا رہی تھی، انتقام کی آگ حکومت کے سینے میں روز بروز جھپک جھپک چاہئے تھا قدرتِ اعلیٰ پڑتی رہی۔ بیسیوں مجربین جن کے نام عام معافی نامہ کے اعلان کے بعد بھی استثنائی فہرست سے نہ نکلے تھے۔ تدریجاً نکلنے چلے جا رہے تھے۔ اب کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا واقعہ پیش آیا، کہ حجاج کا وہی قافلہ جو پنجاب والی خشکی و تری کی راہ سے کراچی اور وہاں سے بادبانی جہاز پر حجاز پہنچا تھا، اسی کے پاس کس قسم کی اطلاعیں ہندوستان سے پہنچی تھیں، کہ اسی قافلہ کو یعنی سیدنا الامام الکبیر اور آپ کے رفقاء سفر کو دیکھتے ہیں کہ واپس لوٹتے ہوئے، بجائے کراچی کے بندر کے مصنف امام کا بیان ہے کہ

”مراجعت براہِ مبہنی اور ناسک ہوئی، ریل ناسک تک تھی، وہاں سے گاڑیوں میں اُٹے۔“

ان ہی کی اطلاع یہ بھی ہے کہ

”زیج الادل کے آخر میں مبہنی آئے۔ جمادی الثانی تک پڑن پہنچے۔“ ۳۸

گر یا مبہنی سے وطن تک پہنچنے میں دوڑھائی مہینے صرف ہوئے،

اگر قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ مبہنی کی راہ سے یہ واپسی بھی ”روپوشی“ ہی کی شکل میں تھی، یا یہ قصہ ختم ہو چکا تھا۔ لیکن قرآن کا اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی نگرانی میں اضحلال اور لاپرواہی کی کیفیت ضرور پیدا ہو چکی تھی۔ اسی جج کے سفر سے واپسی کے تذکرے کو ختم کر کے مصنف امام نے لکھا ہے کہ،

”پچھلے بد تحقیقات سرکار نے مطالبہ عام اٹھا دیا تھا، چند خاص شخصوں کی نسبت جن پر سرکار

کاشبہ قوی تھا اشتہار جاری رہا۔“

وائسڈا علم بالصواب ”پچھلے“ کے لفظ سے ان کی کیا مراد ہے، بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان لوگوں کے پچھلے جب وہ عرب میں تھے۔ حکومت کی طرف سے تحقیقات کے بعد ”مطالبہ“ کی گرفت ڈھیلی کر دی گئی تھی، اور صرف چند مخصوص شخصیتوں کی حد تک قصہ محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

مصنف امام کے اس بیان کے سوا اس وقت تک مجھے کوئی ایسی چیز نہیں ملی ہے جس میں صراحتاً اس کا ذکر کیا گیا ہو، کہ سیدنا الامام الکبیر کے اسم گرامی کو استثنائی مجرموں کی فہرست سے نکال دیا گیا تھا۔ پس ان کے بیان کے فحوی سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ جج کے سفر سے واپسی کے بعد سیدنا الامام الکبیر کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جج سے واپس ہونے کے بعد حضرت والا

”پھر گھر پر اپنے رہے۔“ ۳۹

سمجھنا چاہئے کہ اسی نقطہ پر شیعہ کے جہاد کی ہم آہنگی کی ختم ہو گئی۔

باقی رہ حضرت حاجی صاحب کے صاحبزادے یعنی قطب ربانی حضرت مولانا

رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تو جہاں تک میرا خیال ہے ملکہ و کٹوریہ کے عام معافی نامہ کے اعلان کے بعد بھی اپنے رفیق سیدنا الامام الکبیر کی طرح آپ کا شمار بھی ان ہی استثنائی مجرموں میں تھا، جو اس معافی نامہ سے مستفید ہونے کا حق نہیں رکھتے تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے حضرت گنگوہی کو حکومت نے گرفتار بھی کر لیا تھا، اور حوالات میں ڈال کر چھ مہینہ تک آپ پر باضابطہ مقدمہ چلاتا رہا، غیبی امداد سرگرم کار تھی، نہ بڑے بڑے وکیل تھے اور نہ بیرسٹر۔ لیکن اس آفت ناگہانی سے بخیر و خوبی آپ سالم و غائم ہو کر مکمل آئے۔ جس کی تفصیلات تذکرۃ الرشید میں پڑھنا چاہئے۔ یہاں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ حضرت گنگوہی کی گرفتاری کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عاشق الہی نے لکھا ہے کہ

”تجینے سے یہ زمانہ ۱۲۵۵ھ، ہجری کا ختم یا ۱۲۵۶ھ کا شروع سال ہے۔“ ص ۵۲

اگر یہی واقعہ ہے تو عیسوی سن کے حساب سے یہ ۱۸۵۵ء کا آخر اور ۱۸۵۶ء کی ابتداء کا زمانہ ہے، اور عرض کر چکا ہوں کہ ۱۸۵۵ء کے نومبر ہی میں عام معافی نامہ کا اعلان حکومت برطانیہ کی طرف سے ہندوستان میں کیا جا چکا تھا۔ ایسی صورت میں سمجھنا چاہئے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پر مقدمہ عام معافی نامہ کے اعلان کے بعد چلا گیا۔

حضرت مولنا گنگوہی کی گرفتاری کے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے جن کا ذکر مولوی عاشق الہی صاحب نے کیا ہے۔ آج بھی ان کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سترہ سواروں کو ساتھ لے کر ایک مسلمان غلام علی نامی کی مخبری اور راہ نمائی میں کرنل گارڈن نے گنگوہی پر دھاوا کیا، مولنا گنگوہی میں موجود نہ تھے۔ لیکن ان کے اشتباہ میں حضرت کے ماموں زاد بھائی مولوی ابوالنضر صاحب عزم کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جو مسجد بنے کسی گوشہ میں گردن جھکائے بیٹھے تھے۔ مولوی عاشق الہی کی روایت ہے کہ سواروں میں سے ایک سوار نے مولوی ابوالنضر

”کی گردن پر زور سے ہاتھ مارا اور پکارا کہ چل کھڑا ہو، گردن جھکائے کیا

بیٹھا ہے۔“ ص ۵۲

مولوی ابوالنضر حالانکہ جانتے تھے کہ مولنا گنگوہی کے مشبہ میں مجھے گرفتار کر رہا ہے لیکن اس مرد خدا

اللہ کے بندے کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ

”میں رشید احمد نہیں ہوں“

اخلاص و وفا کی یہ مثالیں سلف میں تو سننے میں آئی ہیں۔ لیکن روح القدس کا فیض خلف میں بھی ایسی دھون کو پیدا کرتا رہا ہے۔ ایک زندہ شہادت تو اس کی یہی ہے۔

بہر حال کہا جاتا ہے کہ حضرت گنگوہی ایک مسلمان حکیم احمد امیر بخش کی مخبری سے رامپور منہیا ران میں گرفتار ہو گئے، اور بقول مولانا عاشق الہی سہارنپور جیل کے اندر

”تین چار یوم کال کوٹھری اور پندرہ دن جیل خانہ کی حوالات میں مقید رہے“

سہارنپور سے آپ کو مظفرنگر جیل میں منتقل کر دیا گیا، لکھا ہے کہ

”مظفرنگر کے جیل خانہ میں حضرت کو کم و بیش چھ ماہ رہنے کا اتفاق ہوا“

قرآن مجید کے حفظ کا کام تو فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہی پورا کر چکے تھے جیل میں تلاوت و ذکر و شغل کے ساتھ ساتھ وعظ و تذکیر کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، لکھا ہے کہ

”حراست کے زمانہ میں آپ کی نماز ایک وقت کی بھی قضا نہ ہوئی“

نماز صرف قضا ہی نہیں ہوئی، بلکہ

”محبس کی کوٹھری میں بھی نماز باجماعت ادا کرتے رہے“

سیرت و کردار اور تقویٰ کی زندگی کا اثر جیل خانہ میں بھی یہ ہوا، کہ قیدیوں میں

”بہتیرے وہیں آپ سے بیعت ہوئے“

اس سلسلہ میں بہاری کتاب کے موضوع کے لحاظ سے قابل ذکر اس واقعہ کا اہم ترین جزو وہ ہے جس کا

لع بطقات ابن سعد میں نقل کیا ہے کہ ابراہیم نخعی کی گرفتاری کا حکم حجاج مشہور ظالم امیر نے دیا، وہ درپوش تھے، کو ذہبی میں ایک دوسرے سالم دوا عظم، ابراہیم نخعی بھی تھے۔ حجاج کے آدمیوں نے ابراہیم نخعی کے اشتباہ میں ابراہیم نخعی کو گرفتار کر کے حجاج کے دربار میں پہنچا دیا، حجاج نے جیلخانہ بھی ان کو بھجوا دیا، ابراہیم نخعی جانتے تھے کہ میں نخعی کے مشابہ میں پکڑا گیا ہوں۔ لیکن اس حقیقت کو آخر وقت تک ظاہر ہونے نہ دیا۔ تاہم کہ جیل ہی میں وفات بھی ہو گئی۔

تذکرہ مولوی عاشق الہی صاحب نے فرمایا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جس وقت سہارنپور سے پانچویں منظر نگر پولیس کی نگرانی میں حضرت گنگوہی جا رہے تھے۔ راستہ دو دن میں طے ہوا تھا۔ سہارنپور سے منظر نگر جانے والی دیوبند ہو کر گذرتی تھی، وہی دیوبند جہاں ان کے رفیق الدنیا والا آخرۃ عاشق زار، یار وفادار سیدنا الامام الکبیر مسجدوں میں اپنے اشر کی پناہ میں زندگی گزار رہے تھے۔ حضرت گنگوہی کی دیوبند کی سڑک سے گذرنے کی خبر کسی طرح آپ تک پہنچ گئی۔ دل نہڑپ اٹھا، تاکنے والی آنکھیں حالانکہ چاروں طرف لگی ہوئی تھیں۔ لیکن ان آنکھوں میں خاک جھونکتے ہوئے بیان کیا جاتا ہے، کسی ایسی جگہ پر جا کر کھڑے ہو گئے، جہاں سے ان کی نظر اپنے محبوب رفیق پر پڑ سکتی تھی۔ اچانک ہاتھوں میں بیڑیاں پاؤں میں زنجیر پہنے ہوئے، ہندوستان کا محدث اعظم ان کے سامنے آگیا۔ پولیس کا پہرہ لگا ہوا تھا۔ بات تو بات شاید اشارے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ زبان حال سے حضرت گنگوہی کی طرف سے روح کی فضاؤں میں یہ آواز گونج رہی تھی

بحرم عشق تو ام می کشند غوغا نیست

تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا نیست،

گویا بغیر اے شاعر مذکور بہ سارا قصہ کو کچھ بھی پیش آیا تھا، گذر چکا کہ سیدنا الامام الکبیر ہی کے اقدام و اصرار کا نتیجہ تھا مولوی عاشق الہی صاحب نے لکھا ہے کہ

”منا ہے کہ دیوبند کے قریب گزرنے پر مولانا قاسم العلوم نظر براہ راستہ سے کچھ مٹ

کر بغرض ملاقات پہلے سے آکھڑے ہوئے تھے۔ گو خود بھی مجددش حالت میں تھو

مگر بے تابئی شوق نے اس وقت چھپنے نہ دیا، دور ہی دور سے سلام ہوئے۔ ایک نے

دوسرے کو دیکھا۔“

گویا، باہم نگرستیم و گرستیم و گدشتیم، کی صورت بجلی کی طرح سامنے کو نہ گئی، یہ مصرعہ عرفی کا ہے جس میں نگرستیم کے بعد ”گرستیم“ کا اس نے ذکر کیا ہے۔ لیکن مولوی عاشق الہی صاحب نے جس راوی سے یہ خبر سنی تھی، اس کا بیان تھا کہ باہم ایک دوسرے کو دیکھ کر ”مسکرائے“ بے ساختہ

ٹوٹکی شاعر کیف مرحوم کا شعر یاد آ رہا ہے۔

ملتے ہی آنکھ رنج نہ تھا ظلم غیر کا
 کیا جائے اس نگاہ نے سمجھا دیا مجھے

آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک نے دوسرے سے کچھ کہا، جانے والا منظر نگریل میں داخل ہونے کے لئے منظر نگری طرف روانہ ہو گیا، اور دیکھنے والا، جب تک دیکھ سکتا تھا، دیکھتا رہا۔ پھر ان ہی آنکھوں پر کیا گذری ہو گی جو دیکھنے سے بھی محروم کر دی گئیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں صاحبین کے شیخ نے تو خیر مکہ معظمہ ہی کو وطن بنالیا، اور یہی ان کے لئے مقدر بھی تھا، پیدا ہوئے تھے ہند میں، لیکن قدرت ان کو شیخ العجم والعرب بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ جس فیصلہ کی تکمیل اسلام کے قبلہ اور مرکز میں قیام کے بغیر ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ باقی صاحبین تو دیکھ چکے کہ معافی عام کے اعلان کے بعد بھی دونوں پر حکومت کی نگرانی قائم رہی، حضرت گنگوہیؒ پر تو مقدمہ بھی چلا۔ جو خطرہ ان کے لئے تھا۔ وہ معمولی نہ تھا، تذکرۃ الرشیدیہ میں مولوی عاشق الہی نے ایک واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اور تو اور ان کے پیرومرشد حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تک کا احساس تھا کہ حکمۃ حضرت گنگوہیؒ کو پھانسی دے دے گی، ایک دفعہ اپنے رفقاء سے فرمایا بھی کہ

”میاں کچھ سنا مولوی رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہو گیا“ ۵۵

اور جب پھانسی تک کی سزا کا اندیشہ حضرت گنگوہیؒ کے متعلق پیدا ہو چکا تھا، اور اس قسم کی خبیثہ سبب اٹھنے لگی تھیں، تو پھر جس نے شاعری کے دروازے کو جلا یا تھا، جس کے جل جانے کی وجہ سے خدا ہی جانتا ہے کہ حکومت کی فرج کے کتنے آدمی مارے گئے۔ جنیو کا ہاتھ چلا کر عفریت پیکر فرجی کو جس نے دو پارہ کیا تھا۔ اس کے سوا خود اس کی تلوار نے کتنوں کو ٹھکائے لگایا تھا، زخمِ چشم کی عینی شہادت سے جس کا جرم پہچانا بھی جاسکتا تھا۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ وہ خطرات کی کتنی گہری تاریکیوں میں گھرا ہوا ہو گا، جو کچھ بھی سوچا جاسکتا ہے۔ سمجھنا چاہئے کہ سب ہی کی گنجائش تھی لیکن حضرت

گنگوہی پر مقدمہ چلنے، اور جیل میں رہنے کے باوجود اور بقول مولانا عاشق الہی سہارنپور میں بھی،

”تحقیقات پر تحقیقات اور پیشی پر پیشی ہوتی رہی“ ص ۷۷

اور منظر نگار میں بھی حاکم کے سامنے بار بار پیش ہوئے پر جس کا حال یہ رہا ہو، کہ

”جو کچھ وہ دریافت کرتا، بے تکلف اس کا جواب دیتے تھے، کبھی کوئی کلمہ دبا کر زبان

کو موڑ کر نہیں کہا، کسی وقت جان بچانے کے لئے تقیہ نہیں کیا، جو بات کہی سچ کہی۔“ ص ۷۸

یا این ہمہ پھانسی تک کا خطرہ کیا بلکہ گونہ نقین تک کی کیفیت جس کے متعلق پیدا ہو چکی تھی، دیکھا گیا کہ حاکم اس سے پوچھتا ہے کہ

”رشید احمد تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا، اور فساد کیا؟“

جواب میں صرف چند الفاظ

”ہمارا کام فساد کا نہیں، نہ ہم مفسدوں کے ساتھی“

اور کچھ نہیں کہا گیا، پوچھا گیا

”تم نے سرکار کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائے؟“

بجائے زبان کے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ پہلے ہاتھ اٹھا، جس میں تسبیح تھی، اسی تسبیح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا تھا

”ہمارا ہتھیار تو یہ ہے“

”ہاتھ کا یار“ یا ہاتھ کی یاری جس سے تھی، اسی کو دکھا دیا گیا، گویا ہاتھ کے اشارے سے حافظ کی غزل سنائی جا رہی تھی

بادشاہان ملک صبح گیم

گرچہ مابند گان بادشیم

جام گیتی نما، و خاک رہیم

گنج در آستین و کیسہ تہی

اور یہ کہ ع روی بہت بہر کجا کہ نہیم

دوستان را قبائے فتح د، یم

دشمنان را از خون کفن سازیم

کچھ مصنوعی بندر بھبکیوں کے بعد دیکھا گیا، روایت متواتر ہے، مصدق بالمشاہدہ ہے کہ ”پھانسی کے حکم کا انتظار جس کے لئے کیا جا رہا تھا“ اسی کے متعلق فیصلہ سنانے والا فیصلہ یہ سنارہا تھا، یا اس سے سنوایا جا رہا تھا، کہ

”رشید احمد ہا کئے گئے“ ۵۵

اور یہاں تو خیر گرفتاری بھی ہوئی، مقدمہ بھی چلا، پیشی بھی ہوئی۔ پوچھ تاچھ سے بھی کام لیا گیا، لیکن جس کا جرم بھی سخت تھا، اور اپنے جرم کی عینی شہادت جس کی پیشانی پر چمک رہی تھی، اپنے تمام ممکنہ وسائل کے ساتھ حکومت کی لامحدود آنکھیں اسے ڈھونڈھتی رہیں، سلطان ہی آنکھوں کے نیچے چلتا پھرتا رہا، ان ہی کے درمیان سے گذرنا ہوا، پنجاب پہنچا، پنجاب سے سندھ، سندھ سے عرب تک سمندر پھلانگ کر پہنچ گیا۔ وہاں سے واپس بھی لوٹا، دیکھنے والے دیکھتے بھی رہے، لیکن وہ کسی کو نہ سوچھا، اور آج تک یہ معمرہ بدرجہ اسباب معمرہ ہی بن رہا کہ ڈھونڈھنے والوں کی اقطار ہند میں بھری ہوئی نگاہیں اچانک کیوں سمٹ گئیں۔ جو مجرم اور سخت مجرم تھا، وہ جرم سے بری کیوں ٹھہرا دیا گیا۔ کم از کم میری جستجو اور تلاش کے لئے تو یہ سوال ابستار میں بھی چیتا ہی تھا، اور سب کچھ اٹنے پلٹنے اور اسباب کے سارے دفاتر ممکنہ کے کھنگال ڈالنے کے بعد بھی، اب تک وہ چیتا ہی بنا ہوا ہے۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسے معمول کا حل ان نائنٹی اسباب و مسببات کے پریچ سلسلوں میں تلاش کرنا ہے بھی نادانی۔ ایسے حیرت ناک امور اور ان کے حیرت افزا نتائج کا حل صرف ان غیبی میدانوں میں دستیاب ہو سکتا ہے جن کی سرحد عالم محسوسات کے مادراء سے شروع ہوتی ہے۔ یقیناً وہ مختوم اقلوب انہیں کبھی نہیں سمجھ سکتے جو ہمہ وقت محسوسات ہی کے دائروں میں تہ وبالا اور غلطان دیہان ہوتے ہوئے بالآخر ایک دن اسی ناسمجھی کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ کیا انہیں یہ نہیں معلوم کہ ع سناڑوں کے آگے جہاں اور بھی ہیں اس چیتا کا حل کہ حکومت کی نگاہوں میں ایک سخت ترین مجرم اس کی ساری کشتیوں کے

بعد بھی صاف بچار ہے اور وہ کہ جسے خود حکومت کا فیصلہ بری قرار دے رہا ہو، اسی کے ہاتھوں ۶ ماہ جیل میں بند رہے۔ ستاروں کے پیچھے ان ہی عرشی انسانوں کے واقعات کے مبادی میں تلاش کر دو تو بآسانی مل جائے گا۔ خود حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے ایک جملہ سے یہ سارا محلِ متن حل ہو جاتا ہے۔ مولانا گنگوہیؒ نے جیل سے رہائی کے بعد فرمایا کہ جہاں دشاطلی کے مسئلہ میں مجھے ابتداءً کچھ تامل تھا۔ شاید اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مجھے ۶ ماہ جیل میں رہنا پڑا اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو کسی وقت بھی کوئی تامل نہیں ہوا تو وہ اس ابتلا سے نہیں گذارے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ جس معصہ کو دالبتگان اسباب کا دشوں کے بعد بھی حل نہ کر سکے، ایک دالبتہ غیب نے اسے چٹکیوں میں حل کر کے حیرتوں کا پردہ چاک کر دیا۔ یعنی معاملہ کا تعلق حتیٰ اسباب سے زیادہ باطنی شئون سے نکلا۔ ہو سکتا ہے کہ اُن تنگ چشمانِ عالم محسوسات کے لئے یہ مسئلہ پھر بھی چیتان ہی رہے۔ جنہیں غیبی مقامات پر دھیان دینے کی نہ فرصت ہے نہ اہلیت، لیکن ان کی تنگی چشم و دامان سے عالم روحانیات کی لامحدود وسعتوں اور ان سے دالبتہ رہنے والوں کے وسیع ترین حوصلوں اور ذہنی وسعتوں میں اس سے فرق ہی کیا پیدا ہو سکتا ہے اور اگر اس تقدیری حقیقت کو تدبیر کے سلسلوں میں نمایاں کرنے کے وسائل کسی کے سامنے نہ آئیں تو اصل حقیقت پر اس سے کیا غبار آ سکتا ہے؟

ذوق و وجدان کی راہ کو چھوڑ کر جو لوگ خواہ مخواہ اصول اور استدلال ہی کی راہ پیمائی ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے لئے بھی آخر اس قدرتی اصول میں تامل کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے کہ جسکی راہ میں سو جان سے جان دینے کے لئے کھڑا ہونے والا کھڑا ہوا، اسی لئے اس کی جان تک کسی مجسس کسی جاسوس اور کسی دُش کو نہ پہنچنے دیا۔

اگر اس اصول کے نیچے اس لمبی چوڑی تاریخ کو رکھ لیا جائے جو اس اصول کے لئے دلائل اور مظاہر کی حیثیت رکھتی ہے تو اس میں معصہ کی کیا بات رہ جاتی ہے۔ جاں سپاردوں کی جانوں کو ملائکہ مستومین کے ذریعہ محفوظ کر دیا جائے۔ رجال غیب کے ہاتھوں جلادوں کے ہاتھ شل کر دیئے جائیں۔

اور حکام کے قلم پھیر دئے جائیں۔ خلیل کے ہاتھ کی چھری ذبح کے گلے پر آکر کند کر دی جائے۔
 راہ ہجرت میں حبیب کے بچاؤ کے لئے دیکھتی آنکھوں سرافقہ ابن مالک کے گھوڑے کی ٹانگیں
 زمین میں دھنسا دی جائیں، جو غیبی طاقت ان حقائق میں بلا توسط اسباب بلکہ خلاف اسباب اپنے
 جاں بازوں کے لئے یہ کرشمے دکھلا سکتی ہے۔ اسی قوت نے اگر شاہی کے میدان اور میدان
 کے مابعد اپنے سچے جاں نثاروں کی جانوں کے تحفظ کے لئے دیوثوں کی کھلی آنکھوں کو نابینا
 حکام کے رواں قلموں کو شکستہ اور ان کی بولتی زبانوں کو گنگ بنا دیا تو یہ کوئی نیا سانحہ اور
 جبرت ناک چیتاں کب ہے کہ اسے عقدہ لایا جائے بلکہ ہر دور ہر قرن کا ایک عام اصول
 ہے۔ جسے تاریخ دہراتی چلی آئی ہے۔ بہر حال ذوق و وجدان، اصول داستان لال اور تاریخ
 و مشاہدات سب ہی اس پر ایک زبان ہیں کہ من کان للہ کان اللہ لاہ۔ (محمد طیب غفرلہ)

۸۵۷ء میں جو طوفان اٹھا تھا، وہ اوروں کے لئے کسی وقت بھی ختم ہوا ہو۔ لیکن سیدنا
 الامام الکبیر کی حد تک کہا جاسکتا ہے کہ نشیب و فراز کی مختلف منزلوں سے گزرتے ہوئے صحیح
 معنوں میں اس وقت تھا، جب ۸۷۱ء کا سال گزر رہا تھا، اور پہلے حج کے سفر سے براہِ مہجرت
 آپ نالوثہ واپس ہوئے، اسی کے بعد جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے
 ”پھر گھر پر اپنے رہے“ ۳۹

حضرت دالاکہ زندگی مبارک کے یہی چند سال (پانچ چار سال کے قریب) وہ ہیں جن میں
 جہاد کے فرض کفایہ، اور حج کے فرض عین سے بھی سبک دہشی آپ کے لئے آسان کی گئی،
 اور اسی محدود مدت میں حفظ قرآن کی سرمدی دولت و سعادت سے بھی سرفرازی میسر آئی جو
 مصائب و آلام کا دیاؤ آپ پر ڈالا گیا۔ ان کے یثمرات و نتائج تو وہ ہیں جنہیں دیکھنے والوں
 نے دیکھا اور جاننے والوں نے جانا، لیکن عالم شہادت اور عالم محسوس کے پیچھے غیبی
 میدانوں کا لامحدود سلسلہ جس کے سامنے ہو، اس کے مدارک کو کوئی کیا بیان کر سکتا ہے کہ
 پانے والے نے ان مصائب کا صلہ کیا کچھ پایا۔ قرب و وصال کی کتنی کتنی بلند منزلیں طے کر ڈالیں

ادمان جاں باز یوں میں اس کے سلف کو جو کچھ ملاتھا اسے اس میں سے کیا کچھ مل گیا؟۔

شرح صدر کی نعمت پائے دالوں کے لئے یقین مانئے کہ مصیبت کا ہر دباؤ، غیبی حدود کا چڑھاؤ بنتا چلا جاتا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے، کہ عروج و ارتقاء کے آخری نقطہ تک چڑھائی کی جو صورت اسرار کی رات میں پیش آئی تھی، کون کہہ سکتا ہے کہ رشوب اپنی طالب کے ہولناک تاریخی دباؤ سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

فاتبعونی کی پکار پر چل پڑنے والوں کے سامنے کیسے بتایا جائے کہ اپنے اپنے طرف
اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کسی نہ کسی رنگ میں وہ سب کچھ پیش آتا ہے، جس سے خود
فَاتَبِعُونِی کا پکارنے والا گذرا تھا، یا اسے گزارا گیا تھا۔ فصلے اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ
محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔



خِدْمَاتِ جَلِيلہ

شاہکار

حد سے زیادہ تاریک اور مہیب مستقبل جس سے اچانک سرزمین ہند میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ دوچار ہو گئی تھی، اس سے مقابلہ کرنے کے لئے اترنے والے میدان میں اتر کر آپ دیکھ چکے، کہ ایک طبقہ تو ان ہی میں ان لوگوں کا تھا جو بہ یک جست قلندرانہ کہنے یا شہیدانہ دوسروں کو نہ ہی لیکن خود اپنے آپ کو ایسے ”روشن مستقبل“ تک پہنچا دینے میں کامیاب ہو گیا، جس کے بعد تاریکی کا خطرہ ہی باقی نہیں رہتا، تھا نہ بھون کی جہادی ہم میں اس طبقہ کے سرگروہ حضرت حافظ ضامن شہید نور اللہ مرقدہ تھے۔

لیکن فتنہ ہم من قضیٰ خبیہ کے فرض سے سبکدوش ہونے والے اس گروہ کے مقابلہ میں ومنہم من ینتظر کی قدرتی کمند نے جن کو ”تاریک مستقبل“ ہی کے ساتھ کش مکش کرنے کے لئے روک لیا تھا، کیا آگے بڑھنے سے وہ رک گئے؟ بجائے گھٹنے کے تاریکی بڑھتی ہی چل جاتی تھی، لیکن مرزا غالب جس زمانہ میں گارے تھے کہ

موجِ خوں سگرگد رہی کیوں نہ جائے

آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا؟

اس زمانہ میں دیکھنے والوں نے چشمِ سر سے دیکھا کہ واقعی کسی کے سر سے خون کی موج اُبل رہی؟

لہ اشارہ قرآن کی اس آیت کی طرف ہے جس میں ارشاد ہوا ہے

ایمان والوں سے کچھ لوگ وہ ہیں کہ سچ کر دکھایا جس کا خدا سے عہد و پیمان کیا تھا۔ پھر ان میں بعض نے اپنا ذمہ پورا کر دیا، اور بعض ان ہی میں انتقال کر رہے ہیں پھر ان کی تکمیل کا۔

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَنْتَظِرُ (الاحزاب)

پوچھنے والے پوچھ رہے ہیں، کہ کیا ہوا؟ اور وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ کچھ نہیں ہوا، کچھ نہیں ہوا،
 رو در رو ہو کر اس کے چہرے پر گولی چلائی گئی، بندوق کی گولی چلائی گئی۔ سوچو اور دارھی کا بھی کچھ
 حصہ مل گیا۔ آنکھوں کو بھی چشم زخم پہنچا۔ لیکن سو آگے بڑھنے ہی کے لئے میدان میں اترا تھا، وہ سن کچھ
 اسی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا، جدھر جانے کا وہ فیصلہ کر چکا تھا، لٹو فانی کا رخ پھیرا جائے گا، جو
 اذھیرا پھیلا ہے، اس کو روشنی سے بدلا جائے گا، اس کا یہ عزیمت اب بھی ترونازہ تھا، اس کی
 اُمنگوں کا جو رخ اب بھی باقی تھا، بلکہ شاید کچھ زیادہ تیز، زیادہ قوی ہو گیا تھا، شہید تک تو اس
 کے ہاتھ میں تلوار بھی تھی، اس ہنگامہ کے فرو ہو جانے کے بعد تو یہ تلوار بھی چھن گئی، اور غالب ہی
 کے الفاظ ہیں

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں،

آہنی اور نفرتی و طلائی الغرض سارے ہتھیار جن سے کام لیا جاتا ہے، وہ سب ہی سے نہتا ہو چکا
 تھا۔ لیکن اس کے ارادے کی بلندیاں اب بھی باقی تھیں، حالانکہ وقت تنگ ہو چکا تھا، لیکن
 اسی تنگ وقت میں اس سے جو کچھ ہو سکا گر گذرا، اس کی بھی کوشش بار آور اور سعی مشکور ہوئی، یوں
 اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک مستقل دینی و علمی تحریک کی بنیاد پڑ گئی۔ یہ دہی دینی و علمی تحریک ہے،
 جو ضلع سہارنپور کے قصبہ دیوبند کی طرف منسوب ہو کر ”دیوبندیت“ کے نام سے عوام و خواص میں
 موسوم و مشہور ہوئی۔

یہ دینی و علمی تحریک جس کا عرفی نام ”دیوبندیت“ ہے، اور اپنے بانی کے نام کی نسبت سے
 اس کی تعبیر چاہئے تو یہی کہ

”قاسمیت“

سے کی جائے۔ حقیقت کی آئینہ دار سچ پوچھئے تو یہی تعبیر ہو سکتی ہے۔

بہر حال دہر بندیت کہنے یا قاسمیت کی تحریک، اپنی اصل حقیقت کی رو سے کیا ہے، کیا یہ کوئی بسیط حقیقت ہے؟ یعنی اسلامی علوم کی تعلیم کے لئے کسی خاص عصری نظام ہونے کے سوا یہ اور کچھ نہیں ہے؟ بظاہر شاید یہی سمجھا جاتا ہے، لیکن حقائق آگاہ دیدہ و دروں سے پوچھئے، وہ آپ کو متلنگ کر کے جیسے یہ ایک قطعی نظام ہے، اسی طرح ملکہ اس سے بھی زیادہ خاص قسم کی دینی و روحانی تربیت کا ایک ایسا معتدل سانچہ اور قالب بھی ہے، جس میں ڈھل کر نکلنے والوں میں اسلامی مطالبات کے اعتقادی و عملی، ظاہری و باطنی، عناصر کا امتزاج کچھ ایسے رنگ میں ہو جاتا ہے، جس کی نظیر کم از کم اس زمانہ میں ہندوستان تو ہندوستان، شاید بیرون ہند کے کسی اسلامی ملک میں بھی بآسانی نہیں مل سکتی۔

صرف یہی نہیں بلکہ اسی کے ساتھ اس تحریک کے قوام میں ابتداء ہی سے کچھ ایسی چیزیں گھلی ملی ہوئی ہیں، جو ایک طرف خود ہندوستان کو بھی اپنے صحیح سیاسی مقام تک انشاء اللہ تعالیٰ پہنچا کر رہیں گی، اور دوسری طرف عام عالم اسلامی سے بھی رشتہ اتحاد و اخوت کے استحکام میں ان سے کافی مدد ملتی رہی ہے، آئندہ بھی انشاء اللہ ملتی رہے گی۔ اور خواہ اعتراف کیا جائے یا نہ کیا جائے، لیکن ہندی مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں بھی اس تحریک سے غیر معمولی انقلاب ہوا، بلکہ انصاف سے اگر کام لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ اس قوم کے پس ماندہ طبقات کی معاشی حالت کے سدھارنے میں بھی اس تحریک سے کافی تقویت پہنچی ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ حالات کی ناموافق اگر آڑے نہ آجاتی، جس کی وجہ سے اس تحریک کے بعض اہم اجزاء کی عمر مختصر ہو کر رہ گئی، تو ہمارا وطن شاید آزاد ہونے سے پہلے بہت پہلے آزادی کی ایک بڑی منزل طے کر لیتا۔ کم از کم حکومت مصلحت کی تعمیر کا ایک اہم غیر معمولی

لے کیونکہ اس نظام تعلیم سے زیادہ تر استفادہ کاموقرہ مسلمانوں کے ان پس ماندہ طبقات ہی کے بچوں کو ملا جو اپنی معاشی بنیادوں کی حالت میں حکومت کے قائم کئے ہوئے جوامع یا یونیورسٹیوں کی اس تعلیم کو حاصل نہیں کر سکتے تھے جس سے سرکاری ملازمت کا استحقاق پیدا ہوتا ہے، عوام کو نسل میں بہت مید، مسیح میں فقط جن اکبر مرحوم کی یہ رپورٹ خواہ مخواہ بھی حوصلہ گسل ہو، لیکن جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، عربی اور دینی تعلیم کی عوامیت سے غریب مسلمانوں کی معاشی سطح کے بلند کرنے میں ضرور مدد ملی ہے۔ اپنے ایک مستقل مقالہ میں فقیر نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے جو شاید محکمہ دارالعلوم کے دورِ اول میں شائع ہوا تھا۔ ۱۲

ستون تو یقیناً گر جاتا، آئندہ اوراق میں ان ہی باتوں کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آپ کے سامنے آئے گی۔
 الغرض نام کے لحاظ سے تو میں نہیں کہتا، لیکن کام جو انجام پایا، اسکو دیکھتے ہوئے بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا
 ہے کہ تعلیمی و قدسی تحریک کے ساتھ ساتھ دیوبندیت ایک قسم کی معاشرتی تحریک بھی ہے، اور یہی بھی دینی ہی
 نہیں بلکہ مسلمانوں کے پس ماندہ طبقات کی دنیاوی، فلاح و صلاح میں بھی اس کا کافی حصہ ہے، اور بلوچیا یہ ہے،
 کہ گونا گوں پہلوؤں والی اس تحریک کا سرچشمہ نہ تو باضابطہ کوئی سوسائٹی تھی، نہ انجمن، بلکہ سیدنا الامام الکبیر اپنے
 چند راستباز مخلص رفقاء کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوئے، پھر جس کے ہاتھ میں ہر کام کی آخری باگ ہے،
 وہ اس کو آگے بڑھاتا چلا گیا، واللہ مقم نورہ ولو کما الکافرون۔

بتا چکا ہوں کہ ۱۸۶۱ء مطابق ۱۲۸۱ھ ہجری میں سیدنا الامام الکبیر سفر حجاز سے واپس ہوئے، اور
 ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۹۶ھ ہجری میں کل (۲۹) سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہو گیا، گویا ۱۸۶۹ء کے فتنہ
 کے بعد اٹھارہ سال سے زیادہ وقفہ آپ کو خالکدان ارضی پر قیام کا نہیں ملا۔ اٹھارہ سال کے اس
 وقفہ میں بھی جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔ یک سوئی کے ساتھ آپ کی سرگرمی اور مشغولیت کی مدت
 کم و بیش ایک عشرہ یا دس گیارہ سال کے قریب قریب ہے، لیکن اسی مختصر زمانہ میں اس ہمہ گیر
 تحریک کی صرف بنیاد ہی قائم نہیں ہوئی، بلکہ ہر جہتی حیثیت سے وہ اپنے تمام شعبوں میں ترقی کے
 خاص حدود تک آپ کی زندگی ہی میں پہنچ چکی تھی۔

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ ان ہی چند گنے چنے سالوں میں ہندوستان کے ایک بد بختانہ
 شقاقی و افتراتی سیلاب کے مقابلہ میں بھی آپ کو سینہ سپر ہونا پڑا، یعنی مناظرے کے نام سے
 مشاتمہ و مسابہ کا جو بازار سیاسی بازیگروں کی اندرونی دسیہ کاریوں کی بدولت اس ملک میں
 گرم ہوا تھا۔ اور پادریوں کے بعد یا ان کے ساتھ ساتھ ایک نیا محاذ پنڈت دیا ندر سرسوتی جی
 نے کھول دیا تھا۔ جیسا کہ آئندہ بتفصیل معلوم ہوگا، اپنی افتاد طبع کے برخلاف واقعات و حالات
 نے اس محاذ پر بھی آپ کو لاکر کھڑا کر دیا، کھڑے ہونے کے بعد دیکھنے والوں نے جو کچھ دیکھا تھا،
 اس کی یاد دلوں کو اسی وقت تک محو نہیں ہوئی ہے، ادرہ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ آپ کی ساری تصنیفی یادگاریں

بھی وقفہ کی اسی قلیل مدت میں تیار ہوئیں۔ لیکن اکثر و بیش تر حصہ یہ واقعہ ہے کہ اسی مختصر زمانہ میں قلم بند ہوا ہے، قدرتی کار فرمایوں کے ان ہی استثنائی مظاہر کو دیکھ کر کہنے والے نے کہا تھا کہ

لیس علی اللہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی واحد

وَنُیْسِرُكَ لِّلْيُسْرَىٰ کی تفسیر سچ پوچھئے تو اسی قسم کی ناقابل فہم سہولتیں اور آسانیاں ہیں، جن کی صحیح توجیہ عام واقعات و حوادث کی روشنی میں ہم نہیں کر سکتے۔ اور اب آپ کے سامنے اسی اجمال کی تفصیل الشارح پیش ہوگی۔ واللہ ولی الامر والوفیق۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

دارالعلوم دیوبند

اور اسکے

آغاز و تاسیس کی داستان

دیوبندیت کے نام سے اسلامی ہند کی جو تحریک جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تدریس و تعلیم کے مستقل اور خاص نظام ہونے کی حیثیت، یہی اس تحریک کا سب سے زیادہ نمایاں مشہور اور عام پہلو ہے، جس کی بنیاد دارالعلوم دیوبند کی مشہور عالم تعلیم گاہ پر قائم ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ دارالعلوم کے قیام و بناء کی ابتداء کا مسئلہ جب کبھی عوام ہوں، یا خواص کی مجلسوں میں چھڑا، یا چھیڑا جاتا ہے، تو ایک عمومی روایت جو زبان زد عام ہے، اسی کا تذکرہ کر کے سمجھ لیا جاتا ہے، کہ جو تاریخی سوال اٹھایا گیا تھا، اس کا یہی کافی دشمنی جواب ہے میرا

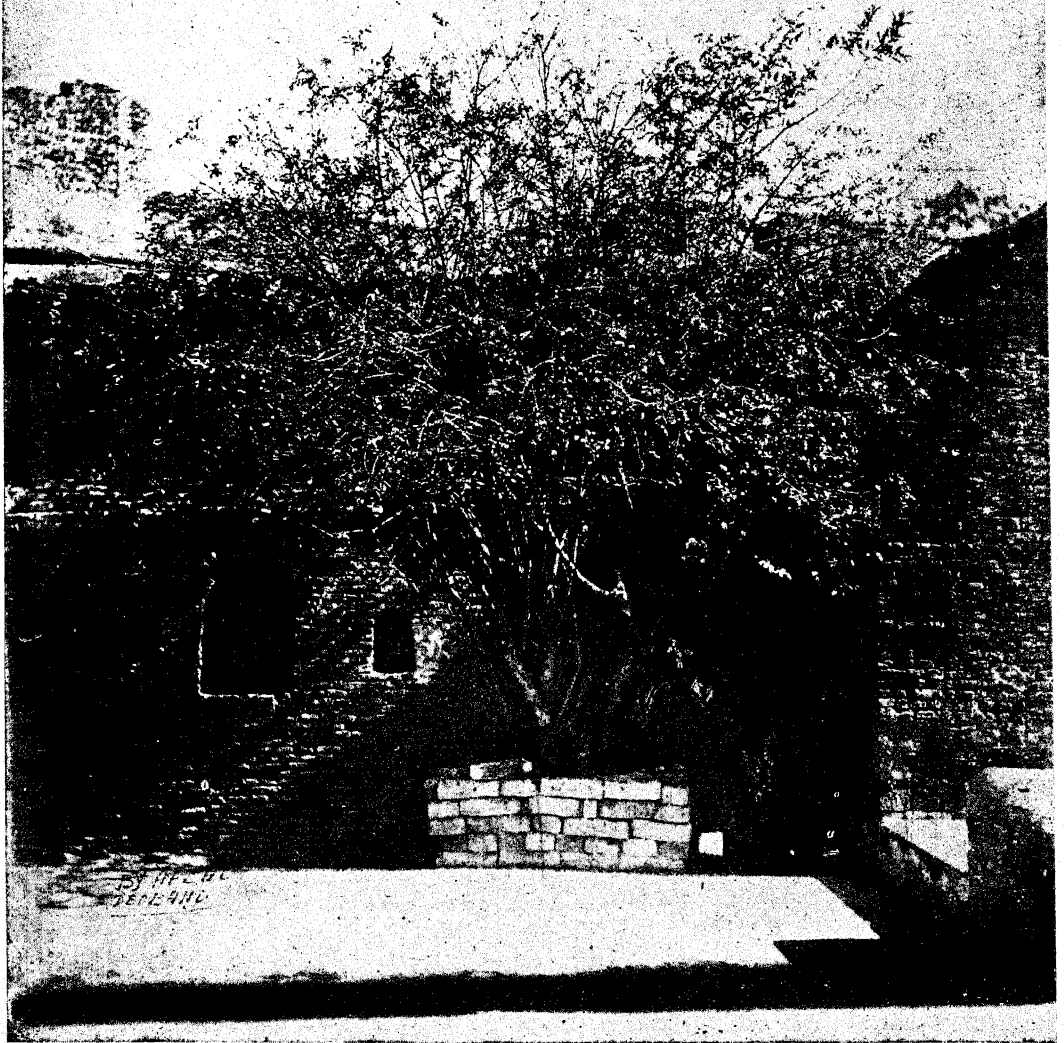
اشارہ

انار و محمود

والی مشہور روایت کی طرف ہے، دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والوں میں مشکل ہی سے کوئی ہوگا، جو انار و محمود کی اس داستان سے واقف نہ ہو، اور مزے لے لے کر اس قصہ کا ذکر نہ کرتا ہو۔

اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو خیال آتا ہے کہ پڑھنے کیلئے مسٹر ایچ طابق (۱۹۱۱ء) میں خاکسار جیے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا تو حجۃ کی مسجد میں یاد آتا ہے شرفی دیوار سے متصل انار کا ایک درخت تھا۔ پرانے طلبہ اسی درخت انار کی طرف اشارہ کر کے بتاتے تھے کہ اسی کے نیچے مدرسہ پہلی دفعہ کھلتا تھا۔ ملاحود اس کے پہلے مدرسہ پنڈرہ روپے ماہوار پر مقرر رہوئے تھے اور محمود (یعنی ہمارے زمانہ کے شیخ الحدیث و صدر دارالعلوم شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) اس کیلئے طالب علم تھے (باقی اگلے صفحہ پر)

پچھتہ کی مسجد (دوبوند) میں انار کا درخت جس کے نیچے مدرسہ دوبوند کا افتتاح ہوا



دیوبندی اس اسلامی درسگاہ کی ابتداء رکب ہوئی، اسی کا جو اسبازیتے ہوئے ہمارے مخدوم و
محترم فاضل گرامی، قدر سولہ ناسیدہ محمد یان صاحب ناظم حبیبۃ الدار اپنی مشہور و مقبول کتاب
”علماء ہند کا شاندار ماضی“ میں یہ درخشاں فرما لے گئے بعد کہ
”۵ احرار الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء تقریباً یوم پنجشنبہ، اسلامی ہند
کی تاریخ کا وہ مبارک دن ہے۔“

آگے ”انار و محمود“ والی حکایت لذیذ کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ
”تاریخ مذکور پر چند باخدا بزرگوں کا اجتماع ہوا۔ چند جمع کیا گیا، اور مسجد
چھتہ کے فرش پر

درخت انار

کی ٹہنیوں کے سائے میں ایک مدرسہ کا افتتاح ہوا۔“
”درخت انار کی ٹہنیوں کے سائے“ کے بعد یہ خبر دیتے ہوئے کہ

”چندہ کار مال پھیلا لے والا، اور سب سے پہلے چندہ دینے والا عابد تھا۔“

یہ ”عابد“ کس ذات گرامی کی تعبیر ہے۔ اس کی تفصیل آگے معلوم ہوگی، اس وقت تو ”حکایت لذیذ“
کے اس دوسرے جز ”لفظ محمود“ کا تذکرہ مقصود ہے، مولانا نے اسی جز کا ذکر ان الفاظ میں کیا
”سب سے پہلا متعلم محمود، اور متعلم بھی محمود“ ۶۵ حصہ پنجم (علماء ہند کا شاندار ماضی)

(گذشتہ صفحہ سے) ایک نوگزار نو عمر طالب علم ہونے کے باوجود خیال آتا ہے، دل میں اس وقت بھی دوسرہ ہوا
تھا کہ تقریباً نصف صدی تک انار کے درخت کا باقی رہ جانا، کیا عام حالات میں ممکن ہے، کیونکہ اس وقت تک تقریباً
(۴۴) سال مدرسہ کے قیام پر گزر چکے تھے۔ نصف صدی کے لئے کل تین سال کی ضرورت تھی، واللہ اعلم یہ وہی درخت
درخت تھا، یا کوئی نیا درخت اس کی جگہ لگا دیا گیا تھا، جسے طلبہ تاریخی درخت حرض کئے ہوئے تھے معلوم نہیں اب بھی ”درخت انار“
چھتہ کی مسجد میں موجود ہے یا نہیں۔ جذباتی حیثیت سے جی تو یہی چاہتا ہے کہ کاش انار کے اس درخت کو محفوظ رکھا جاتا،
لیکن بودہ کے مقدس درخت کے انجام کو دیکھ کر اب سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے بیعت رضوان والے
درخت کو کیوں کٹوا دیا تھا۔ ۱۲

(نوٹ) یہ درخت انار بنسب وہی ہے جس کا ذکر اس روایت میں کیا گیا۔ ہے اور آج تک محفوظ ہے۔ (محدث طیب غفرلہ)

ابھی اس سے بحث نہیں کہ بجائے خود اس روایت "کہنے" یا "حکایت" کی تاریخی قدر و قیمت کیا ہے، واقعات سے کس حد تک اس کی تائید ہوتی ہے، لیکن جہاں تک میرا احساس ہے، سننے والوں پر ابتدائی اثر اس قصہ کا یہ مرتب ہو گا کہ شروع میں شاید کسی مقامی مکتب کی شکل میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی، پھر رفتہ رفتہ کچھ سازگار موافق و مساعد حالات پیش آتے چلے گئے، تو جیسے دنیہ میں بہت سی چیزیں جو ابتداء میں چھوٹی تھیں، ان کو بڑا بن جانے کا موقع ملا گیا۔ کچھ یہی صورت حال دارالعلوم دیوبند کے ساتھ بھی پیش آئی ہے۔ ماسوا اس کے اس "تذید حکایت" کی دلچسپیوں میں لوگ کچھ اس طرح محو ہو جاتے ہیں، کہ "دارالعلوم دیوبند" اور اس کے تعلیمی نظام کے خصوصی پہلوؤں کے متعلق جن سوالوں کو اجاگر کر کے اٹھانا، اور ان ہی کی رد و مشنی میں جو اہل "گو حاصل کرنا چاہئے ان ہی سے توجہ آدمی کی ہٹ جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ بذات خود "تعلیم و تعلم" "درس و تدریس" کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے نہ کوئی نیا مسئلہ ہے، اور نہ عجیب بات، جس امت کے دین کی بنیادی آسانی کتاب "القرآن الحکیم" کی ابتدائی وحی میں اقراء (پڑھ) سے خواندگی کا مطالبہ کیا گیا ہو، اور سب سے پہلے اترنے والی اسی وحی میں علمہ بالقلل (سکھا یا قلم سے)، کی نعمت کا ذکر خدائی نعمتوں کے سلسلہ میں قراۃ اور خواندگی کے مطالبہ کے بعد کیا گیا ہو، انسانی فطرت کی سب سے زیادہ نمایاں اور اہم ترین امتیازی خصوصیت علمہ الانسان (مالم یعلم) یعنی سکھا یا خدائے "الانسان" کو وہ جسے وہ نہیں جانتا، دوسرے لفظوں میں جس کا مطلب یہی ہوا کہ انجانی باتوں کے جاننے اور جانتے چلے جانے کی فطری استعداد و صلاحیت جو آدمی میں پائی جاتی ہے اسی ابتدائی وحی میں اس پر بھی تنبیہ کی گئی ہے، الغرض نوشت و خواند کی ابتدائی منزل سے تعلیمی ارتقاء کے آخری مراتب و منازل اور ان کے امکانات ہی پر جس دین کا گویا سنگ بنیاد رکھا گیا ہو، بھلا اس دین کے ماننے والوں کے لئے یہ بھی کوئی اچھبہ کی بات ہو سکتی ہے کہ ان ہی کے بعض افراد نے کسی خاص مقام میں پڑھنے پڑھانے کا نظم شروع کیا تھا، عملاً مسلمانوں کی تعلیم و تدریس کا دامن تو اس تعلیمی چبوترے کے ساتھ وابستہ ہے جو مسجد نبوی میں آج سو

تیرہ ساڑھے تیرہ سو سال پہلے ”صفہ“ کے نام سے قائم ہوا تھا، بحمد اللہ اسی کا سلسلہ دنیا کے طول و عرض میں بغیر کسی انقطاع کے جاری رہا، اور امید ہے کہ قیامت تک انشاء اللہ تعالیٰ جاری رہے گا، اسی طرح تعلیم پانے والے طلبہ کے ساتھ سوا سوا دہمزدی اور ان کے طعام و قیام کا نظم بھی اسلامی دنیا کا قدیم رواج ہے، ”صفہ“ میں داخل ہونے والوں ہی سے اس رواج کی بھی ابتدا ہوئی اور بعد کو مسلمانوں نے جہاں کہیں وہ گئے، کسی نہ کسی شکل میں اس رواج کو قائم رکھا۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ”انارو محمود“ کی اس مقبول و مشہور سیرول عزیزہ و لذیذ حکایت میں جو کچھ بھی بیان کیا جاتا ہے، اس کا حاصل یہی تو ہے کہ تعلیم و تدریس کا انتظام دیوبند میں مختصر ترین یہاں پر کیا گیا تھا۔ لیکن کیا دیوبند کا تعلیمی نظام صرف اسی قدر ہے؟ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، وہ یہ جانتے ہیں کہ یوں تو تاریخ کے طویل و وسیع دور میں اس امت نے دنیا کے ان تمام حصوں میں جہاں جہاں وہ آباد اور توطن پذیر ہوئی، بڑے سے بڑے یہاں پر تعلیم کا نظم کیا۔ اور گو تعلیم و تدریس کے لئے مدارس کی مستقل عمارتوں کی تعمیر کو مسلمانوں نے ضروری تو کسی زمانہ اور کسی ملک میں نہیں قرار دیا تھا، بلکہ بڑی بڑی مسجدوں یا خانقاہوں کے سوا سبھی بات تو یہ ہے ابتدائی تعلیم کے منازل عموماً آباد کاروں کے مکانات، اور ڈیوڑھیوں ہی میں طے ہو جاتے تھے، دور کیوں جائیے، دیوبندی نظام تعلیم کے بانی اعظم و اکبر سیدنا الامام الکیسری کی تعلیم کا ابتدائی زمانہ جیسا کہ حضرت والا کے ذاتی حالات کے ذیل میں عرض کر چکا ہوں، اسی دیوبند کے ایک امیر (شیخ کرامت حسین دیوبندی یعنی حضرت والا کے خسر) کی ڈیوڑھی ہی پر نوگذا تھا۔ وہی ڈیوڑھی جو آج بھی دارالعلوم کے مشرقی گوشہ میں ”دیوان کی ڈیوڑھی“ کے نام سے کسی نہ کسی شکل میں کھڑی ہے، اسی ڈیوڑھی کے کسی حصہ میں ”مہتابی مکتب“ قائم تھا۔ جہاں دوسرے بچوں کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے باقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایام طفولیت و معصومیت میں ابتدائی تعلیم اپنے استاذ مولوی مہتاب علی صاحب مرحوم سے حاصل کی تھی اور اسی مکتب خانے میں عربی کی ابتدائی تعلیم آپ کو شروع کرائی گئی تھی۔

بہر حال باوجود اس اطلاقی نقطہ نظر کے یعنی کسی خاص شکل و صورت کے عمارتی قالب کے ساتھ تعلیم تدریس جیسی عام اور اہم ترین ضرورت کو متعذر کرنا مسلمانوں نے کسی زمانہ میں ضروری قرار نہیں دیا۔ بلکہ اس طرح جس جگہ بیٹھ گئے بس وہی میخانہ بنا

باہر ہمارے تاریخ ہی آپ کو بتائے گی کہ اسی قوم نے تعلیم گاہوں کے لئے بھی بڑی بڑی عمارتیں دنیا کے مختلف حصوں میں تعمیر کیں۔ آج بھی ان کی بچی کچھی یادگاریں دنیا کے مختلف حصوں اور گوشوں میں پائی جاتی ہیں۔ خاکسار نے بھی اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں ہندوستان کے بعض اہم تعلیمی ابوالوں کا تذکرہ کیا ہے۔ بعضوں نے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں۔ تاہم جہاں تک تلاش و تحقیق کا اقتدار ہے، عہد حاضر کا تعلیمی نظام جس سے مغرب نے دنیا کو روشناس کیا ہے اس میں جماعت بندی، امتحان خصوصاً تحریری امتحان، طلبہ کی حاضری کے رجسٹر اور ایزین قبیل دوسرے لوازم و خواص جن کے ایک بڑے حصہ کو دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نظام میں نہ صرف قبول ہی کر لیا گیا ہے، بلکہ پوری قوت و احتیاط کے ساتھ تعلیم کی ان جدید خصوصیات کی نگرانی بھی کی جاتی ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی عصری یونیورسٹیوں میں جتنا لحاظ و پاس ان امور کا کیا جاتا ہے، دارالعلوم میں بھی ان پر زیادہ نہیں تو کچھ کم توجہ نہیں کی جاتی، بلکہ کہا جاسکتا ہے، کہ امتحانی سوالات کے انشاء (اؤٹ ہو جانے) کا حادثہ عموماً بڑی سی بڑی یونیورسٹیوں میں کبھی کبھی جو پیش آ جاتا ہے، دارالعلوم کو تقریباً اپنی صد سالہ عمر میں اس حادثہ سے جہاں تک میں جانتا ہوں کبھی دوچار ہونا نہیں پڑا، جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تعلیم کی جدید خصوصیات جو عصری تقاضوں کی بنیاد پر دیوبندی نظام تعلیم میں جذب ہو چکی ہیں، ان کے آثار و لوازم کی حفاظت میں جو کامیابی دارالعلوم دیوبند کو میسر آئی ہے شاید وہ اپنی آپ نظر ہے، جس میں زیادہ دخل اس خلوص و ولایت کو ہے جو دارالعلوم کو کارکنوں کے کاروبار کی روح ہے۔ حتیٰ تو یہ ہے کہ گریہ اور بھارے پر کام کرنے والوں کو دارالعلوم کے کام کرنے والوں پر قیاس بھی نہ کرنا چاہئے۔ للاحب رجال وللقصۃ رجال

لہ عربی کی مشہور ضرب المثل ہے، یعنی کچھ لوگ جاں سپاری اور جنگ کیلئے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ صرف پیاسے کیلئے ۱۷

پس اصل سوال یہی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نظام میں موجودہ عصری جامعات اور یونیورسٹیوں کی خفہ و صیانت کے شریک ہونے کے اسباب کیا ہوئے؟ کیونکہ کچھ بھی کہا جائے ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ دارالعلوم سے پہلے مسلمانوں میں تعلیم و تدریس کا جو عام طریقہ مروج تھا۔ ان جدید خصوصیتوں کو ہم اس میں نہیں پاتے۔ افادیت و عدم افادیت کی بحث جداگانہ ہے۔ اس بحث سے اگر آپ کو دلچسپی ہو، تو خاکسار کی کتاب ”مسلمانان ہند کا نظام تعلیم و تربیت“ شائع کردہ ندوۃ المصنفین کا مطالعہ کیجئے۔

بہر حال جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے متعلق اس قسم کی باتیں کہ ابتداء میں کہاں کس حال میں قائم ہوا، جس کا جواب ”انارو محمد“ کی حکایت کو دہرا دہرا کر دینے والے دے دیا کرتے ہیں، ان سے زیادہ اہم یہی سوالات ہیں، شروع ہی سے ان کی طرف اشارے کرتا چلا آ رہا ہوں، آپ کو یاد ہو گا کہ ہندوستان کی نئی قائم ہونے والی حکومت نے جو مدرسہ عربک کالج کے نام سے دلی میں قائم کیا تھا، مدرسہ سے زیادہ کالج ہی کی خصوصیات و لوازم پر مشتمل تھا اور ان ہی عناصر پر اس کا مشتمل ہونا، قدرتی بات تھی۔ اسی عربک کالج کے صدر والاقدرد مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ سے ہمارے سیدنا الامام الکبیر بانی دارالعلوم نے تعلیم حاصل کی تھی، اور کیسی تعلیم؟ بجز علم حدیث کے عمومی طور پر عربی کی اعلیٰ نصابی کتابوں کے مولانا مملوک العلی ہی اُن کے استاد و حید تھے، الایہ کہ مفتی صدر الدین سے بھی کچھ پڑھا ہو، بعضوں نے تو اس کی تصریح بھی کی ہے۔ حضرت والا کے ذاتی حالات کے ذیل میں خاکسار نے بھی قرآن و قیاسات کی بنیاد پر مفتی صاحب کے استاد ہونے کی طرف اپنے ذاتی رجحان کو ظاہر کیا ہے، کچھ بھی ہو، سچی بات تو یہی ہے، جیسا کہ عربی کا مشہور مقولہ بھی ہے کہ

الاب واحد والا اعمام شتی | باپ تو آدمی کا ایک ہی ہوتا ہے، اور چچا بہت سے ہوتے ہیں۔

مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیتہ العلماء اپنی کتاب ”علماء ہند کا شاندار ماضی“ میں فرماتے ہیں کہ ”حجۃ الاسلام (یعنی سیدنا الامام الکبیر مولانا انور تو ہی) اور امام ربانی (مولانا رشید احمد صاحب) کے دوسرے استاذ جناب مولانا مفتی صدر الدین صاحب تھے“ ص ۵۷ ج ۵

اس مقولہ کی رود سے علمی اب اور تعلیمی پدر ہونے کی خصوصیت حضرت نانوتوی کے اعتبار سے مولانا ملوک العلی ہی کو حاصل ہے، یہ بارت کہ مولانا ملوک العلی سے سیدنا الامام الکبیر نے کالج میں شریک ہو کر تعلیم حاصل کی تھی، یا کالج سے باہر ان کی تکمیل ہوئی تھی، اپنا خیال اس باب میں جو کچھ تھا، اسے پیش کر چکا ہوں، لیکن کالج کے اندر ہو، یا باہر تعلیم تو آپ نے کالج کے استاد ہی نہیں، بلکہ صدر سے حاصل کی تھی، اور اسی زمانہ میں حاصل کی تھی، جب وہ یعنی مولانا ملوک العلی عربک کالج کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ایسی صورت میں سیدنا الامام الکبیر جیسی وقتاً و فطرت اور اخاذ طبیعت والے آدمی کے لئے اس تعلیم کے لوازم اور خصوصیات کا سمجھ لینا بھلا کوئی بڑی بات ہو سکتی ہے۔ کھیل کود کے قصوں میں جس کی نظر ان کے بنیادی اصول پر پڑتی تھی ان صبیانی ملاعب میں بھی طفولیت ہی کے ایام میں جو کلی قواعد پیدا کرتا ہو جس کی تفصیل مصنف امام کے حوالہ سے گذر چکی، پھر ہمہ گیر وہمہ پذیر دماغ کے ساتھ ساتھ حضرت والا کے سینے میں جو درخشاں دل تھا، مسلمانوں کی زبوں حالیوں جیسے خون کے آنسو رلا رہی تھیں، آج کون بتا سکتا ہے کہ اس درجہ سے نکلنے کے امکانی تصورات کے سلسلہ میں ان کی نظروں کہاں کہاں کن کن چیزوں پر پڑتی ہوں گی، تعلیمی تصورات کے سلسلہ میں کسی موقع پر حضرت والا کے اس حکیمانہ نظریہ کا ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی اس زمانہ کے علماء درس کی تعلیم کے انفرادی طریقہ تدریس کے متعلق یہ فرماتے ہوئے کہ علم کی کیفیت میں تو ترقی اسی طریقہ سے ہوتی ہے، لیکن علم کی وسعت، اور علماء کی مقدار و کثرت کے بڑھانے میں کامیابی کی واحد صورت یہی ہے کہ تعلیم کے قدیم شخصی و انفرادی طریقہ کی جگہ درس و تعلیم کے اجتماعی طریقہ کو اختیار کیا جائے۔ مسلمانوں کا شیرازہ بکھر چکا تھا، سیاسی مرکز ان کا ٹوٹ چکا تھا، ان کی اجتماعی شیرازہ بندی کے سلسلے میں اپنے تعلیمی نظریہ کے مطابق کوئی وہمہ ہو سکتی تھی، کہ عربک کالج میں اجتماعی درس و تدریس کے جس طریقہ کا آپ مشاہدہ فرما رہے تھے، اس سے استفادہ کی تدبیریں آپ کے دماغ مبارک میں نہ آئی ہونگی، سیدنا الامام الکبیر کے دست مبارک سے لکھی ہوئی ایک تحریر کا عموماً تذکرہ کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ دارالعلوم کو خزانے

حضرت نادر علی شاه آقا خان ابدی اور اساسی اصول

دہ اصول جن پر ہمہ مدرسہ اور نیز اور مدارس

چندہ مبنی معلوم ہوتی ہیں

جن پر از انعام و جود و مدد کی انتظامی بنیاد رکھی گئی

(۱) اصل اول یہ ہے کہ ہر مدرسہ کا کنگن اندر سے کوہمیشہ تخریجہ بہ نظر ہی آپ گنہش کریں

اور ہر کسی کو اس میں خیر اندیشی نہ رہے کہ ہمیشہ ملحوظ رہی

(۲) ابقاء انعام طلبہ علم افزائش طعام طلبہ میں صلح ہوگی خیر اندیشی نہ رہے کہ ہمیشہ علم میں

(۳) مسٹر ان مدرسہ کو ہمیشہ مہمات ملحوظ رہی کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو۔ اپنی بات

کی بچ لکھائی خدا کو ترسنے جب اس کی فوٹہ انگلی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخافتہ رای اور اور زکی ہای

کی موافق ہونا اور ہر توبہ کر اس مدرسہ کی بنا بریں تر لرزل آقا کیلک احقرہ تہ دل سی بردقت شہرہ

اور نیز اس کی پیش ہی اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہی سختی بروری ہو اور اس میں ضروری اہل مشورہ

انعام راہی ہی کیسہ ہستی متعلق نون اور سب معین بہ نیت نیک اور کو کسین معنی نہ خیال ہی کہ اگر مدرسہ

بات سمجھ میں آجاتی ہو اگر چہ جاری مخافتی ہو بخیر بدل جان قبول کریں گی اور نیز اس کی

ضروری کہ مہم امور مشورہ ملت اہل مشورہ سی ضرور مشورہ کیا کری خواہ وہ لوگ ہوں یا جوہر

میسر مدرسہ مہم کی ہا کوئی دارد صادر جو علم عقل کتاب اور مدرسہ کا خیر اندیشی ہو اور نیز

کیسہ سی ضروری کہ اگر اتفاقاً کیسہ کی کسی اہل مشورہ کی فوٹہ آئی اور ہر ضروری

کیسہ سی ضروری کہ اگر اتفاقاً کیسہ کی کسی اہل مشورہ کی فوٹہ آئی اور ہر ضروری

کیسہ سی ضروری کہ اگر اتفاقاً کیسہ کی کسی اہل مشورہ کی فوٹہ آئی اور ہر ضروری

این مؤصلی معتقد است که کسی که مؤصلی را بر تو پیرده یعنی مؤصلی را بر تو پیرده که مؤصلی را بر تو پیرده
اگر مستحق کسی نباشد تو پیر بر این مؤصلی مستحق نشستی

(۴) سید ابی طالب حضرت علی که در سنین مدرسه با هم متفق الشرب چون در مثل علی در زکار

خود بین او در سر زنی ادبی نمیشد چون خداوند است حبس می نمود تا سگی تو پیر بر سر کسی خورده

(۵) خواندن مقرره اگر اندازسی جو بی تو بر تو صلی می یا بعد من گویا در انداز سوره کسی تو بر تو صلی
هر جای کاری در نه سید مدرسه اول تو خوب آباد شوگا و در اگر شوگا تو سفینه هوا

(۶) کسی مدرسه من جنگ استی کی لوی بسیل یقینی جنگ سید مدرسه است و در سبط

تو صلی سید سبط علی علی او در اگر گویا استی سید یقینی حاصل گویا صلی علی سید یا کارخانه
تجارت یا کسی سید علم القول کا و عده تو پیر لوی نظر اناسی که سید حوت در حاد و سید

بوجه الی العسی فانه کسی جاتا بر سید او را در غسی مؤلف هوا علی او را در گویا

با هم نزاع پیدا هوا علی العقد استی او در غیر دغیره من انکسیر کی کی بر گویا مؤصلی

(۷) سرکار کی سرگشته او را در اکی سرگشته بسی زیاده مضر معلوم بودی

(۸) تا معتقد را بسی او را در جبهه زیاده موجب بر گشته معلوم نهایی جنگی جبهه جنگی

امید با مؤصلی او را در جبهه حسن نیست اهل جبهه زیاده یا مؤصلی کاسانی معلوم نهایی

میں یہ تحریر اس وقت تک محفوظ ہے۔ بدقسمتی سے براہ راست اس کی زیارت کی سعادت اس فقیر کو میسر نہیں آئی ہے۔ لیکن یہ تو اتنے بزرگوں سے یہ سنتا رہا ہوں کہ اس تحریر خاص میں سیدنا الامام الکبیرؑ بطور وصیت نامہ کے ان بنیادی کلیات کو قائم بنا دیا ہے جن پر آپ نے اس دارالعلوم کی بنیاد قائم فرمائی تھی اور وصیت فرمائی گئی ہے کہ اُسند جن لوگوں کے ہاتھوں میں دارالعلوم کے نظم و نسق کی باگ آئے، وہ ان کلیات کی روح کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجلہ ”القاسم“ کے دارالعلوم نمبر چھ بیست و تین کے حوالہ سے اسی ”تحریر خاص“ کے مشتملات و مضامین کو نقل کرتے ہوئے، ناظم مرکزی جمعیتہ العلماء (دہلی)، مولانا سید محمد میاں صاحب نے ”علماء ہند کے شاندار ماضی“ میں منجملہ دوسری دفعات کے ایک دفعہ کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ

”اس کا (یعنی دارالعلوم کا) تعلق عام مسلمانوں سے زائد سے زائد ہو، تاکہ تعلق خود بخود مسلمانوں میں ایک نظم پیدا کرے، جو ان کو اسلام اور مسلمانوں کی اصل شکل پر قائم رکھنے میں معین ہو۔“

آگے اسی مقصد کی تفصیل فرماتے ہوئے آخر میں ارقام فرمایا گیا ہے کہ دارالعلوم کا مسلمانوں سے ”جمہوری تعلق ہو، جو ایک کو دوسرے کا محتاج بنائے رکھے“

اسی بنیاد پر آپ نے دارالعلوم کے لئے آمدنی کے کسی مستقل ذریعہ کے قائم کرنے کے خلاف یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ عام مسلمانوں سے چاہئے کہ اس مدرسہ کا احتیاجی رشتہ بیستہ قائم رہے، حکومت یا کسی رئیس کی دوائی امداد یا مستقل جائداد کی صورت میں عام مسلمانوں سے احتیاجی رشتہ دارالعلوم کا باقی نہ رہے گا۔

سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بعض سننے والوں نے یہ الفاظ سنے تھے یعنی فرمایا کرتے تھے کہ

دارالعلوم اس وقت تک مستقل رہے گا، جب تک اس کی آمدنی غیر مستقل رہے گی۔ لیکن جس وقت

اس کی آمدنی کا ذریعہ مستقل ہو جائے گا، اسی وقت دارالعلوم کی بنیاد غیر مستقل ہو جائے گی۔“

مولانا سید محمد میاں صاحب مظلّم نے بھی اصل علما کے عنوان سے یہ فقرہ نقل کیا ہے جسے حضرت املا کی طرف (باقی صفحہ پر)

خود براہ راست اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ سے خاکسار نے بھی بنار دارالعلوم کے متعلق قریب قریب کچھ اسی قسم کے الفاظ اس وقت سنے تھے، جس زمانہ میں یہ اختلاف رونما ہوا تھا کہ تعلیمی کاروبار کے سوا سیاسیات سے بھی مدرسہ کا کون تعلق رکھا جائے، یا نہ رکھا جائے۔ تنصیلاً اس قطعہ کا ذکر مجلہ دارالعلوم کے اس مضمون میں کر چکا ہوں جو

احاطہ دارالعلوم کے جیتے ہوئے دن

کے عنوان سے متعدد شماروں میں مسلسل شائع ہوا ہے، اور شیخ کے مقولہ کی حد تک رسکا تذکرہ ان اوراق میں بھی آکر آیا ہو، اور سچ تو ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کو ”دلی عربک کالج“ کے ماحول سے گزرنے اور تعلیم جدید کے لوازم و خصوصیات کے تجربہ و مشاہدہ کا موقعہ اگر نہ بھی ملتا، تو ان کی ”عجبریت“ اور فکر و نظر کے جس قدرتی ”ملکہ فائتہ“ سے وہ خطرہ سرفراز کئے گئے تھے، خود وہی پیش آنے والی مشکلات سے عہدہ بڑھونے کی کافی ضمانت تھی، مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی، اور آئندہ ان کو دینی زندگی اور دینی علوم سے منحرف کرنے کی کوششیں اس ملک میں جو یہور ہی تھیں، ان کے مقابلہ کے لئے مسلمانوں میں دینی علوم کی عبوریت کے لئے کیا کرنا چاہئے، اور نئے حالات کی رو سے تعلیم و تدریس کے نظام میں کن اصلاحات کی ضرورت ہے، ان مسائل کے حل کے لئے خود ان کا دماغ کافی تھا، اسے قدرتی تیسیر ہی کی ایک شکل سمجھنا چاہئے، کہ ”دلی عربک کالج“ کے ماحول میں ”نظریات“ کو ”عملی قالب“ میں دیکھنے، اور برتے جانے کے مواقع بھی ان کے لئے آسان کئے گئے۔

جس وقت ”شاعلی“ کے میدان سے وہ خود اور ان کے رفقاء کا رنڈا ہر ناکامی کے ساتھ واپس

(گذشتہ صفحہ سے) براہ راست منسوب کیا گیا ہے یعنی اسی وصیت، نامہ میں ہے کہ

”اسی مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی مستقل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توبہ الی اللہ اسی طرح جلتا رہیگا“ اور اگر کوئی آمدنی لیج یقینی حاصل ہوگئی جیسے جائیداد یا کارخانہ، تجارت، یا کسی امیر محکم القدر کا وعدہ تو یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوفِ جا جو سرایہ جوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہیگا، اور اندھا دینی موقوف ہو جائیگی، کارکنوں پر باہم نزاع پیدا ہو جائیگا۔“ چنانچہ

اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ عام مسلمانوں کے ساتھ احتیاجی رشتہ کا دائمی مطلب کیا تھا۔ سچ پوچھئے تو ”رجوع الی اللہ“ کا یہی واحد ذریعہ اور اسی کی یہ ایک گونہ تعبیر ہے۔ ۱۲

ہوئے۔ یقیناً ان کی یہ واپسی یاس اور نامرادی کی واپسی نہ تھی، اور نہ ہو سکتی تھی۔ ایران و سکینت، ایقان و طمانینت کی جن لاپرواہیوں سے خود اچھا اور اچھے رائے کی کہیں اور دل لب ریز و معمور تھے، ان لاپرواہیوں کے ساتھ بھلا قنوط و یاس کے غیر ایمانی جذبات کا کوئی تصور بھی کر سکتا ہے، واپس تو وہ بیشک ہوئے تھے، لیکن یقیناً یہ واپسی

متحرقات القتال و متحیرات الی | جنگ ہی کے لئے کتراتے ہوئے، یا کسی ٹولی سے
فئة الانفال | ملنے کے لئے

... .. ہو سکتی تھی، یقیناً اسی کے لئے تھی بھی، جس کی تصدیق آپ کے آئندہ اقدامات اور فاعلی مجاہدات سے ہوتی ہے۔

شہرہ کی کش مکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ کا دماغ مصروف ہو گیا۔ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام، اسی لمحہ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی وجوہی عنصر تھا، وہ مشہور روایت یعنی شاملی کے میدان کے امیر جہاد میدان حاجی املا اللہ المہاجر المکی رحمۃ اللہ علیہ اس زمانہ میں جب آپ مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے۔ اور ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند کا افتتاح ہو چکا تھا، غرض کرنے والے نے جب یہ عرض کیا کہ

”ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اسکے لئے دعا فرمائی جائے۔“

بیان کیا جاتا ہے کہ سینے کے ساتھ شاملی کے میدان کے امیر جہاد یہ فرماتے ہوئے کہ

”سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں، ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے“

اس اطلاع سے سرفراز فرمایا تھا کہ

”یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں، اوقات سحر میں سر بسجود ہو کر گزر گئی رقی رہیں، کہ خداوند اہل ہندوستان

میں بقادر اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔“

اور اسکے بعد اصل واقعہ کا اظہار حاجی صاحب نے ان الفاظ میں فرمایا کہ

”یہ مدرسہ (یعنی دارالعلوم دیوبند) ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ (ادراخ ثلثہ و طہار ہند کا شاندار ضعی)

جس کا مطلب بجز اس کے ادا کیا ہو سکتا ہے کہ شامی کے میدان سے واپسی کے بعد سوچنے والوں نے نہ تو بایوس ہو کر سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا، اور نہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وہ بیٹھ گئے تھے، بلکہ ”بقادر اسلام اور تحفظ علم دین“ کے نصب العین کو آگے بڑھانے کے لئے ان کے دماغ بھی مصروف فکر و نظر تھے، اور ان کے قلوب بھی کائنات کی مرکزی قوت سے ڈانگے۔ ”غیبی لطیف“ کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے، امامت اور قیادت (لیڈری) میں یہی اصولی فرق ہے کہ قیادت میں صرف دماغ کام کرتا ہے، اور امامت میں دماغ کے ساتھ دل پر بھی زور دیا جاتا ہے، بلکہ کامیابی کی ”حقیقی کلید“ دل ہی کے کاروبار کو یقین کیا جاتا ہے، ”ہد“ کے میدان میں صف بندیاں بھی ہو رہی تھیں، ہر قسم کے ہتھیار کو استعمال کے مواقع اور مقامات بھی متعین کئے جا رہے تھے۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ اسی کے ساتھ خدا کے سب سے بڑے بندے کی پیشانی مبارک خاک پر بھی پڑی ہوئی تھی، سننے والے سن رہے تھے کہ السموات والارض کی ملکوت و بادشاہت جس کے ہاتھ میں ہے، جس کے حکم ادا ذن کے بغیر اس کی پیدا کی ہوئی دنیا میں کوئی چیز شریک ہی نہیں ہو سکتی تھی، اسی سے عرض کیا جا رہا تھا۔

اللهم ان تملک هذا العصابة من
 اهل الاسلام لا تعبد فی الارض (صحاح) } آپ پھر بوجہ نہ جائیں گے۔
 اے اللہ اہل اسلام کی یہ ٹولی اگر تباہ ہو گئی، تو زمین پر

بہر حال لوگ سوچتے نہیں ہیں، ورنہ وہی واقعہ جس کا ذکر کچھ دیر پہلے کر چکا ہوں، یعنی شامی کے میدان سے واپسی کے بعد امیر بیوت حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ مشرقی پنجاب کے ایک قصبہ سے دوسرے قصبہ، اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں منتقل ہوتے ہوئے جس زمانہ میں عرب پہنچنے کی کوشش فرما رہے تھے، تو جیسا کہ مصنف امام نے یہ اطلاع دی تھی کہ دشت نوردی کے ان ایام میں بھی سیدنا امام الکبیر اپنے امیر و پیر و مرشد سے، صرف مراسلاتی ربط ہی نہیں قائم کئے ہوئے تھے، بلکہ ان سے شفا ہائے ملنے کے لئے ایک دفعہ نہیں، بلکہ بقول مصنف امام ”بوڑیہ، گتملا، لاڈوہ، پنجلاسہ، جٹاپار کئی دفعہ گئے آئے“ ۳۳

ظاہر ہے کہ فتنے کے ان تاریک دنوں اور نازک ترین ایام میں حضرت والا کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ صرف

پیر و مرشد کی قدم بوسی کے حصول برکت و سعادت ہی کی حد تک کیا محدود تھا؟ یا محدود رہ سکتا تھا؟ بظاہر ایسی فاش شکست کے بعد مامور کی اپنے امیر کے ساتھ بار بار کی یہ ملاقاتیں، یقیناً صرف گوئی بہری خشک ملاقاتیں بن کر نہ رہ سکتی تھیں، اور نہ واقع میں ان ملاقاتوں کی یہ نوعیت تھی۔ دعا ہائے محرکات ہی اور نالہ ہائے نیم شبی جنھیں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی ایک ”پیشانی“ کی طرف نہیں، بلکہ ”پیشانیوں“ کی طرف منسوب کر رہے تھے، ان ”پیشانیوں“ میں کم از کم ان دونوں ”امیر و مامور“ ”پیر و مرید“ کی ”پیشانیوں“ کو تو بہر حال شریک ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔

سیدنا الامام الکبیر اس کے بعد جس تک آپ سن چکے، روپوشی کے ایام میں خود حجاز پہنچ جاتے ہیں۔ ”امیر اور مامور“ کے باہمی اجتماع کی یہ صورت، کیا صورت ہی بن کر رہ سکتی تھی، جس کے اندر ہم فرض کر لیں، بلاوجہ فرض کر لیں کہ کوئی ”معنی“ نہ تھے۔

الغرض واپس ہونے والا جب واپس ہوا تھا تو کسی نئے محاذ ہی کے قائم کرنے اور اس ”قنۃ“ یا جماعت سے رشتہ اتصال و ربط کو درست کرنے ہی کے لئے واپس ہوا تھا۔ جس کے اجتماع شیرازے کو درہم دہرہم کر کے چاہا جا رہا تھا کہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا جائے، جس کتاب کو اس نے خدا کی کتاب مانا تھا، اور اس کے احکام کو خدا کا حکم یقین کرتا تھا، اس کا مطالبہ بھی یہی تھا، اور جن لوگوں کے ساتھ وہ واپس ہوا تھا، ان کے بڑوں اور چھوٹوں کے متعلق بھی ہم اس کے سوا اور کچھ نہیں سوچ سکتے کہ اس قرآنی مطالبہ کی تفصیل و تکمیل ہی کے لئے وہ واپس ہوئے تھے۔ خود اس کے بلند عزائم، اور وسیع حوصلوں کا اقتضا بھی یہی تھا۔

پس واقعہ یہی ہے کہ دیکھنے والوں نے شہداء کے ہنگامہ رست و خیز کے دھیمے پڑ جانے کے بعد اس کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھا، بذات خود اس کے لئے اور واپس ہونے والے ساتھیوں کے لئے یہ سب کچھ دیکھا بھلا تھا، ایک طے شدہ لائحہ عمل تھا۔ اپنے اپنے وقت پر اسی کے فیصلے علی غالب اختیار کرتے چلے جاتے تھے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ مصلحت الہیہ اور ”اجل مسمیٰ“ کا اٹل قانون ہندی مسلمانوں کے اندر اس کے قیام کی مدت کو اگر حد سے زیادہ مختصر نہ کر دیتا، تو

دیکھنے والوں کو خدا ہی جانتا ہے، وہی کیا کیا کر کے دکھاتا، جس کا قصورنا بہت تذکرہ آئندہ اوراق میں بھی کیا جائے گا۔

تاہم اس نے دکھانے کی ابتدا جس انداز سے کی اس کا اجمالی خاکہ اس واقعہ سے ذہنوں میں آسکتا ہے جو خاکسار نے ملا واسطہ سیدنا الامام الکبیر کے سچے وارث اور جانشین الاستاذ الکرم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، اور اس کا اجمالی تذکرہ پہلے بھی اسی کتاب میں کسی موقع پر کر چکا ہوں کہ میں حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم تھے) کے فرستادہ کی حیثیت سے حضرت الاستاذ شیخ الہند کی خدمت میں حاضر ہوا، اور بطور پیغام رساں حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کا صحیح سیاسی مسلک کیا ہے؟ یہ پیغام سناتے ہی میں نے دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہے، اور ارشاد فرمایا:

”حضرت الاستاذ (حضرت نانوتویؒ) نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس، تعلیم و تعلم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، شہ کے ہنگام کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ شہ کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔“

آخر میں ارشاد فرمایا

(صرف) تعلیم و تعلم درس و تدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے۔ میں ان کی راہ میں مرگم نہیں ہوں۔ لیکن اپنے لئے تو اسی راہ کا انتخاب میں نے کیا ہے جس کے لئے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا۔

مدرسہ دیوبند کی یہی وہ اساسی خصوصیت تھی جس نے اس مدرسہ کے تمام کاروبار حتیٰ کہ تعلیم میں بھی ایسی ہی حریت پر و خصوصیات پیدا کیں، اور وہ دینی اور مذہبی حمیت و غیرت کا ہندگیر ہی نہیں، عالمگیر جامعہ اور اقامتی ادارہ بن گیا۔ اس کے فضلا کا ایک خاص مکتب خیال نمایاں ہوا، اور اس کے مستفیدین ایک لیا خاص بلا جلا اور مرکب نصب العین لیکر باہر نکلے جس میں سب پر مچا جاسکی

اس واقعہ کی مزید تفصیل میں نے اپنے مضمون ”احاطہ دارالعلوم“ میں کی ہے۔ متعلقہ قسط بائیں ”دارالعلوم“ باب ۱۰، ج ۱، ۱۳ میں شائع ہوئی ہے۔ ۱۴

اسپرٹ موجود تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اساسی خصوصیت حضرت والا کے سوا کسی کے سامنے نہ تھی اور نہ ہی ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو اس وقت سامنے تھے، ہر ایک سے اتنی بلند نظری کی توقع ہی کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ سیدنا الامام الکبیر کی مجلس انس کے سب سے پہلے اور اہم رکن حاجی سید محمد عابد صاحب تھے جن کی بزرگی ہی کا نہیں دانشمندی اور اصابت لئے کا بھی اس زمانہ میں خاص شہرہ تھا۔ جیسا کہ آگے آ رہا ہے لیکن وہ بھی باوجودیکہ اجراء مدرسہ میں سیدنا الامام الکبیر کے دست راست ثابت ہوئے مگر اس تصور سے خالی تھے۔ مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیتہ العلماء ہند نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ

”اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دارالعلوم کے پرشکوہ تصور سے حضرت حاجی صاحب (حاجی محمد عابد صاحب) کا ذہن خالی تھا۔ (علماء ہند کا شاندار ماضی ص ۱۷۱)

کسی موقع پر الاستاذ اکبر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے خود سنا ہوا فقرہ اس کتاب میں نقل کر چکا ہوں جو افادہ ثلاثہ میں بھی منقول ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی موجودہ پرشکوہ عمارتوں کے متعلق حضرت مدظلہ

۱۔ دیکھو سوانح قاسمی جلد اول ص ۱۹۹ ۱۲

۲۔ مولانا محمد میاں صاحب نے اس دعوے کی دلیل میں جو واقعہ شاندار ماضی میں پیش کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے جو میں نے اپنے حیدر دہرگوں سے سنی ہے کہ مدرسہ جاری ہو چکا تھا، لیکن اس کی کوئی مستقل عمارت نہ تھی۔ کہ ایہ کے مکانوں پر تعلیم دی جاتی تھی۔ جب سلسلہ تعلیم بڑھنے لگا اور مکان کی تنگی محسوس ہوئی تو حضرت نانوتوی رح کی رائے یہ ہوئی جس کے مؤید مولانا محمد یعقوب صاحب ہیں، حضرت گنگوہیؒ اور حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری بھی تھے کہ مدرسہ کی کوئی اپنی مستقل جگہ اور عمارت ہونی چاہئے۔ (جیسا کہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ نے ضمیمہ روداد مدرسہ بابت ص ۱۳۱ میں ظاہر فرمایا ہے)، حاجی صاحب نے اس کی شدت سے مخالفت فرمائی کہ کیا ضرورت اتنے مصارف کی، مسلمانوں کا پیسہ ضائع ہو گا۔ جامع مسجد کی سہ دریاں اور جرے اس کے لئے بالکل کافی ہیں لیکن بقول حضرت شیخ الہند رح کے کہ حضرت والا کے سامنے مدرسہ کا روشن مستقبل تھا، اسلئے انہوں نے فرمایا کہ حاجی صاحب مدرسہ کے لئے اگلی ہی جگہ مناسب ہے۔ مسجد میں مدرسہ کا ہونا بہت سے مشکلات اور دشواریوں کا باعث ہو گا۔ یہ طلبہ کی قوم آزاد قوم ہوتی ہے۔ کبھی شکایت ہو گی کہ مسجد کے لوٹے ٹوٹ گئے کبھی فریاد ہو گی کہ مسجد کی صفیں گم ہو گئیں لائٹیں نہ ہیں۔ غرض اس قسم کی بیسیوں مشکلات پیش آئیں گی۔ اس لئے مدرسہ کا مسجد سے الگ اپنے ہی (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

نے فرمایا کہ

”حاجی صاحب (حاجی محمد عابد صفا) کے سامنے دارالعلوم کا وہ مستقبل نہ تھا جو حضرت اشاذ (حضرت نانوتوی)

کو نظر آ رہا تھا۔ انکی فراسمت کے سامنے یہ کتب مدرسہ اور پھر مدرسہ سے دارالعلوم ہونے والا تھا۔“

بہر حال مدرسہ کے اجراء و قیام کی حد تک وہ اپنے اور اپنے رفقاء کار کے اسی طے شدہ لائحہ عمل کے ساتھ نئے محاذ کے کھولنے کیلئے صرف صالح اور قابل زمین کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ دینی تعلیم کا اجتماعی نظام جس میں عصری

(گذشتہ صفحہ سے) مکان میں رہنا مناسب ہے۔ مگر حاجی صاحب نے اس لائے کو تسلیم نہ کیا۔ آخر کار حضرت والا نے لوگوں سے فرمایا کہ مکان مدرسہ کیلئے اشتہار جاری کر دیا جائے۔ اس اشتہار میں اس کا تذکرہ نہ ہو کہ مدرسہ کا مکان الگ بنے گا یا مسجد میں رہے گا۔ یہ وقت پر طے ہوتا رہیگا۔ اتنے عرصے میں حاجی صاحب بھی انشاء اللہ موافقت فرمائیں گے۔ چنانچہ اشتہار جاری ہو گیا اور اس میں عام مسلمانوں کو دعوت دی گئی۔ جمہور کا دن سنگ بنیاد رکھنے کا طے ہوا اور ہر دگرگرم یہ تھا کہ بعد نماز جمعہ حضرت دالا وعظ فرمائیں گے اور ختم وعظ پر یہ سارا مجمع شہری اندیسرونی حضرات کا جائے مقررہ پر پہنچ کر سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں شرکت کریں گے۔ چار دائرہ کے حساب سے زمین کا معاملہ طے ہو چکا تھا۔ چنانچہ حسب ہدیہ گرام عمل ہوا۔ اطراف و اکناف کے لوگ جمع ہوئے، اور حضرت کے وعظ کی وجہ سے لوگوں کا ہجوم اور بھی زیادہ تھا۔ وعظ ہوا، اور ختم وعظ پر حضرت نے فرمایا کہ جائے بنیاد پر سب حضرات چلیں تاکہ سنگ بنیاد رکھ دیا جائے۔ یہ سنتے ہی حضرت حاجی صاحب نے غصہ کی آواز میں زور سے فرمایا، ہائیں؟ یکا؟ حضرت نے فرمایا کہ حاجی صاحب یوں ہی مناسب ہے۔ آپ تشریف تو لے چلیں۔ فرمایا، کیوں چلوں؟ کیا ضرورت ہے اس اسراف کی؟ اذکیوں یہ بیکار آنا بڑا بار اٹھایا جا رہا ہے؟ یہ الفاظ حضرت حاجی صاحب نے غصہ سے بھرائی ہوئی آواز میں فرمائے۔ حضرت نے فرمایا حاجی صاحب آپ وہ چیز نہیں دیکھ رہے ہیں جو مجھے نظر آ رہی ہے۔ یہ مدرسہ بڑھنے والی چیز ہے۔ اس پر حاجی صاحب نے پھر زور سے انکار ہی میں جواب دیا حضرت نے فرمایا حاجی صاحب کو اختیار ہے سب صاحب چلیں اور سنگ بنیاد رکھیں۔ حاجی صاحب تو جامع مسجد سے روانہ ہو کر چھتہ کی مسجد میں اپنے حجرہ میں جا بیٹھے اور یہ مجمع اور ہجوم حضرت کے ساتھ مدرسہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب اس جگہ پہنچے جہاں مشرک پر مدرسہ کا موجودہ ڈھانڈا واقع ہے۔ مجمع کو روک کر حضرت دالا نے فرمایا، کہ آپ لوگ یہاں ٹھہریں، میں ابھی حاضر ہوا اور یہاں چھتہ کی مسجد میں پہنچے اور حاجی صاحب کے حجرہ میں پہنچ کر فرمایا۔ اچی حاجی صاحب آپ تو ہمارے بڑے اور بزرگ ہیں، اہم سب آپ کے چھوٹے ہیں۔ بھلا ہم آپ کو کیا آپ ہمیں چھوڑ سکتے ہیں، اور یہ کہ حاجی صاحب کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ اس طرز عمل کا حاجی صاحب پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ بے اختیار رو پڑے اور اتنا کہ آواز نکل نکل گئی۔ انتہائی کسری سے فرمایا مولانا میر تقی میر کا یہ شعر کہ ہے جو آپ فرما رہے ہیں حضرت کجا حاجی صاحب کو اٹھا کر لے گیا، اور لیکر جائے بنیاد پہنچے۔ مجمع ان دونوں بزرگوں کو آتے ہوئے دیکھ کر بے حد مسرور ہوا سائے مجمع میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، اور پھر سب نے لکڑہر لکڑہر کی بنیاد رکھی جو دارالعلوم کی سب سے پہلی عمارت ہے۔ محمد طیب غفرلہ

اقتضاؤں کی تکمیل کا بھی سامان کیا جائے۔ اس کے اسی لائحہ عمل کا اہم ترین جز، بلکہ قالب کے لحاظ سے سب کچھ وہی تھا کہ نئے محاذ کا یہ نیا قالب یا ”عملی مرقع“ کہاں قائم ہو۔ یہ سوال تھا جس کا جواب ڈھونڈھا جا رہا تھا۔ بیعت جہاد کے امیر حضرت حاجی صاحب نور اللہ ضریحہ کی جس اطلاع کا تذکرہ ابھی گذرا، راوی کا اسی روایت کے سلسلہ میں یہ بیان بھی تھا کہ آخر میں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ

”یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گردانہ یہ کو یہ سرزمین لے اڑی“ چچ (علماء ہند کا شاندار ماضی)

اسی روایت کے بعض طریقوں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے، کہ بجائے دیوبند کے ”نئے محاذ“ کے لئے دلوں میں تھا نہ بھون، نانوتہ، اور اسی قسم کے دوسرے مقامات کے ترجیحی خطرات بھی گذرتے تھے۔ اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، دیوبند میں اس ”نئے محاذ“ کی بنیاد ڈالنے کے بعد علاوہ دیوبند کے مراد آباد، ملکنہ، تھانہ بھون وغیرہ میں اس کی شاخیں میدانِ الہام الہامی کے فضاء کے مطابق کھلتی چلی گئیں۔ ناظمِ جمعیۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب نے مراد آباد کے ایک بزرگ مولانا سید غالب علی کے حوالہ سے یہ فقرہ اپنی اسی کتاب ”علماء ہند کے شاندار ماضی“ میں جو نقل فرمایا ہے، کہ ”دارالعلوم دیوبند، مدرسہ شاہی مراد آباد، مظاہر العلوم سہارنپور کو آپ ان اسکولوں اور مدرسوں کی طرح نہ سمجھیں جن کو اتفاقیہ طور پر قائم کر لیا جاتا ہے۔“

اس کے بعد اپنے پیرو مشد قاضی محمد اسماعیل رحواپنے وقت کے ارباب کشف و الہام میں شمار ہوتے تھے، کا یہ قول بھی مولانا سید غالب علی دہرات کے

”یہ مدارس خاص الہامات کے بموجب قائم کئے گئے ہیں“ ملاحظہ ۵

۱۔ اپنے عجب آقا اور پیشوا صلی اللہ علیہ وسلم کی راہوں پر چلنے والے بلکہ ان ہی پر مرٹنے والے راستہ باز و دفا کیش غلاموں کے اس واقعہ کو بڑھتے ہوئے اگر آفا کی وہ بات یاد آ جائے کہ کد کو چھوڑ دینے کے بعد کہاں جائے کا حکم دیا جائے گا۔ خیال کسی یرمیاہیجر کی طرف جاتا تھا۔ لیکن معلوم ہوا کہ طابہ و طیبہ و مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بننے کے لئے شرب کی سرزمین کا انتخاب ہو چکا تھا، فذہب وھلی الی انھالیا مہر اوھو فاذاھی المدینۃ یتذب (بخاری،

دل کے لحاظ سے ”الہامات“ اور دماغ کے اعتبار سے چاہئے تو ”عمل کے لائحہ“ سے بھی اس کی تعبیر کر سکتے ہیں۔ عرض ہی کر چکا ہوں کہ قیادت و امامت کی راہ نمایاں میں بھی جو ہری فرق ہے۔

اور یہی میرا مطلب بھی ہے کہ ”نئے محاذ“ کا کسی تعینی و تدریسی نظام کے تحت مکمل کرنے کا ارادہ تو فیصل شدہ ارادہ اور الہامی محرکات کے زیر اثر قطعی فیصلہ کی صورت اختیار کر چکا تھا، اور بقول حضرت حاجی صاحب دیوبند کی سرزمین کی قسمت تھی کہ قدرت کی طرف سے اسی کا انتخاب سب سے پہلی دفعہ اس نئے محاذ کے افتتاح کے لئے ہوا۔

لیکن ظاہر ہے کہ قسمت کہئے، یا ازلی تقدیر کا ظہور ہمیشہ اسباب و علل کے پردوں ہی میں ہوتا ہی دیوبند کی سرزمین کے لئے یقیناً یہ ایک تقدیری فیصلہ تھا، مگر ”منصہ شہود“ پر بھی تقدیر تدریس کے کس رنگ میں جلوہ گر ہوئی، اس کی حد سے زیادہ تشنہ اور قطعاً ناکمل تفسیر ہوگی۔ جسے لوگ ”انار اور محبود“ کی روایت کی حد تک محدود کر دیتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے، عرض ہی کرنا چلا آ رہا ہوں، کہ اس نئے محاذ کے بانی سیدنا الامام الکریمؒ کی دیوبند والوں سے قرابت قریبہ کے موردی تعلقات پشتہا پشت سے قائم تھے، یہ بھی آپ سن چکے کہ آج جس مقام پر دارالعلوم کی طویل و عریض عمارتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے اسی کے قریب دیوان کی ڈیوڑھی میں حضرت والا کی تعلیمی زندگی کا ابتدائی زمانہ گزرا تھا، نہ صرف دیوبند، بلکہ آپ کی طرف سے شہدہ کی ناکامی کے بعد ”نیا محاذ“ دیوبند کے جس قطعہ اراضی پر کھلنے والا تھا، خاص اسی قطعہ اراضی اور خطہ پاک سے بچپن ہی میں مانوس بنائے کا قدرت نظم کر چکی تھی، آج جہاں دارالعلوم ہے وہی میدان اس کے باغ، تالاب، آپ کی بازیگاہ اور سیرگاہ تھی، پھر دیوبند کے دیوان کی یہی ڈیوڑھی آپ کی سسرال بھی بنی، اور جیسا کہ تفصیل بتایا جا چکا ہے، شہدہ کے ہنگامہ کے بعد سیدنا الامام الکریمؒ کی مدد پر کی کافی مدت دیوبند ہی میں گزری، حالات ہی ایسے تھے کہ نافرت سے اپنے اہل دعیال کو اس زمانہ میں دیوبند ہی منتقل کرنا پڑا، بلکہ سوانح خطوط کے مصنف نے جو یہ خبر دی ہے، جس کا پہلے بھی ذکر کر چکا

ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر نے دیوبند کو بجائے نانوتہ کے جب اپنا وطن ثانی قرار دیا تو
 ”شمس الاسلام کی رونق افرہی ہوئی“

ان ہی الفاظ کو بعض لوگوں نے آپ کی اس نئی وطن پذیری کا مادہ تاریخ قرار دیا تھا، جس کے اعداد و
 ۱۲۷۴ھ میں جو عیسوی سن کے حساب سے ٹھیک وہی ۱۸۵۷ء کا سال ہے، جس کے معنی
 یہی ہوئے کہ ۱۸۵۷ء ہی میں یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ بجائے نانوتہ کے حضرت والا کے اہل و عیال کا مستقل
 قیام دیوبند ہی میں رہے گا، اور ہوا بھی یہی کہ روپوشی کے زمانہ کا ٹیرا حصہ حضرت الا کا دیوان کی ڈیوٹی
 کی معزنی پشت پر چھتہ کے نام سے جو ایک مسجد تھی، اہاس وقت تک بمحافظہ موجود ہی میں گذرا۔ زمانہ دراز
 سے اس مسجد کے حجرے صاحب دل بزرگوں کی قیام گاہ بننے کی سعادت حاصل کرتے چلے آتے
 تھے، اور اس زمانہ میں بھی دیوبند کے دو مشہور و معروف بزرگوں یعنی حاجی سید محمد عابد حسین صاحب
 اور مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہا کی قیام گاہ بھی چھتہ کی مسجد کے یہی حجرے تھے، ہم جنسی اور ہم مذاقی
 کے رشتہ کا اقتضایہ ہوا کہ اس زمانہ میں ”خلوت گاہ حق“ بننے کا شرف چھتہ کی مسجد کے ایک حجرے کو
 سیدنا الامام الکبیر کے قیام کی وجہ سے حاصل ہوا۔

چنانچہ صاحب سوانح مخطوط نے یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

”اسی زمانہ میں جناب مولوی رفیع الدین صاحب و جناب حاجی محمد عابد صاحب دیوبندی
 جن کی تعریف ذیل میں مفصل درج کی جاوے گی، چھتہ کی مسجد میں قیام پذیر تھے“

ہم اگے اطلاع دی ہے کہ

”مولانا (سیدنا الامام الکبیر) نے ان بزرگوں کی وجہ سے اسی مسجد میں قیام کیا، اور ان دنوں

۱۔ ہمارے مخدوم و محترم الحاج مولوی سید محمد رفیع الدین صاحب بی۔ اے (علیگ)، ویرا سٹریٹ لا، جو حکومت اصفیہ
 حیدر آباد رکھیں، ایچ کیو، اور علیچن مین تعلیم و مذہب کے محکمہ کی متحدہ (سکرٹری) کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہو کر اب
 بجائے الہ آباد والحدید آبادی کے ”الپاک تانی“ بنے ہوئے کراچی میں مقیم ہیں، ان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ چھتہ کی مسجد کے
 اس ”کمرے“ کی فرسودہ درودہ حالی کو دیکھ کر اپنے ذاتی مصارف سے اثناء ست کر دیا کہ گویا ایک نیا کمرہ ہی بن گیا،
 جس سے طلبہ مستفید ہوتے ہیں اور سید صاحب کے حق میں دعا گو ہیں ۱۱

بزرگوں سے کمال درجہ کا انس اور ربط و قطع قائم ہو گیا۔“

یورپوشی کے زمانہ میں سرکاری دوش کا رخ اس مسجد کی طرف اُگر ہوتا، تو آپ سن چکے ہیں کہ اس مسجد سے نکل کر دیوبند ہی کی دوسری مسجدوں میں آپ منتقل ہو تے رہتے تھے۔ ہندوستان سے نکل کر یہ نیت حج اسی زمانہ میں آپ ججاز پہنچے، اور ”عام معافی نامہ“ کے ساتھ حکومت کی طرف سے نگرانی جب اٹھالی گئی، تو حجاز کی واپسی کے بعد بھی وطن کی حیثیت گویا دیوبند ہی کی رہی، گو اس کے ساتھ ساتھ نانوتہ بھی آتے جاتے رہتے تھے، پھر جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے کہ مطالبہ عام کا سلسلہ حکومت کی طرف سے جب ختم ہو گیا تو

”منشی ممتاز علی صاحب نے میرٹھ میں چھاپہ خانہ کیا، مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کو پرانی دوستی کے سبب بلایا، وہی تصحیح کی خدمت تھی“ ۳۹

تصحیح کتب کی اسی خدمت کی وجہ سے میرٹھ ہی گویا اس زمانہ میں آپ کا مستقر تھا، لیکن خدمت کی جو نیت تھی، اس میں کافی گنجائش تھی، کہ اپنے وطن ثانی دیوبند میں آپ کی آمد و رفت کا سلسلہ باقی رہے، اور حالات و واقعات سے یہی معلوم بھی ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ باقی تھا۔

بس یہی سرچنے کی بات ہے کہ جس ”نئے محاذ“ کے کھولنے کا دلولہ آپ کے سینہ، صداقت گنجینہ میں جوش زن تھا جس کے لئے مناسب و صالح و قابل زمین کی تلاش میں جیسا کہ چاہئے، جب آپ سرگردان تھے تو یہ بتانا تو مشکل ہے کہ اس عہد تلاش جستجو میں آپ کی نظر مسلمانوں کی کن کن آبادیوں پر پڑتی تھی، یہ واقعہ تھا کہ ”مطالبہ عام“ کے اٹھ جانے کے بعد بھی مسلمانوں کو اس کا اطمینان نہ تھا کہ حکومت نے ان کا تعاقب ترک کر دیا ہے۔

اللہ اللہ مسلمانوں کی سلطنت و سیاست، تہذیب و معاشرت، علم و فن، صنعت و حرفت کا مرکز و حید مرحوم دلی تک کے متعلق غالب بے چارے کا جب یہ احساس تھا شاید پہلے بھی کہیں ذکر کر چکا ہوں یعنی

”دیکھا چاہئے مسلمانوں کو دلی میں، آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔“ (اردوئے معلیٰ ص ۶۶)

خود ہی دیوبند جو سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی ”پناہ گاہ“ تھی۔ اور بقول مصنف سوانح مخطوطہ آپ کا وطن ثانی بھی وہ قرار پا چکا تھا، وہاں کے مسلمانوں کی بھی حالت جب یہی تھی جس کے راوی ہمارے مخدوم و محترم مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم جمعیت العلماء (دہلی) ہیں کہ

”دیوبند کے ایک بڑے میاں نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ میں تہجد سے فارغ ہو کر انگریزوں کے لئے بد دعا کیا کرتا ہوں، مگر بد دعا سے پیش تر سارے مکان پر اور درودیوار پر نظر ڈال

دیتا ہوں کہ کوئی اجنبی شخص تو یہاں موجود نہیں۔“ ص ۳۳ علماء ہند کا شاندار ماضی

ایسی صورت میں یہی سمجھنا چاہئے، کہ آج کل کرفیو کے نام سے کبھی کبھی خاص مواقع پر گورنر حکومت کی طرف سے چند خاص گھنٹوں کے لئے جو سہرہ ہوتے رہتے ہیں، لفظاً نہ سہی، لیکن ہندوستان کے سارے مسلمان ”کرفیو آرڈر“ کے اسی دوا می حکم کے زیر اثر گویا زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ کسی مقصد اور کسی غرض سے بھی چند مسلمانوں کا اجتماع گویا اس ”کرفیو آرڈر“ کی خلاف ورزی کا رنگ اختیار کر لیتا تھا، جس پر حکومت کی سخت اور کڑی نگرانی قائم تھی۔

ماسوا اس کے وہ ”نیا محاذ“ جسے سیدنا الامام الکبیر شاعلی کے میدان سے واپس ہونے کے بعد کھولنا چاہتے تھے۔ اس ”نئے محاذ“ اور اس کے دور رس مضمرات و کمونانات خواہ کچھ ہی ہوں، لیکن ظاہری قالب تو اس کا یہی تھا کہ مسلمانوں کی دینی زندگی کی حفاظت کے لئے دینی تعلیم کا ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس کے ذریعہ ملک کے طول و عرض میں جہاں تک ممکن ہو، بڑی سے بڑی تعداد دینی علوم کے علمبرداروں کی پھیل جائے۔ اس جدید تعلیمی نظام کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے قدیم علماء کی تدریس و تعلیم کا آزاد اور انفرادی طریقہ سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک قطعاً ناکافی تھا، اور مشاہدے سے اس کی تصدیق بھی ہو رہی تھی، اپنے اسی اصولی نقطہ نظر کے زیر اثر آپ دینی تعلیم کا اجتماعی نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس میں حتی الوسع تعلیم کے عصری لوازم اور تقاضوں کو بھی ممکنہ حد تک سمونے اور جذب کرنے کی صورت چاہا جاتا تھا کہ نکالی جائے۔ آج تو کالجوں اور اسکولوں کی کثرت، بلکہ دینی تعلیم کے اجتماعی نظام کے تحت چلنے والے عربی مدارس کی بھی اتنی کافی تعداد ملک کے طول و عرض میں

پھیل چکی ہے کہ تعلیم کے یہ عصری لوازم (امتحان، رجسٹر حاضری، جماعت بندی وغیرہ) پیش پا افتادہ حقیقتوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ تعلیم و تدریس کا شاید ان امور کے بغیر تصور بھی لوگ نہیں کر سکتے، لیکن اپنے ”نئے محاذ“ کے لئے ڈھونڈھنے والا جس زمانہ میں اس کے لئے صالح وسیع حاصل زمین ڈھونڈھ رہا تھا، آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ ہمارے قدیم علماء کے لئے ان چیزوں ہی کی نہیں بلکہ ان کے تصور کی بھی کیا نوعیت تھی؟ نئے قائم ہونے والے اسکولوں اور کالجوں ہی کا عام نام صرف ”مچھلے“ نہ تھا، بلکہ تعلیم کے اس اجتماعی نظام کے متعلق جس کی ابتدا، دیوبند سے ہوئی تھی، ہمارے اگلے زمانہ کے علماء کی مجلسوں میں جو بحثیں اس پر کسی جاتی تھیں، اور جن جگر خراش، روح گداز استہزائی فقروں سے اس پر تنقید کی جاتی تھی، دروکی یہ داستان حد سے زیادہ افسوسناک ہے، شاید کسی موقع پر ان کی طرف کچھ اشارے بھی کئے جائیں گے۔ ان مولویوں کے نزدیک علم کی ”کیفیت“ کا مسئلہ تھا، اور ”نئے محاذ“ کے لئے کیفیت سے زیادہ ”کمیت“ اور ”مقدار“ کا مسئلہ اہم تھا۔

ابھی مچھلے کہے، ”کایہ عربی ترجمہ کر لیا گیا تھا“ کہتے ہیں کہ حضرت قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نیز شہید حضرت شاہ اسماعیل گانپانیہ ہوا یہ لفظ تھا۔ تفصیل کیلئے قاری صاحب کی سوانح عمری دیکھئے، غالباً حیات جاوید میں بھی مولانا حالی نے اس کا ذکر کیا ہے جو قاری صاحب کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی زبان پڑھنے کے متعلق کفر و الاشہاب لطیف جس مسلمانوں کی نگاہ کی طرف اب بھی لوگ منسوب کرتے ہیں بجائے خود یہ صرف پرمیگنڈہ تھا بندہ دستان علماء کے استاد اکل حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا مطبوعہ قادیان میں موجود ہے جس میں آپ نے انگریزی زبان کے متعلق یہ فتویٰ دیا تھا کہ ”تعلیم انگریزی یعنی ایمین خط و کتابت و لغت و اصطلاح اپنا راداستن پاس کے ندارد“ ۱۹۵۰ء انگریز اور انگریز کی طرف جو جبر منسوب ہو، مسلمانوں کی غیرت و حمیت واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک اس کو برداشت نہیں کر رہی تھی، جب تک امتداد زمانہ اور دوسری تدبیروں نے از حد ملوث و مردہ بنا کر نہ دکھ دیا تھا۔ اسی قادیان عزیزیہ میں ایک دل دوز کہنے یا دل چسپ واقعہ کا ذکر ملتا ہے۔ کلکتہ کے کوئی مسلمان مختار کار مولوی رعایت علی خان نامی تھے۔ شاہ عبدالعزیز کو حکومت کی طرف سے لکھا، کہ ایک ایسے عالم مفتی کی ضرورت ہے جو شرع شریف کے مطابق فیصلہ بار و رعایت کر سکتے ہوں۔ یہ بھی لکھا کہ انگریزوں کے خلاف دروہنگ کوٹھی میں ان کا قیام ہے گا اور شرع محمدی کے مطابق بے دغ و بے دوسا حکم کا کلی اختیار ان کو ہو گا شاہ صاحب کے مدرسہ کے ایک عالم کے متعلق یہ خبر شاہ غلام علی صاحب غلیفہ مرزا منظر جانچا، ان دنوں کلکتہ جانے پر آمادہ ہو گئے، اس خبر کو پا کر انہوں نے جو خط شاہ عبدالعزیز کے نام لکھا تھا تاریخی خط ہے کلکتہ جانے کا شاہ صاحب نے پوری قوت سے روکا چاہا ہے، یہ اہم فرماتے ہیں کہ اگر قصداً ان امر مبادی نہ کنند، آخر میں لکھا ہے کہ بغیر افسس آخریں انکاریم“ قادیان عزیزیہ

کچھ بھی ہو، دینی علوم کی تعلیم و تنظیم کا کام علماء ہی سے لیا جاسکتا تھا۔ لیکن ان کی عمومیت سے اس مسئلہ میں کسی قسم کی مدد کے ملنے کی توقع نہ تھی۔ ماسوا اس کے اس قسم کے اجتماعی نظام کے تحت قائم ہونے والی ”تعلیم گاہ“ کے نظم و پرداخت کے لئے سب سے بڑی ضرورت اس بات کی تھی کہ انتظامی سلیقہ رکھنے والی کوئی بیدار مغز، راستباز، مخلص شخصیت، ہر قسم کے معاشی مشاغل سے بے تعلق ہو کر ”ہمسہ دہی“ نگرانی کے لئے آمادہ ہو، مگر جن معاشی زیوں، حالیوں، کشاکش اس زمانہ میں مسلمان ہو چکے تھے، ان کو دیکھتے ہوئے بھلا اس کی امید کیا باندھی جاسکتی تھی۔

اب اس کو اتفاق سمجھئے، یا ازنی تقدیر کے ظہور کا تشکیلی قالب، کہ دیوبند جہاں کے باشندوں میں سیدنا الامام الکبیر کو اپنے دل کی لگی آگ کے پھیلانے کا موقع، بہ نسبت دوسری اسلامی آبادیوں کے زیادہ آسان کیا گیا تھا، اسی دیوبند میں ٹھیک اسی زمانہ میں جب ”نئے محاذ“ کے لئے زمین کی تلاش کی، ہم میں سیدنا الامام الکبیر سرگرم و مہم تھے۔ دیکھا گیا، کہ ایک طرف اجتماعی تعلیم کے لوازم و خصوصیات کی ایک سے زیادہ عملی تجربہ رکھنے والی ہستیاں جمع ہو گئی ہیں، جن میں ایک تو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب تھے، اور دوسرے صاحب مولانا فضل الرحمن صاحب تھے جو مفتی عزیز الرحمن و مولانا حبیب الرحمن و مولانا شبیر احمد صاحب نور اللہ صریحہم کے پدر و الا قدر تھے۔ یہ دونوں حضرات بھی جیسا کہ معلوم ہوا ہے، مولانا ملوک العلی صاحب کے شاگرد تھے، یوں دئی عربک کالج کے تعلیمی نظام کے مشاہدہ و تجربہ کا موقع بھی ان کو ملا تھا، اور علم سے فارغ ہونے کے بعد حکومت کے تعلیمی محکمہ میں ڈپٹی انسپکٹر ہو کر وظیفہ (پنشن) پانے کے بعد اپنے وطن دیوبند میں خانہ نشین ہو چکے تھے۔ اور خانہ نشینی کے بعد ہی غالباً یہ دونوں بزرگ مسجد چھتہ کی مجلس انس کا جزو ہو گئے ہیں۔ اس ماحول کو ابتدائی دور میں جب سیدنا الامام الکبیر کی دیوبند میں رونق افروزی ہوئی، جس کا تفصیلی تذکرہ آچکا ہے، ان بزرگوں کا نام نہ آنا شاید ان حضرات کی سرکاری ملازمتوں کی پابندی اور وطن میں مسلسل قیام نہ ہونے کی وجہ سے ہو گا، دور ما بعد میں ان کے اسماء کا تذکرہ اسی کی علامت قرار دی جاسکتی ہے، کہ

اس وقت یہ بزرگ پنشن لے کر دیوبند آچکے تھے اور خزانہ نشین ہو گئے تھے۔

شاید اسی لئے سوانح مخطوطہ کے مصنف کے کلام میں سیدنا الامام الکیبر کے عہد و رونی افزوی و قیام دیوبند کے بارہ میں جو ”عہد قدیم“ کا لفظ پایا جاتا ہے اور اس قید ”عہد قدیم“ کے ساتھ جن خواص مجلس کے ناموں کا ذکر انہوں نے کیا ہے ان میں ان دونوں بزرگوں کا ذکر نہیں ملتا، سوانح مخطوطہ کے الفاظ یہ ہیں۔

”اس عہد قدیم“ (زمانہ) اور دو حضرات نانوتوی رح یعنی ۱۲۸۵ھ کے مجمع کے خاص لوگ یہ

ہیں۔ حاجی دیوان محمد یسین صاحب عرف اللہ دیا، حافظ انوار الحق صاحب عرف حافظ

کلو۔ پیر جی ماجد علی صاحب، حاجی ظہور الدین صاحب، حکیم مشتاق احمد صاحب (ایک گج

ذیل کے دو نام اور اضافہ کئے ہیں، شیخ منظور احمد صاحب، منشی نہال احمد صاحب“

گویا اس مجلس انس کی ابتداء چھتہ کی مسجد میں حاجی محمد عابد صاحب اور مولانا رفیع الدین صاحب کی وقت

سے ہوئی اور رفتہ رفتہ اس میں دیوبند کے مختلف محلوں کے یہ چیمہ اور سربراہ اور وہ لوگ شامل ہوتے گئے،

جن سے ”عہد قدیم“ کی مجلس کی قدرتی تشکیل ہوئی، اور قصبہ کی اصلاح اور نئے محاذ کی زمین ہموار کرنے

میں اولاً یہی حضرات سیدنا الامام الکیبر کے دست و بازو ثابت ہوئے، جن کے احوال پر صاحب سوانح

مخطوطہ نے بھی اجمالی روشنی ڈالی ہے۔ ”عہد قدیم“ کی قید کو سامنے رکھ کر جس کی ساتھ ان مخصوص ناموں

کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد والے دور کو جس میں یہ دونوں بزرگ مولانا ذوالفقار علی صاحب اور مولانا

فضل الرحمن صاحب بھی آئے۔ مسجد چھتہ کی مجلس کا ”عہد جدید“ کہنا چاہئے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ

”عہد قدیم“ نئے محاذ کے لئے تہیہ استعداد اور زمین ہموار کرنے کا دور تھا اور ”عہد جدید“ اس کی عملی

تشکیلات اور فعلیت کے ظہور کا زمانہ تھا۔

اس ”عہد قدیم“ میں جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں چھتہ کی مسجد کے گوشہ گزینوں میں حاجی سید محمد عابد

و مولانا رفیع الدین دو ایسے بزرگ تھے، جن کو سیدنا الامام الکیبر کے بساط قرب و انبساط میں ملا وہ

ظاہری و باطنی فوائد کے جو حضرت والا کی مجالس انس و دانش کی خصوصیات تھیں۔ سب سے زیادہ

آپ کی لولو العزمانہ انگلوں اور بلند حوصلوں سے شعوری اور غیر شعوری طور پر اثر پذیر ہونے کی کچھ ایسی قدرتی صورت پیدا ہو گئی، کہ وہ چاہتے یا نہ چاہتے۔ لیکن اس آج کے تاثری عمل سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے تھے، جو اندر ہی اندر ان کو لگھلائی اور نئے سانچے میں ان کے جذبات و عواطف کو ڈھالتی چلی جا رہی تھی، اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ”گلیم خویش بدرمی برد نموج“ کے جس طبقہ سے ان کا تعلق تھا، اس طبقہ کے عام حدود سے نکل کر ”غزنی گیری“ کے نئے سودے کو لے کر یہ لوگ بھی میدان میں کود پڑے، مولانا رفیع الدین صاحب کی باقی زندگی جیسا کہ معلوم ہے اسی ”غزنی گیری“ کی جد جہد میں بسر ہوئی، حقیقی معنوں میں دارالعلوم کے مہتمم اول وہی ہوئے۔ اور اسی شغل پاک میں شاید آخری سالوں ان کی پوری ہوئی۔

اس شغل میں سیدنا امام الکبیر سے ان کے تاثر یا باطنی استفادہ کا عالم یہ تھا کہ ان کا قلب بھی قلب قاسمی کا دوسرا رخ بن گیا تھا، انہوں نے اپنے زمانہ اہتمام دارالعلوم میں جیسا کہ کسی موقع پر تذکرہ آچکا ہے۔ خود ہی فرمایا ہے کہ دارالعلوم کا اہتمام میں نہیں کرتا، حضرت نانوتوی فرماتے ہیں، جو کچھ حضرت کے

لے۔ مولانا حبیب الرحمن مرحوم جو اپنے عہد میں دارالعلوم کی روح رواں کی حیثیت حاصل کئے ہوئے تھے، اپنے تدبیر، پیش بینی، مردم شناسی کے دانش مندانہ پہلوؤں کے ساتھ ساتھ کم از کم فقیران کی لگنیت و اخلاص سے زیادہ حائر تھا، وہی فقیر سے براہ راست مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کے اہتمامی کارناموں کا ذکر کرتے کرتے کبھی کبھی ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دیا کرتے، کہ مجھ جیسے عقلیت زدہ آدمی کے لئے اس کا ماننا دشوار ہو جاتا تھا۔ فرماتے کہ بسا اوقات مجھے اس کا تجربہ ہوا ہے کہ دارالعلوم کے متعلق کوئی مفید تجویز میرے دماغ میں آئی، لیکن عمل کرنے کے وقت اس کا پتہ چلتا ہے کہ مولانا رفیع الدین صاحب اپنے ایام اہتمام میں اس کی بنیاد سوار کر چکے تھے۔ مہات ہی کی حد تک نہیں بلکہ مجھے خوب یاد ہے مولانا حبیب الرحمن فرماتے کہ مدرسہ کی عمارت میں کسی ترمیم و تجدید کا خیال آیا۔ کام جب شروع کیا تو یاد مجھ کو بھڑی پہلو اس ترمیم کی گنجائش قصداً پیدا کر کے مولانا رفیع الدین صاحب کے ہیں۔ فرماتے کہ کسی چھت میں مجھے نالی بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی، جب بنوانے لگا تو دیکھا کہ پہلے ہی سے نالی اسی مقام پر بنائی جا چکی تھی، چونکہ اس وقت ضرورت نہ تھی اس لئے چھپا دی گئی تھی، مگر اب مجھے صرف اسی ہی ہوئی نالی کے کھلوادینے کا کام کرنا پڑا، جس کا مطلب اس کی سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ سرشت اہتمام کو ہاتھ میں لینے کے بعد اپنی بصیرت و داعی و قلبی ہر قسم کی قوتوں کو دارالعلوم ہی کی فلاح و بہبود میں مولانا رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے غرق کر دیا تھا۔ آج تو ہے کہ مولانا رفیع الدین کے جو حالات میں نے سنے ہیں ان کا انقضائے ہے کہ کسی مستقل سوانح عمری کے ذریعہ ان کی زندگی کے عملی اسباق اور نمونوں کو محفوظ کر دیا جاوے ۱۲

قلب پر دارو ہوتا ہے وہی جبینہ میرے قلب میں منعکس ہو جاتا ہے اور میں وہ کرکند رہتا ہوں چنانچہ میرے کر لینے کے بعد حضرت نانوتوی فرماتے کہ مولانا اللہ آپ کو جزاء خیر عطا فرمائے میرے دل میں یہی آرہا تھا جو آپ نے کر لیا۔ فرمایا کہ بارہا نہیں تقریباً میرے تمام کاموں میں حضرت سے ہم آہنگی کی یہی نوعیت قائم رہتی تھی اور حضرت نانوتوی اسی طرح اسے ظاہر فرمادیا کرتے تھے۔

رہے ہمارے سید مغفور و مرحوم حاجی سید عابد حسین صاحب، انہوں نے سیدنا الامام الکبیر کے اس ”نئے محاذ“ کی افتتاحی منزلیوں میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں، ان سے وابستگان دارالعلوم کے عوام نہ سہی، خواص اچھی طرح واقف ہیں۔ چنانچہ حاجی صاحب مہدی کی اس جدید پرواز اور ”غریب گیری“ کی بخفی روح مولانا فضل الرحمن صاحب مرحوم نے عواطف قاسمی ہی کو ٹھہرا پایا، وہ اپنے ایک مشہور قصیدہ میں ان کے مناقب کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

مرد حق "عابد" صداقت کیش	اولین گستراندہ رومالش
ہم باخلاص دل دریاں بہناد	چیزے از طیبات اموالش
گوئیائیں ہمہ فتوح کشیر	در رسیدہ ہمہ بافضالش

آگے اس مخفی روح کا ذکر کر رہے ہیں کہ

لیک ایک اس "ظاہر ہایوں" شد ز قاسم عطا پیرد بالمش

یہاں مجھے حاجی صاحب کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ باطنی معرفت و سلوک کا جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے حاجی صاحب مدوح کو نو عمری ہی سے شوق تھا، سوانح مخطوطہ کے مصنف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حشری طریقہ کے ایک بزرگ جن کا نام نامی میاں جی کریم بخش تھا، اسی پر پیہاراں کو رہنے والے تھے۔ ان ہی سے حاجی صاحب مرید ہوئے، کسب و سلوک کے مراتب ان ہی کے زیر تربیت طے کئے۔ خلافت بھی حاجی صاحب کو میاں جی کریم بخش ہی سے شروع میں حاصل ہوئی تھی۔ اسی بنیاد پر لکھا ہے کہ سید صاحب

لے یعنی حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

”جناب میاں جی کریم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ رام پوری حشٹی کے خلیفہ ہیں“ ۳۶

اسی کتاب میں اس کی معاصرانہ شہادت بھی مصنف کتاب نے ادا کی ہے کہ

”اہل دیوبند کو آپ سے (یعنی سید محمد عابد صاحب سے) کمال درجہ عقیدت ہے“

ظاہر ہے کہ ایک سالک مسلک معرفت و حقیقت ہونے کے ساتھ ساتھ جب اپنے پیرو مرشد میاں جی کریم بخش رحمۃ اللہ علیہ حشٹی کے خلیفہ مجاز بھی سید صاحب ہو چکے تھے، تو اس زمانہ کے لحاظ سے مسلمانان دیوبند کی عقیدت کیشیوں اور نیاز مند یوں کی مرکز ان کی ذات گرامی بن گئی ہو، تو اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا تھا، بلکہ اسی کے ساتھ اسی کتاب میں سید صاحب مرحوم کی ایک خصوصیت جس کے گونہ مشاہدہ کا موقعہ خود اس فقیر کو بھی اس زمانہ میں ملا ہے جب دارالعلوم میں زیر تعلیم تھا، نہ صرف دیوبند، بلکہ دیوبند سے باہر حتیٰ کہ صوبجات متحدہ سے بھی آگے بڑھ کر بہار و بنگال تک سید صاحب کی اس امتیازی خصوصیت کا چرچا اور شہرہ پھیلا ہوا تھا، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوانح مخطوطہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ سید صاحب کے دیگر ظاہری و باطنی کمالات کے ساتھ ساتھ

”ان میں ادنیٰ تعوید و گنڈہ ہے، جس کے سبب اہل دیوبند اور نواح دیوبند کے ہر قسم

کے دکھ درد و دلزدہ دور ہوتے ہیں“

اسی کا نتیجہ تھا کہ سید حاجی صاحب کی ہر دل عزیزیان خواص ہی کے حلقہ تک محدود نہ تھیں، بلکہ بقول مصنف کتاب

”دیوبند کے مسلمانوں میں شاید کوئی ایسا بچہ ہو گا جس کے گلے میں آپ کا (یعنی حاجی سید

عابد صاحب کا) تعوید نہ ہو گا، اور کم تر ایسی عورتیں ہوں گی، جن کے بازو پر آپ کا نقش

نہ ہو“

سید صاحب کے اسی ”نقش“ کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت نے شہنہ میں جو دارالعلوم کے متعلق کسی زمانہ میں آپ نے نظم فرمائی تھی، یہ مصرع بھی لکھا،

”ع نقش و تعویذش مثال نقش قدس“ (منقول از ص ۵۵ حصہ پنجم، علماء ہند کا شاندار ضمیمہ)
واقعہ یہ ہے کہ جسکی جھاڑ پھونک، تعویذ گندڑوں کی مقبولیت کا حال جب یہ ہو جیسا کہ سوانح مخطوطہ
کے مصنف نے لکھا ہے کہ

”آپ کا مطب (تعویذی) بڑے بڑے (دوائی) طبیبوں سے زیادہ گرم رہتا ہے، خصوصاً
وہابی و موسمی امراض میں غریب علاج کم کرتے ہیں، آپ ہی کے تعویذوں پر قناعت
کرتے ہیں“

خواص و عوام کی فیض رسانی کی اس نمائندگی میں یہ ایک صورت ایسی تھی کہ مصنف کتاب کو یہ گواہی دینی
پڑی کہ

”آپ کی (سید صاحب کی، ذات فیض آیات سے خلائق کو بہت طرح کا نفع حاصل ہو“
”خلافت“ کے اس لفظ میں اسی کتاب کے مصنف کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں
ہی تک اس باب میں آپ کی فیض رسانیاں محدود نہ تھیں، بلکہ وہی لکھتے کیا اپنی عینی شہادت نقل
کرتے ہیں کہ

”غیر مذہب والے بھی آپ کے تعویذوں کے مستفید ہیں“

المغرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حاجی سید محمد عابد صاحب کی ذات بابرکات پر گویا
دیوبند اور اس کے باشندے سمٹے ہوئے تھے، جن میں مسلمانوں کے ساتھ جیسا کہ آپ دیکھ رہے
ہیں غیر مسلم بھی شریک تھے، علاوہ درویشی کے حالات کے شریعت کے ظاہری احکام کی پابندی میں
ان کے رسوم اور استواری کا یہ حال تھا کہ بقول مولانا سید محمد میاں صاحبنا علمائے مشہور سربراوردہ عالم

۱۔ ارواح ثلاثہ میں حضرت تھانویؒ کی طرف یہ روایت منسوب کی گئی ہے کہ حاجی سید محمد عابد صاحب کے ساتھ محدثوں کی
عقیدت کا یہ رنگ تھا کہ ایک بیوی صاحبہ جن کا دو بیٹے چوری گیا تھا، کہتی تھیں کہ کچھ پروا نہیں، حاجی محمد عابد سے کہلا بھیجو۔
دو بیٹے ہیں آجائے گا۔ چنانچہ حاجی صاحب سے کہلا بھیجا گیا، انہوں نے تعویذ دے کر فرمایا کہ الگ جی پر سر دو بیٹے چوری
گیا ہے، اسی پر آجائے گا۔ چنانچہ دو بیٹے وہیں آگیا۔ اسی کتاب میں ہے کہ حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ شاید
کوئی جن وغیرہ تاج ہے۔ ۲۔ قصص الاکابر ۱۲

دماظر مولانا مرتضیٰ حسن مرحوم یہ کیفیت بیان فرماتے تھے کہ

”ایک روز آپ کو (یعنی حاجی محمد عابد صاحب کو) بہت رنجیدہ دیکھا گیا، کبیدگی اور فشرگی کی یہ حالت تھی، کہ جیسے کسی جواں مرگ..... پر ہو، جب سبب دریافت کیا گیا، تو بہت اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ اٹھائیس سال بعد آج جماعت صبح کی تکبیر تحریمہ فوت ہو گئی“ ۵۷ ج

اب صحیح طور پر تو میرے لئے یہ بتانا دشوار ہے کہ یہ کس زمانہ کی بات ہے، چھتہ کی مسجد میں سیدنا الامام الکبیرؑ نے جو آتش دان روشن فرمایا تھا، اور بجائے ”کلمہ بری“ کے ”غزنی گری“ کے ذوق کا شعلہ آپ کی وجہ سے دلوں میں بھڑک اٹھا تھا۔ اس کے بعد کا بد واقعہ ہے یا پہلے کا، یعنی سوانح مخطوط کے مصنف کی روایت ہے کہ حاجی عابد حسین پر ایسا حال طاری ہوا کہ

”گھر، باہر، زمین، باغ، جس قدر آپ کی ملک میں تھا، سب کا سب راہ خدا میں دیکر محض خدا پر تکیہ کیا“ ۳۶

گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ دینی تعلیم کے اجتماعی نظام کے قالب میں ”نئے محاذ“ کے افتتاح کے لئے تعلیم کے اس جدید نظام کے چند عملی تجربہ کاروں کے ساتھ ساتھ کام کو ہاتھ میں لینے، اس کو پروان چڑھانے، آگے بڑھانے کے لئے ایک ایسی

”ہمہ وقتی توانائی“

کا جو اہم سوال تھا، یعنی ہر طرف سے سمٹ سٹا کر کامل یک سوئی کے ساتھ اسی کا جو ہو کر رہ جائے، اسی سوال کا مجسم زندہ جیتا جاگتا جواب بن کر حاجی محمد عابد کی ذات گرامی نگاہوں کے سامنے دیوبند میں گویا کھڑی ہو گئی تھی،

”دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گر انما یہ کو یہ سرزمین لے اڑی“

حضرت حاجی اماد اللہ المہاجر المکی رحمۃ اللہ علیہ کے اس اجمالی ارشاد کا یہی تفصیل مطلب یا قسمت و تقدیر کے ظہور کی یہی تدبیری شکل تھی، زمین بھی مل گئی، زمین پر کام کرنے والے بھی مل گئے، تو جس قالب

میں ”نئے محاذ“ کے کھولنے کا ارادہ کیا گیا تھا، وہ کھول دیا گیا۔

یہی دارالعلوم دیوبند ہے، جو مجدد المذہب اس وقت تک اپنے تاریخی وجود اور تاثری نتائج و ثمرات کے ساتھ ہم سب کے سامنے ہے، دیوبند کی خوش قسمت سر زمین میں درخت انار کی چھاؤں کے نیچے محمود معلم و معلم نامیوں کو بٹھا کر کھولنے والوں نے ”نئے محاذ“ کے اس تعلیمی قالب کے کھولنے کی توفیق جس زمانہ میں توفیق یافتوں کو کئی گنی تھی کھول دیا، اسی زمانہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمارے مصنف امام نے اپنی کتاب میں یہ خبر سنائی ہے کہ

”وہی زمانہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی، اور مولوی فضل الرحمن اور مولوی ذوالفقار علی

اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ تجویز کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں“ ۳۹

اس سے پہلے خود ہی یہ اطلاع بھی دی ہے، کہ اس زمانہ میں خود وہ اور سیدنا الامام الکبیر مولانا محمد قاسم نور اللہ صریحاً بھی میرٹھ میں مقیم تھے، اور مطبع مجتہبی جو پہلے میرٹھ ہی میں قائم ہوا تھا، اسی مطبع میں چھپنے والی کتابوں کی تصحیح کی خدمت دونوں حضرات انجام دیتے تھے، بطور خود میرٹھ میں انفرادی درس و تدریس کا سلسلہ بھی سیدنا الامام الکبیر نے جاری کر رکھا تھا، جس زمانہ میں قصبہ دیوبند میں مدرسہ کی بنیاد پڑی، پڑھنے والے آپ سے صحیح مسلم پڑھ رہے تھے۔ پڑھنے والوں میں خود ہمارے مصنف امام بھی شریک تھے۔

۴۰ ایک بات یاد آگئی، بانی مذہب العلماء حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری (جن کا آبائی وطن دیوبند ہی کے قریب ضلع مظفر نگر کے ایک گاؤں محی الدین پور نامی متصل اسٹیشن کھاتا تو لی ہے)، اس زمانہ میں جب حضرت والا مونگیری خانقاہ رحمانیہ میں جلوہ افروز تھے۔ براہ راست اس قصہ کو فقیر سے بیان کیا کرتے تھے کہ طالب علمی کے زمانہ میں مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے درس حدیث میں شریک ہونے کی سعادت مجھے بمقام میرٹھ میسر آئی تھی۔ غالباً یہ وہی زمانہ تھا جب صحیح مسلم کا درس جاری تھا، مولانا مونگیری قدس سرہ العزیز فرماتے تھے ”حدیث پڑھی گئی، حنفیوں اور شافعیوں کے کسی اختلافی مسئلہ سے حدیث کا تعلق تھا، میں نے دیکھا کہ مولانا نے ایک ایسی جامع و مدلل تقریر کی، جس سے حکیہ شافعی نقطہ نظر کی تائید ہوتی تھی۔ طلبہ حیران ہوئے کہنے لگے کہ آپ کی اس تقریر سے تو معلوم ہوا کہ امام شافعی ہی کا مسلک صحیح ہے، اور حنفیوں کا مذہب حدیث کے مطابق نہیں ہے۔ مولانا مونگیری فرماتے تھے۔ تب میں نے دیکھا کہ مولانا ناٹو توڑی نے رنگ بدلا، اور فرماتے لگے کہ شوافع کی طرف سے اس مسئلہ کی تائید میں زیادہ سے زیادہ (باقی اگلے صفحہ پر)

دیوبند کا دہریہ مدرسہ اور دارالعلوم جس کے اول و آخر، ظاہر و باطن، اندر و باہر، بلکہ جس کی اینٹ اینٹ اور ذرہ ذرہ پر ”قاسمیت“ کی امٹ چھاپ پڑی ہوئی ہے، زمین والوں میں بھی قاسمیت ہی کے ”اُتیازی چھاپ“ سے وہ پہچانا اور اسی نام سے پکارا جاتا ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ آسمانی غفلتوں کی یہ صدائے بازگشت نہیں ہے، جسے زمین کے رہنے والے جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے، دہرا رہے ہیں، الغرض یہی جانی پہچانی، خواص کی مسلمہ اور عوام کی مانی ہوئی حقیقت کے زیر اثر زندگی گزارنے والے جب سنتے ہیں، مصنف امام دارالعلوم دیوبند کے صدائے دل کی زبانِ قلم سے سنتے ہیں کہ جس وقت دیوبند میں دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اور انار کے تاریخی درخت کے نیچے اس کا افتتاح ہوا، تو یہ ”نیا محاذ“ جس کے لئے کھولا جا رہا تھا، وہی اپنے ”نئے محاذ“ پر موجود نہ تھا۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ اس ”نئے محاذ“ کا تعلیمی قالب جس وقت سرزمین دیوبند میں واقعیت کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ تو واقعہً اس ”قالب“ کا ”قلب“ اور اس مرنی ویدہ جسد کی جو روح تھی، وہ دیوبند میں موجود نہ تھی، ”عقل“ تو نہیں مانتی، لیکن جو واقعہ ہے، آخر اس کے انکار کی صورت ہی کیا ہے، نکتہ تراشیوں کا وہ سلسلہ اس سے بھی زیادہ عجیب تر ہے۔ جب نہ ماننے والی عقل کو تھپکیاں دیتے ہوئے لوریاں سنائی جاتی ہیں، انار کے درخت کے نیچے چھتہ کی مسجد میں پندرہ روپے ماہوار کے ایک مدرس کا تقرر کر کے کھولنے والوں نے جس مدرسہ کو کھولا تھا، وہ مدرسہ ہی نہ تھا، ایک قصبائی مکتب متغامی بچوں کی تعلیم کے لئے کھولا گیا تھا، گویا دارالعلوم کی تاریخ کا جو سلسلہ انار والے درخت کے ساتھ بانڈھا جاتا ہے، چاہا جاتا ہے، کہ اس تاریخی رشتہ ہی کا انکار کر کے عقلی بیچینیوں کا ازالہ کر دیا جائے۔ اس سے بھی زیادہ دور کی کوڑیوں کے

دگنشتہ صفحے، کہنے والے اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں، ”جو تم سن چکے، اب سنو! امام ابوحنیفہ کے مسلک کی بنیاد یہ ہے۔ اس کے بعد مولانا نو تو نے پھر ایسی تفسیر کی کہ لوگ مبہوت بنے ہوئے سن رہے تھے۔ ابھی جس مسلک کے متعلق ان کا یقین تھا کہ اس سے زیادہ حدیثوں کے مطابق کوئی دوسرا مسلک نہیں ہو سکتا، اچانک معلوم ہوا کہ درحقیقت صحیح حدیثوں کا مفاد وہی ہے جسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے منقح فرمایا ہے۔ مولانا نوگیری اس کے بعد دیر تک مولانا نو تو کی خدا داد و ہانت و ذکاوت کی تعریف فرماتے رہے۔ ۱۲

لانے والوں کا یہ سیاسی نکتہ ہے کہ اپنے خاص حالات کے لحاظ سے قصداً و ارادۃً سیدنا الامام الکبیر نے اپنے آپ کو اس مقام سے غائب کر دیا تھا۔ جہاں بہر حال ان کی حاضری عملاً ضروری اور ناگزیر تھی۔ یعنی اشتباہی نظر حکومت کی جو آپ پر تھی یہ عدم حاضری اسی مصلحت سے تھی۔ الغرض یہ یا اسی غیبت کی ”فیل شناسیوں“ اور ”دقیقہ آفرینیوں“ کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو پیش کرنے والوں کی طرف سے پیش ہوتا رہتا ہے۔

حالانکہ ”درخت انار“ کی چھاؤں میں ایک استاذ والا یہ مدرسہ، اس مدرسہ کے مستقبل کو اعتبار سے خواہ جس حد تک بھی مختصر نظر آ رہا ہو، تقطیع اس کی اس زمانہ میں جتنی بھی چھٹی ہو، لیکن بہر حال وہ عربی ہی کا دینی مدرسہ تھا، جیسے اپنے اس طویل و عریض سیکل میں بھی دیوبند کا یہ دارالعلوم اس وقت بھی عربی ہی کا دینی مدرسہ ہے شروع میں جس وقت وہ قائم ہوا تھا، اس وقت بھی وہی تھا، حدیث میں بھی وہی رہا، اور اس وقت تک وہی ہے۔ اس سے بڑھ کر حکم و استوار شہادت اس دعوے کے ثبوت کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ درخت انار کی چھاؤں میں اس مدرسہ کا ۱۲۸۳ھ میں افتتاح ہوا، مدرسہ کے اسی پہلے سال کی پہلی مطبوعہ ردودا میرے سامنے رکھی ہوئی ہے۔ ردودا کو ان الفاظ سے شروع کر کے کہ

”الحمد للہ کہ ۱۲۸۳ ہجری بخیریت تمام ہوا“

آگے اسی میں یہ اطلاع دی گئی کہ

”یہ وہ سال مبارک ہے جس میں بنا“

”مدرسہ عربی“

کی دیوبند میں قائم ہوئی“

نام ہی نہیں، امتحانی کتابوں کے ناموں کی فہرست بھی ہیں جب یہ ملتی ہے یعنی لکھا ہے کہ شرح وقایہ شرح ملا، بیبندی، قطبی، اصول شاشی، سراجی وغیرہ کتابوں میں طلبہ کا امتحان لیا گیا، اسی سے اس

”مدرسہ عربی“ کے پہلے سال کے کاموں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعد کو کیا، اس وقت تک ”دارالعلوم“ کے وسیع تدریسی احاطہ میں چند ابتدائی کلاسیں بھی مقامی ضرورتوں کے پیش نظر قرآن ناظرہ و حفظ، اردو فارسی حساب وغیرہ کی بھی ہیں، لیکن آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ عربی کتابوں کے پڑھائے جانے کے بعد جیسا کہ دوسرے سال کی روداد میں لکھا ہے، ان تحتانی کلاسوں کا اضافہ بعد میں ہوا۔ ۱۲۸۴ھ کی روداد جو دوسرے سال کی روداد ہے، اس میں یہ لکھتے ہوئے کہ

”جب دیکھا گیا کہ طلبہ مبتدی سیر و نجات و دیوبند کی کارروائی، بدون پڑھنے کتب فارسی کے نہیں ہوتی، اور فارسی تعلیم، عربی میں ابتداءً داخل تمام رکھتی ہے، اور نیز خیال کیا گیا کہ اگر کتب فارسی ابتداءً سے پڑھائی جاوے گی تو بالضرور لوگ اپنے چھوٹے لڑکوں کو مدرسہ بھیجیں گے، اور اس میں امید قوی ہے کہ رفتہ رفتہ شوق تعلیم عربی ہو۔“ ص ۱

جس کا حاصل یہی تو نکلا کہ عربی زبان کی کتابوں کے پڑھائے جانے کے بعد فارسی ادب کی کتابوں کے لئے گنجائش مدرسہ کے نصاب میں پیدا کی گئی، اسی روداد میں آگے اس کی خبر دیتے ہوئے کہ تعلیم قرآن کا درجہ بھی اسی کے بعد کھولا گیا، اور اس سلسلہ میں

”اداءل ماہ ذی الحجہ سے حافظ نامدار خاں جن کی تعلیم اور حفظ قرآن مشہور ہے، بہ تنخواہ پانچ روپیہ ماہوار مقرر ہوئے۔“

ہمارے مصنف امام نے بھی دیوبند میں قیام مدرسہ کی خبر دینے کے بعد جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ ”چند ہی روز گزرے کہ چندہ کو افزادنی ہوئی، اور مدرس پڑھائے گئے، اور مکتب فارسی حافظ قرآن مقرر ہوئے۔“ ص ۳

دیکھ رہے ہیں کہ قائم جب ہوا تو ”مدرسہ عربی“ ہی کے نام سے قائم ہوا، مکتبی کلاسوں کا اضافہ اس ”مدرسہ عربی“ میں بعد کو ہوا، ایسی صورت میں یہ دعویٰ کہ چھتہ کی مسجد میں دارالعلوم کی بنیاد ہی نہیں پڑی تھی، اور اسی لئے کہ وہ ایک مقامی قصباتی مکتب خانہ تھا، سیدنا امام الکبیر اس کی اقتتاحی تقریب میں

شریک نہ تھے۔ خود ہی سوچے کہ یہ توجیہ واقعات کے مطابق کس حد تک ہو سکتی ہے، پھر مدرسہ کے پہلے سال کی اسی روداد میں

”نام مہتممان“

کے عنوان کے نیچے حسب ذیل ناموں کو جب ہم پاتے ہیں، یعنی
 ”حاجی عابد حسین، مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولوی مہتاب علی صاحب مولوی
 ذوالفقار علی صاحب، مولوی فضل الرحمن صاحب، منشی فضل حق، شیخ نہال احمد“
 بظاہر ارکان مجلس شوریٰ کی تعبیر ”مہتممان“ کے لفظ سے کی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ دیوبند
 میں ”مدرسہ عربی“ جو قائم ہوا تھا، اس سے اپنے تعلق کو سیدنا الامام الکبیر قطعاً پوشیدہ رکھنا نہیں
 چاہتے تھے۔ جب ”مجلس شوریٰ کے ارکان“ میں آپ کا نام شریک تھا۔ وہی طبع بھی ہوا اشاعت بھی
 ہوا تو یہ کہنا کہ ابتداء میں حضرت والا اس مدرسہ سے سیاسی مصالح کے پیش نظر ایسا تعلق رکھنا نہیں چاہتے تھے،
 جس پر حکومت کی نظر پڑ سکتی ہو۔ بجز ایک خود تراشیدہ مفروضہ کے اور بھی کچھ ہے، اسی سال کی روداد میں

لے احقر کے خیال ناقص میں بسلسلہ تاسیس دارالعلوم حضرت والا کے کھل کر سامنے نہ آئے کہ وقت کی سیاسی مصالح پر محمول
 کر لیا جانا بھی کوئی ایسی بے سرو پا توجیہ نہیں کہ اسے خود تراشیدہ مفروضہ کہہ کر کلیۃً نظر انداز کر دیا جائے۔ اس وقت کے نازک
 حالات، حضرت والا کا دارلش، اردو پٹشی، سرکاری دوشوں کا پیچھے پیچھے لگا رہنا، پھر حضرت والا کے ان جذبات نظریات کا
 ماضی سزا کا مستقبل کیلئے ہوتا جو اس وقت اجراء مدرسہ کی دفعہ اور آج ایک مستقل مکتب خیال اور ملت کی تاریخ بنی ہوئے
 ہیں، جن کی رو سے یہ مدرسہ تعلیمی ہوئے کے ساتھ ساتھ گویا اہل اللہ کی سیاست کا ایک مرکز بھی تھا، کچھ ایسی باتیں تھیں
 جو کلیۃً پردہ خفا میں ہوں یا کم از کم بحیثیت مجموعی حکومت وقت کی نگاہوں سے بالکل ادھمل ہوں، ایسی صورتیں حضرت
 والا کا بحیثیت بانی یا بحیثیت کسی ذمہ دار عہدیدار کے سامنے آتا بلاشبہ مدرسہ کو خطرات و مہالک کا شکار بنا سکتا تھا، اور
 ابتداء ہی سے حکومت وقت کی نگاہ میں اس پر کڑی ہو جاتی جس سے وہ حریت پرورد مقاصد بر جوئے کا رنہ آ سکتے جن
 کے لئے یہ تاسیس عمل میں آئی تھی، ان حالات میں، حضرت والا کا کسی رسمی ذمہ دار کی صورت سے سامنے نہ آنا
 اور مدرسہ کے حق میں سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ بھی نہ ہونے کو نمایاں رکھنا ایک اچھی خاصی سیاسی مصلحت کی صورت
 ہو جاتی ہے۔ رہا ممبران یا متحیین کی فہرست میں حضرت والا کا نام شائع ہو جانا ان کی کسی رسمی ذمہ داری کو ظاہر نہیں کرتا
 اگر اس میں ذمہ داری نمایاں ہوتی ہے تو ایک جماعت کی، اور وہ بھی اعزازی جس کا کسی مسئول یا فی منصب سے تعلق نہیں
 ہوتا پھر جس میں اکثریت ایسے حضرات کی تھی جو تارک الدیوار اور مسجد نشین بزرگ تھے، جنہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

”امتحان سالانہ“

کا عنوان قائم کر کے یہ رپورٹ درج کی گئی ہے کہ

”ماہ شعبان ۱۲۸۳ھ میں فاضل کامل مولوی محمد قاسم نانوتوی نے بشمول مولوی مہتاب علی و

مولوی ذوالفقار علی صاحب نہایت مستعدی اور سرگرمی سے امتحان لیا۔“ ص ۷۱

کام کرنے کیلئے ’میرٹھ جو دیوبند مجلس شوریٰ میں شریک ہوئے‘ طلبہ کا امتحان لینے کیلئے آسکا تھا اسی مدرسہ کا سنگ بنیاد جب کھاجا رہا تھا افتتاح مدرسہ کی اس تاریخی مجلس سے بجائے حاضرہ نمونے کے غائب اولگ کیوں ہو گیا؟ اور غائب ہ کر آخر اس مدرسہ کے اجراء افتتاح کے تعلق کی کیا نوعیت تھی؟ یقیناً مندرجہ بالا ”معلومات“ کے پیش نظر ایک دلچسپ سوال بن جاتا ہو۔ خدا جانے داغوں میں اسکی اور کیا کیا توجہیں آئی ہیں یا آسکتی ہیں، لیکن میں کیا عرض کروں۔ اتنے

(گزشتہ صفحہ سے) سیاسیات سے توجہ لے خود، عمام شہری معاملات سے بھی کوئی خاص گھاؤ نہ تھا اور یا ایسے بزرگوں کی تھی جو گورنٹ کے قدیم ملازم اور حال پختہ تھے جن کے بارہ میں گورنٹ کو شک و شبہ کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ ایسے رے لے ناموں میں قریباً کسی خاص شخصیت پر نگاہ عادیہ نہیں پڑ سکتی۔ اس پر بھی مخالفین مدرسہ نے حضرت ہی کے تعلق کو بنیاد قرار دیکر مدرسہ کو حکومت وقت کی نگاہوں میں مستحکم کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بغاوت کے الزامات بھی لگائے اور غیر حاکم سے سازش کی تہمتیں بھی تراشیں، حتیٰ کہ گورنٹ کو تحقیقات کرانی پڑی، اس وقت یہی حضرات آگے بڑھے اور اپنے سرکاری اعتماد کو سامنے رکھ کر مدرسہ کی طرف سے صفائی پیش کی جو کارگر ہوئی۔ ہند اگر شخصی طور پر عہدیدارانہ ذمہ داریوں کے ساتھ حضرت اللہ کے آئے ہوئے ہوتے تو ظاہر ہے کہ مدرسہ کی طرف سے ان بزرگوں کی یہ صفائی اور یقین دہانی کبھی بھی کارگر نہ ہو سکتی۔ گویا حضرت والا کا پس پردہ رہنا جس مصلحت سے تھا، عملاً اس کا خوشگوار نتیجہ ظاہر بھی ہوا۔ اسلئے حضرت والا کی حکمت عملی کہ مدرسہ کے سب کچھ ہونے کے باوجود وہ کچھ بھی نہ ہونا ہی دکھانا چاہتے تھے اور نہ صرف تاسیس مدرسہ ہی کی حد تک بلکہ آخر تک اسی کو نباہا گیا۔ بلاشبہ وقتی مصلحت کے لحاظ سے ایک حکیمانہ روش تھی جس کو سیاسی مصلحت کے سوا اور کس نام سے تعبیر کیا جائے؟

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس افتخار و تہمتیں حضرت والا کی قلبی اقتدار و روحانی کفایت اور تواضع کو بھی کافی دخل تھا اور کوئی شہ نہیں کہ جس طرح وہ امانت خطابت، زمامت مشیخت افتاء اور تمام امتیازی مواقع سے گھبراتے تھے اسی طرح کارہائے مدرسہ کی قیادت سے بھی یقیناً گریز فرماتے رہے جیسا کہ حضرت مصنف دام مجہد کا نظریہ ہے اور واقعہ بھی ہے لیکن ان دونوں باتوں، یعنی سیاسی مصلحت اور قلبی تواضع میں کوئی منافات نہیں۔ اگر قلبی افتاد کے ساتھ عقل کی انگریز بھی شامل ہو جائے تو اہل اللہ کے لئے یہ جمع اضداد کچھ مشکل نہیں۔ ایسے لوگوں کے قلب سلیم کی مقاماتی ترقی میں عقل معین ہوتی ہے اور عقل کے اونچے اونچے نظریات میں قلب کی سلامتی مددگار ہوتی ہے۔ اسلئے ہو سکتا ہے کہ قلب نے اپنے راستہ سے اور داغ نہ اپنے طریقہ سے حضرت والا کو اس باہمہ دے برہمکت عمل پر قائم کیا ہو، نظریہ بریں ہم اسے اعلیٰ ترین تواضع بھی کہہ سکتے ہیں اور بہترین سیاسی مصلحت کا عنوان بھی دے سکتے ہیں۔

محمد طیب غفرلہ

اور اکرٹنے اپنے بھائی بچوں پر برتری اور فوقیت حاصل کرنا کا ذریعہ یاد ہو گا عید کے اسی جوڑے کو جس چھونک کر رکھ دیا تھا طفولیت کو ایام بیہوشی میں جو ہوش کی ایسی باتیں کرتا تھا کہ بڑے بڑے ہوشیاروں کو بھی جتنی ہم توقع نہیں کر سکتے، لکھے پڑھے حتیٰ کہ کھیلنے، کودنے تک کے مشغلوں میں کام کو انتہائی منزلوں تک پہنچانے میں کامیاب ہونے کے ساتھ ہی نام اور شہرہ عام کے موقع پر جس کا جتنی سنجیدہ، اور دوامی دطریرہ بجائے حاضری کے غائب ہو جانا ہی قرار پانچکا ہو، ساری بلندیاں جن پر چڑھ چڑھ کر بجائے والے اپنے اپنے فضل و علم کی ڈنگ لگیاں پہلے بجاتے تھے، یا آج تک بجا رہے ہیں، کیا ہمیشہ ان سے اترنے ہی پر اصرار کرتے ہوئے اسے نہیں پایا گیا، حکومت کی ملازمت یا وکالت جیسی باتوں کو توخیر دور رکھئے، آپ سن چکے کہ جس زمانہ میں اس کے دیوان علم کے رفقاء و وسیع صحراؤں کی طرف بگڑ بھاگے چلے جاتے تھے، ٹھیک ان ہی دنوں میں وہ دہ دہی کے کوچہ چلیان نامی کے ایک مکان میں جھلنگے پر پڑا ہوا تھا۔ اسی طرح امانت، خطابت، افتاء، دراست، تصنیف و کتابت، حتیٰ کہ ارشاد و بیعت تک کی راہوں میں آپ دیکھ چکے کہ کبھی وہ خود آیا نہیں، بلکہ لایا گیا، علم و دین کی ان نمائش گاہوں پر خود چڑھا نہیں، بلکہ چڑھایا گیا، بنو جبر چڑھایا گیا، پھر کام کے بعد آج ہی نام کے مقام پر وہ کیوں ڈھونڈھا جا رہا ہے، جو اس مقام پر پہلے کب اور کہاں پایا گیا تھا۔ ان ہی پنهانیوں میں تو عرض کر چکا ہوں۔ اس کی ”پیدائشوں“ کا راز پوشیدہ ہے، آج اس کے ظہور کی شدت ممکن ہے، بعضوں کے لئے ناقابل برداشت بنی ہوئی ہو۔ سرگوشیاں ہو رہی ہیں کہ وہ تو غائب تھا۔ پھر ہر جگہ وہی وہ آج کیوں پایا جا رہا ہے۔ شاید قرآنی قانون واللہ محض ہر ماکنتھ تکتمون اور اس کی تفسیر جو انہیں سنائی گئی تھی، اسے وہ بھول گئے، حالانکہ چاہئے تھا کہ بجائے اس کے ان معلومات کا جائزہ لیتے، اور ان میں اپنے اس سوال کا جواب تلاش کرتے جو ان کے ”حافظہ“ سے امید ہے کہ ابھی غائب نہیں ہوئے ہوں گے، کچھ بھی ہو، سچی بات یہی ہے، یہی واقعہ ہے، اور اسی کو واقعہ ہونا بھی چاہئے کہ ”جامعہ قاسمیہ“ یا ”دیوبند کے دارالعلوم“ کی جب بنیاد پڑی تھی تو سیدنا الامام الکبیر اس وقت دیوبند میں موجود نہ تھے اسی لئے قیام دارالعلوم کی ابتدائی داستان میرے دائرہ بحث سے سچ پوچھئے تو خارج ہے۔

ان جزئیات کی سراغ رسانی یعنی مقامی طور پر مدرسہ عربی کے نام سے دیوبند کے قصبہ میں اس تعلیم گاہ کا افتتاح کب اور کن مقامی بزرگوں کی تحریک و تجویز سے ہوا۔ ان باتوں کی تحقیق کا صحیح مقام سیدنا الامام الکبیر کی سوانح عمری نہیں، بلکہ دارالعلوم کی تاریخ ہو سکتی ہے، لیکن آئندہ کی کڑیوں کی حلقہ بندی کے لئے یہاں بھی ضرورت ہے کہ ذیلی طور پر ان معلومات کو اس کتاب میں بھی درج کر دیا جائے، جو ان امور کے متعلق اب تک سیدنا الامام الکبیر کے اس ظلم و جہول سوانح نگار تک پہنچے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شاعلی کے میدان کا زخم خوردہ شیر، اس میدان سے واپس ہونے کے بعد نئے داؤ اور نئے گھات کے لئے کسی نئی "کمین گاہ" کی تلاش میں جب سرگردان تھا، تو جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اس کا پتہ چلانا تو دشوار ہے کہ اس زمانہ میں ان کی نظریں کہاں کہاں کن لوگوں پر پڑ رہی تھیں، تاہم قرآن و قیاسات کا اقتضاء ہے کہ سہارنپور تھا نہ بھون مراد آباد میرٹھ وغیرہ جیسے مقامات جہاں سے آپ کے خاص تعلقات تھے۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ کوئی وجہ نہ تھی کہ دیوبند اور اس کے امکانات آپ کے سامنے نہ آئے ہوں، جواب بجائے نانوہ کے آپ کا وطن ثانی بھی بن چکا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اپنے اس

”کچھار“

کے پروردہ شیرینچوں سے جو آپ ہی کی آغوش تربیت میں پل رہے تھے، آپ کے طبعی رجحانات و میلانات، خربو، کو آپ کی مجلس انس میں شریک ہو رہے کہ شعوری و غیر شعوری طبع پر جو چوس رہے تھے ان ہی شیرینچوں سے توقعات کی لہریں آپ کے قلب مبارک سے زیادہ ٹکراتی ہوں، ان ہی سے آپ کا دل زیادہ امیدیں باندھتا ہو، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ لیکن یا ایں ہمہ اس کا کوئی تاریخی وثیقہ ہمارے پاس نہیں ہے کہ قیام مدرسہ کی تاریخ و سنہ یا اس کے ابتدائی مبادی طے کر کے کیلئے بقید وقت صاف صاف دو ٹوک الفاظ میں ”دیوبند“ کے باشندوں کو کوئی واضح تصریحی حکم آپ نے دیا تھا۔ اگرچہ آپ کی ہر حرکت اور ہر سکون ساری زندگی اس میں شک نہیں کہ ہم سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی، لیکن اس سوال کا جواب کہاں ہی آئیگا؟ اور کن لوگ لبیک کہینگے؟ اسی کے انتظام میں پرون، ہینڈوں پر ہینڈ، سال پر سال گزرے چل جاتے

تھے، ایک سال دو سال، تین سال، تاہم کہ قریب تھا کہ سالوں کا ایک دہا یا عشرہ بھی گزر جائے اسی سوال کا جواب زمین پر بھی ڈھونڈ رہا تھا اور عرض کر چکا ہوں، کہ تلاش کرنے والا آسمانوں میں بھی اسی سوال کے جواب کو تلاش کر رہا تھا، کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں جب میرٹھ کا شہر اور اس کے مطبع مجتہائی میں انتظار کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹ رہی تھیں کہ دیوبند سے یہ ”بشارت نامہ“ موصول ہوا، یعنی حاجی عابد حسین صاحب نے سیدنا الامام الکبیر کو میرٹھ خط لکھا، جس کا اقتباس تذکرۃ العابدین میں دیا گیا ہے۔ حاجی نذیر احمد صاحب مصنف تذکرۃ العابدین یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ حاجی عابد حسین صاحب نے مدرسہ کے سلسلہ میں چندہ شروع کر دیا، خود بھی دیا، اور دوسروں سے بھی لیا اور جمع کیا۔ آگے لکھتے ہیں

”اگلے روز حاجی صاحب (حاجی عابد حسین صاحب) نے مولوی محمد قاسم صاحب کو میرٹھ خط لکھا کہ آپ پڑھانے کے واسطے دیوبند آئیے۔ فقیر نے یہ صورت (فرہی چندہ) اختیار کی ہے۔“ (تذکرۃ العابدین ص ۶۹ مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دہلی)

اس خط کے بارہ میں جو بیان مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی استاد دارالعلوم دیوبند کا شامل مواد سوانح قاسمی ہے اس میں اس خط کے کچھ اور فقرے بھی ملتے ہیں۔ جن سے بعض دوسری پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے مولانا ممدوح لکھتے ہیں

”حاجی عابد حسین صاحب کا یہ خط میں نے حاجی نذیر احمد صاحب کے پاس بچشم خود دیکھا، اور مجھ کو اس کا مضمون بجنسہ قریب قریب اسی کے الفاظ میں پوری طرح محفوظ ہے اس خط میں حاجی صاحب نے مولانا مرحوم کو لکھا ہے، کہ وہ جو آپ کے ہمارے درمیان مختلف مجالس میں مذاکرات ہو کرتے تھے کہ کوئی مدرسہ قائم ہونا چاہئے۔ کیونکہ ایک ایک سوال پوچھنے کے لئے سہارنپور آدمی بھیجنا پڑتا ہے۔ فقیر کے دل میں اک دم خیال آگیا اور چندہ کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کل عصر مغرب کے درمیان تین سو روپے ہو گئے۔ اب آپ تشریف لے آئیے۔ (فائل مسودات مواد سوانح)

یہ سوال کا جواب اور لبیک کی پہلی آواز تھی جو خوش قسمت دیوبند اور اس کے خوش نصیب، توفیق یافتہ باشندوں کی طرف سے تقریباً دس سال کی "تاؤزین عام" کے بعد پہلی دفعہ سیدنا الامام الکبیر کے "قلب منتظر" سے ٹکرائی، سب پیچھے رہ گئے، دیوبند سب سے آگے بڑھ گیا اور اَلْفَضْلُ لِمُتَقَدِّمٍ کا "قدرتی حق" ضلع سہارنپور کے اس گننام قصبہ "دیوبند" کے طالع ارجمند کے لئے ہمیشہ کے واسطے محفوظ ہو گیا، سبقت اور پیش قدمی کا ایسا حق جو کوئی اس سے اب چھین نہیں سکتا۔ ذلک فضل اللہ یؤتیه من یشاء

مندرجہ بالا "بشارت نامہ" حضرت سید حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارقام فرمودہ تھا جو چھتہ کی مسجد کی "مجلس انس" کے رکن رکن تھے

بشارت نامہ کے ان دونوں اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارسال بشارت نامہ تک حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب کی مساعی صرف فراہمی چندہ تک محدود رہیں۔ تعلیم کا افتتاح یا مدرسہ کا اجرا عمل میں نہیں آیا تھا، اسی کے لئے انہوں نے سیدنا الامام الکبیر کو یاد فرمایا۔ اور ان مذاکرات کا حوالہ دے کر یاد فرمایا جو اجراء مدرسہ کے سلسلہ میں ان میں اور سیدنا الامام الکبیر میں ہوا کرتے تھے۔ گویا یہ اقدام ان مذاکرات کے نتیجہ کے طور پر ایک باہمی سمجھوتہ یا ایک مہرود فی الذہن منصوبہ کے تحت عمل میں آیا تھا۔

ابتدائی مراحل کی اطلاع بشارت نامہ کے ذریعہ میرٹھ پہنچی۔ جس کے قلب میں ۱۲۵۷ھ کے بعد سے ایک اساسی مقصد کی آگ لگی ہوئی تھی، اور جس کے بروئے کار آنے ہی پر بظاہر اسباب مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کی تعمیر ہونے والی تھی۔ جس کے لئے ۱۲۵۷ھ ہی سے دیوبند کی آمد و رفت مسجد چھتہ کی مجلس انس اور مذاکرات و تصرفات کا ایک لمبا سلسلہ قائم کیا گیا تھا۔ آج جبکہ اسی مقصد کے بارہ میں

لہذا اقتباس از آیت واذن فی الناس بالحق یاتونک رجلاً وعلیٰ کل صاعہ یاتین من کل فج عمیق۔ انصافاً بنار واد العلوم کے سلسلہ میں اسی آیت کے مضمون سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اقتباس کر کے اپنے استاذ حضرت نانوتوی کے بارہ میں شیعہ لکھا ہے۔ اس کی آواز تھی یا بانگ قلیل الہی + کہہ کے لبیک چلے اہل عرب اہل عجم۔ اسی تاؤزین اور اس کی لبیک کی داستان کی طرف حضرت مصنف لفظ تاؤزین سے اشارہ فرما رہے ہیں۔ محمد طیب غفرلہ

عملی لبیک کی خوش خبری سامنے آئی تو سیدنا الامام الکبیر کی خوشی و مسرت کا آج کون اندازہ کر سکتا ہے؟ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت جلد سے جلد اصل مقصد کی عملی تکمیل کا دلولہ کس حد تک قلب مبارک میں جوش زن ہوا ہو گا۔ اس بشارت نامہ کے جواب میں آپ نے جو والا نامہ تحریر فرمایا، اس کا یہ متعلقہ حصہ صاحب تذکرۃ العابدین نے نقل کیا ہے جس کے الفاظ مجتہدہ یہ ہیں۔

”مولوی محمد قاسم صاحب نے جواب لکھا کہ میں بہت خوش ہوا۔ خدا بہتر کرے، مولوی ملا محمود صاحب کو پندرہ روپے ماہوار مقرر کر کے بھیجتا ہوں۔ وہ پڑھا دینگے، اور میں مدرسہ مذکور کے حق میں ساعی رہوں گا۔“ (تذکرۃ العابدین ص ۶۹)

سیدنا الامام الکبیر کے اس اذن اور عملی پیشقدمی پر جو تعمیلی صورت دیوبند میں نمودار ہوئی اس کے بارہ میں صاحب تذکرۃ العابدین ہی نے یہ اطلاع دی ہے

”چنانچہ ملا محمود صاحب آئے اور مسجد چھتہ میں عربی پڑھانا شروع کیا۔“

(تذکرۃ العابدین ص ۶۹)

حاجی محمد عابد صاحب کے اس بشارت نامہ اور سیدنا الامام الکبیر کے جوابی والا نامہ سے یہی معلوم ہوتا ہے اور سچو دالے اس کے سوا اور سوچ ہی کیا سکتے ہیں کہ دیوبند میں تعلیم کی اجتماعی شکل میں ”نئے محاذ“ کا افتتاح سیدنا الامام الکبیر ہی کے منشاء و صوابدید کے مطابق اور آخر کار ان ہی کے اذن صریح بلکہ افتتاح مدرسہ کے بارہ میں عملی پیش قدمی سے عمل میں آیا تھا۔ جس کے لائحہ سر براہ کلام حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب تھے، گویا سیدنا الامام الکبیر نے اگر ابتداء ہی سے انہیں اس کام کے لئے نگاہ میں رکھ کر چھتہ کی مسجد کا قیام اختیار فرمایا تھا۔ جیسا کہ سوانح مخطوط کی عبارت اس بارہ میں پیش کی جا چکی ہے۔ پھر مذاکرات کی داغ بیل ڈالی تھی، جیسا کہ حاجی صاحب کے اس بشارت نامہ کی عبارت سے واضح ہے تو حاجی صاحب ہی اس سلسلہ میں آگے بڑھے، انہوں نے ہی قیام مدرسہ کے ابتدائی مراحل (فراہمی چندہ) طے کئے اور انہوں نے ہی حضرت والا کو بشارت نامہ بھیج کر گویا استیذان کیا اور بالآخر حضرت والا کے اذن اور مدرسہ بھیجنے پر چھتہ کی مسجد میں

مدرسہ کا افتتاح عمل میں آگیا۔

باقی یہ جو لوگ پوچھتے ہیں کہ مقامی طور پر مدرسہ کے افتتاح کی دیوبندیوں کی صورت پیش آئی؟ تحریک و تجویز میں کس نے پہل کی؟ وغیرہ سو میرے نزدیک تو یہ اسی قسم کا سوال ہے کہ دیوبند کے بعد سہارنپور، مراد آباد، تھانہ، کیرانہ، نگینہ، گلا دھمی، مظفر نگر، رٹکی، انبہٹ وغیرہ آس پاس کے قری و امصار میں سیدنا الامام الکبیر ہی کے منشاء و ایما، کے متعلق مقامی درس گاہیں وقتاً فوقتاً جیسا کہ آگے معلوم ہوگا کھلتی رہیں، ان کے متعلق یہ تحقیق کی جائے کہ مقامی طور پر ان مقامات میں سب سے پہلے کس نے ”درس گاہ“ کے قیام کی تجویز پیش کی، تجویز کو کن کن لوگوں نے پہلی دفعہ قبول کیا، اور اہتمام و انتظام کا بار کن بزرگوں نے اپنے اوپر لیا، میرے نزدیک کوئی قابل توجہ بات نہیں۔

تاہم اس وقت مسجد چھتہ کی مجلس انس کے سربراہ آدرہ اور ذمہ دار اراکین میں حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب اپنے تقدس اور درویش کی حیثیت سے مقبول خلافت اویوبند میں مرجع عوام و خواص بنے ہوئے تھے جن کے بارہ میں مولانا ذوالفقار علی صاحب کا یہ فقرہ نقل کیا جاتا ہے کہ مدرسہ دیوبند کو سلطان روم بھی بغیر حاجی محمد عابد صاحب کی مدد کے نہیں چلا سکتا اور مولانا فضل الرحمن صاحب نے اپنی مشہور نظم میں انہیں ”مرد حق“۔ ”عابد صداقت کیش“ اور ”طائر ہایوں فال“ وغیرہ کے الفاظ سے یاد کر کے اپنی گہری عقیدہ مندی کا ثبوت دیا ہے، اور ادھر یہ دونوں نامبرو بزرگ یعنی مولانا ذوالفقار علی صاحب اور مولانا فضل الرحمن صاحب جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں اپنی علمی حیثیت اور تعلیمی تجربہ کے لحاظ سے قصبہ میں ممتاز تھے۔ بقول مصنف امام ان تینوں حضرات نے تجویز کی اور گویا ارادہ کیا کہ دس سال سے جس کام کے لئے قلوب مستعد ہوتے چلے آ رہے تھے اب وہ کام بروئے کار لایا جائے پھر اس مبارک کام کو چھیڑنے کے لئے تحریک ان میں سے پہلے کس نے کی؟ سوتذکرۃ العابدین کی روایت کے مطابق حضرت حاجی محمد عابد صاحب نے اور سوانح خطوط کی روایت کے مطابق مولانا فضل الرحمن صاحب نے، ہمارے نزدیک یہ دونوں روایتیں متعارض نہیں ہیں۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ دونوں بزرگوں نے کی۔ کیونکہ جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ مسجد چھتہ کی مجلس انس کی تاشیری کار فرمایوں سے

جبکہ یہ کام ان سب ذہنوں کی مشترک پیکار بن چکا تھا تو جو زبان بھی پہلے ہی۔ اُس نے اپنی ساتھ دوسرے کی ترجمانی بھی کی، اسلئے ہم اس پہل کو تذکیر سمجھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً یہ صدا کبھی کسی کی زبان پر اور کبھی کسی کی زبان پر آتی رہی جو دوسروں کو ابھارنے اور یاد دلانے کے لئے ہوتی تھی۔ کچھ بھی ہو، بہر حال اچانک دیکھا یہ گیا کہ حاجی محمد عابد صاحب تن تنہا گلے میں جھولی ڈال کر چندہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے جس کی تفصیلی روایت آگے آرہی ہے، اور روپیہ جمع کر کے اصل مقصد یعنی افتتاح تعلیم و ابراہام مدرسہ کے لئے سیدنا امام الکبیر کی خدمت میں میرٹھ بشارت نامہ بھیج دیا، اور وہاں کی تصویب و تائید اور مدرس کا تقرر کر کے بھیج دینے پر افتتاح مدرسہ عمل میں آگیا، جیسا کہ ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، حاصل اس کا یہی ہوا کہ اسی کے ہاتھوں اس کام نے عملی قالب اختیار کیا۔ جس کے قلب کا یہ جذبہ تھا، اور جس نے دوسرے قلوب کو بھی اس تپش سے تیار رکھا تھا۔ یعنی اجراء مدرسہ حضرت والا نے کیا گو پس پردہ میرٹھ میں بیٹھ کر کیا۔ لیکن عملاً اس کام کو چلانے اور آگے بڑھانے کے لئے بہر حال ایک ایسی مقامی شخصیت کی ضرورت تھی جو اپنے اثر و اقتدار سے ”مائی سرمایہ“ کے فراہم کرنے میں بھی کامیاب ہو سکتا ہو، اور اسی کے ساتھ بڑا اہم مسئلہ یہ تھا کہ ہمہ وقتی نگرانی کے لئے دوسرے مشاغل سے وہ آزاد بھی ہو، کہہ چکا ہوں کہ ان دونوں خصوصیتوں یعنی اثر و اقتدار اور ہمہ وقتی توانائی کی جو ضرورت اس ادارہ کو عملی گردش میں لانے کے لئے تھی۔ ان دونوں جو ہری خصوصیتوں کی جامع ذات اس زمانہ میں حضرت حاجی محمد عابد صاحب قبلہ کے سوا جہاں تک معلومات کا تعلق ہے، دیوبند میں اس وقت شاید کوئی دوسری ہستی نہ تھی، حاجی صاحب کا اثر اور کافی گہرا اقتدار مسلمان مردوں اور عورتوں ہی کی حد تک محدود نہ تھا، بلکہ قصبہ کی غیر مسلم آبادی میں بھی جیسا کہ سن چکے، اپنے خاص حالات کے لحاظ سے وہ کافی مقبول اور ہرول عزیز تھے، اور صرف یہی نہیں بلکہ سوارخ مخلوطہ کے باخیر مصنف نے حاجی صاحب کے متعلق یہ بیان کرتے ہوئے کہ

لے پہلے تو ان کی شخصیت کچھ مجھول ہی تھی لیکن معلومات ان کے متعلق جو فراہم ہوئے ہیں، ان کی روشنی میں تو دارالمعلوم دیوبند کی تاریخ میں ان کی ہستی کافی ممتاز اور اہم بن جاتی ہے۔ مولانا طیب صاحب کے (باقی اگلے صفحہ پر)

”آپ کی صورت کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے“

آگے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ

”پابندی وضع، استقلال طبع، ادب العزیم، خوش تدبیری آپ کی مشہور ہے“

اور گو لکھنے کے بعد اپنے مسودہ میں ان الفاظ کو نہ معلوم کیوں قلم زد کر دیا گیا ہے۔ لیکن بہر حال ہیں یہ قلم زدہ الفاظ بھی ان ہی کے قلم سے نکلے ہوئے، اور وہ یہ ہیں کہ

”باوجودیکہ (حاجی عابد صاحب نے) دنیا کو ترک کر دیا، مگر کوئی آپ سے مشورہ لیتا ہے، تو اس

میں بھی ایسی اچھی صائب رائے ہوتی ہے، جیسے بڑے ہوشیار دنیا دار کی۔“

شاید آخری الفاظ میں کچھ تعمیری خامی محسوس ہوئی، اسی لئے وہ کاٹ دیئے گئے، مگر میرے سامنے جو سوال ہے، اسکے حل میں ان کے قلم کے نکلے ہوئے یہ تاریخی الفاظ کافی اہمیت کو حامل ہیں۔ سمجھیں آتا ہے کہ ”شر“ و ”فرصت“ کے سوا حاجی ضامن وہ ساری خوبیاں جمع تھیں جن میں کسی اجتماعی نظام کے تحت چلا کر جانیا لے ادارہ کی فلاح و بہبود، نفاذ و ارتقاء کی ضمانت پوشیدہ ہے، حاصل یہی ہے کہ صاحب دل ہونے کے ساتھ حاجی صائب صاحب مانع بھی تھے۔

(گذشتہ صفحہ سے) بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف دیوبندی کے ایک بزرگ منشی فضل حق نامی ہیں، یہ وہی منشی فضل حق صاحب ہیں، جن کا اسم گرامی دارالعلوم دیوبند کی سب سے پہلی مجلس شوریٰ کے ارکان کی اس فہرست میں درج ہے جو مدرسہ کے پہلے سال ۱۲۸۵ھ کی روداد میں شریک ہے، گویا ابتداء ہی سے مجلس شوریٰ کے ”لوگن“ منتخب ہوئے اور آخر تک رہے۔ دارالعلوم کی بعض قدیم رودادوں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ۱۳۱۸ھ میں حاجی سید عابد حسین صاحب کی تحریک اور قطب ربانی حضرت گنگوہی کی ترغیب سے منشی فضل حق دارالعلوم کے مہتمم بھی مقرر ہوئے تھے، حاجی عابد حسین صاحب نے اپنی تحریک مجلس شوریٰ میں جن الفاظ میں پیش کی تھی ان کی خصوصیات کا کافی روشنی پڑتی ہے تحریک کے الفاظ یہ تھے۔ ”منشی فضل حق ابتداء مدرسہ سے داخل اہل شوریٰ ہیں اور پہلے عرصہ تک اہتمام کا کام کر چکے ہیں اور استعداد تحریر و تقریر کی دانی رکھتے ہیں، اور تدابیر و قوت انتظام سے بھی عاری نہیں ہیں منشی صاحب کا خاندان ادبی کی پشتوں و حساب و حاجی عابد حسین صاحب کے مل جاتا ہے، خود سیدنا الامام الکبیر سے بھی سسرالی رشتہ آپ کا تھا۔ منشی صاحب کے ایک صاحبزادے مولانا ظہور الحق صاحب مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں مدرس ہیں، اور ڈاکٹر شفیق احمد صاحب منشی صاحب منفور کے نواسے ہیں، جو آج کل دیوبند کے ممتاز محالوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مولانا طیب صاحب نے لکھا ہے کہ منشی صاحب کا مکان دیوبند کے محلہ سرائے میں اب بھی موجود ہے، ان کے خاندان والوں سے مولانا کے گھرانے سے خوش گوارا گہرے تعلقات ہیں۔ داخریہ ہے کہ اس اکتشاف کے بعد ”سوانح مخطوط“ اور اس کے مشتملات کی قدر و قیمت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ۱۳

بلکہ صاحب دل و صاحب دماغ ہونے کے ساتھ ساتھ حاجی صاحب کے متعلق اس قسم کے معلومات ہم تک جو پہنچے ہیں۔ مثلاً ارواحِ ثلاثہ میں حضرت تمھانوی کی یہ روایت پائی جاتی ہے، حضرت والا اپنے استاد مولانا فتح محمد صاحب کے حوالہ سے بیان فرمایا کرتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں مولانا فتح محمد صاحب جب زیر تعلیم تھے، تو کسی ضرورت سے وہ حاجی سید محمد عابد صاحب قبلہ کی خدمت میں پہنچے، اس وقت وہی مدرسہ کے مہتمم بھی تھے۔ لیکن ٹھیک اسی وقت کوئی ڈپٹی صاحب بھی حاجی صاحب کی ملاقات ہی کی غرض سے آدھکے۔ حاجی صاحب نے حد سے زیادہ لاپرواہی سے گویا کام لیتے ہوئے ڈپٹی صاحب سے سرسری گفتگو کی اور اٹھ کر جانا ہی چاہتے تھے کہ مولانا فتح محمد جن کی حیثیت اس زمانہ میں مدرسہ کے ایک معمولی طالب علم سے زیادہ نہ تھی، دیکھا کہ وہ آرہے ہیں، ان پر نظر کا پڑنا تھا کہ پلٹ پلٹے اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر مولوی صاحب سے آئے کی وجہ دریافت فرماتے لگے، مولوی فتح محمد صاحب نے یہ دیکھ کر کہ حاجی صاحب جا رہے تھے، خواہ مخواہ میری وجہ سے ان کو رکنا پڑا۔ ادباً عرض کرنے لگے کہ کوئی خاص بات نہ تھی، پھر کبھی عرض کروں گا، مگر ان کو حیرت ہو گئی، جب وہ حاجی صاحب کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ان الفاظ کو سن رہے تھے۔

”تم اپنے کو ڈپٹی صاحب پر قیاس کرتے ہو گے، کہاں وہ دنیا دار اور کہاں تم نائب

رسول“ ارواح ۲۶۹

اسی کتاب ارواح ثلاثہ میں ایک دوسری روایت بھی پائی جاتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مدرسہ کے کسی طالب علم اور حاجی صاحب کے درمیان باہمی بخشش کی کوئی صورت پیش آگئی تھی، طالب العلم نے منہ پر حاجی صاحب کو کچھ سخت و سست بھی منادیا تھا، طالب العلم ایک مسجد میں رہتا تھا، لکھا ہے کہ حاجی صاحب اسی مسجد میں بنفس نفیس پہنچے، دیکھا جا رہا تھا کہ طالب العلم کے

”سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے ہیں۔ فرمایا کہ مولانا معاف کر دیجئے۔ آپ نائب رسول ہیں،

آپ کا ناراض رکھنا مجھے گوارا نہیں“ ۲۶۹

”ملا اور صوفی“ کے تعلقات جن کی طرف کتاب کے ہمیدی مقدمہ میں بقدر ضرورت بحث بھی کی گئی ہے۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ حاجی سید محمد عابد صاحب پر درویشی ہی کا پہلا ابتداء سے غالب تھا گو شریعت کے ظاہر احکام کی پابندی میں بھی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، وہ خاص امتیازی شان رکھتے تھے، لیکن بجائے انقباض کے غریب ملاؤں کی، حاجی صاحب کی درویشی میں انہی گہری جگہ جس کا اندازہ مذکورہ بالا مثالوں سے ہوتا ہے۔ اب خواہ یہ رنگ جس راستہ سے بھی آیا ہو، شہد کے بعد دیوبند کو وطن ثانی بننے کی عزت سیدنا الامام الکبیر کی بدولت جو حاصل ہوئی، اور چھپنے کی مسجد میں جو حلقہ درویشوں کا اس کے بعد قائم ہوا، بظاہر تو یہی اسی حلقہ کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں جیسا کہ گذر چکا اس رنگ کے سب سے بڑے علمبردار حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب سے بھی حاجی صاحب کا رشتہ قائم ہوا، اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ خلافت کی سعادت بھی آستانہ امدادی کو حاجی محمد عابد صاحب کو حاصل ہوئی تھی۔ لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ بظاہر یہ قصے اس وقت کے ہیں جب دیوبند میں عربی کا مدرسہ شروع شروع میں قائم ہوا تھا۔ اس وقت تک حاجی عابد حسین صاحب میں یہ رنگ اس زمانہ کے لحاظ سے اگر منتقل ہو سکتا تھا تو مسجد چپتہ کی قاسمی محفل ہی سے منتقل ہو سکتا تھا۔ شاید اسی کی طرف مولانا فضل الرحمن صاحب نے اشارہ فرمایا ہے۔ جو ان کے ایک قصیدہ کے شعر میں پایا جاتا ہے۔

لیک این طا ئر ہایوں فال شد ز قاسم عطا پر و بالش

بہر حال صاحب دل، صاحب دماغ ہونے کے ساتھ علماء اور علماء کے علم کی عزت و احترام اور سپر قاسمی تصرفات سے پیدا شدہ غیر معمولی جذبہ جو حاجی صاحب میں پیدا ہو گیا تھا۔ یہ سارے اسباب دو جوہ تھے ہی ایسے کہ مدرسہ کے افتتاح کی تجویز کو عملی شکل میں لانے کے لئے نظر انتخاب دیوبند میں حاجی صاحب کو سوا آپ خود سوچئے، اور کس پر بڑتی؟ سارے

۱۲۵۵ھ میں معلوم ہوا ہے حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو خلافت حاصل ہوئی، یعنی قیام مدرسہ کے چند روزہ سال بعد۔ ۱۲ سال یعنی حاجی محمد عابد صاحب ۱۲

سازو سامان جن کی اس مہم کی سرانجامی میں ضرورت تھی یا ہو سکتی تھی، ان سے وہ لیں تھے۔ بہر حال حاجی عابد صاحب جب کام ہاتھ میں لینے کے لئے آمادہ ہو گئے، تو جیسا کہ سوانح مخطوطہ کے مصنف کا بیان ہے، اور ان کا یہ بیان کافی اہمیت رکھتا ہے، لکھا ہے کہ

”ایک دن بوقت اشراق سفید رد مال کی جھولی بنا، اور اس میں مین روپیہ اپنے پاس سے ڈال، چھتہ کی مسجد سے تنہا مولوی مہتاب علی صاحب کوم کے پاس تشریف لائے۔ مولوی صاحب نے کمال کشادہ پیشانی سے چھ روپے عنایت کئے، اور دعا کی، اور بارہ روپیہ مولوی فضل الرحمن صاحب نے اور چھ روپے اس مسکین (یعنی سوانح مخطوطہ کے مصنف منشی فضل حق صاحب دیوبندی) نے دیئے۔ وہاں سے اٹھ کر مولوی ذوالفقار علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آئے۔ مولوی صاحب ماشاء اللہ علم دوست ہیں، فوراً بارہ روپے دیئے، اور حسن اتفاق سے اس وقت سید ذوالفقار علی ثانی دیوبندی وہاں موجود تھے، ان کی طرف سے بھی بارہ روپے عنایت کئے،

۱۔ مدرسہ کی تاریخ میں مالی امداد کے ساتھ پہلی دفعہ پیش قدمی کرنے والوں کی اس تاریخی فہرست میں جن جن بزرگوں کے گرامی اسماء درج ہیں، ہماری کتاب کے پڑھنے والے عموماً ان سے روشناس ہو چکے ہیں۔ مولانا مہتاب علی صاحب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے تایا تو وہی بزرگ ہیں، جن کے مہتابی مکتب دیوبند میں سیدنا امام الکبیر نے عربی شروع کی تھی۔ مولانا فضل الرحمن صاحب اور مولانا ذوالفقار علی صاحب کے علاوہ مصنف سوانح مخطوطہ کے حال سے بھی آپ آگاہ ہو چکے ہیں۔ البتہ ڈپٹی ذوالفقار علی صاحب دیوبندی ہو مولانا محمد طیب صاحب کی یہ اطلاع ہے، کہ دیوبند کے مشاہیر میں ان کا شمار تھا۔ قلعہ پران کی شاندار حویلی اب تک موجود ہے، جس میں اب اسلامیہ ہائی اسکول کھول دیا گیا ہے۔ لاہور کا سب سے پہلا نسوانی مجلہ ”تہذیب النسوان“ ڈپٹی ذوالفقار علی صاحب کے پڑے صاحبزادے مولوی ممتاز علی کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا مولوی ممتاز علی صاحب نے قرآنی مضامین کی تیاری کر کے چار جلدوں میں ”البيان في مقاصد القرآن“ کے نام سے شائع کی تھی۔ عہد جدید کے ممتاز انشاء برداروں میں مولوی ممتاز علی کے صاحبزادے منشی امتیاز علی تاج

وہاں سے اٹھ کر یہ درویش بادشاہ صفت (یعنی حاجی محمد عابد صاحب محمد
ابوالبرکات میں پہنچے۔“

آگے کے الفاظ مخطوطہ مسودہ میں کچھ کٹ گئے ہیں، جو صاف طور پر پڑھے نہیں گئے، بظاہر کچھ
ایسا کچھ میں آتا ہے کہ محلہ کی اس مسجد میں بیٹھ کر حاجی عابد صاحب مرحوم نے چندے کی اپیل شروع
کی، الفاظ اس کے بعد جو پڑھے جاتے ہیں وہ یہ ہیں،

”دو سو روپے جمع ہو گئے، اور شام تک تین سو روپے۔ پھر توفرتہ رفتہ خوب چرچا
ہوا، اور جو پھل پھول اس کو لگے وہ ظاہر ہیں۔“

ابتدائی چندے کی اس لطیف سرگزشت کو درج کرنے کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ
”یہ قصہ بروز جمعہ دوم ماہ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ میں ہوا۔“

ذی قعدہ کے بعد ۱۲۸۲ھ ہجری کا ایک ہی مہینہ ذی الحجہ کا باقی تھا، ان ہی دو مہینوں میں کوشش
کی گئی اور اتنا سرمایہ فراہم ہو گیا، کہ مدرسہ کھول دیا جائے، اور اسی مبارک تاریخی فیصلہ کے مطابق
ان ہی کا بیان ہے کہ

”اور مدرسہ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ میں جاری ہوا۔“

سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۶۶ء ماہ اپریل کی غالباً ۱۴ تاریخ ہوگی، گویا بہار کا موسم ختم ہو رہا
تھا، لیکن ختم ہوا نہیں تھا، اور دیوبند کے علاقہ میں آموں کا موسم شاید شروع ہو چکا تھا، یا شروع
ہونے والا ہی تھا۔

غرض سیدنا الامام الکبیر کی ”ناذین عام“ اور آخر میں میرٹھ والی ”ناذین خاص“ کے مقابلہ میں
لیکھ کاپہلا جواب سرزمین دیوبند سے جو بلند ہوا، اور ان ہی کے منشا کے مطابق مجوزین کرام نے
”نئے محاذ کی اس تعلیمی قالب کو دیوبند ہی میں قائم کرنے کی صورت پیدا کر کے جو مدرسہ کو کھول دیا، تو واقعہ
یہ ہے کہ اس زمانہ کے لحاظ سے ان بزرگوں نے بڑا بھاری کام انجام دیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے
والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے عربی الفاظ میں دیوبند کے مدرسہ کے

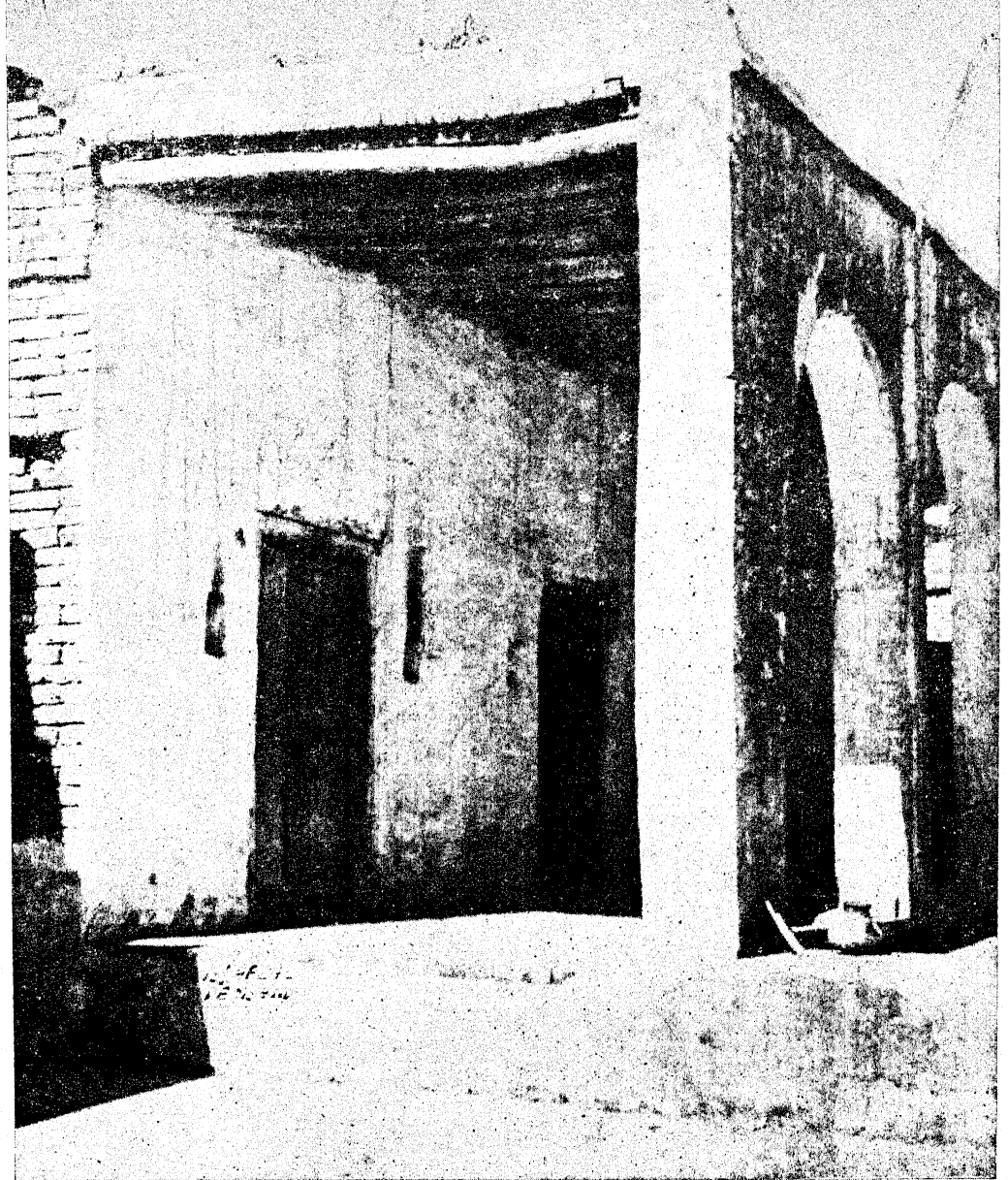
کے افتتاح اور اس وقت کے ماحول کا ذکر ان الفاظ میں پایا جاتا ہے۔

<p>وان لم یساعده الزمان والمكان ولم یوافقه الحین والاوان</p>	<p>اگرچہ اس مدرسہ کے قیام کے لئے زمانہ کے حالات ہی سازگار تھے، اور نہ وہ جگہ جہاں مدرسہ قائم ہوا، اس کا ماحول ہی مناسب تھا۔</p>
--	---

الغرض وقت بالکل ناموافق تھا۔

ایسی صورت میں اس کام کو اٹھانے والے، اس کی تحریک کو قبول کر کے اسے عملی شکل میں لانے والے، مالی امداد میں پیش قدمی کرنے والے، الغرض اس راہ میں دامن، دامن، قدمے، سخی، جس منزل میں بھی جن سے کچھ بن پڑا، حد سے زیادہ ناموافق حالات میں کر گزرنے والے سچ تو یہ ہے کہ اس سنت حسنہ کی راہ کھولنے میں جو بھی جس منزل میں بھی شریک ہوئے وہ صرف اپنے ہی عمل کی حد تک نہیں، بلکہ دارالعلوم دیوبند کے وجود کے سارے ثمرات و نتائج جو اس وقت تک سامنے آچکے ہیں، اور آئندہ جب تک خدا کی مرضی ہو، سامنے آتے رہیں گے ہر ایک میں ان کے اجر و صلہ کا حق نبوی و شیعہ کی بنا پر وہاں محفوظ ہو چکا ہے، جہاں وہ پہنچ چکے ہیں، اور میں تو دیکھ رہا ہوں کہ اس دنیا میں بھی دارالعلوم ان ”آباء صالحین“ کے ”ابناء صالحین“ کی فلاح میں کافی معاون ثابت ہوا ہے۔ آج ان اسلاف کا وجود ان کے اخلاف کے لئے سرمایہ نازد افتخار ہے۔

لے چمتہ کی مسجد کے مجلس انس کے ہی تین اساطین جنہوں نے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے ”ذہن“ کو سب سے پہلے عملی صورت دی اور جن کا ذکر حضرت مصنف امام نے مجوزین کے نام سے کیا ہے، یعنی حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب نور اللہ مرقدہم ان ہی کو دیکھئے۔ مولانا فضل الرحمن صاحب کی براہ راست اولاد میں حضرت اقدس مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب، حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب حضرت مولانا شہیر احمد صاحب رحمہم اللہ اپنے اپنے وقت میں علم و دین کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اسی زمانہ میں مولانا مطلوب الرحمن صاحب مد فیوضہم جو ان ہی مولانا فضل الرحمن صاحب کے صاحبزادے ہیں مسلمانوں کی دینی اور دہائی تربیت جس وسیع پیمانہ پر کر رہے ہیں، یقیناً اس کو بھی دارالعلوم ہی کے فیوض و برکات میں شہلہ گزرا چلا ہے۔ اسی طرح حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب کے صاحبزادے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ تو ہند کے شیخ اہل بی بن کر رہے، اور ہند ہی کیا، کون گن سکتا ہے کہ آپ کے تلامذہ اور شاگرد (باقی اگلے صفحہ پر)



باقی دارالعلوم کی تاسیس و آغاز کے سلسلہ کی ”حکایت لذیذ“ یعنی قصہ ”انار و محمود“ یہ عجیب بات ہے کہ سوانح خطوط نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے، مگر ان الفاظ کے ساتھ

”گذشتہ صفحہ سے، ایشیا و افریقہ کے کن کن علاقوں میں پھیلے ہوئے علم و دین کی خدمت میں معروف رہے اور ہیں، علمی اور دینی پہلوؤں کے سوا ملک کے سیاسی انقلاب میں آپ کا جو حصہ ہے، کیا اس کا کوئی انکار کر سکتا ہے؟ یقیناً آج جن قربانیوں، جان فروشیوں، کی قیمت ملک کی آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس قیمت میں کافی اور مقبول سرمایہ شیخ الہند کی غیر معمولی اور اولوالعزہ قربانیوں کا بھی شریک ہے۔ حضرت شیخ الہند کے حقیقی بھائی مولانا حکیم محمد حسن رحمہ اللہ کی پوری زندگی دارالعلوم کی علمی خدمات کے ساتھ اس ... کے شعبہ طب کی ہمہ وقت خدمت میں صرف ہوئی اور اساتذہ دارالعلوم میں اپنی خصوصیات کے ساتھ علمی میدان میں ان کی شخصیت نمایاں رہی۔ شیخ الہند کے داماد مولانا قاضی مسعود احمد صاحب کو آج دارالعلوم کے شعبہ افتاء کی خدمات میں زندگی کھیلا دینے کی توفیق ملی ہوئی ہے۔ مجلس انس کے تیسرے اور نمایاں رکن جن کی تھنیت و عظمت کے سامنے سابقہ ہر ردکن بھی جھکے ہوئے تھے، یعنی حضرت اقدس حاجی سید محمد عابد صاحب قدس سرہ کے متعلق یہی کیا کم ہے کہ مرکز جمیعیۃ العلماء ہند کے ناظم مولانا سید محمد میاں صاحب سلمہ دیوبند کے اسی خاندانہ سادات کے چشم و چراغ ہیں جس کے ایک رکن حضرت حاجی صاحب بھی تھے۔ اپنے اس تعلق کا انظار مولانا موصوف نے اپنی مشہور کتاب ”علماء ہند کا شاندار ماضی میں فرمایا ہے۔“

علاوہ براہ راست اولاد کے ان حضرات کے احقاء و اسباب کو دارالعلوم کی برکات ظاہری و باطنی سے مستفید ہونے کے جو مواقع میسر آئے، ان کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ مولانا فضل الرحمن صاحب کے پوتے یعنی حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب کے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمن صاحب ادارہ ”ندوۃ المصنفین“ اور مجلہ ”برہان“ کے ذریعہ جن علمی ہمت کو انجام دے رہے ہیں، وہ ہم سب کے سامنے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی قاری حافظ جلیل الرحمن صاحب دارالعلوم کے شعبہ تجوید کی قابل قدر خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے نواسے مولانا محمد عثمان صاحب نے دارالعلوم کی تدریس کے ساتھ ملک کی سیاسی خدمات اور شہری معاملات کی تنظیم کے سلسلہ میں کافی متعارف ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے دوسرے نواسے یعنی مولانا قاضی مسعود احمد صاحب کے صاحبزادے مولوی محمد ہارون صاحب بھی دارالعلوم دیوبند کے دائرہ تدریس میں کام کر رہے ہیں، اور انہیں علمی لائن کی خدمات کی اہلیت نصیب ہوئی ہے، اور پھر ان تمام علمی قابلوں کی روح رواں یعنی حضرت اقدس مولانا نانوتوی قدس اللہ سرہ جی کے خلک رس جذبات آتش دان سے مشکل شکل کر یہ گرمی اس سارے ماحول کو تپائے ہوئے تھی، اور آج تک یتیمش اپنے کام میں مصروف ہے، ان کی روحانی اور معنوی ذریت کے ساتھ جو پورے عالم اسلام میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے نسیب کو دیکھا جائے تو براہ راست ان کے خلف اکبر حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ، ہم دارالعلوم دیوبند سے جو پھل پھول اس چہستان فاسمی کو لگے آج ان کا کون انکار کر سکتا ہے؟ باقی اگر صفحہ

”سب سے پہلے اس مدرسہ کے مدرس ملاں محمود صاحب ہیں اور جائے مدرسہ فرس مسجد چھتہ طالع مولوی عبدالعزیز صاحب ہیں۔

حکایت کی اس تعمیر کو عجیب سلیقہ قرار دے رہا ہوں، جیسا کہ آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اس میں متعلم کا تو نہیں مگر معلم کا نام ”محمود“ ہی بتایا گیا ہے اور جگہ کے سلسلے میں بھی خبر دی گئی ہے کہ چھتہ ہی کی مسجد کے فرس پر پہلی دفعہ اس مدرسہ کا افتتاح ہوا، لیکن انار کے مشہور زبان زد عام درخت کے ذریعہ اس کتاب میں نہیں پاتے۔ اور اس سے بھی حیرت افزا جز ان کی اس اطلاع کا یہ کہ مدرسہ کے پہلے متعلم کا نام بجائے ”محمود“ کے وہ مولوی عبدالعزیز بتاتے ہیں، درخت انار کے عدم ذکر کے متعلق اگرچہ یہ مولویانہ توجیہ ہو بھی سکتی ہے کہ عدم الذکر عدم الوجود کو مستلزم نہیں، تاہم اس کا

(گذشتہ صفحہ سے) اُن کا چالیس سالہ دور انتہام دارالعلوم کا تاجناک دور اور یادگار زمانہ عہد کہا جاتا ہے جس میں دارالعلوم نے ہر جہتی ترقیات کے مدارج طے کئے اور وہ مدرسہ سے ایک بڑے دارالعلوم کے قالب میں ڈھلا۔ تعمیری ترقیات ہوئیں، ملی حیثیت اونچی ہوتی گئی، حلقہٴ اثر وسیع سے وسیع تر ہوا، اور بالآخر وہ مرکزیت جو اس ادارہ کی بنیاد میں چھپی ہوئی تھی۔ اسی ذوق میں شاخ در شاخ ہو کر نمایاں ہوئی۔ پھر ان کی درسی خدمات ان ہمہ گیر خدمات کے علاوہ ہیں۔ آگے کی اولاد میں حضرت والا کے نواسے ابو حامد مولانا محمد میاں رحمہ اللہ مہاجر کا بل و فین خاص سیاسی حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ احاطہ دارالعلوم سے علم و سیاست کے میدان میں کام کرتے ہوئے کا بل پیچھے تو انہوں نے دارالعلوم کے بنیادی مقاصد کو دیاں کی حکومت اور پبلک میں روشناس کرائے اور دیاں کے لوگوں کو تقریر و تصنیف کے ذریعہ ان مقاصد سے ہم آہنگ بنانے میں ۳۰ برس تک جو کردار ادا کیا، اُس سے عوام اگر زیادہ واقف نہ ہوں، تو خواص سے ان کی جانباً زمانہ مساعی مخفی نہیں ہیں، جو اسی دارالعلوم کے فیوض و برکات کا ثمرہ تھیں۔ حضرت نانوتوی کے بڑے پوتے اور مولانا حافظ محمد احمد صاحب کے پوتے مولوی حافظ قاری محمد سالم سلمہ، بھی محمد امجد دارالعلوم دیوبند میں فرائض درس و تدریس انجام دے رہے ہیں تصنیف میں بھی ان کا قلم تیز گام ہے۔ تبلیغ کے سلسلے میں تقریر و خطابت بھی امید افزا انداز سے سامنے آ رہی ہے۔ پھر عام افادیت کی لا اُن پر ”ادارہ تاج المعارف“ قائم کر کے اشاعت دین کی جو قابل قدر خدمت وہ انجام دے رہے ہیں، وہ بلاشبہ اسی احاطہ قاسمی کا فیض اور ان کی جدی نسبت کا مظاہرہ ہے۔ بہر حال مدرسہ کی تاسیس و افتتاح کے سلسلے سے یہ اسلاف اور ان کی مساعی جس حد تک مقبول ہوئیں۔ اسی حد تک ان کے اخلاف رشید بھی اس سلسلے میں ان کے ساتھ مشرف الحاق سے محروم نہیں رکھے گئے اور اَلْحَقُّنَا بِہِمَّہُ دُیْرَیْتِہُمُ کے خدائی قانون نے ان کی نسبتوں کے راستہ سے انہیں بہت کچھ ادنجا کر کے دکھایا ہے فَتَعْنَا اللہ بِاَثَارِہِمُ وَتَعْنَا بِاَنْفَاسِہِمُ۔

محمد طیب غفرلہ

پتہ ضرور چلتا ہے کہ ”شعور عام“ میں انار کے اس درخت کا مقام وہ نہ تھا، جہاں کچھلے دنوں سے ہم اس کو پائے لگے ہیں اور انار کے اس درخت کو تو چھوڑیے، ایک اتفاقی واقعہ تھا جس پر کچھ دنوں سے بیان کر کے اتفاق ہو گیا ہے، لیکن مدرسہ کے ”پہلے معلم“ کے متعلق ان کی روایت میں ہم جو کچھ پڑا رہے ہیں، اس میں تو مذکورہ بالا مولویا توجیہ کی بھی گنجائش نہیں، کیونکہ ذکر مدرسہ کے ادلیات کا وہ کر رہے ہیں، روایت میں آئندہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ”سب سے پہلے“ کے تمییدی الفاظ کے نیچے درج ہے، یہ کہنا کہ ”سب سے پہلے“ کا تعلق صرف مدرسہ کے مدرس سے ہے، اس توجیہ کو تو ہمارا مولویانہ ذہن بھی شاید برداشت نہیں کر سکتا، پھر قصہ کیا ہے؟ اگر انار و محمود دلی حکایت صرف افواہاً منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچتی، تو ”افواہ“ کے مقابل میں سوانح مخطوطہ کے مصنف جیسے گواہ کی تحریری گواہی کی ترجیح پر شاید ہم مجبور ہو جاتے، لیکن کیا کیجئے کہ ”انار و محمود“ والی حکایت کا اعادہ دارالعلوم دیوبند کی سب سے بڑی تاریخی ”مختل“ میں لکھ کر کیا گیا ہے، میں نے خود تو نہیں دیکھا ہے، لیکن مولانا طیب الحفید صاحب حال صدر مہتمم دارالعلوم سے معلوم ہوا کہ ”دارالعلوم“ کے عظیم الشان جلسہ دستار بندی مسعدہ ۱۳۲۸ھ میں ”زین ماضی و مستقبل“ کے نام سے ان کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو تحریری بیان دارالعلوم کے ہزار ہا ہزار فارغ شدہ علماء و اراکین کے آگے پیش کیا تھا، جن میں خود وقت کے صدر دارالعلوم حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک اور موجود تھے، اسی تحریری بیان میں منجملہ دوسری باتوں کے علی رؤس الاشہاد ”انار و محمود“ والی حکایت بھی بایں الفاظ دہرائی گئی تھی کہ

”مدرسہ دیوبند کا افتتاح دیوبند جیسی گننام بستی میں چھتہ کی مسجد کے اندر انار کے درخت کی نیچے ہوا، جناب مولانا علامہ محمد صاحب دیوبندی مدرس تھے، اور مولانا محمود حسن صاحب پہلے طالب علم تھے، جنہوں نے کتاب کھولی، مدرسہ دیوبند نے اس سادگی کے ساتھ وجود میں قدم رکھا۔“

مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ مطبوعہ شکل میں یہ تحریری مقالہ اس وقت دارالعلوم کے دفتر میں محفوظ ہے اور اس کے صفحہ ۲۲ پر مذکورہ بالا فقرات کو آج بھی پڑھنے والے پڑھ سکتے ہیں، حضرت مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ جن کی حیثیت دارالعلوم کے لحاظ سے ”صاحب المبریّت“ کی تھی،

علماء کرام کی بھری مجلس میں ان کے اس تحریری بیان کے متعلق یہ خیال تو یقیناً ہی ہوا کہ ایک زبان زد عام، سنی سنائی افواہی روایت جو لوگوں میں منتقل ہوتی چلی آ رہی تھی، اسی کا ذکر بطور ”حکایت لذیذہ“ کے آپ نے بھی فرمادیا۔ چونکہ دارالعلوم سے تعلق رکھنے والے ہر اعلیٰ دینی کے کان اس حکایت سے مانوس تھے، اور سوانح مخطوط کے مصنف کی نوشتہ شہادت سے لوگ واقف نہ تھے، اسی لئے خاموشی کے ساتھ سننے والوں نے اس کو سن لیا۔ کسی طرف سے کسی قسم کی تنقید اس پر نہیں کی گئی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس قسم کا دوسو سو وہی پکا سکتا ہے، جو حضرت مولانا حافظ محمد احمد علیہ الرحمۃ و العزرا کی ذمہ دارانہ ہستی اور ان کے صحیح منزل و مقام سے ناواقف ہے، یہ صحیح ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کی اس ابتدائی تقریب میں حضرت حافظ صاحب خود موجود نہ تھے، اور سوانح مخطوط کی عصری شہادت کے مقابلہ میں ان کی روایت کی حیثیت یقیناً سماعی روایت کی ہے۔ لیکن سماعی روایت بھی، یہ دارالعلوم کے رکن کریم، اور حبیب اکبر میں لے عرض کیا ”صاحب البیت“ کی روایت ہے۔ ماسوا اس کے یہ بھی تو سوچنے کی بات ہے کہ اس تاریخی ”مجلس کبیر“ میں جس وقت دارالعلوم کے صدر مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی یہ نوشتہ تحریر پڑھ رہے تھے کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اس وقت مجلس میں دارالعلوم کے صدر مدرس یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ موجود نہ ہوں، یہ دعویٰ کہ ”سب سے پہلے جنہوں نے کتاب کھولی“ خود ان ہی کی ذات اقدس سے براہ راست تعلق رکھتا تھا، اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو کیا سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ بجائے تصحیح کے آپ اس غیر واقعی امر کے متعلق خاموشی سے کام لے سکتے تھے۔

دونوں روایتوں میں تطبیق کا امکان جب باقی نہیں ہے، تو یقیناً حضرت حافظ صاحب کا بیان ہی ہر لحاظ سے ترجیح کا مستحق ہے۔

یہ حد سے زیادہ لمبی اور عرصہ دراز کا رنگہ نوازی ہوئی، کہ طالب علم ہونے کی حیثیت سے اول طالب علم مولوی عبدالعزیز کو قرار دیا جائے جیسا کہ سوانح مخطوط کی روایت کا اقتضا ہے، لیکن اس زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے کتابیں مولوی عبدالعزیز کے پاس نہ ہو گئی۔ کتاب لانے والوں اور استاد کے آگے اس کو کھول کر پڑھنے والوں میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب سب سے پہلے طالب علم تھے۔ اور دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت پیدا کر دی جائے (باقی اگلے صفحہ پر)

خیر واقعہ کچھ بھی ہو، پہلے متعلم مدرسہ کے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے، یا مولوی عبدالعزیز، جس زمانہ کی یہ بات ہے، اس وقت کے اعتبار سے یہ دونوں باتیں مساوی ہیں۔ ہاں حضرت مولانا بعد کو جو کچھ ہوئے، اس کے لحاظ سے دل تو یہی چاہتا ہے کہ اس بڑے مدرسہ کا آغاز بھی مولانا جیسے بڑے آدمی سے ہو، کیونکہ باوجود تلاش کے سوانح مخطوطہ والے مولوی عبدالعزیز کی شخصیت میرے لئے اس وقت تک چھپل ہے، مگر کیا کیجئے کہ متعلم محمود تو نہیں مگر ”معلم محمود“ کی بڑائیوں کے متعلق بھی ہمارے معلومات حد سے زیادہ محدود ہیں۔ کم از کم ”متعلم محمود“ اور دارالعلوم کی بڑائیوں میں جو مناسبت ہے، اس مناسبت کا دعویٰ معلم محمود کے متعلق مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے۔

غالباً میری دل چسپیاں اس ذیلی مسئلہ کے متعلق کچھ حد سے زیادہ بڑھ گئیں، لیکن ایک عام اور مشہور روایت کے ساتھ ساتھ سوانح مخطوطہ میں بعض ایسی چیزیں مل گئیں، کہ دل ان کے قلم انداز کرنے پر راضی نہ ہوا، آئندہ دارالعلوم کی تاریخ پر قلم اٹھانے والوں کے لئے بحث کا یہ ”جدید پہلو“ بھی پیش نظر رہے گا، اور ”انار و محمود“ والی حکایت کی تحقیق میں امید تو یہی ہے کہ آئندہ لوگ کافی غور و خوض سے کام لیں گے۔ خیر اب اس قصہ کو ختم کیجئے، اپنے ”موضوع بحث“ کے لحاظ سے میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ دیوبند میں مدرسہ جس وقت ابتدا میں قائم ہوا، حسب تحریر مصنف امام وہ خود اور ہمارے سیدنا الامام الکیسرا اس زمانہ میں بسلسلہ ملازمت مطبع مجتہبی (میرٹھ) میرٹھ ہی میں مقیم تھے۔ دیوبند میں خواہ جس یہاں نہ پر بھی ہو، مدرسہ قائم ہو گیا، مدرس اور طلبہ بھی آگئے۔ چندہ بھی فراہم ہوا۔ اس کے بعد سیدنا الامام الکیسرا

(گذشتہ صفحے) میرے خیال میں تو ”کتاب کھولی“ کے الفاظ طالب علم ہونے کی یہ عام تعبیر ہے۔ اس عام اور اتفاقی تعبیر سے خواہ خواہ ناجائز نفع اٹھانے کے مولویانہ کرب کے سوا یہ اور کچھ نہیں ہے ۱۲

۱۲ ”زین ماضی مستقبل“ کے حوالہ سے جو عبارت نقل کی گئی ہے، اس میں ان کے نام کے ساتھ مولنا ہی نہیں بلکہ علامہ کے لفظ کو ہم پاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علم و تبحر کا اچھا خاصہ ذوق اساطین دارالعلوم کے قلوب میں تھا، لیکن اسی کے مقابلہ میں سوانح مخطوطہ کے مصنف نے ملا ہی نہیں بلکہ باضافہ ”نون ملاں“ ہی کے لفظ کو ان کے لئے کافی قرار دیا ہے، دارالعلوم کی تاریخ مدون کرینے والوں کے فرائض میں ہے کہ دارالاحیاء کے ان پہلے مدرس و معلم کے صحیح حالات کا پتہ چلائیں ۱۳

یہ بشارت بھی پہنچائی گئی، کہ ان کے حسب منشاء دیوبند والوں نے دینی تعلیم کے اجتماعی نظام کو افتتاح میں سبقت کی، مدرسہ کی مجلس شوریٰ کے ایک رکن وہ بھی قرار دیئے گئے، ۱۲۸۳ھ میں مدرسہ قائم ہوا۔ اس کی روداد سے نقل کر چکا ہوں کہ طلبہ کے امتحان لینے والوں میں بھی دوسروں کے ساتھ آپ کا ذکر بھی خاص طور پر کیا گیا ہے، چندہ دہندوں کی فہرست میں آپ کے اسم گرامی کے آگے (رقم درج ہے، جو آخر وقت تک جاری رہی۔ اتنی بات تو یقینی ہے، کہ حاجی سید محمد عابد صاحب مرحوم کے بشارت نامہ میں دیوبند تشریف آوری کی دعوت آپ کو جو دی گئی تھی، اس وقت یہ دعوت دعوت ہی بن کر رہ گئی۔ صحیح طور پر یہ بتانا دشوار ہے کہ یہ صورت حال کب تک قائم رہی، بس مصنف امام ہی بیکایک یہ اطلاع دیتے ہیں کہ

”مولوی محمد قاسم صاحب شروع مدرسہ میں دیوبند آئے، اور پھر ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہو گئے“ ۱۱ ص ۲۱

میرٹھ سے دیوبند حضرت والا کی یہ تاریخی تشریف آوری جس کے بعد بقول مصنف امام ”ہر طرح“ اور ”ہر پہلو“ کے لحاظ سے آپ مدرسہ کے سرپرست ہو گئے۔ کچھ اتنے دے پاؤں خاموشی کے ساتھ ہوئی، کہ تلاش کے باوجود اس کی چونکہ صحیح تاریخ معین نہ ہو سکی، اس لئے یہ بتانا بھی سخت دشوار ہے کہ قیام مدرسہ اور ”ہر طرح سرپرست“ بن جانے والی اس تشریف آوری کی درمیانی مدت کا وقفہ کتنے دنوں پر مشتمل ہے، ایک مطبوعہ حامل تشریف جو حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمہ کے ساتھ مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ شاید کہیں پہلے بھی اس کا ذکر گذر رہا ہو، اس حامل میں بجائے عام دستور کے ترجمہ زیر سطور نہیں، بلکہ ہر صفحہ کی آیتوں کا ترجمہ نمبر لگا کر حاشیہ پر چھاپا گیا ہے، شاید اب بھی ملتا ہو، اس حامل کی آخریں جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ابتداء یہ نسخہ خاص طریقہ سے میرٹھ کے مطبع مجتبائی سے ۱۲۸۶ھ میں شائع ہوا تھا۔ اسی سلسلہ میں

۱۵ اسی حامل کے طبع کی تاریخ بھی سید نالامام الکبیر کی کھائی ہوئی ”املا امثل للہ ولا مثال“ کا ذکر بھی کیا ہے اس سے بھی ۱۲۸۶ھ کے اعداد نکلتے ہیں، اگرچہ ہے تو یہ ایک تاریخی مادہ اور دلیس کمثلہ شیء“ (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ اطلاع بھی درج کی گئی ہے کہ میرٹھ کے مطبع مجتبائی میں شائع ہونے والی اس حائل کی
 ”قاسم الخیرات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی مدد بانی مدرسہ دیوبند نے اس
 کی تصحیح فرمائی“

اس کا اقتضا بہر حال اتنا ضرور ہے کہ ۱۲۸۳ھ میں دیوبند کا مدرسہ قائم ہوا، اس کے تین سال
 بعد یعنی ۱۲۸۶ھ تک میرٹھ کے مطبع مجتبائی میں چھپنے والی کتابوں کی تصحیح کا کام سیدنا الامام الکبیر
 انجام دیتے رہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کے لئے براہ راست میرٹھ میں قیام ضروری نہیں۔ اور
 تین سال تک اگر اسی بنا پر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ میرٹھ ہی میں آپ کا قیام رہا، تو مصنف امام کی
 اطلاع میں

”شروع مدرسہ میں دیوبند آئے“

اس میں ”شروع“ کے لفظ کی پھر کیا توجیہ کی جائے گی؟ کیا تین سال کے بعد تشریف آوری کے واقعہ کی
 تعبیر ”شروع مدرسہ“ کے لفظ سے کسی حیثیت سے صحیح ہو سکتی ہے؟

بمشکل ہم اگر کہہ سکتے ہیں تو وہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ ”لفظ شروع“ سے حقیقی آغاز وابتداء
 مدرسہ تو ہم مراد ہی نہیں لے سکتے، کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، اور تین سال کے وقفہ کی بھی گنجائش ”شروع“
 کے لفظ میں نہیں، کچھ اوسط ہی نکالنا پڑے، لیکن وہ اوسط بھی کیا ہو؟ اور تو کوئی بات ملی نہیں، البتہ ۱۲۸۴ھ
 چر قیام مدرسہ کا دوسرا سال ہے، اس کی جو روداد شائع ہوئی ہے، اس میں یہ خبر دیتے ہوئے کہ مدرسہ کی

(بسم اللہ صفحہ گذشتہ) کے کلام کی تاریخ کے لئے مؤذن تین مادہ تاریخ یہ ہو سکتا ہے۔ لیکن یوں بھی جب
 ہم غور کرتے ہیں، کہ قرآن جو سورتوں اور آیات کے ساتھ ساتھ رکوعوں میں تقسیم شدہ ہے، لیکن ہندوستان کے
 شائع شدہ قرآنی نسخوں میں ہر رکوع کے آیات پر نمبر اندازی کا رواج نہیں تھا۔ غالباً سیدنا الامام الکبیر
 کی یہ جدت طرازی تھی کہ ہر صفحہ کی آیتوں پر آپ نے نمبر لگائے، اور ان ہی نمبروں کے حساب سے حاشیہ پر ہر
 آیت کا اردو ترجمہ اس طرح سے درج ہو گیا ہے کہ سابقہ و لاحقہ آیتوں کے ترجمہ سے کسی قسم کا اشتباہ ان لوگوں
 کے لئے ابھی آتی نہیں رہتا، جو براہ راست قرآن کی عربی عبارت سمجھنے سے معذور ہیں۔ زیر سطر ترجموں میں اعلیٰ اور پچھلی آیتوں
 کے ترجموں کے الفاظ میں ان غریبوں کو جو دشواری قدر تائیش آتی ہے۔ نمبر اندازی کی اس تدبیر سے یہ وقت رفع ہو جاتی
 ہے، سچ پوچھئے تو اس لحاظ سے یہ اچھوتا کام تھا۔ جس کی تقلید نہیں کی گئی ۱۲

عمر کے اسی دوسرے سال میں

”ایسا اعظیم اور حادثہ فہیم پیش آیا، کہ جس سے تمام اہل دیوبند اور جملہ مدرسین و طلبہ کو گمان

غالب تھا کہ اب قائم رہنا اس مدرسہ کا مشکل ہے“

آگے اسی ”اعظیم“ اور ”حادثہ فہیم“ کی تفصیل یہ درج کی گئی ہے کہ

”حاجی عابد حسین صاحب جو ہمہ تم مدرسہ، بلکہ اصل اصول اس کام کے تھے، اور باشندگان

دیوبند و اطراف و جوانب کے دلوں میں ان کی عظمت و توقیر بدرجہ کمال تھی۔ ان کے لحاظ و

پاس سے بہت سے طلبہ بیرونجات کے واسطے کھانا مقرر ہوا، اور چندہ بھی بہت آب و

تاب سے تحصیل ہوا، یکایک عزم بہت اللہ کا کیا، اور قطع تعلق سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ

پھر ہندوستان تشریف نہ لائیں گے“

ایک ایسے الہامی کام کو شروع کر کے اچانک حاجی صاحب قبلہ کا یہ تکوینی طرز عمل اور انقلابی اقدام

اس کے ظاہری و معنوی اسباب کیا تھے؟ اس کا جواب کچھ نہیں دے سکتے، اب خواہ اسباب کچھ

ہی ہوں، اسی روداد میں لکھا ہے کہ حاجی صاحب کے اس فیصلہ نے دلوں میں یہ اندیشہ پیدا کر دیا کہ

”بنیاد مدرسہ از سرِ کدہ ہو جاتی تو عجیب نہ تھا“

بائیں ہمہ معلوم یہی ہوتا ہے کہ حاجی صاحب اپنے فیصلہ پر قائم رہے، اور جس مدرسہ کی باگ الہام کے

زیر اثر جیسا کہ کہا جاتا ہے، انہوں نے اپنے ہاتھوں میں لیا، اس کے ”از سرِ کدہ“ ہو جانے کے نتیجہ

سے بے پروا ہو کر وہی کر گزرے جس کا انہوں نے ارادہ کیا تھا، اور شاید یہی مطلب ہے ان لوگوں کا جو

کہتے ہیں کہ دیوبند کا مدرسہ جس پیمانہ پر بھی شروع میں قائم ہوا تھا، حج کو چلے جانے کے اس ارادہ کے

بعد ہی کم از کم اپنی ذات کی حد تک حاجی عابد حسین صاحب نے صرف یہی نہیں کہ اس مدرسہ کو ختم ہی کر دیا

تھا بلکہ روداد ہی میں جو یہ لکھا ہے کہ

”قطع تعلق سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ پھر ہندوستان تشریف نہ لائینگے“

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے طرز عمل سے مستقبل میں بھی لوگوں کو اس مدرسہ کی جانب سے مایوس

بنا چکے تھے، لیکن واقع میں یہ مدرسہ جس کا تھا، اور جو پیدا ہی کیا گیا تھا، اس مدرسہ کے لئے مدرسہ کے ختم ہونے کا یہی خطرہ یا حادثہ اسی حقیقت اور واقعہ کے ظہور کا ذریعہ بن گیا، اور اب اسی سلسلہ پر میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

مدرسہ میں مستقل قیام

اب تک جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے، اس سے بہر حال اتنی بات عیاں ہو چکی کہ دیوبند میں مدرسہ عربیہ سعیدنا امام الکبیر کی چشم دابرہ کے اشاروں، بلکہ صریح اذن اور عملی پیش قدمی کا رہن منت تھا۔ شہ ۷ کی ناکامی کے بعد اس ”نئے محاذ“ یا لگھات کی ”نئی کمین گاہ“ کے کھولنے میں پیش قدمی بھی ان ہی کے کچھار کے پروردہ شیر بچوں کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، اور فراہمی چندہ کے بشارت نامہ ہی میں آپ کو دعوت بھی دی گئی کہ براہ راست اپنے ہاتھ سے تعلیم کا افتتاح یا مدرسہ کا اجرا کریں۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ قیام مدرسہ سے پہلے بھی، اور قیام مدرسہ کے بعد بھی روح اور قلب تو دیوبند ہی میں، لیکن جسم کہنے یا قالب جس پر دیکھنے والوں کی نظر پڑ سکتی تھی، کچھ خاص اسی موقع پر نہیں بلکہ اپنی فطری عادت اور دوامی طریقے کے مطابق آج بھی نگاہوں سے وہ مخفی تھا۔ مگر عوام نہ یہی، خواص کی آنکھوں سے بھی دیوبند کے مدرسہ سے آپ کا واقعی تعلق کیا مخفی تھا، یا مخفی رہ سکتا تھا۔ محفلہا نہ سہی، لیکن چھتہ کی مسجد کی ”محفل“ میں جو کچھ ہوتا تھا، وہ راز بن کر رہتا تھا، آخر میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں، دیوبند، جو عرض کر چکا ہوں، ضلع سہانپور کے دوسرے مہجول الحال والا اسم قصبات کے ساتھ ساتھ جس زمانہ میں دیوبند نہیں بلکہ عوام کا صرف دینٹر تھا۔ اسی دور افتادہ مقام میں مدرسہ قائم ہوتا ہے، مانا کہ حاجی عابد حسین رحمۃ اللہ علیہ کو قصبہ اور اس کے گرد و نواح میں غیر معمولی ہر دل عزیز حاصل تھی، ان کا ان لوگوں پر کافی اثر و اقتدا بھی تھا، اسی لئے جیسا کہ روداد کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں، بیرونجات کے طلبہ کے قیام و طعام کے نظم میں سہولتیں بھی ہوئیں۔ یوں بھی ”طلبہ نوازی“ مسلمانوں کا موروثی ذوق تھا، اس زمانہ میں بھی اور اس سے پہلے بھی میں تو یہی جانتا ہوں کہ شہروں اور قصبوں ہی کی حد تک نہیں، بلکہ دیہاتوں تک میں بسنے والے

مسلمانوں کے یہاں ”طالب علم کی جاگیر“ ہندوستان کے اربابِ ہمت و ثروت کے لوازمِ زندگی میں داخل تھی لیکن اسی کے ساتھ آپ آئندہ سالوں کی نہیں، بلکہ دیوبند کے اس ”مدرسہ عربی“ کے پہلے سال کی مطبوعہ روداد اٹھا لیجئے۔ اس کے ابتدائی اوراق میں آپ کو بیرونجات کے طلبہ کے متعلق خیبر بھی ملے گی؛

”فقط قصبات ضلع سہارنپور و اضلاع مالک مغربی کے طلبہ ہی نہیں بلکہ

پنجاب و کابل و بنارس

تک کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔“

جس کا مطلب یہی تو ہوا کہ مغرب میں پنجاب سے گذر کر کابل تک طلبہ کو دسمبٹر کا یہ مدرسہ دامن کشاں اپنے احاطہ میں لئے چلا آ رہا تھا، اور مشرق میں ”بنارس“ تک کے طلبہ پہلے ہی سال میں اس مدرسہ کا طالب علم بن چکے تھے۔ بنارس کے نام کی تو رودادیں تصریح کی گئی ہے۔ طلبہ کے خانے پر میری نظر جب اسی روداد میں پڑی تو دوسرے ناموں کے ساتھ ”مولوی بدرالدین عظیم آبادی“ کا نام بھی دیکھا کہ پہلے سال کی اسی روداد میں شریک ہے، مولوی صاحب کی شخصیت سے تو واقف نہیں ہوں، لیکن ”عظیم آبادی“ کی نسبت بتا رہی ہے کہ بنارس سے آگے بڑھ کر عظیم آباد، پٹنہ (بہار) تک کے طلبہ اس مدرسہ کی آغوشِ تعلیم و تربیت میں اپنی جگہ بنا چکے تھے۔

اسی طرح مالی امداد کے سلسلہ میں ذرا ملاحظہ فرمائیے پہلے سال کی اسی روداد کا اور جائزہ لیجئے۔ ان ناموں اور مقاموں کا جن سے ضلع سہارنپور کی گنام آبادی دیوبند میں چندے آنے لگے تھے میری آنکھیں تو بھٹی کی بھٹی رہ گئیں جب چندہ کے خانے میں ایک طرف راجپوتانہ کی پہاڑی ریاست ٹونک سے حکیم عبدالحمید نامی کے چندے کا اور دوسری طرف سینکڑوں میل دور دانا پور (بہار) کے باشندوں کے نام سے بھی پچاس روپے کی رقم کا ذکر کیا گیا ہے۔ سوچتا ہوں تاریکی، دہشت و خوف کے ان بھیانک دونوں کو سوچتا ہوں، چند ہی سال تو گذرے تھے کہ شہر میں بزن و یکش، گیر و دار کے ہنگاموں سے ہندوستان کی زمین خصوصاً مسلمانوں کی آبادیاں کانپ رہی تھیں۔ اس خوفی سمندر اور آتشیں دوزخ

میں نہ دبلا ہوئے کا تماشہ جنھوں نے کیا تھا، ان کی آنکھوں کے سامنے سے تو یہ تماشہ ضرور ہٹ چکا تھا لیکن وہ مرے بھی تو تھے۔ جو اپنے حلقے ادب و دانش کی قوتوں سے ان خونیں، جگر خراش، روح گسل مہیب و ہولناک، انسانیت سوز نظاروں کی یاد کو مٹانا بھی چاہتے تھے تو مٹا نہیں سکتے تھے۔ اپنے بزرگوں عزیزوں، جگر پاروں، دوستوں، ہمسایوں کی پھانسیوں پر لٹکی ہوئی لاشوں، اور ان پابزنجیر دست بطوق سے ہوئے جسموں کو بھولنا ہی چاہتے تھے جو ان ہی کے ساتھ جیل خانوں اور دریائے شور کے دیران جزیروں کو بھرنے کے لئے گھسیٹے جا رہے تھے، لیکن بھول نہیں سکتے ظلم و ستم کے اس طوفانی تلاطم میں گونہ سکون کی کیفیت نو دس سال کے اس عرصہ میں یہ واقعہ ہے کہ پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن یہ توجہ کچھ تھا، یاہر میں تھا، اندر میں تو اب بھی تہلکہ ہی برپا تھا، باطن تو اب بھی ان ستم دیدوں کا غیر مطمئن لرزان و ترسان ہی تھا، پھر مراسلات و مواصلات کے ذرائع بھی اس وقت تک حد سے زیادہ نامکمل تھے، غلغلہ انگیزوں اور شاغبہ بازیوں کے عام ذرائع اخبار اور پریس کی قوت سے ملک اس وقت تک گویا کچھ نا آشنا ہی تھا ٹوٹے پھوٹے شکستہ درپردہ حال میں کچھ ماہوار یا ہفتہ وار اخبار نکلتے بھی تھے۔ یا گنتی کے چند مطابع ملک کے مختلف گوشوں میں جاری بھی ہوئے تھے۔ سو شہر کی افزائش میں ان کا نظام بھی درہم درہم ہو چکا تھا۔ یہ اور اسی قسم کے وہ سارے اسباب و وسائل جن سے کسی چیز کے مشہور کرنے میں کام لیا جائے یا اس وقت جن سے لوگ کام لے رہے ہیں، اس زمانہ میں ہم ان کا شاید تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ پنجاب و کابل، راجپوتانہ، بہار، جو اس زمانے کے لحاظ سے یقیناً دیوبند کے لئے در دست علاقے تھے۔ ان علاقوں سے طلبہ بھی، اور چندے بھی اس تھباتی مدرسہ میں قائم ہونے کے پہلے سال ہی سے کیسے اور کیوں آنے لگے تھے۔ کیا دیوبند کے مقامی بزرگوں کے وجود اور ان کے وجود کے اثر و اقتدار سے ہم اس کی من مانی نہیں، دل نشین اور واقعی صحیح منطقی توجیہ میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟

وہی جس کا جسم دیوبند سے غائب تھا، لیکن روح اس کی ہمہ تن ابتداء ہی سے اس مدرسہ کی بنیاد میں جذب تھی، اس کے تعلق کے سوا کوئی صحیح جواب اس سوال کا دل کو یا دماغ کو مل سکتا ہے؟ اور سچ تو ہے کہ مدرسہ کی پہلی مجلس شوریٰ کے ارکان اور مدرسہ کے پہلے امتحان تک کے کاموں میں روح کے ساتھ اسکے

جسم مبارک کو ہم جب حاضر ہی پاتے ہیں، تو غالب کی یہ مجازی غیر حاضری بھی مجازی ہونے کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتی ہے؟ جن کی نظر مجاز پر تھی، وہ نہ سہی، لیکن ملک کے طول و عرض میں حقیقت شناسوں کا طبقہ بھی تو تھا۔ مسلمانوں کے دینی تعلیم کے اس سب سے پہلے اجتماعی نظام کے عملی قالب ”مدرسہ عربی دیوبند“ سے سیدنا الامام الکبیر کا جو تعلق تھا، ان کی نگاہوں سے بھی کیا یہ تعلق ادھیل رہ سکتا تھا؟ ”غیب“ کے ”لا یختبئ“ قوانین کے نتائج و آثار کا جھینس تجربہ نہیں ہے، وہ یہی سمجھ سکتے ہیں کہ ظاہری اسباب کی رو سے بھی ضلع سہارنپور کی اس قصبائی آبادی میں قائم ہونے والے مدرسہ میں پنجاب و کابل، بنارس و عظیم آباد، ٹونک (راجپوتانہ)، دانا پور (بہار) سے طلبہ اور مالی امداد کے سلسلہ کا شروع ہو جانا محل حیرت و استعجاب نہیں ہو سکتا، واقعہ یہ ہے کہ دیوبند و اطراف دیوبند کی آبادیوں پر حاجی عابد حسین صاحب کا جو اثر و اقتدار تھا، سیدنا الامام الکبیر کی اس زمانہ تک تقریباً سارے ہندوستان کی اسلامی آبادیوں سے یہی نسبت قائم ہو چکی تھی، اور شاید یہی وجہ ہوئی کہ دیوبند کے جس مقامی مدرسہ کے لئے ہندو گیارہ سارے اسلامی ممالک کا ”عالمگیر جامعہ“ بن جانا مقدر ہو چکا تھا، اسی تقدیر کو تدمیر کے قالب میں لانے کیلئے کہ ایک طرف بظاہر شرکی صورت میں یہ حادثہ پیش آیا کہ از بیخ کندہ ہو جائے کا خطرہ حاجی عابد حسین صاحب کے قطع تعلق کی وجہ سے مدرسہ کے لئے پیش آیا، اور دوسری طرف جیسا کہ اسی روداد میں لکھا ہے کہ

”باشندگان دیوبند میں بظاہر ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا کہ اس کام کا تکفل ہوتا“

یہ صورت حال ہی ایسی تھی کہ مجاز کا جو پردہ حائل تھا، وہ بھی سامنے سے ہٹ جائے اور وہ ہٹ گیا، قلب کے ساتھ ساتھ قالب بھی اس کا دیوبندی پہنچ گیا، جسے ابتدا و قیام مدرسہ کے وقت تاریخ کی آنکھیں ڈھونڈھ رہی ہیں۔ اور تھک تھک کر واپس ہوتی ہیں کہ آخر جس کا یہ مدرسہ تھا اور جو اس مدرسہ کے لئے تھا، وہی آج کیوں غائب ہے؟

صحیح تاریخ متعین ہو سکتی ہو، یا نہ ہو سکتی ہو، اور جس شخص کی ولادت کی تاریخ تو تاریخ ہمیں تک کو اس کی طفولیت و شباب و کہولت کے رفیق ہمارے مصنف امام تک متعین کرنے سے اپنے آپ کو قاصر و معذور بتا رہے ہوں تو ایسی عجیب و غریب شخصیت کے متعلق دارالعلوم کی ودامی خدمت کیلئے

دیوبندیوں میں مستقل قیام کی تاریخ ہم جیسے دور افتادوں کے لئے کچھ مبہم ہو کر اگر رہ جائے تو اس پر تعجب کیوں کیجئے۔ زیادہ سے زیادہ بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ مدرسہ کے کاروبار کا جو تکفل ہو، جب دیوبندیوں کوئی ایسی ہستی بظاہر باقی نہ رہی، یا نظر نہ آئی، تب لائے پر دیوبند والے اور آنے پر سیدنا الامام الکیہ بھی مجبور ہو گئے۔ اسی کے بعد مدرسہ سے آپ کا وہ عجیب و غریب باہمہ و بے ہمہ رشتہ نفس و الپسین تک قائم رہا کہ ایک طرف مصنف امام تو سیدنا الامام الکیہ کے بارہ میں یہ فرماتے ہیں کہ

”ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہو گئے۔“

اور دوسری طرف منانے والے مسلسل ہی سناتے چلے آ رہے ہیں کہ

”دارالعلوم دیوبند میں مولانا محمد قاسم نے نہ درس دیا، اور نہ اس کے اہتمامی و انتظامی شعبوں سے بظاہر بحیثیت عہدہ کے کسی قسم کا کوئی تعلق آپ کا کبھی قائم ہوا۔“

”باہمہ اور بے ہمہ“ کا یہ حیرت انگیز رشتہ اس لئے بھی عجیب تھا کہ ”ہر طرح سرپرست“ بن جانے کے بعد یہ واقعہ ہے کہ آپ دارالعلوم تھے اور دارالعلوم آپ ہی کا وجود باوجود تھا، لیکن مجھ ہی سے آپ سن چکے کہ مدرسہ کی دوات کی سیاہی کے ایک قطرہ کا بھی بلا معاذہ صرف کرنا، فقط اسی کو اپنے لئے کبھی آپ نے جائز نہیں قرار دیا۔ جس میں سیاہی کے چند قطرات ہی ہیں، کچھ خرچ تو ہوتا تھا، بلکہ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ ”سردخانہ“ سے صفاتی استفادہ جس سے نہ سرد خانے کی ذات میں کوئی کمی پیدا ہوتی تھی، اور نہ صفات میں اس استفادہ کا بھی حقدار اپنے آپ کو نہیں خیال کیا، اور شدید طبعی حرارت مزاج کے باوجود موسم گرما کی تپش اور لو کی تکلیف کے برداشت کر لے ہی کو اپنی دلی راحت کی ضمانت ٹھہراتے رہے۔ قدس اللہ سرہ و دفعنا اللہ بمائتہ الطیبہ الطاہرۃ اللزہ الباہرۃ۔

بہر حال میرٹھ میں قیام مدرسہ کے بعد آپ جتنے دنوں بھی رہے ہوں، لیکن مصنف امام کے بیان کو مطابقت نامانے پر بہر کیف ہم مجبور ہیں کہ

”شروع مدرسہ میں آپ دیوبند رہے اور ہر طرح اس مدرسہ کے سرپرست ہو گئے۔“

اب ”شروع“ کے لفظ کو سامنے رکھتے ہوئے ”قالب“ کی دوری کے ان دنوں کی نوعیت جتنی بھی چاہی

متعین کر لیجئے، ان دنوں میں مدرسہ میں کیا کیا ہوا، ہندوستان کے عربی، دینی تعلیم کے قدیم نظام کے مقابلہ میں، دیوبندی سلسلہ کے اس جدید نظام میں جن امتیازی خصوصیات کو ہم پاتے ہیں، ان میں کتنی باتوں کا اضافہ سیدنا الامام الکبیر کی مستقل تشریف آوری اور ہر طرح سرپرست بن جانے کی پہلے اس مدرسہ میں ہوا، ان امور کی تفصیل جیسا کہ کہتا چلا آ رہا ہوں، دارالعلوم کی تاریخ لکھنے والوں کا علمی فریضہ ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ جماعت بندی، رجسٹر حاضری، امتحان تحریری جیسی باتیں جن سے حکومت قائمہ کے نئے نظام تعلیم نے ملک کو روشناس کیا تھا، شروع ہی سے ان کی افادیت اور ضرورت کو محسوس کر کے قبول کر لیا گیا ہو، آخر حاجی سید عابد حسین صاحب مرحوم جن کے ہاتھ میں مدرسہ کے اہتمام و انتظام کی باگ ابتدا میں سپرد کی گئی تھی۔ وہ اجتماعی تعلیم کے ان عصری لوازم و خصوصیات سے ماہانہ کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں، لیکن مولنا فضل الرحمن اور مولنا ذوالفقار علی خاں بھٹو جی تو عمر ہی ان چیزوں کے عملی تجربوں کی دشت نمائی میں گزری تھی، طالب علمی کے زمانہ میں بھی، اور ملازمت کے ایام میں بھی، دونوں دینی عربک کالج کے صدر مولنا مملوک علی سے تلمذ کا تعلق رکھتے تھے، اور حکومت کے محکمہ تعلیمات میں منسلک ہو کر ڈپٹی انسپکٹر کے عہدوں تک پہنچے تھے۔ ان نئے اصلاحات کے لئے ان ہی دونوں بزرگوں کا وجود کافی تھا، پھر سیدنا الامام الکبیر بھی مسکنانی بعد کے باوجود حقیقتہً اس مدرسہ سے جتنے قریب تھے، ان کے مشوروں سے بھی اثر پذیر ہونے کی راہیں اس زمانہ میں بھی کھلی ہوئی تھیں لیکن براہ راست حضرت والا کا قیام چونکہ مدرسہ میں ابھی نہیں ہوا تھا، اس لئے وقفہ کی اس مدت کے متعلق جو کچھ بھی عرض کیا گیا، اپنی بحث کے حقیقی دائرہ سے تجاوز کے بعد ہی عرض کیا گیا، لیکن میرٹھ چھوڑ کر دیوبند میں مستقل قیام کا فیصلہ کرنے کے بعد جب مدرسہ کے کاموں سے آپ کا وہ عجیب و غریب اچھوتا ہوا انوکھا رشتہ ”بابہ اور بے ہمہ“ والا قائم ہوا، یعنی سب کچھ ہونے کے باوجود دیکھنے والے یہ بھی دیکھ رہے تھے، کہ آپ ”کچھ نہیں“ ہیں۔ اس ”عہد“ کے متعلق مجھے اعتراف کرنا چاہئے، کہ جن جن سوالوں کے جوابوں سے واقف ہونے کی ضرورت ہے، اور اس سلسلہ میں جس نوعیت کی ”معلومات“ کو دل ڈھونڈنا ہے، جیسا کہ چاہئے، ان کی فراہمی میں تو کھامیاب نہ ہو سکا، تاہم تلاش و جستجو سے اب تک جن امور تک

رسائی میرے لئے آسان کی گئی ہے، انہیں ہمیشہ کر دیتا ہوں، جن سے اس کا بھی پڑھنے والوں کو اندازہ ہوگا کہ دینی نظام تعلیم کے اس نئے قالب و بیگل میں جن کام کر دار العلوم دیوبند ہے، اس میں سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے منشاء کے مطابق کتنی باتیں پوری ہو چکی ہیں، اور کتنی اس وقت تک تشنہ تکمیل ہیں، و اللہ ولی الامور والتوفیق۔

دَارُ الْعُلُومِ كَانِصَابِ تَعْلِيمٍ

سب سے پہلا مسئلہ ”نصاب تعلیم“ کا ہے۔ دارالعلوم میں جو کچھ پڑھا پڑھایا جاتا ہے۔ یا پڑھ پڑھ کر اب تک جو لوگ اس مدرسہ سے فارغ ہوئے ہیں، ان کو دیکھ کر عام رائے یہی قائم ہو سکتی ہے کہ دارالعلوم کی تاریخ میں ”نصاب تعلیم“ کے مسئلہ پر شاید کبھی غور نہیں کیا گیا، اور من و عن ”درس نظامیہ“ کا جو نصاب تھا اسی کو قبول کر لیا گیا ہے، الزام لگایا جاتا ہے کہ زمانہ کے جدید تقاضوں کی طرف سے چشم پوشی اختیار کی گئی، اس میں شک نہیں کہ جو دیکھا جا رہا ہے، اس کو دیکھ کر کہنے والے آخر اذکر کیا کہہ سکتے ہیں، لیکن سیدنا الامام الکبیر کا نقطہ نظر اس باب میں کیا تھا، اس کا اندازہ حضرت دالاک اس تقریر سے کر سکتے ہیں جو خوش قسمتی سے ۱۲۹ھ کی ردا میں شریک کر دی گئی ہے، وہی مطبوعہ شکل میں میرے سامنے ہے۔ طلبہ جو فارغ ہوئے تھے، ان کو سند و انعام دینے کے لئے ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹ھ مطابق ۹ جنوری ۱۸۷۲ء میں یہ جلسہ دیوبند میں منعقد ہوا تھا، گویا عصری یونیورسٹیوں میں ”کانوڈکیشن“ کے اجلاس کی جو نوعیت ہوتی ہے، کچھ اسی طرز کا جلسہ تھا، اطراف و جوانب سے بھی کافی تعداد مہانوں کی اس تعلیمی تقریب میں شریک ہونے کے لئے دیوبند پہنچی تھی، فارغ ہونے والے طلبہ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، مغلہ دوسری خصوصیتوں کے ایک خصوصیت اس ”تعلیمی حقلہ“ کی یہ بھی نظر آتی ہے، کہ جن علوم و فنون کی تعلیم فارغ ہونے والے طلبہ کو دی گئی تھی، ان میں سے کسی فن اور علم کے کسی خاص موضوع پر امتحانی مقالے لکھوائے گئے تھے، یہی مقالے لوگوں کو

سنائے گئے۔ یہ مقالے بھی رد و اد میں شائع کر دیئے گئے تھے، جن کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں دیوبند کے اس مدرسہ کا تعلیمی معیار کتنا بلند ہو چکا تھا، گویا سمجھنا چاہئے، کہ مختلف یونیورسٹیوں کے آخری مدارج مثلاً ایم۔ اے یا ریسرچ وغیرہ کی کلاسوں میں جیسے مقالے (Essays) لکھوائے جاتے ہیں، دارالعلوم کے نظام تعلیم میں انہی سال گویا ایک صدی پہلے یہ سنت جاری ہو چکی تھی، جو افسوس ہے کہ بعد کو جاری نہ رہی، اور کہہ سکتا ہوں کہ یونیورسٹیوں کے ”کانوڈیشن“ کے جہاں میں خطبوں، یا ایڈریسوں کا جو عام رواج ہے، تقریباً کچھ اسی رنگ میں سیدنا الامام الکبیر نے ایک تقریری خطبہ عطاءئے اسناد و انعام کے اس جلسہ میں ارشاد فرمایا تھا، خطبہ کافی طویل ہے، اور جیسا کہ چاہئے گوناگوں حقائق و معارف سے لب ریز ہے، سارے نفاذ جن پر اس خطبہ میں بحث کی گئی ہے، ان کے پیش کر لئے کا نہ یہ موقع ہے، اور نہ ضرورت، بلکہ نصاب تعلیم کے متعلق اپنی اس تقریر میں حضرت والائے جن اصولی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے، صرف ان ہی کا ذکر یہاں مقصود ہے۔

لیکن اصل تقریر کے الفاظ کو پیش کرنے سے پہلے چاہئے کہ ایک بات سمجھ لی جائے۔ میرا مطلب یہ ہے، کہ ہمارے عربی و دینی مدارس کے تعلیمی نصاب کے متعلق سب سے زیادہ اہم سوال یہی ہے کہ عصر حاضر کے عام علمی حلقوں میں اتنا زور و قاریورپ کے جن جدید علوم و فنون اور اسنسہ یا زبانوں سے آگاہی حاصل کئے بغیر علمی کاروبار کرنے والے حاصل نہیں کر سکتے، ان کا پیوند اپنے یہاں کے دینی علوم، اور دوسرے عقلی و ذہنی تعلیم و فنون سے کیسے قائم کیا جائے۔

اب تو تقریباً علماء کی اکثریت اس سوال کی اہمیت کو محسوس کرنے لگی ہے، لیکن یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ پیوند قدیم و جدید علوم و فنون میں کیسے قائم کیا جائے۔ کیا دینی علوم اور قدیم تدریسی فنون کے ساتھ ساتھ جدید علوم و اسنسہ کی کتابیں بھی نصاب میں شریک کرنی چاہئیں؟ یا جدید علوم و فنون سے فارغ ہونے کے بعد اسلامی علوم کے سیکھنے کا موقع طلبہ کے لئے فراہم کیا جائے؟ یہ دونوں صورتیں تو ایسی ہیں جو ہندوستان کے بعض تعلیمی و تدریسی اداروں میں زیرِ تجربہ بھی آچکی ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء (دکن) اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبہ دینیات میں مشترک نصاب کے طریقہ کو اور سلم یونیورسٹی میں

بی۔ ٹی۔ ایچ۔ کی کلاسوں کو کھول کر دوسرے طریقہ کو عملاً آزمایا جا چکا ہے جس کے نتائج بھی لوگوں کے سامنے آچکے ہیں، لیکن اسی سلسلہ میں ایک تیسرا احتمال بھی غفلتاً پیدا ہوتا ہے۔ یعنی پہلے مسلمان بچوں کو دینی و اسلامی علوم سے کم از کم وقت میں قدر ضرورت کی حد تک واقف بنالینے کے بعد ان کو جدید علوم و فنون کی یونیورسٹیوں میں شریک کیا جائے، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انفرادی طور پر اس ترتیب سے بھی تعلیم پانے والے چند گنے چنے اشخاص ہندوستان میں جدید یونیورسٹیوں کے قیام کے بعد ضرور پیدا ہوئے ہیں، لیکن تقریباً ایک صدی کی طویل مدت میں اتنے طویل و عریض ملک جیسا کہ ہندوستان ہے، اس میں شاید اتنی تعداد بھی اس قسم کے تعلیم یافتوں کی نہیں مل سکتی، جن کو گنتے کے لئے دس انگلیوں کے استعمال کی ضرورت ہو، مگر باوجود اس کے شاید یہ کہتا واقعہ کا اعتراف ہوگا، کہ اسی تیسرے نہج پر تعلیم پانے والوں میں علم و عمل کے جن نمونوں کا اس وقت تک مشاہدہ کیا گیا ہے، شاید ان کی مثال مذکورہ بالا دو طریقوں پر تعلیم حاصل کرنے والوں میں ہم نہیں پاسکتے۔
 الا ماشاء اللہ وقلیل ماہم۔

بہر حال جدید و قدیم علوم کے ”پیوند“ کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے، عملی تشکیل کی یہی تین عقلی صورتیں ممکن ہیں، اب دیکھئے کہ سیدنا الامام الکبیر کا زادیہ نگاہ اس باب میں کیا تھا، ”مجلس عطلے اسناد و انعام“ کے اسی جلسہ میں تقریر فرماتے ہوئے، دوسری باتوں کے ساتھ آخر میں یہ فرماتے ہوئے کہ
 ”اب ہم اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے کہ درجہ تحصیل، یہ طریقہ خاص کیوں تجویز کیا گیا“

طریقہ خاص سے مراد یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں جدید علوم و فنون اور السنہ کی کتابیں کیوں شریک نہیں کی گئیں، خود ہی اجمال کی تفصیل آگے ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے کہ
 ”اور علوم جدیدہ کو کیوں نہ شامل کیا گیا“

سب سے پہلی بات تو صرف اسی سوال سے یکجہ میں آتی ہے، کہ جدید علوم و فنون کے سوال سے جو یہ باور کر لیا گیا ہے، یا اب بھی باور کر لیا جاتا ہے، کہ ہمارے علماء قطعاً خالی الذہن تھے، افتراء یا اتہام کو سوا

وہ کچھ نہیں ہے۔ کم از کم دیوبندی حلقہ کے علماء کی ذمہ دار ہستیوں کا دامن تنگ خیالی اور جمود کے اس داغ سے پاک تھا۔ اس کے لئے تو یہی کافی ہے کہ اس طبقہ کے سب سے بڑے پیشوا، امام کبیر کے سامنے ہی نہیں کہ صرف سوال ہی تھا، بلکہ جو جواب اس سوال کا دیا گیا ہے، اسے سنئے، اور انصاف سے کہئے کہ تقریباً ایک صدی پہلے حضرت دلا کا ذہن جن اشتباہی پہلوؤں کو چاک کر کے نتیجہ تک پہنچ چکا تھا، کیا اس وقت تک فراخ چشمیوں کے مدعوں کا گردہ وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہے؟

اس سوال کی جوابی تقریر سیدنا الامام الکبیر کے ان الفاظ سے شروع ہوئی ہے، فرمایا گیا تھا کہ ”منجملہ دیگر اسباب کے، بڑا سبب اس بات کا تو یہ ہے۔“

”دیگر اسباب“ جن کی طرف اجمالی اشارہ فرمایا گیا، ان کا ذکر تو بعد میں کر دوں گا، پہلے ”سب سے بڑے سبب“ کی تفصیل ان ہی کے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہوں، ٹھنڈے دل کے ساتھ فکر معقول سے کام لیتے ہوئے، ان گرامی ارشادات کا مطالعہ کیجئے، سب سے پہلے ایک کلی قاعدے کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا تھا کہ

”تربیت عام ہو، یا خاص، اس پہلو کا لحاظ چاہئے، جس کی طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو۔“

مطلب یہ ہے، کہ افراد ہوں، یا جماعتیں، ان کے اٹھان، اور جن کمالات تک ان کو پہنچانا مقصود ہو، سب سے پہلے توجہ کے تحت اس سلسلہ میں وہی معاملات ہوتے ہیں، بلکہ چاہئے کہ وہی ہوں، جو سب سے زیادہ کس میسر اور لا پرواہی کا شکار ہو چکے ہوں، ایک شخص جس کے بدن پر کھادی ہی کا کرتہ کیوں نہ ہو، لیکن کرتہ کے ساتھ یہ دیکھا جاتا ہو کہ نیچے کا بدن اس کے بالکل ٹھکا ہے، تو ظاہر ہے کہ کھادی کے کرتہ کی جگہ ریشمین قمیص کی فکر سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہو گا کہ بے ستری سے محفوظ کرنے کے لئے لنگی یا پانچا مسکاتلم اس غریب ننگے کے لئے کیا جائے۔

جس زمانہ میں یہ تقریر ہو رہی تھی، اس وقت تعلیمی راہ سے مسلمانان ہند کی تربیت و اصلاح کے

مسئلہ کی نوعیت مذکورہ اصول کی روشنی میں کیا ہونی چاہئے، اسی کا جواب دیتے ہوئے پہلا فقرہ یہ فرمایا گیا تھا

”سواہل عقل پر روشن ہے، کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس قدر ترقی پر ہے، کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی“

جس کا مطلب جیسا کہ ظاہر ہے یہی تھا کہ تعلیم علوم جدیدہ کی افادیت ہی کے آپ منکر تھے، اور نہ آپ کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو ان علوم و فنون سے الگ تھلگ رہنا چاہئے، جن سے ملک کو نئی قائم ہونے والی حکومت نے روشناس کیا ہے۔ توجہ صرف اس پر دلائی گئی، کہ خود حکومت کی طرف سے جن علوم و فنون کی پڑھنے پڑھانے کا نظم و وسیع پیمانے پر کیا جا چکا ہے اور آئندہ کیا جائے گا۔ اور کیسا نظم و وسیع؟ کہ بقول حضرت دلا اتنی سرپرستی قدیم علوم، اور اسلامی فنون کو گذشتہ سلاطین اور مسلمان بادشاہوں کی طرف سے بھی کبھی میسر نہیں آئی تھی،

علوم جدیدہ کی عام اشاعت و ترقی کے اس تذکرہ کے بعد ارشاد ہوا کہ
 ”ہاں! علوم نقلیہ (یعنی خالص دینی و اسلامی علوم،) کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا“

علوم جدیدہ، اور علوم اسلامیہ دنیویہ دونوں کے باہمی تعامل کی تصویر جو حقیقت اور واقعہ کی عکاسی تھی، اس کو پیش کرنے کے بعد نتیجہ کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا تھا کہ
 ”ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا، تحصیل حاصل نظر آیا“

گویا مثال اس کی وہی ہوئی، کہ جو کرتے ہی نہیں رہیں قیص پہنچے ہوئے ہے، اس کی قیص میں قیصوں کا اضافہ کیا جا رہا ہے، لیکن جس وجہ سے غریب ننگا ننگا کھلاتا ہے، اور عربانی و بے ستری کی مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہے، اسی سے لاپرواہی برتی جا رہی ہے۔

بہر حال جس چیز کی متکفل غیر محدود ذرائع رکھنے والی حکومت ہو، اسی کے اضافہ میں محدود ذرائع رکھنے والے محکموں اور رعایا کی آمدنی کو خرچ کرنا، اور اس کے لئے امدادی چندوں کا باران ہی غریبوں

کے سرڈانا، حضرت والا کا خیال تھا کہ تحصیل حاصل کے سوا اسے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

آپ نے اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ پبلک کے عام چندوں، اور مالی امداد سے استفادہ کی اسی لٹریٹرین عقل و دانش یہی تدبیر نظر آئی، کہ حکومت جن علوم کی سرپرستی کر رہی ہے، ان کو تو حکومت کے سپرد رکھا جائے۔ لیکن مسلمان جس علم سے محروم رہ جانے کے بعد مسلمان باقی نہیں رہ سکتے، اور نئی حکومت اپنے خاص حالات کی وجہ سے مسلمانوں کے ان علوم کی سرپرستی سے صرف دست بردار ہی نہیں ہو گئی ہے بلکہ واقعات بتا رہے تھے کہ نئی حکومت کے پیدا کئے ہوئے ماحول میں زبونی کے آخری حدود تک وہ پہنچ چکے ہیں، ان علوم کے احیاء و بقا کا انتظام رعایا کی مالی امداد سے کیا جائے، اور یہی مطلب ہے ان الفاظ کا جو آگے اسی تقریر میں پائے جاتے ہیں، یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب میں اسی لئے ارشاد ہوا کہ

”صرف بجانب علوم نقلی (یعنی خالص اسلامی و دینی علوم)، اور نیز ان علوم کی طرف جن سے

استعداد علوم مرؤبہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے (انعطاف) ضروری سمجھا گیا۔“

آپ دیکھ رہے ہیں، دارالعلوم کے نصاب میں خالص دینی و اسلامی علوم (قرآن و حدیث و فقہ و غیرہ) کے ساتھ ساتھ عقلی و ذہنی فنون کی شرکت کی توجیہ کرتے ہوئے، حضرت والا نے جہاں اس عام اور مشہور غرض کا تذکرہ فرمایا ہے، یعنی مسلمانوں کے ”علوم مرؤبہ“ کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، قبل و قال، جو اب و سوال سے فکری و دذش کر کے طلبہ میں دقیقہ سمجھوں، موثر گائیڈوں کے ملکہ کو ابھارا جاتا ہے ”استعداد علوم مرؤبہ“ سے یہی مراد ہے۔

خیر یہ تو عام بات ہے، بیان کرنے والے عموماً اس کو بیان بھی کرتے ہیں، لیکن خصوصی توجہ کے ساتھ پڑھنے کا مستحق توجیہ کا دوسرا پہلو ہے، یعنی یہ جو فرمایا گیا ہے کہ

”اور استعداد علوم جدیدہ، یقیناً حاصل ہوتی ہے۔“

جس کا مطلب اس کے سوا، اور کیا ہو سکتا ہے، کہ دارالعلوم کے مرؤبہ نصاب میں حضرت والا یہ سمجھانا چاہتے ہیں، ایک پہلو یہ بھی ہے، کہ اس نصاب کو پڑھ کر فارغ ہونے والوں میں ”علوم جدیدہ“ کے

حاصل کرنے کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، گویا ”علوم جدیدہ“ کی تعلیم کا مقدمہ بھی دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نصاب بن سکتا ہے، اور چاہا جائے تو اس سے یہ کام بھی لیا جاسکتا ہے، دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب کے متعلق حضرت والا کا یہ جدید نقطہ نظر ہے، جس کی طرف آپ نے صرف اسی اجمالی اشارہ سے ہی توجہ نہیں دلائی ہے، بلکہ خالص دینی و اسلامی علوم کے مقابلہ میں مدرسہ کے نصاب کے عقلی و فنی فنون کا ”علوم دانش مندی“ کے عنوان سے تذکرہ کرتے ہوئے اپنے صحیح تعلیمی نصب العین کو سیدنا امام الکبیر نے کھلے کھلے واضح الفاظ میں پیش فرما دیا ہے، آگے اسی تقریر میں اس کا اعادہ کرتے ہوئے کہیوں

”علوم نقلیہ، اور ان کے ساتھ علوم دانش مندی کو داخل تحصیل کیا“

اپنی اس تجویز سے اسی زمانہ میں سننے والوں اور سمجھنے والوں کو آسگاہ فرما دیا تھا کہ

”اس کے بعد یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد اگر طلبہ

مدرسہ ہذا، مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں بات

زیادہ مؤید ثابت ہوگی“

زما سوچئے کہ غم و غصہ، بے زاری، اور دل انگاری کے ان ایام کو جن میں مسلمانوں کو ہندوستان حبس

اقلم کی شہنشاہیت سے محروم کر کے غلام بنالیا گیا تھا، جو آسمانوں پر تھے زمین پر پٹک دیئے گئے تھے،

ان کے قلوب میں جیسا کہ چاہئے تھا، قدرتاً اس قوم کی طرف سے انتقام اور نفرت کی آگ بھری ہوئی ہو

جس کے ہاتھوں اس سیاہ انجام تک وہ پہنچے تھے۔ ہر وہ چیز جو اس قوم کی طرف منسوب تھی، فطرتاً

اس سے مسلمان بھڑکتے تھے، بلکہ چڑھتے تھے۔ انگریزی مدارس اور ان مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا

تھا، اس کے تصور سے بھی وہ لرزہ بر اندام ہو جاتے تھے۔ ”جو انگریزی پڑھے گا وہ کافر ہو جائیگا“

مولویوں کی طرف اس تکفیری لطیفہ کو مسخروں نے جو منسوب کر رکھا ہے، بجائے خود افتراء و بہتان کی

بینی بھی شرمناک مثال ہو، لیکن اس کا شاید انکار نہیں کیا جاسکتا، کہ اسلامی آبادیوں کی فضا کچھ ایسی قسم

کی صداؤں سے معمور ضرور تھی، اس نے فتویٰ دیا، اب دیا، ان سوالوں سے بے تعلق ہو کر کہنے والے کچھ

اسی قسم کی باتیں کہہ رہے تھے، اور اسی نوعیت کے چرچے عموماً پھیلے ہوئے تھے۔

لیکن اسی مسموم فضا، اور غلط فہمیوں سے بھرے ہوئے ماحول میں سیدنا امام الکبیرؑ یہی نہیں کہ انگریزی مدارس میں داخل ہو کر تعلیم پانے کے جواز ہی کا فتوے دے رہے ہیں، بلکہ بغیر کسی حجب کے مولویوں کی بھری ہوئی مجلس میں اعلان فرما رہے ہیں کہ سرکاری مدارس میں شریک ہو کر علوم جدیدہ کی تعلیم علمی کمالات کے چمکانے، اور آگے بڑھانے میں مولویوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف اسی زمانہ میں مولویوں کا ایک طبقہ تھا، بلکہ ان کی اکثریت یہ باور کئے بیٹھی تھی کہ جو کچھ انہوں نے پڑھ لیا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے، جسے سیکھا اور پڑھا جائے۔ ان ہی مولویوں کو دریاں بیکار نے دلا بیکار رہا ہے، کہ مولویوں میں اپنے علمی کمالات میں جو مزید فروغ، اور زیادہ وزن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ چاہئے کہ یورپ کے جدید علوم و فنون کا مطالعہ کرے، ان کی علمی زبانوں کو سیکھے، جو سرکاری مدارس میں سکھائی جاتی ہیں، یقیناً حضرت والا کے ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے اور میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ یورپ کے جدید علوم و فنون کی اہمیت و ضرورت کا انکار جسے اس زمانہ میں عموماً ہمارے علماء نے اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ یہی نہیں، کہ صرف انکار ہی کی حد تک بات محدود تھی بلکہ

”دیوبندی نظام تعلیم“

کے امام اول و اکبر نے ٹھیک وقت پر ان جدید عصری علوم کی ضرورت و اہمیت ہی کو تسلیم کر لیا تھا، بلکہ جن الفاظ میں حضرت والا نے اپنے نقطہ نظر کو پیش کیا ہے۔ اس سے آگاہ ہونے کے بعد بلا خوف و تردید بآسانی یہ دعوے کیا جاسکتا ہے کہ علوم اسلامیہ کے ساتھ یورپ کے جدید علوم و فنون، والہانہ کے پیوند لگانے کے سلسلے میں مذکورہ بالا تین عقلی شکلوں یعنی دونوں کی تعلیم ساتھ ساتھ دلائی جائے، یا عصری علوم سے فارغ ہونے کے بعد جو پڑھنا چاہتے ہوں انکے لئے اسلامی علوم کے پڑھنے کا نظم کیا جائے۔ یا مسلمانوں کو دینی و موردی علوم میں بقدر ضرورت بصیرت حاصل کر لینے کے بعد مسلمان بچوں کو دانش نو سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم کئے جائیں، ان ہی تین شکلوں میں تیسری شکل کو اپنے نصب العین میں حضرت والا نے شریک کرنا چاہا تھا، اپنی اسی تقریر میں آپ نے اس کا بھی جواب دیا ہے کہ بجائے قدم و تاخیر کی اس ترتیب کے

قدیم و جدید علوم کا مشترک نصاب دارالعلوم دیوبند میں کیوں جاری نہیں کیا گیا، یعنی ہر دو صنف کے علوم کی کتابیں ساتھ ساتھ پڑھائی جائیں، ایسا کیوں نہ کیا گیا، جواب میں فرمایا گیا ہے کہ ”زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تکمیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے۔“

ایک مطلب تو اس کا ظاہر ہے کہ اسلامی و دینی علوم کی صحیح بصیرت حاصل کرنے کے لئے جن فنون کی تعلیم بطور مقدمہ دی جاتی ہے، صرف و نحو، ادب، معانی، بیان، اصول فقہ، کلام اور علوم دانش مندی جن سے ذہنی ورزش کا کام لیا جاتا ہے۔ ان سب کو چھوٹے سے چھوٹے مختصر ترین نصاب کے لئے بھی، اتنی کتابوں کی ضرورت ہے کہ ان کے ساتھ علوم جدیدہ کی کتابوں کی گنجائش بہ شکل نکل سکتی ہے۔ اور طلبہ پر کسی نہ کسی طرح اس ناقابل برداشت بوجھ کو لا دیا جائے تو ”طلب الكل فوت الكل“ کے سوا عموماً کوئی دوسرا نتیجہ سامنے نہیں آئے گا۔ پوری محنت اور توجہ جس کے بغیر صحیح استعداد طلبہ میں پیدا نہیں ہو سکتی، سیدنا الامام الکبیر سی فرماتا چاہتے ہیں۔ قدیم و جدید دونوں علوم اس سے محروم رہ جائیں گے۔ آپ کے بیان کا یہ تو خیر کھلا ہوا پہلو ہے، اسی کے ساتھ اگر اس کو سوچا جائے کہ جس زمانہ میں یہ تقریر کی گئی تھی، یعنی آج سے ستراسی سال پہلے حالت یہ تھی کہ مشرقیات کے پڑھنے پڑھانے والے ہمارے علماء اور مغربی علوم کے معلمین، پروفیسروں اور ڈیپارٹمنٹوں کا طبقہ دونوں کے پڑھنے پڑھانے کا صرف طریقہ ہی مختلف نہ تھا، بلکہ مشرقیات کو اساتذہ پر عموماً عقیدت و یقین و ادب سلف کے احترام کے جذبات غالب تھے، اور اس کے برعکس مغربی علوم و فنون کی تعلیم جو دیتے تھے، وہ شک وارتیاب، بے اعتمادی، مطلق العنانی کی ذہنیت کے دباؤ کے نیچے دبے ہوئے تھے اور مرض متعدی کی طرح ان سے پڑھنے والوں میں اسی ذہنیت کے جراثیم قدرتاً منتقل ہوتے رہتے تھے اب تو مختلف اسباب و وجہ کے کسروانکسار کی بدولت ایک صدی کی طویل مدت میں دونوں طبقوں کے رجحانات میں اتنا بعد و تخالف باقی نہیں رہا ہے

لیکن جس عہد میں قدیم و جدید نصاب کے پیوند کے اس مسئلہ کو سیدنا الامام الکبیر نے اٹھایا تھا، اس وقت یہ واقعہ ہے کہ ان دو مختلف، قطعاً مختلف احساسات و رجحانات والے اساتذہ کو ایک ہی

زمانہ میں تعلیم پانے والوں کے متعلق اگر یہ تخمینہ کیا گیا تھا کہ قدیم ہو، یا جدید دونوں ہی سے صحیح مناسبت نہ پیدا ہو سکے گی، تو جو واقعات تھے، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے صحیح بصیرت کسی اور نتیجہ تک شاید پہنچ بھی نہیں سکتی تھی، الغرض "نقصان استعداد" کے جس اندیشہ کا اظہار مندرجہ بالا تقریر میں کیا گیا ہے۔ ایک پہلو اس اندیشہ کا یہ بھی ہو سکتا ہے۔ آخر استادوں کے ایک حلقہ میں جن علوم و مسائل کی قدرو قیمت طلبہ پر واضح کی جاتی ہو، اور دوسرے حلقے میں پہنچنے کے ساتھ ان ہی کے وزن و وقار سے طلبہ کو خالی الذہن کر دیا جائے، اثبات و نفی کے اس قصہ میں اگر ہر دو کو "نفی" ہوتی ہے، تو ان دو متضاد طریقہ تعلیم کا خود ہی سوچنے دوسرا انجام ہی کیا ہو سکتا ہے۔

ادریہ وجہ تو اس بات کی تھی کہ قدیم و جدید علوم کا مشترکہ نصاب دارالعلوم دیوبند میں کیوں نافذ نہیں کیا گیا۔ بلکہ بجائے اس کے سیدنا الامام البکیر نے اپنے اس تعلیمی نظریہ کو پیش کیا ہے کہ پہلے دینی و اسلامی علوم کا نصاب دانش مندی کے فنون کے ساتھ ختم کر لیا جائے، جن کے بغیر حقائق اسلامی علوم، تفسیر، شروح احادیث و فقہ وغیرہ کی کتابوں کے نہ مطالعہ ہی کی صحیح قدرت پیدا ہو سکتی ہے، اور جیسا کہ چاہئے، ان کتابوں سے استفادہ بھی باسانی ممکن نہیں، اس کے بعد جیسا کہ آپ

ملہ بعد کو ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے خاکسار بھی اسی نتیجہ تک پہنچا، بلکہ اسی کے ساتھ جدید علوم و فنون والسنہ کو چونکہ حکومت کی سرپرستی و پشت پناہی حاصل تھی، اس کی وجہ سے یہ بھی دیکھا گیا کہ اسلامی دینی علوم کے جن آثار کی توقع پڑھنے والوں میں کی جاتی ہے، بجائے ان کے اکثریت میں وہی رنگ غالب ہو جاتا ہے، جو رنگ خالص مغربی علوم و فنون کی تعلیم پانے والوں کی خصوصیت ہے، رنگ ڈھنگ، وضع قطع، طریقہ فکر و بیان سب ہی میں پایا گیا کہ وہ مغربی علوم کے طلبہ کے طفیلی بنے ہوئے ہیں۔ الناس علی دین ملوک کھھ بات تو پرانی ہے، لیکن ہر نئے زمانہ میں اسی پرانی بات کا تجربہ کیا گیا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، مولانا حبیب الرحمن سابق ہتم دارالعلوم رحمۃ اللہ علیہ سے دارالعلوم کے نصاب کے متعلق اسی سلسلے میں ایک دن گفتگو ہوئی، تو پہلی دفعہ اسی "پیر دانا" نے نوجوانی کے زمانہ میں فقیر کو سمجھایا تھا کہ توازن کا باقی رہنا دشوار ہو جائے گا۔ طلبہ پر عموماً انگریزیت غالب آجائے گی، دین کی ٹوٹی بھوٹی خدمت وقت دارالعلوم کے طلبہ سے اس وقت جو بن آتی ہے، تم دیکھو گے کہ اس سے بھی وہ محروم ہو جائیں گے۔ وقت جیسے جیسے گزرتا چلا گیا، مشاہدہ سے ان تجربہ کاروں کے خیال کی تائید ہوتی چلی جا رہی

دیکھ چکے صاف اور واضح لفظوں میں اپنی یہ تجویز پیش کی ہے، کہ علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے سرکاری مدارس میں مسلمان بچوں کو داخل کیا جائے۔ اپنی اس تقریر میں یہ دعوئے بھی کیا ہے، کہ اس ترتیب سے تعلیم دلائے کا تجربہ کیا جائے۔ عوام ہی کہ نہیں، خود حکومت کو جو جس میں اگر براہ راست مخاطب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا کہ

”سرکار کو بھی معلوم ہو کہ استعداد اسے کہا کرتے ہیں“

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دانش مندی کے قدیم علوم جن کو معقولات بھی کہتے ہیں، ان میں بال کی کھال بھکانے کی مشق کی وجہ سے قدرتنا فکر و نظر میں گہرائی کی کیفیت جو پیدا ہو جاتی ہے، نازک سے نازک بات تک پہنچنے اور پہنچانے کی اس عادت کے ساتھ جدید علوم و فنون میں حقیقت بینی، واقعات طلبی پر جو زور دیا جاتا ہے۔ قدیم و جدید تعلیم کی ان دونوں طبعی خاصیتوں کی باہمی ترکیب سے علمی استعداد کے جس رنگ کو پیدا کیا جاسکتا ہے، اس رنگ کو صرف قدیم، یا صرف جدید تعلیم کی راہ سے شاید حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والائے اپنے ہی زمانہ میں تعلیم کے تمام پہلوؤں، اور ان کے مختلف نتائج کا صحیح اندازہ کر لیا تھا، تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ حکومت مسلط جس کی امداد کی طرف غلطی سے بھی آپ دیکھنا شاید پسند نہیں فرماتے تھے، لیکن قدیم و جدید علوم کے پیوند کی مجوزہ ترتیب کی افادیت کے خیال نے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اس التزام کے حدود کے توڑنے پر بھی آپ کو شاید مضطر و مجبور کر دیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ سب سے بڑی رکاوٹ آپ کی تجویز کے ”عملی نفاذ“ میں حکومت کا وہ عجیب و غریب رویہ تھا، کہ ”حصول علم“ کو بھی طلبہ کی عمر کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، فلاں عمر تک فلاں امتحان میں طلبہ شریک نہیں ہو سکتے، یا فلاں امتحان میں شرکت کے لئے ضروری ہے کہ امیدوار اتنی عمر کا ہو چکا ہو۔ امتحان میں شرکت کے حق سے وہ محروم ہو جائیں گے، جو حکومت کی مقرر کردہ عمر سے ایک دن بھی آگے بڑھ گئے ہوں، علم کے طلبہ کی غلامی کے ساتھ خود علم کی اس غلامی کو دیکھتے ہوئے سیدنا امام الکبیر نے محسوس فرمایا کہ میری مجوزہ ترتیب پر تعلیم پانے والوں کے لئے سرکاری مدارس میں

داخل ہو کر جدید علوم و فنون سے استفادہ میں رکاوٹیں پیش نہ آئیں گی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خلاف دستور دستگیری کے لئے اس موقع پر آپ نے حکومت کو بکھارا ہے، ارشاد ہوا تھا کہ

”کاش! گورنمنٹ ہند بھی قید و غلبہ نو داخل کو ارادے“ ملا

اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ دینیات و اسلامیات کی تعلیم کے بعد یورپ کے نئے علوم اور اس ملک کی نئی علمی زبانوں کے سیکھنے سکھانے کے متعلق حضرت دلا کے خیالات و جذبات کی صحیح نوعیت کیا تھی؟

بہر حال مسئلہ کے جن جن زاویوں کو جس جس طریقہ سے اپنی تقریر میں حضرت دلا نے پیش کیا ہے، ان کو دیکھتے ہوئے، کوئی نہیں کہہ سکتا، کہ صرف جواب دینے کے لئے سرسری طور پر اس کا ذکر کر دیا گیا تھا، گویا ذکر کرنے والے کے سامنے حقیقی معنوں میں کوئی مشخص نتیجہ یا اس باب میں نہ تھی۔

میں کیا عرض کروں، دارالعلوم دیوبند کی رودادوں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مشروع میں مدت کی تعلیمی مدت معلوم ہوتا ہے کہ دس سال مقرر کی گئی تھی، لیکن دو سال گزرنے کے بعد ۱۲۸۵ھ میں ہم دیکھتے ہیں، نصاب اور تعلیمی مدت وغیرہ پر نظر ثانی کرنے کے لئے ایک مجلس مقرر کی گئی، جس نے منجملہ دوسری تجویزوں کے ایک تجویز بھی پیش کی کہ

”کل میعاد مدت تمام کتب اسباق ثلاثہ کے چھ سال معین ہوئے“ ۱۲۸۵ھ

”اسباق ثلاثہ“ مراد یہ ہے، کہ وقت واحد میں تین کتابوں سے زیادہ پڑھنے کی اجازت کسی طالب علم کو نہیں دی گئی تھی، چھ سال کی محدود مدت میں اس کا انتظام کیا گیا تھا کہ خالص دینیات یعنی حدیث و تفسیر و فقہ و اصول فقہ و فرائض کی وہ ساری کتابیں ختم ہو جائیں، جن کے پڑھنے پڑھانے کا عام رواج اس زمانہ میں تھا، اور جن کو پڑھ لینے کے بعد دینی علوم کے متعلق مزید کتابی تعلیم کی سمجھا جاتا تھا کہ ضرورت باقی نہیں رہتی، اس میں مشکوٰۃ کے ساتھ حدیث میں ہم صحاح ستہ کو بھی پاتے ہیں، فقہ میں ہدایہ، اصول فقہ میں توضیح تلویح تفسیر میں بیضاوی تک اس میں شریک ہے، ادب عربی کے لئے شرح ملائک صرف و نحو کی کتابوں کے ساتھ نثر میں فتح الیمین، حریری، کلید دمنہ، تاریخ عینی، اور نظم میں متنبی، حامدہ شریک ہیں، عربی سے اردو

اردو سے عربی ترجمہ کے لئے بھی وقت نکالا گیا ہے، اور مقولات یا علوم دانش مندی میں فلسفہ کی حد تک اگرچہ صرف میبذی ہے، لیکن دماغی تربیت اور ذہنی ورزش کے لئے منطق کی چھوٹی بڑی کتابوں کی کافی تعداد باقی رکھی گئی تھی، مختصر رسالوں، ایساغری، قال اقول، مرقات، تہذیب، اور مبسوط کتابوں میں شرح تہذیب قطبی، میر قطبی سب کو باقی رکھا گیا ہے۔

چھ سال کی اس محدود مدت میں اس نصاب کو ختم کرا سنے کے لئے نقشہ میں سال بھر کے تعلیمی دنوں کی میزان کو پیش کر کے ہر دن اور ہر دن میں ہر سبق کے لئے کتنا وقت دینا چاہئے، تفصیل والا نقشہ میں ان سارے امور کا ذکر کر کے مدرسین کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے کہ فلاں کتاب کو اتنی مدت میں ختم کر دیں۔

الغرض کوئی سوال اور کوئی پہلو ایسا نہیں ہے، جسے تین چھوڑ دیا گیا ہو یا نقشہ کو دیکھ کر یہ سمجھ میں آتا ہی کہ دس سال کی عمر میں بھی، دارالعلوم کے اس شش سالہ نصاب کو شروع کر کے سولہویں سال میں پڑھنے والے اس کو ختم کر سکتے تھے، اسیوں صرف خالص اسلامی علوم ہی نہیں، بلکہ مسلمانوں کے موروثی مروجہ فنون سبھی کافی مناسبت پیدا کر لینے کے بعد سرکاری مدارس میں داخل ہو کر جدید علوم، اور ذہنی علمی باتوں کو دیکھ کر یائیں تئیں کی عمر میں گریجویٹ بن جائے گا کافی اور مغتنم موقعہ پیدا کر دیا گیا تھا، یعنی آج بھی گریجویٹ بننے کی جو عام عمر ہے، کم و بیش اسی عمر میں سیدنا امام الکبیر کی مجوزہ ترتیب کے مطابق باضابطہ مولوی اور مستند گریجویٹ بن جائے گا دوقیمتی امکان، مسلمانوں کے سامنے آگیا تھا، دین اور اپنے آبائی سربراہ کی ضمانت کے ساتھ باہر کی چیزوں سے استفادہ کی صلاحیت کے لئے مزید وقت دینے کی ضرورت قطعی طور پر باقی نہیں رہی تھی،

صحیح طور پر یہ بتانا تو مشکل ہے، کہ اس تعلیمی نصب العین کے مطابق آئندہ عمل درآمد کی راہوں میں کیا رکاوٹیں پیش آئیں، کہ اس مغتنم اور قیمتی امکان سے مستفید ہونے کا موقع نہ مل سکا۔

دیوبند کے مقامی مدرسہ کو ”ہندوگیر جامعہ“ کے قالب میں ڈھالنے کی کوششوں میں بدترین ناسازگار ماحول میں جس کے عزم کی بے پناہ قوت سرگرم عمل تھی، چند ہی سال گزرے تھے، کہ اچانک ہندی مسلمانوں کو اس کی ناسوتی خدمات سے قدرت کی نامعلوم مصلحتوں نے محروم کر دیا یعنی پچاس سال بھی

پورے نہیں ہوئے تھے کہ سیدنا الامام الکبیر کی ”احل سنی“ پوری ہوگئی۔ یہ حادثہ واقعہ تو یہ ہے، دارالعلوم کی تاریخ کا ایسا حوصلہ گسل، ہوش ربا حادثہ تھا کہ دیوبند کی یہ تعلیم گاہ باقی ہی کیسے رہ گئی، اور گو جو کچھ ہونا چاہئے تھا، مان لیا جائے کہ وہ نہ ہوا، لیکن جو کچھ بھی ہوا، حیرت اسی پر ہوتی ہے کہ یہی کیسے ہو گیا۔ پہلے سال میں جس ادارہ کا میزانیہ (بجٹ) (۳۹۳) روپیہ تھا۔ آج قریب قریب پانچ لاکھ روپے کا بجٹ اسی ادارے کی مجلس شورے نے مجد اللہ منظور کر رہی ہے، اور جس مدرسہ کی بنیاد قائم کرتے ہوئے قائم کرنے والوں کو یہ نشہ ستارہ تھا کہ

”پڑھنے والے عربی کے کہاں سے آئیں گے“۔ پہلی روداد متعلقہ ۱۲۸۳ھ

آج اسی میں طلبہ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو کر ہزاروں بھی آگے بڑھی ہوئی ہے، اور جن کی اکثریت کی ہر جہتی ضرورتوں کا متکفل خود مدرسہ ہے۔

بہر حال بظاہر میرا خیال تو یہی ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے عملی نفاذ میں غالباً آپ کی وفات کا واقعہ زیادہ اثر انداز ہوا، ہر شخص کے بس کی بات یہ تھی، کہ جس زمانہ میں مدرسہ قائم ہوا تھا، اور جو ماحول اس عہد کا تھا، اس میں اس ”تعلیمی نصب العین“ اور اس کے ثمرات و فوائد کا صحیح اندازہ لگا سکتا۔ روداد میں درج ہونے کے باوجود آپ کے اس ”تعلیمی نصب العین“ کا چرچا لوگوں میں بوجہ کو نہیں کیا گیا، حتیٰ کہ اس کا خیال بھی لوگوں میں باقی نہ رہا، خود یہی واقعہ بتا رہا ہے کہ سوچنے والے کی بات شاید سوچنے والے کے ساتھ ہی دفن ہوگئی۔

باقی اس زمانہ کا ”ماحول“ جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں، آج تو اس کا کچھنا بھی دشوار ہے، لیکن اس ”ماحول“ میں جو جی رہے تھے، میں تو سمجھتا ہوں کہ بے چارے معذور تھے تفصیل کا تو موقع نہیں ہے، لیکن اجمالاً مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند خصوصی مؤثرات کا ذکر کر دیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ دیوبند کا مدرسہ سرسبز بنیاد میں جس وقت قائم ہوا تھا۔ اس وقت ایک طرف تو نظم و انضام کے نصاب کے پڑھنے پڑھانے والے حضرات تھے، ان ہی کو ”علماء“ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، دوسری طرف عام مسلمان تھے، جن کے آباد اجداد مغل حکومت کی کشوری و فوجی خدمات انجام دیتے تھے،

مغل حکومت اگرچہ ختم ہو چکی تھی، لیکن مغل دربار کی کشوری و فوجی خدمات کیلئے شاہی زبان (فارسی) کا جو نصاب تھا۔ فارسی ادب (نظم و نثر) کا وزن و وقار ان کے دلوں سے خاندانی روایات کے زیر اثر نہیں نکلا تھا۔ نئی قائم شدہ حکومت کی خدمات کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہو، یا نہ ملتی ہو۔ لیکن موروثی دباؤ کے نیچے لوگ فارسی کے اسی نصاب کو پڑھتے ہی چلے جاتے تھے۔ بجائے خود فارسی ادب کا یہ نصاب بھی کافی بوجھل اور وزنی تھا۔ گویا علماء کے مقابلہ میں یہ تعلیم یافتوں کا قدیم طبقہ تھا، اور اب نئی حکومت کے جدید و فائز اور خدمات کے لئے، نئے قائم شدہ سرکاری مدارس، اور یونیورسٹیوں سے ملک روشناس ہو رہا تھا۔ یہی جدید تعلیم یافتوں کا نیا گروہ تھا، جو خاص قسم کی ذہنیت لے لے کر آبادیوں میں پھیل رہا تھا، یا پھیلا یا جا رہا تھا۔

گو واضح اور صریح شہادت تو میرے پاس نہیں ہے۔ لیکن دارالعلوم کے اس شش سالہ نصاب اور جو تبدیلیاں آئے دن اس نصاب میں ہوتی رہیں۔ انکو دیکھ کر ہی سمجھ میں آتا ہے، کہ چھ سال والے اس نصاب کو درس نظامیہ والے مولویوں نے تو اس لئے قبول نہیں کیا کہ سلیات اور ذواہد سے بھی یہ نصاب خالی تھا، اور مینڈی کے سوا فلسفہ کی کوئی کتاب اس نصاب میں نہیں رکھی گئی تھی۔

عام طور پر درس نظامیہ کے مولویوں میں دیوبند سے فارغ ہونے والوں کے متعلق یہ سچ ہونے کا تسلسلہ یعنی نعتہ مشہور تھا۔ کہتے ہیں، کہ نظامیہ نصاب کے پڑھانے والے ایک مشہور و معروف

لے سلیات سے سیری مراد محب اللہ بھاری کا مشہور منطقی متن، سلم اور اسکی شروح حمد اللہ قاضی مبارک شریع سلم بحر العلوم، ملا حسین وغیرہ ہیں، ذواہد ثلاثہ، عالمگیری عہد کے ایک مفتوی مولوی مرزا زاید کی تین کتابیں ہیں، جو میرزا ہدیر سالہ، میرزا ہدایا جلال، میرزا ہدایت شرح موافق کے ناموں پر مشہور ہیں مرزا زاید کی ان کتابوں کے ساتھ نظامی مولویوں کے ذواہد شریف کا یہ حال تھا کہ جب تک ان تینوں یا ان میں سے کسی ایک کتاب پر اپنا خاص حاشیہ مولوی نہ لکھتا تھا۔ مستند مولویوں میں شمار نہیں ہوتا تھا۔ یہی حال سلم اور اس کی شروح کا تھا۔ ان کتابوں کی افادیت کے متعلق ہمارے علماء کا غلو اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ ندوۃ العلماء کے اجلاس میں نظامی نصاب کی ترمیم کا مسئلہ پیش کرتے ہوئے یہ تجویز جب سامنے آئی کہ ایسا غوجی منطق کے رسالہ کو نصاب سے خارج کر دیا جائے تو صلہ یا درجگ نواب حبیب الرحمن مرحوم مغفور رحمۃ اللہ علیہ جو اس اجلاس میں خود شریک تھے۔ اکثر اس قصہ کا ذکر کیا کرتے تھے کہ تین دن تک اس مسئلہ پر بحث ہوتی رہی۔ علماء کی اکثریت کو اصرار تھا کہ علم کی بنیاد ہی اکھڑ جائیگی اگر ایسا غوجی کو نصاب سے خارج کیا گیا۔ ۱۲

مولوی صاحب کا دستور تھا کہ ان سے پڑھنے والے طلبہ میں کوئی طالب علم کسی سلسلہ پر الجھنے لگتا اور ناہمی سے کام لیتا، تو مولوی صاحب کہتے ”دیکھو! اس کا چہرہ دیوبند کی طرف تو نہیں ہے، ظاہر ہے کہ یہ حال زیادہ دن تک قابلِ برداشت نہیں،“ ہاں سکتا تھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دارالعلوم کے نصاب میں درس نظامیہ کی ایک ایک معقولی کتاب اپنے تمام منہیات و عواشی کے ساتھ اسی طرح بہ تدریج شریک ہوتی چلی گئی، جن کو خارج کر کے نصاب کو چھ سال کی محدود مدت میں ختم کرائے کا انتظام کیا گیا تھا۔

اسی طرح دارالعلوم کی رودادوں میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے، شاید میں نے کہیں ذکر بھی کیا ہے، کہ فارسی ادب کی کتابوں کے درس کے اضافہ کو قرینِ مصلحت قرار دیا گیا، اور اسی سلسلہ میں گلستانِ بوستان کے ساتھ ابوالفضل، سکندر نامہ، انوارِ سیلی، یوسف زلیخا، عبدالواسع انشاء خلیفہ وغیرہ کتابوں کو بھی دارالعلوم کے درسی نصاب میں ہم شریک پاتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس سے ملک کے قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کی تسکین کا کام لیا گیا۔

اسی کے ساتھ میرا ذاتی تاثر یہ بھی ہے، کہ اس شش سالہ نصاب میں بھی ادبِ عربی کی نظم و نثر اور ترجمہ کو داخل کر کے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے، کہ سرکاری مدارس کے جدید تعلیم یافتوں کے اس مطالبہ کی تکمیل کی گئی تھی، کہ انگریزی زبان پڑھنے والے انگریزی میں بولنے اور لکھنے کی قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن مولویوں پر حیرت ہے کہ سالہا سال تک کہتے ہیں کہ انہیں عربی زبان ہی میں سب کچھ پڑھایا جاتا ہے، لیکن نہ ایک جملہ وہ بول ہی سکتے ہیں، نہ لکھ سکتے ہیں۔ ان کو اس سے بحث نہ تھی کہ ہندوستان کے مولویوں کے لئے عربی بولنے یا لکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ لیکن چونکہ انگریزی پڑھنے والے انگریزی بولتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ عربی پڑھنے والے مولوی بھی عربی میں بول کر اور لکھ کر ہم کو دکھائیں۔ گو یا اس کمال کے بغیر جدید تعلیم یافتہ طبقہ مولویوں کو مولوی ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ ان ہی کے مطالبہ کی تکمیل عربی ادب کی کتابوں کو نصاب میں داخل کر کے کی گئی تھی۔

بہر حال اسی سہ عملی میں علم کا جو آشیانہ بن رہا تھا، قدرتا ہر ایک کا دباؤ اس پر پڑنا ہی چاہئے تھا،

اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارالعلوم کا تعلیمی نصاب کافی پوچھل اور عرض و طویل ہوتا چلا گیا، اسی نصاب کے ختم کرنے میں پڑھنے والوں کی عمر کا کافی حصہ صرف ہونے لگا، اور دینی تعلیم پانے کی وجہ سے عمر نائی کے آلات (ریش و برت) سے بھی کش مکش کا موقعہ ان کے لئے باقی نہ تھا، حقیقت کے چہرے پر مجاز کی نقاب چڑھانے سے مذہباً وہ معذور تھے، ظاہر ہے کہ لمبی لمبی داڑھیوں کے ساتھ سرکاری مدارس میں داخل ہو کر پڑھنے کی صورت ہی کیا تھی؟ اور یوں سیدنا الامام الکبیر کا تعلیمی نصب العین صرف ایک تاریخی نصب العین بن کر رہ گیا، عوام کے مطالعہ کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے، جس سے قطع نظر کہ کام کرنا آسان نہیں ہے، اور تو اود اسی شش سالہ نصاب میں، عربی ادب کی نشرو نظم اور ترجمہ کا کافی زور جو نظر آتا ہے، میں تو نہیں سمجھتا کہ خالص اسلامی علوم (قرآن و حدیث فقہ و کلام وغیرہ) کی عربی عبارتوں کے سمجھنے کے لئے سیدنا الامام الکبیر جیسے دیدہ و درحضرات نصاب میں اس غیر ضروری اضافہ کو اسی طرح ناگزیر قرار دیتے تھے، جیسے حقائق و واقعات سے جو نادانف ہیں، کچھ ہی باور کئے ہوئے ہیں۔

ممکن ہے میرا یہ خیال غلط ہو، لیکن اپنا ذاتی احساس یہی ہے کہ ادب عربی میں ناقص رہ جانے کا جو اعتراض جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے مولویوں پر کیا جاتا تھا، اس اعتراض کا ازالہ کر کے چاہا گیا تھا کہ مولویوں سے انگریزی خوان مسلمانوں کو مانوس بنایا جائے، یہی دیکھا بھی گیا کہ شروع شروع میں ان ہی مولویوں کو حسن قبول جدید تعلیم یافتوں میں حاصل ہوا، جنہوں نے کسی نہ کسی طرح عربی ادب کی مہارت کا ثبوت اس زمانہ میں پیش کیا تھا۔ اور اس سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے، کہ مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی درس نظامیہ کے معقولاتی مولویوں کے مقابلہ میں زیادہ رعایت نصاب مرتب کرنے والوں کے مد نظر تھی۔

آخر اگر یہ نہ مانا جائے، تو پھر اس واقعہ کی کیا توجیہ کی جائے، کہ نظامیہ درس کی اکثر و بیش تر معقولاتی کتابیں خارج کر دی گئیں۔ وہی کتابیں جن کے پڑھے بغیر نظامی درس کے مولویوں کا عام خیال تھا کہ طالب علم سطحی بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن عربی ادب کی ایسی کتابیں جن کے نام سے بھی شاید اس زمانہ کے نظامی مولوی عموماً دانف نہ تھے۔ مثلاً کلیلہ و منہ، تاریخ مینی وغیرہ کا اضافہ شش سالہ نصاب میں کیا گیا،

اور کسی طرف سے کوئی مخالفانہ آواز مجلس شوریٰ میں نہیں اٹھائی گئی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ درس نظامی کی خارج شدہ معقولاتی کتابیں سیدنا الامام الکبیر کی زندگی ہی میں جیسا کہ ردوداؤں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، تدریجاً دارالعلوم کے نصاب میں شدید ہوئی جلی جا رہی تھیں۔ سطحیت کا الزام دارالعلوم کے فیض یافتہوں پر نظامی درس کے معقولاتی مولویوں کی طرف سے جو مسلسل لگایا جا رہا تھا، اور طعن و تشنیع، تعریف و تضحیک کا جو طوفان اٹھایا گیا تھا، اس کا مقابلہ آخر تک کیا جاتا، لیکن بالآخر ہم اس کا بھی پتہ چلتا ہے، کہ حلقہ دیوبند کے بعض ذمہ دار اکابر آخر وقت تک اسی پراصرار فرماتے رہے، کہ قدیم فلسفہ کی کتابوں سے دارالعلوم کے نصاب کو پاک رکھا جائے۔ ان اکابر میں سب سے زیادہ نمایاں سیدنا الامام الکبیر کے رفیق الدنیا والآخرۃ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات تھی۔ حضرت والا کی وفات کے بعد دارالعلوم کے مستقل سرپرست اپنی زندگی کے آخری دنوں تک آپ ہی رہے، مسلمانوں کے شاندار ماضی میں مولانا محمد میاں صاحب نے بھی آپ کی مخالفت کا تذکرہ کیا ہے۔ بلکہ مکاتیب رشیدی میں حضرت گنگوہی کا خط مولانا صدیق احمد مرحوم کے نام جو پایا جاتا ہے، جس میں دارالعلوم دیوبند کے متعلق مولانا صدیق احمد صاحب کے ایک خواب کی تعبیر درج کرتے ہوئے ارقام فرمایا گیا تھا کہ

”مگر دیوبند کے مدرسہ کے خواب کی البتہ ضرورت تعبیر ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے، کہ اس حقیر کا خیال ہر روز یہ ہے، کہ فلسفہ محض بے کار امر ہے، اس سے کوئی نفع معتد بہ حاصل نہیں، سوائے اس کے کہ دو گیارہ سال ضائع ہوں، اور آدمی ضرر و ماغ، غبی و بیبیات سے ہو جائے، فہم کج، و کوہ فہم شریعات سے ہو جائے، اور کلمات کفریہ زبان سے نکال کر ظلمات فلاسفہ میں قلب کو کدورت ہو جائے، اور کوئی فائدہ نہیں“

اسی کے بعد یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

”لہذا اس فی خبیث کا مدرسہ سے اخراج کر دیا تھا، چنانچہ ایک سال سے اس کی پڑھائی مدرسہ دیوبند سے موقوف کر دی گئی ہے“

آگے لکھا ہے کہ

”مگر بعض بعض مدرسین اور طلبہ کو خیال اس کا (یعنی فلسفہ کا) چلا جاتا ہے اور شاید خفیہ خفیہ درس

بھی اس کا ہوتا ہو۔“ ۲۷ مکاتیب رشیدی

مکتوب گرامی کے آخر میں تاریخ رمضان ۱۳۰۵ھ کی درج ہے، جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جیسے شش سالہ نصاب سے میبذی کے سوا فلسفہ کی ساری کتابیں، اور عقولات کا سارا طومار دیوبند کے تعلیمی نصاب سے سیدنا الامام الکبیر کی زندگی میں خارج کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح آپ کی وفات کے بعد داخل ہونے کے بعد کچھ نہیں کے لئے پھر فلسفہ کی کتابیں مدرسہ بدر ہوئیں لیکن مولویت کا اس زمانہ میں جو ماحول تھا، اس نے پھر مجبور کیا، اور نکلی ہوئی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے میں لوگ پھر وقت ضائع کرتے رہے، اور آج تک ”اضاعت اوقات“ کا وہی سلسلہ جاری ہے۔ چونکہ دارالعلوم کی تاریخ میں عقولاتی کتب ابوں کی بے قدری، اور بے ثمری کا خیال ابتداء ہی سے شریک ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھنے کی حد تک ان کتابوں کو لوگ پڑھتے بھی رہے، اور پڑھا لے والے پڑھاتے بھی رہے، کافی وقت طلبہ کا اس میں صرف ہوتا ہے، لیکن حوصلہ شکن موردنی رہا یا بت لے اس توجہ و محنت سے اس فن کو محروم رکھا جس کی کوہ کندن، کاہ پر آوردن کے اس شغل میں ضرورت ہے، ادیبوں ذہنی دوش، فکری ریاضت کا فائدہ جیسا کہ سمجھا جاتا ہے عموماً طلبہ کو میسر نہ آسکا۔ ضرورت سے زیادہ، اور بہت زیادہ طول کلامی سے اس موقع پر مجھے کام لینا پڑا، لیکن کرتا کیا؟ سیدنا الامام الکبیر کا صحیح تعلیمی نصب العین نگاہوں پر ادھمل ہو چکا ہے۔ اس کو سمجھنا، وثائق و شواہد سے دعویٰ کو مدلل کرنا، اور سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ جب یہی چاہا گیا تھا کہ اسلامی و دینی علوم کی صلاحیت اور ان علوم سے کافی مناسبت پیدا کرالینے کے بعد جدید علوم اور نئی علمی زبانوں سے استفادہ کا موقع مسلمان بچوں کے لئے فراہم کیا جائے۔ تو پھر ایسا کیوں نہ ہوا؟ اور تقریباً ایک صدی کی طویل تاریخ میں کوئی ایک ”نمونہ“ بھی اس تعلیمی نصب العین کے مطابق دیوبند کا دارالعلوم پیش نہ کر سکا۔ یقیناً یہ کافی اہم اور دشوار سوال تھا۔ واقعات کی روشنی میں اس کا صحیح جواب اگر نہ دیا جاتا، تو اس تعلیمی نصب العین کا سیدنا الامام الکبیر کی طرف انتساب کا دعویٰ شاید

سیرا ذاتی رجحان، یا صرف نحو شش اعتقادی بن کر رہ جاتا۔

بہت سے مخفی پہلو اور دقیق اسباب پھر بھی باقی رہ گئے، لیکن واضح اسباب جن کی وجہ سے آپ کا تعلیمی نصب العین بر رویے کار نہ آسکا۔ اور قدیم و جدید علوم والسنہ کے بیوند و گرہ اندازی کی جو ہم آپ سر کرنا چاہتے تھے۔ افسوس ہے، کہ دارالعلوم دیوبند کا نظام تعلیم مان لینا چاہئے کہ اس وقت تک اس کے سر کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اگرچہ بہ تدریج جو حالات پیش آئے، اور مسلسل پیش آتے چلے جا رہے ہیں۔ جن کی ان پر نظر ہے، وہ یہ امید قائم کر سکتے ہیں، کہ جو ہم اب تک سر نہ ہو سکی، اس کے سر کرنے کے لئے جس زمین کی ضرورت تھی، وہ مجدداً اللہ چند در چند وجوہ سے کہا جاسکتا ہے کہ تیار ہو چکی ہے۔ ولعل اللہ یحذ ث بعد ذلک امرا۔

یہ عجیب بات ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین یعنی خالص اسلامی، اور دانش مندی کے قدیم علوم سے فارغ ہونے کے بعد، سرکاری مدارس میں داخل ہو کر جدید علوم و فنون کو حاصل کیا جائے اس نصب العین کے مطابق جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اپنی پوری تاریخ میں دارالعلوم دیوبند کسی ”صحیح نمونہ“ کو پیش کرنے سے اگرچہ اس وقت تک قاصر رہا ہے۔ لیکن ۱۳۲۵ھ میں عام دستار بندی کے لئے مشہور تاریخی اجتماع دارالعلوم دیوبند میں جو ہوا تھا، جس میں پہلی دفعہ دیوبندی علماء کے جلسہ میں جدید تعلیم یافتہ کی

۱۔ میرا مطلب یہ ہے کہ نظامی درس کے مقولات کی ہوا بھی اکھڑ چکی ہے، اور داخل دہار کے دفتروں کی اولاد فارسی ادب کی اس اہمیت کو بھلا چکی ہے، جو صرف موروثی روایات کی پیداوار تھی، اہل بصیرت برعری زبان کی دونوں قسموں کی نوعیت واضح ہو چکی ہے، یعنی خالص اسلامی علوم (قرآن و حدیث و فقہ وغیرہ) کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے سمجھنے سمجھانے کے لئے عربی زبان کے جس حصہ سے واقفیت کی ضرورت ہے، وہ اس حصہ سے بالکل مختلف ہے، جس کی ضرورت صرف ان ہی لوگوں کو ہے، جو عربی زبان کو جاہلی و اسلامی ادبی ذخیروں پر عبور حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایسے قد قیغیرات ہیں، جن کی وجہ سے خالص اسلامی علوم کے نصاب میں کافی گنجائش اس بات کی پیدا ہو چکی ہے کہ جدید علوم و فنون کی تعلیم حاصل کرنے اور سرکاری مدارس میں داخل ہونے کیلئے بطور مقدمہ کے جن چیزوں کے سکھانے کی ضرورت ہے، ان کو نصاب میں شریک کر کے قدیم و جدید علوم میں سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے مطابق رشتہ قائم کرنے کیلئے راہ درست کی جائے۔ خاکسار نے اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں بجائے اثنینیت کے نظام تعلیم کی وحدت کا نظریہ جو پیش کیا ہے، اس میں بھی اس سلسلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۱۲

بعض ممتاز اور سربراہان ہستیاں شریک ہوئی تھیں، علیگڑھ کالج، اب مسلم یونیورسٹی بن چکا ہے، اس کی طرف سے صاحبزادہ آفتاب احمد ہاں مرحوم گویا نمائندہ بن کر اس جلسہ میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ اس وقت پھر وہی ”قدیم و جدید علوم کے بیوند“ کا مسئلہ چھڑا، اور چاہا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر کے نصب العین کے بالکل برعکس ترتیب ہی کا اس سلسلہ میں تجربہ کیا جائے۔ یعنی جدید علوم و فنون کے گریجویٹوں کو دارالعلوم دیوبند میں داخل کر کے اسلامی علوم و فنون کی تعلیم سے استفادہ کا موقعہ دیا جائے۔ تجویز پاس بھی ہوئی، اور اس کے مطابق علیگڑھ کالج کے گریجویٹ دیوبند کے مدرسہ میں تشریف لائے۔ لیکن نتیجہ اس کا کیا ہوا؟ ناظم جمعیت العلماء مولانا سید محمد میاں صاحب اپنی کتاب ”علماء ہند کا شاندار ماضی“ میں یہ لکھتے ہوئے کہ:

”اس کا (یعنی اس تعلیمی ترتیب کا) ثمرہ نہایت تلخ تھا“

آگے وہی اطلاع دیتے ہیں کہ:

”پہلی مرتبہ جو علیگڑھ سے عربی حاصل کرنے کے لئے آئے وہ انگریز کے سی۔ آئی۔ ڈی تھے جنہوں نے حضرت شیخ الہند کو گرفتار کرانے میں وطن دوستی اور قوم پروری کا حق ادا کر کے انگریز بہادر سے سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی کا عہدہ حاصل کیا“ ص ۱۱۱ حصہ پنجم

اب جب کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی زندانِ خاکی سے آزاد ہو کر اپنے سلف صالحین تکبر عزیز و مقدر کے مقعدہ صدق میں پہنچ چکے، اور ان کا دشمن انگریز بھی ملک کو خالی کر کے جا چکا۔ اس ”ثمرہ تلخ“ کی اجمالی خبر کی تفصیل فضول ہے۔ جو ہو نا تھا، وہ ہو چکا، اور میں نہیں سمجھتا کہ جس تلخی کا تجربہ ہوا، سیدنا الامام الکبیر کے نصب العین کے معکوس ترتیب کا تجربہ آخر اس کے سوا کس ثمرہ کو پیدا کرتا، انسانی جبلت کا یہ فطری قانون ہے، کہ نامِ عمری میں جس رنگ کو بھی پختہ کر دیا جائے، وہی پختہ ہو جاتا ہے۔ پختہ رنگ کا ازالہ کر کے نئے رنگ کا چڑھانا آسان نہیں ہے۔ سیدنا الامام الکبیر کی حکیمانہ بصیرت نفیات انسانی کو اس راز کو تجربہ سے پہلے اگر نہ پالیتی تو اور کون پاتا۔

باقی میں نے افواہا بھی سنا ہے، اور مولانا سید محمد میاں نے بھی لکھا ہے کہ معکوس ترتیب کے

کے تجربہ کے ساتھ ساتھ تجویز کا ایک جزویہ بھی تھا کہ دارالعلوم سے فارغ ہونے والوں میں سے بھی انتخاب کر کے جدید علوم کی تعلیم کے لئے کچھ لوگوں کو علیگڑھ بھیجا جائے۔ گویا دوسرے لفظوں میں سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے تجربہ کا بھی کہا جاتا ہے کہ ارادہ کیا گیا تھا۔ مولانا سید محمد میاں صاحب نے جو ارقام فرمایا ہے کہ

”صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے تعلیم یافتہ علیگڑھ کالج انگریزی پڑھنے جایا کریں“ ۱۱۷

اس کا مطلب یہی ہے، لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، ترتیب محکوس کا عملی تجربہ تو یقیناً کیا گیا، شاید دارالعلوم میں ایک سے زیادہ گریجویٹ، یا انڈر گریجویٹ حضرات شریک کر لئے گئے، اور اپنی بے سروسامانی کے باوجود میرا علم یہی ہے کہ ان میں بعضوں کو مدرسہ سے امداد (تعلیمی وظیفہ یا خوراک وغیرہ) کی شکل میں دی گئی۔ لیکن علیگڑھ بھی دیوبند سے اپنے خرچ، یا کالج کے خرچ پر کوئی بلا یا گیا، شاید ایسی کوئی صورت عملاً پیش نہ آئی، کاش! ایک دو نمونے بھی سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کے مطابق تیار ہو جاتے، تو شاید محکوس ترتیب کے تجربہ کی تلخیوں کی تلافی کی کوئی صورت نکل سکتی تھی، لیکن یہ مسئلہ

خدا وندان نعمت را کرم نیست

کرمیاں را بدست اندر درم نیست

کے جھولوں ہی میں جھولتا رہا، اور آج تک جھول رہا ہے۔

بہر حال دارالعلوم کے تعلیمی نصاب پر سیدنا الامام الکبیر کے تعلق سے جو کچھ کہنے کی ضرورت تھی، آپ اسے پڑھ چکے، البتہ اسی سلسلہ میں حضرت والا کے رفیق الدین والاخرہ مولانا گنگوہی کے گرامی نامہ سے فلسفہ کے متعلق جو الفاظ نقل کئے گئے ہیں، ممکن ہے کہ پڑھنے والوں کو کچھ زیادہ درشتی اور سختی ان الفاظ میں محسوس ہوئی ہو۔ لیکن جب یہ سوچا جاتا ہے، کہ خواہ کتابوں میں ”فلسفہ“ کی فنی تعریف کچھ بھی کی جاتی ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے، کہ کائنات کے متعلق انسانی فطرت میں

بنیادی سوالات جو پیدا ہوتے ہیں، ان سوالوں کے حل کی قدرتی راہ، یعنی وحی و نبوت سے بے نیازی اختیار کر کے جانے بغیر اپنے اپنے زمانہ کے چرب زبانوں نے خود تراشیدہ دوسو سو کے جس مجموعہ کو فرض کر کے مشہور کر دیا کہ یہی ان بنیادی سوالوں کا صحیح جواب ہے، اسی کا نام ”فلسفہ“ رکھ دیا گیا، چونکہ ان جوابوں کا تعلق حقائق و واقعات سے نہیں ہوتا، بلکہ مفروضہ و ہام سے زیادہ وہ اور کچھ نہیں ہوتے، اسی لئے مقبول ہونے کے بعد تھوڑے تھوڑے دنوں پر ہر زمانہ کا فلسفہ مسترد ہوتا رہا ہے پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے، اور اب بھی ہو رہا ہے، آئندہ بھی یہی ہوتا رہے گا۔ ہمارے درس نظامیہ کے تدریسی حلقوں میں فلسفہ کے نام سے جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، وہ اس زمانہ میں جس میں حضرت گنگوہیؒ نے یہ خط لکھا ہے، قطعی طور پر مردہ ہو چکا تھا۔ لیکن ہمارے علماء، محض موروثی روایات کے زیر اثر اسی مرجع و مدفن فلسفہ کی کتابیں پڑھاتے چلے جا رہے تھے، آپ ہی بتائیے کہ طلبہ کا قیمتی وقت اور عمر کا گرانا یہ حصہ ایک ایسے مہل مشغلہ میں جو برباد ہو رہا تھا، اس پر سنجیدہ دماغوں کو جتنا بھی غصہ آئے، کم تھا۔ دین کے لئے فلسفہ کے مطالعہ کی ضرورت صرف اس لئے ہوتی ہے کہ فلسفہ کی راہ سے خام غفلتوں کو جن مغالطوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے، ان کا ازالہ کیا جائے۔ اس لحاظ سے بجائے اس مسترد اور مردہ فلسفہ کے کچھ ضرورت تھی تو اس بات کی، کہ اس زمانہ میں ”فلسفہ“ کے نام سے جن خیالات کو حق قبول حاصل ہو رہا تھا، جو ظاہر ہے کہ مغرب کا جدید فلسفہ ہی ہو سکتا تھا، لیکن اس کی طرف نظامی درس کے معقولی علماء، نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ سیدنا امام الکبیر قدیم علوم کا جدید علوم سے جو رشتہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ حضرت والا کے منشاء کے مطابق یہ رشتہ اگر قائم ہو جاتا، تو بجائے اس مردہ فلسفہ کے یورپ کے ”جدید فلسفہ“ کے مطالعہ کا موقعہ ہمارے علماء کے لئے باسانی

یعنی یہ کائنات جن میں انسان بھی شریک ہے کیلئے اس کی ابتدا کیلئے انتہا کیا ہے۔ اس کا مدعا کیا ہے، یہی وہ بنیادی سوالات ہیں، جن کے صحیح جوابوں کا علم حاصل کئے بغیر عالم کا یہ سارا نظام صرف گونگے کا ایک خواب بن کر رہ جاتا ہے، مذہب یا دین درحقیقت ان ہی سوالوں کے ان جوابوں کا نام ہے، جو وحی و نبوت کی راہ سے بنی آدم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وحی و نبوت کے سوا ان سوالوں کے حل کا کوئی علمی ذریعہ آدمی کے پاس نہیں ہے ۱۲

میسر آسکتا تھا، اور اس وقت مقبول سیدنا الامام الکبیر دنیا دیکھ سکتی تھی کہ علماء کی علمی استعداد کیسی ہوتی ہے کچھ بھی ہو، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مندرجہ مکتوب الفاظ سے نتیجہ نکالنا کہ علماء دیوبند کلیتہً ”عقلی علوم“ کے درس و تدریس، مطالعہ و مذاکرہ کے مخالف تھے۔ صحیح نہ ہوگا۔

آخر میں پوچھتا ہوں کہ مطلقاً عقلیات کے اگر وہ مخالف ہوتے تو شش سالہ نصاب میں بھی نصف درجن سے زیادہ چھوٹی بڑی کتابیں منطق کی کیوں باقی رکھی جاتیں۔ اور مفتی مبارک علی صاحب حال نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، براہ راست مولانا سید برکات احمد بہاری ثم ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ سے سن کر جس قصہ کے راوی ہیں۔ یعنی مولانا برکات احمد مرحوم مفتی صاحب سے فرماتے تھے، کہ آج فلسفہ اور منطق کے درس و تدریس میں غیر معمولی شہرت مجھے جو حاصل ہوئی ہے، اس کو میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت سمجھتا ہوں، کہتے تھے کہ بچپن میں ایک دفعہ اپنے والد مرحوم حکیم مولانا دائم علی خاں صاحب مرحوم کے ساتھ حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، میرے والد نے حضرت دلا سے استعداد کی کہ اس بچے کے لئے دعا فرمائی جائے، مولانا برکات احمد صاحب کا بیان ہے کہ

”حضرت مولانا نانوتویؒ کی زبان سے بے ساختہ نکلا، کہ اللہ تعالیٰ اس کو علم مقبول میں کمال عطا فرمائے“

سننے کے ساتھ کہتے تھے کہ میرے والد حکیم دائم علی صاحب نے عرض کیا کہ

”حضرت نے یہ کیا دعا فرمائی، میری تمنا تو یہ ہے، کہ اس کو فقہ اور دین کا علم حاصل ہو“

مفتی صاحب کا بیان ہے کہ اس کے جواب میں حضرت نانوتویؒ نے جو کچھ فرمایا تھا، الفاظ تو یاد نہیں رہے، لیکن مولانا برکات احمد صاحب کی روایت کے مطابق خلاصہ اس کا یہی تھا، کہ فتنے کے اس زمانہ میں

”دین پر قائم رہنا علم مقبول حاصل کئے بغیر دشوار ہے“

لے مفتی مبارک علی صاحب دام مجہ نے اپنے ایک نوازش نامہ میں جو فقیر کے نام انہوں نے لکھا تھا (باقی اگلے صفحہ پر)

گویا غور دین "پر استقامت کے لئے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ "عقلیات" کے مطالعہ کی ضرورت محسوس فرماتے تھے، اور کیسی ضرورت کہ علم دین کے طالب کو عقلیات کے مطالعہ کا صرف مشورہ ہی نہیں دیا جاتا تھا، بلکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دعا تک اسی کیلئے کی گئی۔

اور یہ روایت تو خیر مفتی مبارک علی صاحب کی ہے، خود "صاحب البیت" حضرت نانوتوی کے تحت جگر، فرزند سعید مولانا حافظ محمد احمد مرحوم سے براہ راست خاکسار نے جو قصہ "انگریزی زبان" کے سیکھنے کے متعلق سنا ہے۔ اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں تفصیلاً اس قصہ کو درج کر چکا ہوں، حاصل جس کا یہی ہے کہ حج کے سفر میں سیدنا الامام انگلیسی جہاز کے کسی یورپین کپتان نے مذہبی سوالات کئے جن کا جواب "ترجمان" کے ذریعہ دیا گیا، کپتان آپ کے جوابوں سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا، اس نے وعدہ بھی کیا تھا کہ ہندوستان آنے کا موقع ملا تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گی، حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مولانا نانوتوی نے اس کے بعد عزم کر لیا تھا کہ حج سے فارغ ہونے کے بعد

(گذشتہ صفحہ سے)، اس روایت کا تذکرہ فرمایا ہے یہ بھی اسی خط میں ہے کہ حکیم صاحب قبلہ نے بمقام سرونج اس قصہ کو جن مجلس میں بیان کیا تھا، اس میں مفتی صاحب کے ساتھ حکیم فضل الرحمن ٹوکی بھی تھے جو مولانا برکات احمد کے خاص تلامذہ میں سے ہیں، تو کہا جاسکتا ہے کہ خبر آیا دی خاندان کی عقلیت کا چراغ آخر نوں میں مولانا برکات احمد صاحب ٹوکی رحمۃ اللہ علیہ کی شکل میں جو روشن رہا، پس پردہ بانی دارالعلوم دیوبند کی دعا ہی سے اسے اساد علی تھی، اس سلسلہ میں قدرتا حضرت مرشد تھانوی کا وہ قول یاد آتا ہے خود بھی فرماتے تھے کہ ہم توحیداً بخاری کے مطالعہ میں اجر سمجھتے ہیں، میرزا اہد اور عامر کے مطالعہ میں بھی ویسا ہی اجر سمجھتے ہیں۔ (مسائل النور ماہ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ) اور اپنے استاد دارالعلوم دیوبند کے صدر مولانا محمد یعقوب صاحب علماء دیوبند کے استاد اساتذہ کا یہ قول بھی وہ نقل فرماتے تھے کہ "ہم کو تو امید ہے کہ جیسے بخاری اور مسلم کے پڑھانے میں ہم کو ثواب ملتا ہے، ایسے ہی فلسفہ کے پڑھانے میں بھی ملے گا۔" آخر میں فرماتے کہ "ہم اعانت فی الدین کی وجہ سے فلسفہ کو پڑھنے پڑھانے میں (قصص الاکابر)، اور صرف فلسفہ ہی نہیں، بلکہ حضرت مولانا یعقوب کا مذاق مطالعہ کے باب میں کتنا وسیع تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے، فرمایا کرتے تھے، کہ میں اگر گالیوں کی کتاب بھی ہو، تو اس کو بھی دیکھ لینا چاہئے، اور کچھ نہیں تو دو چار گالیاں ہی یاد ہو جائیں گی" (قصص)، سچ تو یہ ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی کتابوں کا مطالعہ صحیح معنوں میں وہی کر سکتے ہیں اور وہی ان کی تصنیفات سے مستفیض ہو سکتے ہیں، جنہوں نے کسی نہ کسی حد تک عقلی علوم کا مطالعہ کیا ہو۔

ہندوستان پہنچ کر میں خود انگریزی زبان سیکھنے کی کوشش کروں گا۔ حضرت نافوتویؒ کا احساس تھا کہ ترجمان کے بغیر براہ راست تقریر سے کپتان زیادہ متاثر ہو سکتا تھا۔

مطلب جس کا یہی ہو سکتا ہے کہ دوسروں تک دین کی دعوت کو پہنچانے کیلئے انگریزی جیسی زبانوں کے سیکھنے کو بھی حضرت والا نے اپنے ”دینی مجاہدات“ کی فہرست میں شامل کر لیا تھا، اور حج سے واپسی کے بعد ہی آپ کا وقت پورا نہ ہو جاتا، تو کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کا یہ عزم پورا ہونے سے رہ جاتا۔

آپ ہی بتائیے کہ ”مذکورہ بالا معلومات“ جن کا ذکر متن اور حاشیہ میں کیا گیا ہے۔ ان سے وقف ہونے کے بعد کیا علماء دیوبند کی طرف ”تنگ نظری“ کے الزام کے عائد کرنے کی اب بھی کوئی جرات کر سکتا ہے۔ مولانا سید محمد میاں نے اپنی کتاب ”علماء ہند کا شاندار ماضی“ میں حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

”جملہ علوم عقلیہ و نقلیہ میں حضرت کو بھی کمال حاصل تھا، کسی فن کی کوئی کتاب ملی، اسکو شروع سے آخر تک ایک بار ضرور مطالعہ فرمایا“

یہ اطلاع بھی دی ہے

”آپ نے بعض مخصوص تلامذہ کو سائنس جدید کی کتاب بھی پڑھائی تھی“

غالباً جدید سائنس یہ وہی ابتدائی کتاب ہے، جسے بیروت کی یونیورسٹی نے عربی زبان میں تالیف کر کے شائع کیا تھا، یہ بھی اسی کتاب میں ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ

”اب علماء کو قدیم فلسفہ و ہیئت کے ساتھ جدید فلسفہ و ہیئت کو بھی حاصل کرنا چاہیئے“

۲۲۲ حصہ پنجم

جتنی مدت دارالعلوم دیوبند کے قیام پر اب تک گزر چکی ہے۔ اس کے اول وسط آخر ہر دور میں اس تعلیمی ادارہ سے تعلق رکھنے والی ذمہ دار ہستیاں اپنے جن احساسات و تاثرات کو ظاہر کرتی رہی ہیں چاہئے تو یہی تھا کہ ان کے مطابق کچھ عملی نمونے بھی پیش ہوتے۔ لیکن ایسا کیوں نہ ہوا۔ اس کا کیا جواب دیا جائے مسلمانان ہند کے تقدیری کرشموں میں اس کو بھی شامل کر لیجئے۔

ایک یہی کیا، دارالعلوم دیوبند کو ہند گیر جامعہ بنانے کے لئے، یہی نہیں کہ ہندوستان بلکہ بیرون ہند کے طلبہ کو مدرسہ میں داخل کر کر کے ملک کے ہر حصہ میں پھیلانے کا کام جو کیا گیا، اور مجدد اللہ اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، اس کے سوا بھی جہاں تک میرا خیال ہے، سیدنا الامام الکبیر کے زمانہ میں جس کوشش کا آغاز ہو چکا تھا، کہ کچھ بھی اس کو آگے بڑھانے کا ارادہ کیا جاتا، تو غالباً ہندوستان کی عام یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں دیوبند ہی کا جامعہ ایسا جامعہ بن جاتا، جس کی براہ راست نگرانی میں بے شمار مدارس ہر برصوبہ اور صوبہ کے ہر ضلع، ضلع کے ہر تعلقہ میں چاہئے تو یہی تھا کہ قائم اور جاری نظر آتے۔

واقعہ یہ ہے کہ دیوبند میں مدرسہ کے قیام کے کل دو سال بعد اس قصبہ کے ضلع کا جو صدر مقام تھا، یعنی سہارنپور، وہاں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی گئی، ۱۳۹۲ھ کی روداد میں سیدنا الامام الکبیر کی جو تقریر حلیہ تقسیم اسناد و انعام میں ہوئی تھی، اسی تقریر میں سہارنپور کے اسی عربی و دینی مدرسہ کا ذکر فرماتے ہوئے، ارشاد ہوا تھا،

”مخدوم العلماء و مطاع الفضلاء مولانا سعادت علی سہارنپوری مرحوم کو خیال مدرسہ جس کے باعث اہل سہارنپور نے کمر ہمت باندھ کر دوسرا چتر فیض علم برپا کیا“

اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا تھا،

”آج دو مدرسہ اس مدرسہ کی ہم جہت ہے“

ہم جہت کی تشریح اسی کے بعد ان الفاظ میں کی گئی تھی،

”غرض اصلی اس مدرسہ سے بھی یہی تعلیم علوم دین ہے۔ گویا یہ دونوں ایک دریا کے دو گھاٹ ہیں، جن پر ہزاروں تشنیلب آتے جاتے ہیں، اور اپنی لیاقت کے موافق اپنا حصہ لے جاتے ہیں، اس نعمت غیر مترقبہ کا شکر کس زبان سے کیجئے“ روداد ص ۱۳ یا بت ۱۲۹۶ھ

اور ایک سہارنپور ہی کی خصوصیت نہیں ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ دیوبند میں قیام مدرسہ کے بعد روہیل کھنڈ کی متعدد چھوٹی بڑی آبادیوں میں تدریجاً عربی مدارس کے گویا جال ہی ایسا معلوم ہوتا ہے،

بچے چلے جاتے ہیں۔ مظفرنگر، مراد آباد، رڈکی، خودہ، منظور، نگینہ وغیرہ میں آگے پیچھے مدرسے جو قائم ہوئے، اور مجدد اشد اس وقت تک ان میں اکثر و بیشتر کسی نہ کسی شکل میں اب تک باقی ہیں، ان کی تاسیس زیادہ تر سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کے چشم دایرہ کے اشاروں ہی کی رہیں منت ہی نئے قائم ہونے والے ان مدرسوں کے ساتھ حضرت والا کے غیر معمولی تعلق و توجہ کی نوعیت کی تھی، اس کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے، کہ نگینہ میں عربی کا مدرسہ جو قائم ہوا تھا، اور صدارت کیسٹلے حضرت والا ہی نے اپنے تلمیذ مشید مولانا فخر الحسن گنگوہی کا انتخاب فرمایا تھا، کچھ دن بعد اپنے ایک خط میں مولانا فخر الحسن مرحوم نے حضرت نافو توئیؒ کو خبر دی کہ مدرسہ باشتدگان نگینہ کی لاڈلیوں کا شمار بنتا چلا جا رہا ہے، شاید یہ بھی لکھا کہ ان حالات میں اب میرا قیام نگینہ میں مشکل ہے، اسی کے جواب میں حضرت والا کے قلم سے جو الفاظ نکلے ہیں، انہیں پڑھئے، جواب کی زبان جیسا کہ اس زمانہ میں دستور تھا، فارسی تھی، ارقام فرمایا گیا تھا کہ

”باقی باطلاع تنزل بنا، مدرسہ نگینہ بدو وجہ رنج دام، یکے از طرف آن عزیز، دوم از طرف اہل نگینہ، کہ چہ کم حوصلگی کردند“

لہجہ اس کے بعد کافی تند و تیز ہو جاتا ہے، بے ساختہ نوک قلم سے یہ فقرہ نکل پڑا ہے۔

”اے ہر نعمت کے بے سابقہ جد و جہد می رسد ناقد و دشمنان بہین سان ضائع می کنند“

بے چین ہو کر اپنی قلبی کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا

”یارب! ایں چہ زمانہ است کہ از شرفاء ہم برگرفتند“

آخر میں نگینہ کے ان ہی شرفاء کے مرض کی تشخیص ان الفاظ میں فرماتے ہوئے کہ

”چوں بنظر خود بنگرم، این ہمہ نیرنگیہا بے نیازی ست، صدق رسولہ الکریم“ یرفع

العلم“

مطلب یہی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے علم کا جو نیا ابدیتی سرمایہ مسلمانوں کو عطا کیا گیا تھا، اس کی ضرورت کا احساس لوگوں میں باقی نہیں رہا ہے، اسلئے باور کیا گیا ہے کہ مسلمان علم کو

اس نبوی سرمایہ سے بے نیاز اور مستغنی ہو چکے ہیں۔ مشہور حدیث جس میں پیشگوئی کی گئی ہے کہ وقت ایسا بھی مسلمانوں پر آئے گا کہ نبوت کی راہ سے علم کی جو دولت ان کو ملی تھی دینے والا اس کو واپس لے لے گا، وہی پیشگوئی پوری ہو رہی ہے، گو یا علم ہی مسلمانوں کو چھوڑ رہا ہے، لیکن وہ سمجھ رہے ہیں، کہ ہم اس کو چھوڑ رہے ہیں۔ آخر میں نگینہ والوں کو اسی خط میں یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ

”بظاہر پٹیاں می نامد کہ اگر ایس خوان نعمت را از نگینہ خواہند برداشت باز نخواہند گسترانید

انالله وانا الیه راجعون“ ص ۲ مکتوب یازدہم (مجموعہ قاسم العلوم)

شاید یہی دھمکی کارگر ثابت ہوئی، اسی کا نتیجہ ہے، کہ مدت دراز تک نگینہ کا یہ مدرسہ قائم رہا، اور نگینہ والے کسی نہ کسی طرح اس کو چلا تے ہی رہے۔

بہر حال قصبہ دیوبند کے سوا قرب و جوار کی چھوٹی بڑی آبادیوں میں مدرسے جو قائم ہو رہے تھے، آج تو عموماً یہ مدرسے جدا گانہ ہستی، اور مستقل وحدت کی حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ لیکن قدیم رودادوں کے جائزے سے اس کا انکشاف ہوتا ہے، کہ کافی مدرسے ان میں ایسے بھی تھے، جو باضابطہ دارالعلوم دیوبند کی مرکزیت کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ اسی طرح ملحق تھے، جیسے جدید عصری جامعات انڈین یونیورسٹیوں کے ساتھ مختلف شہروں میں قائم ہونے والے کلیات اور کالج ملحق ہو کر رہتے ہیں۔ ان الحاقی تعلیم گاہوں کی تعلیم و نصاب مدرسین کا تقرر، ان کے امتحانات، ان کی آمد و خرچ کا حساب و کتاب، یہ اور اس قسم کے سارے متعلقہ امور پر براہ راست دارالعلوم کی نگرانی قائم تھی، دستور یہ بھی تھا کہ دارالعلوم کی سالانہ روزداد کے ساتھ ان الحاقی مدارس کے نتائج امتحانات، اور آمد و خرچ کے حسابات بھی بطور ضمیمہ الترتیباً شریک ہو کر شائع کئے جاتے تھے، ۱۲۹۳ھ یعنی قیام دارالعلوم کے گیارہ سال بعد پرانی رودادوں میں ایک جدید عنوان یہ ملتا ہے، یعنی

”ذکر مدارس شاخائے مدرسہ اسلامی دیوبند“

پہلی دفعہ ۱۲۹۳ھ کی روداد میں اس عنوان کے نیچے یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

اس مدرسہ کی چند شاخیں بھی بعض اہل اسلام کی ہمت سے جاری ہیں ۴ ص ۲۲

اس اجمال کی تفصیل یہ کی گئی ہے، کہ

”منجملہ ایک انیٹھ سیرزادگان، ضلع سہارنپور میں اور دو تھانہ بھون ضلع مظفرنگر اور شہر مظفرنگر میں اور ایک گلاوٹھی، ضلع بلند شہر میں ہے۔“

جس کا مطلب یہی ہوا کہ نئے قائم ہونے والے عام مدارس میں سے دس گیارہ سال کی مدت میں پانچ مدرسے تو ایسے تھے، جن کا باضابطہ قانونی شکل میں الحاق مرکز یعنی دارالعلوم سے ہو چکا تھا، آگے ہر مدرسہ کے متعلق تفصیلی طور پر بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کس مدرسہ میں امتحان لینے کے لئے مرکز نے اپنے یہاں کے کن کن مدرسین کو بھیجا۔ ان الحاقی مدارس کو کتنی اہمیت دی جاتی تھی، اس کا پتہ اسی سے چلتا ہے، کہ بجائے عام مدرسین کے عموماً امتحان لینے کے لئے دارالعلوم کے صدر اول مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بنفس نفیس تشریف لے جاتے تھے، ۱۲۹۳ھ کی روداد میں گلاوٹھی کے مدرسہ کے متعلق لکھا ہے کہ

”مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اول نے ہمراہی، متمم مدرسہ دیوبند اس مدرسہ کا امتحان لیا۔“
۱۲۳

اسی طرح انیٹھ کے مدرسہ کے امتحان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”اس مدرسہ کا امتحان سالانہ بھی جناب مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اول مدرسہ دیوبند نے لیا۔“
۱۲۴

جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان الحاقی مدارس کو کتنی اہمیت دی جاتی تھی، بلکہ ۱۲۹۳ھ کی روداد میں ”اطلاع“ کے عنوان سے الحاقی مدارس کے تذکرے کے بعد ایک اعلان بھی شائع کیا گیا تھا، جس میں ”ج تھا کہ

”ادباب مشاورت مدرسہ دیوبند کے نزدیک جن کے سپرد اب ان مدارس (یعنی الحاقی مدارس) کا امتحان وغیرہ رکھا گیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ اگر مہتممان شاخہائے مذکورہ اپنی اپنے مدارس کے چندہ سے تھوڑی تھوڑی امداد فرمائیں، تو ان مدارس کے امتحان اور نگرانی تسلیم کے لئے ایک گروہ اور مقرر کیا جائے، جو ماہور یا دوسرے ہمین جیسا کہ اتفاق پڑے، ان مدارس کا امتحان لیا کرے، اور جو کسی قسم کی استری یا خرابی دیکھا کرے، تو اس کے دودھ کر نیکی

حسب رائے مہتممان اس کی تدابیر کیا کرے؟ ص ۳۱

اس کا بہتہ تو نہ چلا کہ الحاقی مدارس کے مہتمموں پر اس اعلان اور مشورہ کا رد عمل کیا ہوا، لیکن بہر حال اس سے سیدنا الامام الکبیر کے تعلیمی نصب العین کا ایک ایسا پہلو تو سامنے آتا ہے، جس سے یہی سمجھ میں آتا ہے، کہ سرکاری مدارس کی نگرانی کے لئے جیسے انسپکٹروں کا تقرر حکومت کرتی تھی، چاہا جاتا تھا کہ اس کے مقابل میں آزاد تعلیم کا موازی نظام قائم کر کے اس آزاد نظام تعلیم کے تحت چلنے والے مدارس کی نگرانی کیلئے بھی مرکزی دارالعلوم کی طرف سے بھی انسپکٹروں کا تقرر کیا جائے، اسی لئے خواہش کی گئی تھی، کہ ہر الحاقی مدرسہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ مرکزی خزانہ میں داخل کرے۔

اس سلسلہ کی ایک دل چسپ خبر ان ہی رودادوں میں یہ بھی درج کی گئی ہے، کہ مشہور قصبہ کیرانہ میں بھی مدرسہ قائم کر کے مرکز سے اس کا الحاق کیا گیا تھا۔ عام چندے کے علاوہ وہاں کے باشندوں سے آمدنی حاصل کرنے کی یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی، جو روداد میں بایں لفظ درج ہے، کہ

”یہاں کے رقبہ میں چاہ بکثرت ہیں، اگر سرچاہ ایک من غلہ مقرر کیا جائے تو بہتر ہے، چنانچہ

اس پر اکثر اصحاب راضی ہو گئے ہیں“ ص ۳۱ روداد ۱۲۹۲ھ

اس تجویز کا ذکر کر کے دارالعلوم کی روداد میں باشندگان کیرانہ کو توجہ دلاتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ ”اگر یہ بات چل نکلی، تو پھر دیکھو کہ اس مدرسہ کا کام کس خوبی سے چلتا ہے، اور کیسے کیسے پھل پھول لگتے ہیں“

آخر میں یہ لکھتے ہوئے کہ ”اب خدمت میں جملہ رؤساء قصبہ کیرانہ، و نواح کیرانہ عرض ہے“ یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ

”علم سیکھو سکھاؤ، کہ علم ہی دونوں جہان کی کنجی ہے“ ص ۳۲

الغرض الحاقی مدارس کی آمدنی سے جہاں چاہا گیا تھا، کہ مرکزی دارالعلوم کے خزانہ میں مستطاعت کچھ داخل کریں، وہیں ان الحاقی مدارس کی امداد پر بھی لوگوں کو آمادہ کیا جاتا تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ سرکاری مدارس کو حکومت اور حکومت کے خزانہ کی پشت پناہی حاصل تھی، اور

یہاں جو کچھ بھی تھا، سب کا دار و مدار رضا کارانہ خدمات پر تھا، سیدنا امام الکبیر کے بعد مرکز ثقل پر جمیع کرنے والی قوت باقی نہ رہی، نئے مدارس کا الحاق تو آپ کے بعد کیا عمل میں آتا۔ اپنے الحاق کو جو تعلیم لکھا ہیں منظور کر چکی تھیں، بہ تدبیر منجمل ہوتے ہوئے دارالعلوم سے ان کا رشتہ بھی اتنا کمزور ہو گیا، کہ اب رسمی تعلق سے زیادہ شاید ان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی۔

بہر حال تاسیس دارالعلوم کے ابتدائی سالوں ہی میں یہ نصب العین سامنے تھا کہ سارے ہندوستان کے مناسب مقامات پر قومی خزانہ سے دینی تعلیم کا ہوں گا جال اسی طرح بچھا دیا جائے، جیسے حکومت کے خزانے سے دنیاوی مدارس ہر جگہ کھولے جا رہے تھے۔ آپ کو مدرسہ کے تیسرے سال یعنی ۱۲۸۵ھ ہی کی روداد میں یہ عبارت مل جائے گی، روداد کے آخر میں خاتمہ کے عنوان سے دعا و شکر یہ کی سرخی قائم کر کے منجملہ دوسری باتوں کے یہ اطلاع درج کرتے ہوئے کہ

”نہایت خوشی اپنی ظاہر کرتے ہیں۔ اس امر پر کہ اکثر حضرات باہمت لے اجراء مدارس عربی کو توسیع دینے میں کوشش کر کے مدارس بمقامات مختلفہ دہلی و میرٹھ و خوجہ و بلند شہر و سہارنپور دکن وغیرہ جاری فرمائے، اور دوسری جگہ مثل علیگڑھ وغیرہ اس کا خبر کی تجویزیں ہو رہی ہیں“

آخر میں جامعاتی نصب العین کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے کہ

”امید کرتے ہیں، کہ ہم کو بھی وہاں کے حالات و حساب و کتاب سے کبھی کبھی جیسا کہ یہاں کے ہمت کرتے ہیں، مطلع فرماتے رہیں، تاکہ جو عمدہ انتظام ان کے مدارس میں تجویز ہو، وہ یہاں بھی جاری کئے جایا کریں، اور یہاں سے وہاں، اور نتیجہ اس نیک تدبیر کا یہ ہو گا، کہ ۱۲ انتظام سب جگہ کے قریب یکساں ہو جائیں گے“ ص ۴۴ روداد ۱۲۸۵ھ

لے دارالعلوم کے ادنیٰ خادم کی حیثیت سے خاک کا جب وہاں تعین تھا، آج سے تیس چالیس برس پہلے کی بات ہے اس وقت تک اتنا اثر باقی تھا کہ چند خاص مقامات کے مدارس خصوصاً دہلی، پانسل برٹلی، نلگینہ وغیرہ کے مدیون کے ہر سال چند محتضروں کو طلب کیا جاتا تھا، کبھی کبھی خاکسار بھی جاتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب اب یہ رسم قدیم باقی ہے، یا یہ بھی ختم ہو گئی؟ (محمد انصاف بھی باقی ہے، اہ اس میں وسعت بھی ہو گئی ہے۔ محمد طیب غفرلہ)

آخری الفاظ یعنی ”انتظام سب جگہ کے قریب یکساں ہو جائیں گے“ اسی کو میں جاسماتی نصب العین کہتا ہوں۔

قومی سرمائے سے چلنے والے مدارس کو نظم و ضبط کے وحدانی قالب میں ڈھال دیا جائے، اس دعوے کے ثبوت کے لئے اس سے زیادہ واضح شہادت اور کیا مہیا ہو سکتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقتداری قوت کی پشت پناہی سے محرومی کا احساس کر کے اسی پر لوگوں کو آمادہ کیا جاتا تھا کہ بجائے لاگ ڈانٹ اور قیسانہ تعلقات کے قومی مدارس میں ربط و ضبط کے مراسم ہی کو باقی رکھا جائے، اور تعلیم کا کوشش کرے کہ جس مدرسہ میں مفید طریقہ کار اختیار کیا جائے، بغیر کسی تعصب اور تنگ نظری کے دوسرے مدارس بھی اسی کو اختیار کریں۔

اب یہ واقعات ہی بتا سکتے ہیں کہ کرنے والوں نے کس حد تک ان قیمتی مشوروں اور تجویزوں پر عمل کیا۔ پیش کرنے والا وہ سب کچھ پیش کر کے جاچکا تھا۔ سوچھ والوں کو وہ سوچھایا نہ ہو چھا، ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری ان ہی لوگوں پر عائد ہو سکتی ہے، جن کے ہاتھوں میں دینی تعلیم کی باگ آئندہ سرزمین ہند کے ان مدارس کی آئی۔

تعلیم ہی کے سلسلہ میں ایک نئے اقدام کا پتہ ان ہی پرانی رودادوں سے چلتا ہے، مشکل کے حل ہو جانے کے بعد تو اب اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ لوگوں کو نہیں ہو سکتا، لیکن جس زمانہ میں یہ اقدام کیا گیا تھا، تعلیمی و تدریسی نقطہ نظر سے شاید وقت کا وہ نازک ترین سلسلہ تھا۔

مطلب یہ ہے کہ مطابع اور پریس سے پہلے مسلمانوں میں ایک مستقل نظام ”نقل کتب“ کا قائم تھا، میں نے اپنی کتاب ”مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت“ میں اس مسئلہ کے متعلق کافی معلومات جمع کر دی ہیں۔ حاصل یہی ہے کہ شہروں اور قصبوں تک میں ”ذرا قیمت“ اور ”نساخیت“ یعنی کتابوں کو نقل کر کر کر بیچنے والوں کا ایک گروہ پایا جاتا تھا۔ جو نادر کتابوں کے متعلق اپنے پاس معلومات رکھتا تھا، کہاں جاتی ہیں۔ ان کی نقل کس ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے، ان امور کی واقفیت کے ساتھ اس کا سامان کئے رہتا تھا کہ فرمالیش کے ساتھ ہی ضرورت مندوں تک وہ کتاب نقل کر کے پہنچا دی جائے، معتدل قیمتوں پر

بڑی سے بڑی کتابیں بآسانی ان درآقوں اور نساخوں کے ذریعہ سے مہیا ہو جاتی تھیں، اندازہ کے لئے یہی کافی ہو سکتا ہے، کہ جہاں قرآن مجید کا ہدیہ پانچ پانچ سونک بھی تھا، وہیں صحیح تاریخی شہادتوں سے یہ بھی ثابت ہے، کہ عام معمولی نسخہ ایک ایک ٹکڑے (دوبیہ) میں بھی مل جاتا تھا، جو شاید آج بھی قابل تصور مشکل ہی سے ہو سکتا ہے، اسی کتاب میں مدراس کے مشہور انگریزی روزنامہ ”ہندو“ کے حوالہ سے آپ کو یہ نوٹ بھی ملے گا، ”یعنی ہندوستان میں پریس کا رواج کب سے ہوا، اس کا یہ جواب دیتے ہوئے کہ ”ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب ۱۷۵۷ء میں چھپ چکی تھی“

گو یا آج سے تقریباً چار سو سال پہلے ہی طباعت کا رواج حالانکہ اس ملک میں ہو چکا تھا، مگر بائیں اسی نے لکھا ہے کہ

”ملک کے مختلف حصوں میں چھاپے خانے بہت کم کھل سکے“

جس کی وجہ دہی یہ بیان کرتا ہے کہ

”ہندوستان میں چھاپہ خانوں کی ترقی میں سست رفتاری کی ایک وجہ تھی کہ شہر کتابوں کی نقل کیلئے خطاطوں کا انتظام مغلوں نے کر رکھا تھا“ (اخبار ہندو مدراس ۱۹۳۳ء)

مغلیہ عہد کا یہی انتظام مغلوں کی حکومت کے ختم ہونے کے ساتھ درہم دبرہم ہو گیا۔ لیکن اس کی جگہ نئی حکومت کی سرپرستی میں یوں قائم ہونے کو تو اس ملک میں مطابع قائم ہونے لگے تھے۔ لیکن عام مشرقی زبانوں کی طباعت و اشاعت کی طرف جیسا کہ چاہئے تھا، حکومت نے کافی توجہ نہ کی۔ انگریزوں کو ایستعانی عہد حکومت میں دفتر چونکہ فارسی زبان ہی میں تھا، اس لئے فارسی زبان کے پڑھنے پڑھانے کا رواج بھی زیادہ متاثر نہ ہو سکا، اور اس زبان کی خصوصاً درسی کتابیں ہی زیادہ ان مطبعوں میں چھپتی رہیں۔

فارسی کی جگہ انگریزی کے ساتھ حکومت نے اردو کی طرف اپنی توجہ جب مبذول کی، تو اردو کتابوں کی طباعت و اشاعت کا رواج بھی تھوڑا بہت ہوا، لیکن عربی زبان اور اس زبان میں مسلمانوں کی جو دینی و علمی کتابیں تھیں، ان کے چھاپنے چھپوانے کا محرک اگر کچھ ہو سکتا تھا، تو مسلمانوں کا مذہبی جذبہ، لیکن مسلمانوں کی عمومیت مغرب عربی سے نادانف تھی، لاکھوں لاکھ میں ایک دو ٹوٹے پھوٹے مولوی

غریبوں کی طلب کی تکمیل کے لئے کسی کو کیا ضرورت تھی، کہ عربی زبان کی ان کتابوں کے چھاپنے میں اپنا سرمایہ لگائے۔

الغرض ”ذرا قیت“ یعنی نقل نویسی کے ذریعہ کتابوں کی فراہمی کا قصہ ایک طرف ختم ہوا اور طباعت کے لئے پہلی شرط یہ تھی کہ جو کتاب چھاپی جائے، اس کے طلب کرنے والوں کی تعداد کافی ہو، لیکن ناکافی تعداد بھی جس چیز کے خواہش مندوں کی بازار میں باسانی فراہم نہیں ہو سکتی تھی، خود سوچئے اسی کے چھاپنے پر روپے صرف کرنے، محنت برداشت کرنے کے لئے کون آمادہ ہوتا، مگر دینی تعلیم کی عام اشاعت میں عربی زبان کی کتابوں کا مسئلہ کافی اہم تھا، اسی سے اندازہ کیجئے کہ دارالعلوم کے قیام کے بعد دوسری رواد ۱۲۸۵ھ کی جو شائع ہوئی تھی، اس میں اس کی شکایت کرتے ہوئے کہ

”ترقی خواندگی میں بالخصوص یہ امر بھی خارج رہا کہ کتب درسیہ خاصہ کتب ادب و انشاء عرب جس کی تعلیم بیش تر مد نظر ہے، بقدر کفایت بہم نہ پہنچ سکیں“ ص ۷۲

اس سے جہاں ضمناً اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ادب عربی و انشاء کی طرف دارالعلوم کی تاسیس کی ابتداء نے زمانے میں خاص توجہ کی جاتی تھی، آگے جن کتابوں کے دستیاب نہ ہونے کی اطلاع دی گئی ہے، ان میں جتنی اور نفثۃ الیمین جیسی عام کتابیں بھی ہیں۔ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، کہ نہ دستیاب ہونے والی کتابوں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ

”بالکل بہم نہ ہو سکیں“

ادریہ کی ایسی دشواری ہے کہ

”رفع کرنا اس حرج کا اختیار معتمدان مدرسہ و طلبہ سے باہر ہے“ ص ۷۲ رواد ۱۲۸۵ھ

مطلب جس کا یہی ہوا کہ ایسا زمانہ بھی گزر چکا ہے جب ”نفثۃ الیمین“ اور ”متنبی“ وغیرہ جیسی عام متداول کتابوں کا بندوبست کرنا طلبہ ہی کے لئے نہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام و انتظام کے بس کی بات بھی نہ تھی۔ اللہ اللہ وقت کی نزاکتوں کا کچھ ٹھکانہ تھا۔

اب میں نہیں کہہ سکتا کہ حالات کی ان غیر معمولی نزاکتوں کا اندازہ کرتے ہوئے یہ تجویز کس نے پیش کی

لیکن اسی سال کی روداد میں یہیں ایک تجویز ملتی ہے، درسی کتابوں کی نایابی و کمیابی کی دشواریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ لکھ کر کہ

”یہ مشکل بہ توجہ تاجران کتب، داہل مطالع حل ہو سکتی ہے“

گویا ملک کے اسی خاص طبقہ کو متوجہ کر کے تجویز بایں الفاظ پیش کی گئی ہے۔

”یعنی ان کتب کو بیشتر چھاپیں، اور فروخت کریں، اور کسی قیود و توقف خرچ مدرسہ بھی فرما کر شامل

نفع دین و دنیا ہوں“

جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ تجویز کس کی پیش کی ہوئی ہے، روداد میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا، لیکن دارالعلوم کا سارا کاروبار جس کی نگرانی اور مشورے کی روشنی میں انجام پاتا تھا۔ بظاہر خیال یہی گذرتا ہے کہ ان ہی کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی ہوگی، اور ان ہی کے اشارے سے مہتمم صاحب مدرسہ نے روداد میں اس کو غالباً درج کیا ہے۔ یوں بھی سیدنا امام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا مطالع سے خاص تعلق تھا، آپ کی عمر کا اکثر و بیش تر زمانہ گذر چکا کہ مطالع میں تصحیح کتب کی خدمت میں لگتا تھا، بلا لاسی فقرے کو پڑھ کر سیراد میں خدا جلنے کن کن مسائل کی طرف منتقل ہونے لگا۔ علمی خدمات کے سلسلے میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ کا عربی کتابوں کے چھاپہ خانوں کی خدمت کو قبول کرنا، غدر سے پہلے زیادہ تر آپ کا اسی مشغلہ میں مصروف رہنا، فتنہ کے فرو ہونے کے بعد عربی خط نسخ کے سب سے بڑے مرکزی جگت استاذ فزہتہ تم یعنی منشی ممتاز علی صاحب مرحوم کے ساتھ آپ کے خصوصی تعلقات جن کا ذکر کر چکا ہوں، ان ہی منشی ممتاز علی مرحوم کا

سلجھ سی بلا واسطہ مولانا نظام الدین مغربی حیدر آبادی مرید خاص حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ نے بیان کیا، جب میں جمعہ باد میں مقیم تھا، کہ ان سے حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم نے فرمایا، ”نیز میرے والد صاحب نے بھی مجھ سے یہی واقعہ دوسرے عنوان سے بیان فرمایا، کہ حضرت نانوتویؒ کی حیات میں دارالعلوم کا اہتمام میں نہیں کرتا تھا بلکہ حقیقت حضرت نانوتوی فرماتے تھے کہ ان کا اختتام کی جو چیز حضرت نانوتویؒ کے قلب پر وارد ہوتی تھی، اس کا عینہ ان کا سر میرے قلب پر ہو جاتا تھا“ اور میں اس کام کو کر گزرتا تھا۔ میرے کام کر لینے پر حضرت نانوتوی فرماتے کہ مولانا اللہ آپ کو جزاء خیر عطا فرمائے، میرا دل یہی چاہتا تھا کہ ایسا ہو جائے۔ پھر یہی واقعہ میں نے حاجی امیر شاہ خاں صاحب سے بھی سنا، آگے تن میں بھی اس روایت کا حوالہ آ رہا ہے۔ محمد طیب غفرلہ

قائم کردہ وہ مطبع تھا جو بعد کو مطبع مجتبیٰ دہلی کے نام سے مشہور ہوا، اور مولوی عبدالاحد مرحوم بیسرا آدمی نے یہ مطبع خریدا، جس سے بالآخر وہ دہلی کے رئیسوں میں شمار کئے گئے، نصف صدی تک عربی مدارس کی دہائی کتابوں کے طبع و اشاعت کا کام منشی حمت از علی مرحوم کا قائم کردہ ہی مطبع مجتبیٰ انجام دیتا رہا، منشی صاحب کے دو صاحبزادے منشی مشتاق علی و منشی عبدالغنی اپنے والد کے بعد خط نسخ عربی کے سامنے ہندوستان میں استاذ اہل سبھے گئے۔ یاد ہو گا کتابی کاروبار سے براہ راست تعلق رکھنے والے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی کے نور چشم مولانا حفیظ الرحمن کے مکتوب گرامی سے خط نسخ کے ان ہی دونوں کتابوں (منشی مشتاق علی و منشی عبدالغنی) کے متعلق یہ شہادت نقل کی گئی تھی کہ ان کے

”سینکڑوں تلامذہ ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں“

ہندوستان میں عربی خط نسخ کی طباعتی سرگزشت کی ان مجمل معلومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، آپ خود سوچئے مندرجہ روداد کی تجویز کے ان الفاظ کو جس کے مخاطب ارباب مطالع تھے، یعنی

”ان کتب (عربی کی درسی کتب) کو کثرت چھاپیں“

اگر تجویز کے اس جز کو سیدنا الامام الکبیر کی طرف میرا ذہن منسوب کرتا ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ میرے دل میں اس قسم کے خیالات جو آرہے ہیں، کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جیسے دینی علوم کی درسائے و تبلیغاً اشاعت کا ذریعہ سیدنا الامام الکبیر کی ذات مبارک کو دارالعلوم و دیوبند قائم کر کے حق سبحانہ و تعالیٰ نے بنایا، کیا عربی کتابوں کی طباعت و اشاعت میں بھی کام لینے والے نے آپ ہی سے کام لیا، وہی ہندوستان جہاں نفع المین، اور منتہی حبیبی عام کتابیں بھی ڈھونڈھے نہیں ملتی تھیں، وہیں پھر عربی کتابوں کی طباعت و اشاعت کا کام طول و عرض اور عمق میں جتنا بڑھا، پھیلا پھیلا، اور جو کچھ تماشا بھی دیکھا گیا، اور ۱۹۴۷ء تک جب تک ملک تقسیم نہیں ہوا تھا، عروج و ارتقاء کے ان تماشوں سے شمال جنوب کے علاقے پٹے ہوئے تھے۔ عربی کی ضخیم ضخیم کتابیں جو کسی خالص اسلامی ملک میں بھی نہ چھپ سکیں، ہندوستان میں وہ چھاپی جا رہی تھیں، کون کہہ سکتا ہے، کہ اس کی تہ میں اوروں کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کی

توجہ و ہمت کی قوت پوشیدہ نہ تھی ؟ واقعات کی بکھری ہوئی گڑبڑوں کو جوڑ کر دیکھئے۔ شاید واقعہ آپ کے سامنے بھی اسی شکل میں آجائے، جیسے میرے سامنے آ رہا ہے۔

بہر حال یہ تو تجویز کا پہلا حصہ تھا، یعنی ارباب مطالعہ کو کتابوں کے چھاپنے اور شائع کرانے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ دوسرا جز، اس کا جو یہ تھا کہ اپنی چھاپنی ہوئی کتابوں کے کچھ نسخے بطور وقف مدرسہ میں بھی داخل کر دیں۔ بظاہر اس وقت یہ ایک معمولی تجویز تھی، لیکن جس کا جی چاہے آج دارالعلوم دیوبند میں آکر معائنہ کر سکتا ہے کہ تجویز کے اسی ابتدائی تخم نے کتنے بڑے تناور درخت کا قالمبہ اختیار کر لیا۔ آج اسی کی چھاؤں میں علم کے غریب مسافروں کی کتنی بڑی تعداد آرام کی زندگی گزار رہی ہے۔ نیچے سے اوپر تک بیسیوں جماعتوں، امدان جماعتوں میں ستو ستو اداروں کو بھی کہیں زیادہ بہت زیادہ تعداد شریک ہوتی ہے۔ نہ جانے دالوں کو سن کر تعجب ہو گا، کہ اول سے آخر تک مدرسہ میں تعلیم پانے والے طلبہ میں مشکل ہی سے انگلیوں پر گنے جانے والے ایسے افراد ہونگے جو اپنی خریدی ہوئی کتابیں پڑھتے ہوں، بلکہ پڑھنے کے لئے ہر جماعت کے طالب علموں کو مدرسہ ہی کی طرف سے عاریت کتابیں دی جاتی ہیں، پڑھنے کے بعد طلبہ ان کو پھر مدرسہ میں واپس کر دیتے ہیں۔ ان کتابوں میں بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں کہ جہاں بعض کتابیں روپے دو روپے کی ہوتی ہیں۔ وہیں ان میں ایسی کتابیں بھی ہیں، جن کی قیمت اس وقت بازار میں پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ روپے سے کم نہیں ہے۔ یقین مانئے کہ مدرسہ کی طرف سے مفت کتابوں کی فراہمی کا نظم اگر نہ قائم کیا جاتا، تو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی سمجھ میں نہیں آتا ہے، کہ تعلیم و تدریس کے سلسلے کو جاری رکھنے کی شکل ہی کیا ہوتی۔ عربی مدارس میں پڑھنے والے طالب علموں کی مالی حالت یقیناً ان کتابوں کی خریداری کے بار کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ بڑا مسئلہ تھا۔ جس کے حل کی صورت شروع ہی میں سوچ لی گئی تھی، بھگت داس میں کامیابی ہوئی۔ اور بہت غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ دارالعلوم کا کتب خانہ اسی لئے دو مستقل شعبوں پر منقسم ہے۔ ایک شعبہ صرف ان ہی کتابوں کا ہے جس سے ہر سال طالب علموں کو عاریت پڑھنے کے لئے کتابیں دی جاتی ہیں۔ اسی لئے عموماً اس شعبہ میں صرف درسی کتابیں رکھی گئی ہیں۔ ایک ایک درسی کتاب کے

نسخے سنو سنو اور سنو سنو سے بھی زیادہ تعداد میں محفوظ ہیں، اور یہی شعبہ دارالعلوم کے کتب خانہ کا خصوصی شعبہ ہے۔ باقی دوسرا شعبہ عام کتابوں کا ہے۔ الحمد للہ کہ اس وقت تک اس شعبہ میں بھی پچاس ساٹھ ہزار کے لگ بھگ کتابیں جمع ہو چکی ہوں گی۔ اس شعبہ کی بنیاد بھی ابتدائی میں ڈال دی گئی تھی، مذکورہ بالا تجویز کے آخر میں جو یہ فقرہ ہے کہ

”ماکان تجلانی توجہ سوجن کی کتابیں صندوق اور الماریوں میں رکھی ہوئی وقف خورش کرم دیکھیں، یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے“

الحمد للہ کہ یہ تحریک بھی کامیاب ہوئی، اور وقتاً فوقتاً ملک کے مختلف حصوں سے دارالعلوم میں چھوٹے بڑے کتب خانے ان علمی خاندانوں سے منتقل ہو ہو کر پہنچتے رہے، اور پہنچ رہے ہیں۔ جن میں اسلامی علوم کا شوق باقی نہیں رہا ہے۔ امید ہے کہ ”وقف خورش کرم دیمک“ کی جگہ دارالعلوم کے کتب خانے میں وقف کر کے اپنے بزرگوں کی علمی یادگاروں کی حفاظت کی اس تدبیر سے آئندہ بھی لوگ غفلت نہ برتیں گے۔

اسی تجویز کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کے وقف اور ہبہ کرنے ہی کا مشورہ نہیں فرمایا گیا تھا۔ بلکہ بجائے وقف کے توجہ دلائی گئی تھی کہ مدرسہ کی علمی خدمت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ”کرم دیمک والی الماریوں اور صندوقوں“ سے نکال نکال کر دارالعلوم کے کتب خانے میں لمانہ و عاریتہ اپنی کتابوں کو لوگ محفوظ کرادیں۔ یہاں ان کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی، اور اساتذہ و طلبہ کو ان کتابوں سے استفادہ کا موقع بھی ملتا رہے گا، مہتمم صاحب نے تجویز کے بعد اسی ردود میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

”جن حضرات نے اس شیوہ پسندیدہ کو اختیار کر کے کتب عربی و فارسی وقف مدرسہ فرمائیں، یا عاریتہ واسطے استعمال مدرسہ کے سپرد، مہتمم کیس، فہرست ان کی آخر ردو میں مندرج ہے“

لے کتاب فرنگیوں نے جال ہیں ہے کہ ۱۹۴۲ء تک پچاس ہزار سے زائد کتابیں کتب خانہ میں موجود تھیں۔ ۱۳۵۵ھ
(اب کتابخانہ میں یہ تعداد ستر ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ محمد طیب اعظمی)

جو فہرست عاریۃً و امانۃً مدرسہ میں کتابوں کے رکھوانے والوں کی درج کی ہے، اس میں سب سے پہلا اسم گرامی خود سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، اور کافی قیمتی کتابوں کا نام لیا گیا ہے، گو یا عملاً ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنت حضرت والا ہی کی جاری کی ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ قیام دارالعلوم کے ابتدائی دنوں سے کتب خانہ کے دونوں ہی شعبوں (تدریسی و غیر تدریسی) کی طرف پوری توجہ کی گئی، ہر سال کی روداد میں اس اہم علمی ضرورت کی طرف مختلف الفاظ میں سلسل اور نوٹراپیلیں شائع ہوتی رہیں۔ جن کا بجز اللہ اچھا خاصہ اثر ہوا، گویا اپنے اپنے مطبع اور تجارتی کتب خانوں کی کتابوں کے چند نسخوں کا دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں داخل کرنا رفتہ رفتہ ایک رسم اور دستور کی صورت بن گیا، انتہا یہ ہے کہ علاوہ مسلمانوں کے اس سلسلہ میں غیر معمولی فراخ دلی کا ثبوت منشی نول کشور نے پیش کیا، ۱۲۸۶ھ کی روداد میں یہ لکھتے ہوئے کہ ”امداد کتب کی نسبت جو سال گذشتہ لکھا گیا تھا، بہت سے اہل ہمت نے اس طرف توجہ فرمائی، اور بار سال کتب قیمتی و کارآمد مدرسہ کی امداد فرمائی۔“

آگے اسی کے بعد ہے کہ

”بالخصوص منشی نول کشور صاحب مالک چھاپہ خانہ اعظم مقام لکھنؤ اس امر میں زیادہ تر قابل مشکوری ہیں کہ باوجود بعد مسافت بہت سی کتب کارآمد سے معاونت کی۔“ ص ۳

صرف اسی روداد میں نہیں، بلکہ آگے کی رودادوں میں بھی، منشی نول کشور کی توجہ خاص کا اس سلسلہ میں بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔ ۱۲۸۹ھ کی روداد میں ان کا ادران کے عطیہ کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ ”ارباب مشورہ مدرسہ نہایت شکر گزار ہیں جناب منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اعظم لکھنؤ کے جنھوں نے مثل سابق کمال دریا دلی کو کام فرمایا، اور چند کتب مفید سے امداد مدرسہ میں بہت فرمائی، فہرست ان کی ضمیمہ نمبر ۴ میں مندرج ہے، ان میں ہی خاص کر نسخہ قلموس کہ کتب لغت میں بے نظیر ہے، اور منشی صاحب نے خاص اپنے مطبع میں اس کتاب کو نہایت خوبی اور صحت سے اس سال میں طبع فرمایا ہے، لائق بیان ہے۔“

آخر میں یہ الفاظ بھی درج کئے گئے ہیں کہ

”مدرسہ میں اس سے پہلے کوئی نسخہ اس کتاب کا نہ تھا۔ یہ کتاب ایسی محتاج الیہ ہے کہ ہر

مدرس اور طالب علم کو اس کی حاجت رہتی ہے“ ص ۵۵ ردود سال ۱۲۸۹ھ

گویا یوں سمجھنا چاہئے، کہ مدت تک دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ و طلبہ اپنی دینی و علمی ضرورتوں کو ہی ایک غیر مسلم کے کتابی عطیہ کی مدد سے پوری کرتے رہے، قرآن سمجھتے رہے، حدیثوں کے لغوی مشکلات کو حل کرتے رہے، اور یہ تھا، دور قاسمی کا وہ دارالعلوم جو سرزمین ہند میں ہندوستان کے خاص حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے قائم کیا گیا تھا۔

اور معاملہ کتابوں ہی کی حد تک محدود نہ تھا، ہندوستان کا یہ وہ زمانہ تھا کہ اردو زبان کے مودے چند اخبار بعض بعض مقامات سے نکلنے لگے تھے۔ سب کو تو نہیں، لیکن ایسے چند اخبار جن کے مالک مسلمان تھے۔ ان میں بعضوں کو توفیق ہوئی، اور مدرسہ میں بھی ایک ایک کاپی اپنے اپنے اخباروں کی ہدیہ ارسال کرنے لگے، خصوصیت کے ساتھ اس سلسلہ میں کانپور کے اخبار نور الانوار کا ذکر کیا گیا ہے، جس کے مالک منشی عبدالرحمن مالک مطبع نظامی تھے۔ نیز ”نجم الاخبار“ نامی میرٹھ سے جو نکلتا تھا، اس میں مدرسہ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ تائیدی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ لیکن ایک تو ان اخباروں کے مالک مسلمان تھے۔ اس لئے ان کی طرف سے ایک ایک کاپی مدرسہ میں اگر پیش ہوتی ہو، تو اس پر تعجب نہیں ہوتا، ماسوا اس کے ہفتہ میں ایک بار نکلنے والے اخبارات تھے۔ بلکہ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ یہی منشی نول کشور جو اپنے یاں کی مطبوعہ کتابوں سے دارالعلوم کی ہر سال امداد کرتے تھے، اور ان ہی کے مطبع سے ایک روزنامہ ”ادوہ اخبار“ نامی نکلتا تھا۔ جو غالباً ہندوستان کا پہلا روزنامہ تھا۔ منشی نول کشور کی طرف سے یہ اخبار بھی ہدیہ دارالعلوم میں آتا رہا۔ اسی طرح دیوبند کے نواح میں ایک قصبہ بوڈھانہ ہی، لے ایک فہرست بھی اسی رعداد میں آنے والے اخباروں کی دی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ ادوہ اخبار کے سامنے یہ اضافہ بھی درج ہے کہ

”ان کا (یعنی منشی نول کشور کا) اخبار باوجود کہ روزانہ جاری ہوتا ہے اور پیش بہا ہے، عنایت فرماتے

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہیں“

وہاں کے ایک منچلے ٹھا کر جن کا نام راؤ امر سنگھ تھا۔ ”سفیر بوڈھانہ“ کے نام سے ایک اخبار اپنی اسی قصبہ سے نکالا کرتے تھے۔ اور اس کی ایک کاپی مدرسہ کے نذر بھی التزاماً کیا کرتے۔ ۱۹۴۷ء کی روداد میں ان دونوں (اودھ اخبار اور سفیر بوڈھانہ) کا ذکر کرتے ہوئے جن الفاظ میں شکر یہ ادا کیا گیا ہے، جی چاہتا ہے کہ ان کو نقل کر دیا جائے۔

”شکر یہ مہمان اخبار و مطابع“ کا عنوان قائم کر کے عمومی شکر یہ کے بعد اسی روداد میں ہے کہ، ”جناب منشی نول کشور صاحب مالک اودھ اخبار لکھنؤ، اور جناب راؤ امر سنگھ مالک اخبار ”سفیر بوڈھانہ“ کا بالخصوص کہ باوجود دونوں صاحب اہل ہنود سے ہیں۔ مگر آفریں، صہنر آفریں ان کی سخاوت اور عنایت پر کہ اپنے اپنے اخبارات گراں بہا اس مدرسہ کو مفت عنایت فرماتے ہیں، جملہ ارباب شوریٰ مدرسہ ہذا نہ دل سے شکر یہ ادا کرتے ہیں“ اور بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی، آگے کے الفاظ پڑھئے،

”اور سب صاحبوں کے حق میں اور ان کے اخبارات کے حق میں دعا و خیر کرتے ہیں، کہ خداوند تعالیٰ ان کے اخبارات اور کارخانجات کو دم بدم ترقی عطا فرمائے“

اور آخر میں یہ کہ

”ان کی قوت اودھ آزادی کو قائم رکھے“ ۶۳ روداد ۱۹۴۷ء

مدرسہ دیوبند کی پہلی مجلس شوریٰ جس کے جزو کل و حقیقت سید نالامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے، اسی مجلس شوریٰ کے ”جملہ ارباب شوریٰ“ کی طرف سے شکر یہ اور دعا خیر کے ان الفاظ میں غور کیجئے اور سوچئے کہ حکومت متغلبہ و مصلطہ کی بڑی سی بڑی امدادی پیشکشوں کو اپنی پوری تاریخ میں جس مدرسے کبھی آنکھ نہیں لگائی، اسی کا طرز عمل اسی ملک کے دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ کیا تھا اور کس قسم کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بیش بہائی کے سلسلہ میں یاد آگیا، اسی اودھ اخبار کا ذکر غالب نے بھی اپنے خط (مذہبہ اردوئے معلیٰ) میں کیا ہے، کہ اس کو بھی منشی جی ہدیہ یہ اخبار دیتے ہیں، لیکن محصول ڈاک ملکٹوں کی شکل میں بیچارے غالب کو خود بھیجنے پڑتے تھے۔

تعلق کو وہ ان کے ساتھ قائم رکھنا چاہتا تھا۔

عہد قاسمی کی ان ہی قدیم رودادوں میں ”دستور العمل چندہ“ و ”ذکر آئین چندہ“ کا عنوان قائم کئے پہلی دفعہ اسی دستور اور آئین کی بایں الفاظ اس زمانہ کی ہر روداد میں جو ملتی ہے یعنی

”چندہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں، اور نہ خصوصیت مذہب و ملت“

اسی کے ساتھ ان ہی رودادوں میں چندہ دینے والوں کی فہرست میں دیکھ لیجئے اسلامی ناموں پہلو بہ پہلو، منشی تلسی رام، رام سہائے، منشی ہروداری لال، لالہ بیجناتھ، پنڈت سری رام، منشی موتی لال، رام لال، سیوارام سوار وغیرہ اسار بھی سلسل ملتے چلے جاتے ہیں، سرسری نظر ڈال کر مثلاً چند نام جو سامنے آ گئے، وہ جن لئے گئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ دیوبند مسلمانوں کا خالص دینی مدرسہ تھا، اس مدرسہ کی امداد میں کسی ملت و مذہب کی خصوصیت کو قطعی طور پر ختم کر کے مسلمانوں کے سوا ملک کے دوسرے مذہبی اقوام و طبقات کے لئے دروازہ کو کھلے رکھنے کی پہلے ہمت ہی کیسے کی گئی، اور کسی مصلحت سے لکھنے کو اگر یہ لکھ بھی دیا جاتا تھا، تو عملاً غیر مسلم اقوام کی امداد اس دینی کام میں قبول ہی کیسے کی گئی، اور اس سے بھی زیادہ تعجب اس پر ہوتا ہے، کہ لینے والے لینے پر کسی وجہ سے آمادہ بھی ہو گئے تھے، تو یہ جانتے ہوئے کہ دیوبند کے مدرسہ میں مسلمانوں کے خالص دینی علوم پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، غیر اسلامی دائرے کے افراد کی طرف سے امدادی رقوم کیسے پیش ہو رہی تھیں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ چندہ دینے والوں میں جیسا کہ چاہئے تھا، زیادہ اور بہت زیادہ تعداد مسلمانوں ہی کی تھی، مسلمانوں ہی کا یہ مدرسہ تھا، وہ اس کی امداد نہ کرتے، تو اور کون کرتا، لیکن بایں ہمہ جو مسلمان نہ تھے، وہ اس مدرسہ کی مدد کیوں کرتے تھے مزید حیرت اس پر ہوتی ہے، کہ عموماً غیر مسلم افراد کے ان چندوں کی نوعیت وقتی چندے کی نظر نہیں آتی، بلکہ دوامی چندہ دینے والوں کی فہرست میں ان میں اکثر ناموں کو ہم پاتے ہیں۔ میرے لئے یہ سارے سوالات آج سمجھ بنے ہوئے ہیں۔

آج کیا ہے کل کیا تھا؟ آج کی تاریخ کل کی تاریخ سے کیوں بدل گئی کیسے بدل گئی اور کس حد تک بدل گئی؟

اللہ اللہ دل ان باتوں کو سوچتا ہے، اور سوچ کر دم بخود ہو جاتا ہے۔ اف!

اس گھر کو آگ لگ گئی، گھر کے چراغ سے

شاید یہ صورت جتنی خوفناک مشکلوں میں آج سرزمین ہند میں پیش آئی ہے، انسانی تاریخ میں اس کی مثالیں شکل ہی سے مل سکتی ہیں، معاملہ کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ سیدنا امام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا آخری زمانہ تقریری و تحریری مناظروں اور مباحثوں میں جو گذرا، جس کی بحث آگے آئے گی، شاید اس عجیب و غریب انقلاب کے بعض پوشیدہ اسباب سے اس بحث میں پردہ اٹھایا جائے۔ اس وقت تو ”دارالعلوم دیوبند“ کے ساتھ آپ کے تعلقات اور آپ کی خدمات کا ذکر کر رہا تھا۔ اس سلسلہ میں اپنے نزدیک جو پہلو سچی تھا کداسے اجاگر کیا جائے۔ اپنی معلومات کی حد تک اس کام کو گویا پورا کر چکا ہوں۔

یاد ہو گا کہ پندرہواں سال بھی ابھی مدرسہ کا پورا نہیں ہوا تھا، کہ سیدنا امام الکبیر کی سرپرستی کی برکات سے وہ محروم ہو گیا، ان پندرہ سالوں میں بھی ابتداء کے چند سال عرض کر چکا ہوں، ایسے بھی گزرے ہیں، جن کے متعلق یہ تسلیم کرنا چاہئے، کہ قصبہ دیوبند کا یہ مقامی مدرسہ صحیح معنوں میں براہ راست سیدنا امام الکبیر کے فیوض و برکات سے مستفید نہ ہو سکا، نام تو حضرت والا کا شروع ہی سے خصوصی ارکان کی فہرست میں شریک تھا۔ لیکن ہندو گیارہواں بننے کے لئے آپ کی آغوش شفقت میں بعد کو آیا، پھر حج کا سفر بھی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، اسی زمانہ میں ہوا، جسمانی امراض و آلام کے ہجوم اور حملہ کا زمانہ بھی یہی ہے۔ ان ہی وجوہ سے پندرہ سال کی اس مدت کو پندرہ سال سے بھی کم ہی سمجھنا چاہئے، گویا دہائی سے پندرہ سال تک کی مدت سے زیادہ اس کا تخمینہ مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے

حیرت اسی پر ہوتی ہے کہ اسی محدود مدت میں ضلع مہارنپور کے ایک غیر معروف قصبہ کا مقامی مدرسہ جس کے پہلے سال کی آمدنی ہر مذکی کل چھ سو انچاس (۶۴۹) روپے چار آنے (۴) تھی، امداد طلبہ کی مدد کو بحال دینے کے بعد اصل مدرسہ کی آمدنی درحقیقت کل چار سو ایک روپیہ ہوتی تھی، کل دو مدرسے یعنی ایک عربی، اور ایک فارسی و ریاضی وغیرہ کے لئے مقرر ہوئے تھے۔ کل بیس طالب علم شروع میں شریک ہوئے تھے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر کے سارے معارف کے بعد بھی (۲۵۵) دو سو پچپن

خرچ ہونے سے باقی رہ گئے (دیکھو ردوداد ۲۸۳ ص ۱۸) سیدنا الامام الکبیر کے قلم عاطفت میں آجائے کے بعد چند سال بھی اس مدرسہ پر نہیں گذرے تھے یعنی تاسیس مدرسہ کا بار ہواں سال تھا دارالعلوم کے اول صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جلسہ تقسیم اسناد کا خطاب ارشاد فرماتے ہوئے، طلبہ کی تعداد جو دوسو کے قریب پہنچ چکی تھی، اسی کی طرف اشارہ کر کے آخر میں یہ اطلاع بھی حاضرین جلسہ کو دی کہ ان میں ہندوستان کے سوا

”منجملہ پردیسیوں کے ایک ملک برہما کے رہنے والے ہیں، اور تین جزائر ہستان کے یعنی

سمند زنا پوکے اور ایک ملک تبت کے“ (ردوداد ۲۹۵ ص ۱۸)

جیرت ہوتی ہے، کہ اتنی مختصر مدت میں فراخنائے ہند کے طویل و عریض رقبوں کو پھلانگ کر ایک تصباتی مدرسہ کی شہرت سر بر ہما، تبت اور جزائر ہند کے باشندوں تک کیسے پہنچ گئی تھی، خصوصاً اس زمانہ میں جب نہ اخباروں، اور برقی پیغاموں کے پھیلنے پھیلانے کا عام رواج اس ملک میں عموماً اور طبقہ علماء میں خصوصاً گویا نہیں ہوا تھا۔ اسی ردوداد میں ایک خبر یہ بھی دی گئی ہے، کہ ہندوستان کے اسی گمنام قصبہ دیوبند اور اس کے مدرسہ کی شہرت اس عہد کے اسلامی دارالخلافت استنبول (قسطنطنیہ) تک پہنچ چکی تھی، اور اس امتیاز کے ساتھ پہنچ چکی تھی کہ دارالخلافت کے ایک بڑے سربراہ قدس عالم علامہ احمد حمادی آفندی نے ایک کتاب

”النجوم الدارای فی ارشاد الساری“

نامی تصنیف فرمائی تھی، کتاب طبع نہیں ہوئی تھی، مصنف نے صرف چار قلمی نسخے اپنی اس کتاب کے تیار کرائے تھے، جن میں دو نسخے تو خود دارالخلافت (قسطنطنیہ) کے کتب خانے میں داخل کئے گئے تھے، اور ایک نسخہ اس کا مصر بھی گیا تھا، چوتھا نسخہ اس کتاب کا قسطنطنیہ میں بیٹھ کر اسی مصنف نے خاص دیوبند کے اسی مدرسہ کے لئے لکھوایا تھا، اس زمانہ میں ترکی حکومت کا جو نمائندہ بمبئی میں رہتا تھا، یہ نسخہ اسی نمائندہ کے توسط سے دارالعلوم تک پہنچایا گیا۔ قلمی کتاب کے ساتھ خود علامہ احمد حمادی آفندی کا ایک مکتوب بھی فارسی زبان میں اس علمی ہدیہ کے ساتھ شریک تھا، جو اسی سال کی

ردداد میں چھاپ کر شائع کر دیا گیا تھا۔ خط میں ان ہی باتوں کا تذکرہ کر کے کہ کل چاقلمی نسخے اس کتاب کے تیار کئے گئے تھے، جن میں ایک نسخہ آپ کے مدرسہ کے لئے اس لئے بھیجا جا رہا ہے کہ ”مدرسہ آنحضرت کہ منبع فیض عموم ست، فرستادہ آمد“ ”ایا دگاراں بزرگوار بر محل خود باشد“ اگرچہ رسمی طور پر خط میں مدرسہ کے مہتمم مولوی رفیع الدین اور صدر حضرت مولانا محمد یعقوب، اور مجلس شہرہ کی کے ایک رکن حاجی محمد عابد کے نام بھی مکتوب کے عنوان میں درج ہیں، لیکن اس سلسلہ میں سب سے پہلے جسے علامہ احمد حمدی آفندی نے اپنا مخاطب اول بنانا چاہا ہے، وہ حضرت سیدنا الامام الکبیر ہی کی ذات مبارک تھی، مکتوب کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے۔

”جناب فضائل مآب، مولوی محمد قاسم صاحب“

یہ ”جناب فضائل مآب“ کے الفاظ صرف حضرت دالا کے ام گرامی سے پہلے استعمال کئے گئے ہیں۔ باقی دوسرے بزرگوں کے نام کے ساتھ صرف ”مولوی“ کا لفظ ہے۔

کچھ بھی ہو، قاف ناقاف کی پرانی ضرب المثل کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن عصری تقریروں میں ساحل باسفورس تا دیوار چین کا جو محاورہ مستعمل ہے، یہ واقعہ ہے کہ قریب قریب دس انگلیوں پر گنے جانے والے سالوں کے اندر اندر دیوبند کے قصبہ کا یہی مدرسہ، شاعرانہ رنگ میں نہیں، بلکہ فی الحقیقت اپنی شہرت و عظمت میں حیرت ہوتی ہے، کہ واقعی ان ہی حدود تک کیسے پہنچ گیا تھا۔

ہندوستان کے لحاظ سے چین کی دیوار برہما اور نبت ہی کے علاقے تو ہیں، اور باسفورس کے ساحل کے خوبصورت شہر استنبول (قسطنطنیہ) سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ علمی تحائف وہاں سے چلو آ رہے

ہیں۔ یہی نہیں بلکہ میں تو اس کی توجیہ سے اپنے آپ کو عاجز پاتا ہوں، کہ مصر کے سوانین کے اس گروے پر حالانکہ بیسیوں اسلامی ممالک چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن قسطنطنیہ کے اس عالم

کی اپنی کتاب کے لئے مصر کے بعد نظر انتخاب ہندوستان جیسے در دراز ملک اور اس ملک میں بھی ضلع سہارنپور کی ایک قصبائی آبادی کے مدرسہ پریکوں پڑتی ہے۔ ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کا سیاسی اقتدار بھی ختم ہو چکا تھا، اور مسلم وغیر مسلم باشندوں کا ایک ایسا ملک وہ بن چکا تھا، جس پر تیسری طاقت

حکمران تھی، اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ جو اللہ کے لئے ٹھننے کا قطعی فیصلہ کر چکا تھا، اٹھانے والا اسی کی سرکھڑا تھا، اونچا کر رہا تھا، اور یہ سب جو کچھ تھا، اسی کی رفعت و بلندی کے مختلف مشاہداتی مظاہر تھے، من تو اضع للہ رَفَعَهُ اللہ کی گویا یہ بھی ایک عملی تفسیر تھی، اس کے سوا بتایا جائے کہ آخر کیا سمجھا جائے؟ تاویل و توجیہ میں اور کیا کہا جائے؟

بہر حال گئے چنے، ان ہی چند سالوں میں کراہیہ کے خام مکانوں سے نکل کر اپنی موجودہ تدبیریں و اقامتی عمارت میں بھی منتقل ہوا، جس کی تفصیل دارالعلوم دیوبند کی تاریخ لکھنے والے کے فرائض میں داخل ہے، یعنی یہ سوالات کہ شروع میں دیوبند کا یہ مدرسہ کہاں قائم ہوا؟ جن مکانوں میں مدرسہ کا افتتاح عمل میں آیا، ان کی تعمیری نوعیت کیا تھی، کن کن لوگوں کے مکانات کراہیہ پر لئے گئے، کراہیہ کی مجموعی رقم کیا تھی، پھر کن دشواریوں کا احساس ارباب اہتمام و انتظام کو ہوا، اور طے پایا کہ مدرسہ کی مستقل عمارت بنانی چاہئے، اس سلسلہ میں پہلے دیوبند کی جدید جامع مسجد جو اسی زمانہ میں بعض ارباب ہم کی جدوجہد کی بدولت بن کر تیار ہوئی تھی، فیصلہ کیا گیا کہ اسی جامع مسجد کے آس پاس چند حجرے اگر بنائے جائیں گے وہی کافی ہوں گے، حاجی عابد حسین صاحب مرحوم مدرسہ کے ہتھم اول نے اسی تجویز کے مطابق مسجد کو ارد گرد کچھ حجرے تیار بھی کرادیئے تھے، لیکن حال سے زیادہ جس کے سامنے مدرسہ کا مستقبل تھا، ہم آج جو کچھ دیکھ رہے ہیں، سب کچھ شاید اس کو پہلے ہی دکھایا جا چکا تھا، اپنی اسی لاہوتی بصیرت کی روشنی میں مدرسہ کے لئے پہلے زمین کا انتخاب کیا، زمین کیسے حاصل کی گئی، اور تقدیر کا وعدہ تدبیر کا قالب اختیار کر کے مسلسل کیسے سامنے آتا چلا گیا، ظاہر ہے ”یہ دارالعلوم کی تاریخ“ کے اہم اجزاء ہیں، جب کبھی لکھنے والوں کو اس کی طرف توجہ ہوگی، وہی تحقیق کر کر کے ہر منزل کی روداد کو پیش کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کی حد تک زیادہ سے زیادہ گنجائش اسی کی ہے، کہ ان چند سالوں یعنی ۱۲۸۲ھ آغاز تاسیس سے ۱۲۹۴ھ تک جس سال سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی، اس ہرمیانی دفعہ میں جو کچھ ہوا، اس کا اجمالی ذکر کر دیا جائے۔

عرض کر چکا ہوں، کہ تاسیس مدرسہ کے دوسرے سال ۱۲۸۴ھ میں حاجی عابد حسین صاحب مرحوم مدرسہ کی

مہتممی سے شکش ہو کر سفر حج پر روانہ ہو گئے، ان کی جگہ مولانا رفیع الدین صاحب کو سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ نے مجبور کیا کہ وہ اہتمام کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔ حاجی عابد حسین صاحب کی دایہ سی حجاز سے ۱۳۸۶ھ میں ہوئی۔ اہتمام کی خدمت پھر ان ہی کے سپرد ہو گئی، ۱۳۸۷ھ تک وہی مہتمم رہے، پھر ۱۳۸۸ھ میں مجلس شوریٰ نے حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کو اس خدمت سے سبکدوش کر دیا۔ صرف جامع مسجد کی تعمیر ان کے سپرد رہی، اور مدرسہ کے اہتمام و انتظام کا کام پھر مولانا رفیع الدین صاحب کے سر ڈالا گیا۔ اور اسی سال جو قیام مدرسہ کا چھٹا سال تھا، ایک طویل الذیل اپیل روداد میں شائع کی گئی، جس میں مدرسہ کے لئے مستقل عمارت کی تحریک پیش کی گئی تھی۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا یہ ایک خاص ورق، اور اہم تاریخی وثیقہ ہے، اس میں پہلے تو مدرسہ کی مکانی دشواریوں کا ذکر کیا گیا ہے، کرایہ کے جن مکانوں میں اس وقت تک مدرسہ تھا، کچھ ان کی حالت، 'درگاہ'، طلبہ کی قیام گاہ، کتب خانہ کا مکان، ان سب میں کافی فاصلہ، نیز درگاہ کے تنگ غیر تدریسی مکان میں پڑھنے والے، اور پڑھنے والوں کو جو وقتیں پیش آرہی تھیں، مثلاً اجتماعی تدریس کی وجہ سے شور کا بلند ہونا، اور شور کو محسوس کر کے

”ہر شخص کو اس ضرورت سے کچھ آواز بلند کرنی ہوتی ہے، اور جتنی جتنی آواز بلند ہوتی جاتی ہے، اتنا ہی شور بڑھتا ہے۔“

پھر قصبہ بہمنے کی وجہ سے وسیع مکانوں کی دستیابی میں ناکامی، سب سے دل چسپ اطلاع یہ ہے، کہ قصبہ والوں کے خام کچے، ٹوٹے پھوٹے مکانوں کو کرایہ پر مدرسہ نے جو لے لیا تھا، تو جہاں اسی دیوبندیوں ایک طبقہ ان مسلمانوں کا تھا، جو سب کچھ مدرسہ پر بھجوا کر رہا تھا، وہیں روداد کے اس فقرے کو پڑھ کر کہ

”مکان مدرسہ کا اداں تو کرایہ کا ہے، اور ہر سال نیا معاملہ کرنا ہوتا ہے، اور مالک مکان کے بسبب اس کے کہ حاجت مند جانتے ہیں، ہر سال کچھ نہ کچھ کرایہ زیادہ کرنا چاہتے ہیں۔“

ان الفاظ کو پڑھ کر کم از کم میری گردن تو جھک گئی، مسلمانوں پر جو افتاد پڑی تھی، اور پڑتی چلی جا رہی ہے اس کی تہ میں ٹوٹنے سے کچھ اسی قسم کے اسباب کا نشان ملتا ہے، مظلّمہ زاهد و لکن کا نوا انفسہم یظلمون کے قرآنی قانون کی ہی زندہ شہادتیں ہیں۔

بہر حال یہ اور اسی قسم کے متعدد اسباب و وجوہ کا تذکرہ کرنے کے بعد آخر میں مجلس شوریٰ کی اس تجویز سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ

”ایک مکان وسیع، با فراغت، جس میں قریب ایک سو طلبہ بآرام تمام رہ سکیں، اور چار پانچ درگاہ بھی ہوں، اور درفع حوائج ضروریہ کی جگہ بھی اس میں ہو، تیار ہو،“ ص ۳۳

آج دارالعلوم دیوبند کی فلک پیا، کوہ سیکل، عمارتوں کا سلسلہ طویل و عریض رقبہ میں پھیلا ہوا ہے یہی پہلی تجویز اس تناور درخت کا تخم اول تھی، تجویز شائع کر دی گئی، تعمیر کی مدین رقوم آنے لگیں۔ ۱۲۸۹ھ کی روداد سے معلوم ہوتا ہے، کہ حاجی عابد حسین صاحب حالانکہ مدرسہ کی مہتممی سے سبکدوش ہو چکے تھے، اور جامع مسجد کی تعمیر میں مصروف تھے، انہوں نے اپنی اسی جامع مسجد کے ارد گرد چند چھوٹے بڑے حجرے بنوائے شروع کر دیئے۔ حاجی صاحب مرحوم کا خیال تھا کہ یہی حجرے دیوبند کے مدرسہ کے لئے کافی وافی ہوں گے۔ اگرچہ ارباب شوریٰ نے حاجی صاحب کی اس رائے کی بظاہر مخالفت نہیں کی، بلکہ اسی ۱۲۸۹ھ کی روداد میں تعمیر مدرسہ کے ذرا عانت کے متعلق یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ تعمیر کا کام ان ہی کے ہاتھ میں ہے اس لئے چاہئے، کہ اس مدی رقوم

”بخدمت حاجی صاحب ممدوح الصدر مہتمم جامع مسجد ہی کے ارسال فرمائیں“ ص ۳۴

لیکن سچ پوچھئے، تو مدرسہ کا مستقبل جس کے سامنے تھا، وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا، نہ دیکھنے والوں کے لئے اس کا دکھانا بھی دشوار تھا، اور جب تک وہی سب کچھ دوسروں کو بھی نہ سوجھتا، جو وہ دیکھ رہا تھا، لوگ یہ کیسے باور کر سکتے تھے، کہ ضلع سہارنپور کی ایک قصباتی آبادی کا نام تعلیم و علم، درس و تدریس کی تاریخ میں ایک ایسی ٹھوس حقیقت کا قالب اختیار کرنے والا ہے، کہ عام تعلیمی تاریخ نہ یہی بلکہ اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس کی ہندوستان ہی کی حد تک نہیں، بلکہ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ سارے

عالم اسلام کی تعلیمی تاریخ کا یہ شعبہ اس کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ حالِ ادرستقبیل کے متعلق نقطہ نظر کے اسی اختلاف کا اثر دلوں میں کشش کی ایک ایسی نفسیاتی کیفیت کو پیدا کئے ہوئے تھا، جس پر زیادہ دن تک صبر شاید برداشت سے باہر ہو چکا تھا، حاجی صاحب مرحوم جامع مسجد کے ارد گرد جو حجرے بنوا چکے تھے، دوسری مسجدوں کے حجروں کی طرح طلبہ کی اقامت گاہوں کا کام ان سے لیا جاسکتا تھا، اور یہی کام ان سے بعد کو لیا بھی گیا، آج تک لیا جا رہا ہے۔ اس لئے ان کی تعمیر میں مزاحمت تو مناسب نہ خیال کی گئی، جو کچھ وہ کر رہے تھے، چھوڑ دیا گیا کہ کرتے رہیں۔ اور خود مجلس شوریٰ نے جیسا کہ ۱۲۹۱ھ کی روداد میں مدرسہ کے مستقل اور وسیع مکان کی تعمیر والی تجویز کا ذکر کر کے یہ اطلاع دی گئی ہے کہ

”۹۱ھ کے بعد جمعہ عین جلسہ انعام طلبہ میں اس کے لئے گزارش کیا“ ۳۳

کاغذی ایمل کے بعد باضابطہ ”جلسہ تقسیم انعام“ میں تعمیر والی یہ تجویز عام مسلمانوں کے مجمع میں پہلی دفعہ پیش کی گئی، لکھا ہے کہ

”برابر فرد چندہ پر دستخط ہوتے چلے جاتے ہیں، جس میں بہت سارو پیہ وصول ہوتا تھا، تاہم“ چند ہی دنوں میں اتنی رقم فراہم ہو گئی، کہ اسی سال

”ایک قطعہ نہایت وسیع واسطے تعمیر مکانات کے خرید لیا گیا“ ۳۳ روداد ۱۲۹۱ھ

ان واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے، تمہید میں جو یہ الفاظ درج کئے گئے ہیں، کہ یہ

”آزاد و دیرینہ جس کی سالہا سال سے امید تھی“

اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے، کہ جامع مسجد کے ارد گرد جو حجرے تعمیر ہو رہے تھے، ۱۲۸۹ھ کی روداد میں جن کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ اس کی طرف

”جناب عمدہ اہل صنفا، فیروز خواہ خلای جناب حاجی محمد عابد صاحب، متمم سابق مدرسہ ہذا،

حال، متمم تعمیر جامع مسجد نے توجہ تام فرمائی، اور احاطہ مسجد ہی میں جملہ حوائج ضروریہ در سگاہ

قیام گاہ طلبہ و دیگر ضروریات کے لئے موقع مناسب کے مکان تجویز فرمائے۔ ص ۱۷

یہ شاید حاجی صاحب مرحوم کی ذاتی تجویز تھی، جس کی مزاحمت نہیں کی گئی تھی، لیکن تعمیر کی دیرینہ آرزو، جس کی سالہا سال سے امید تھی، اس کے مقابلہ میں گویا اس کی حیثیت گونہ اصرار بے جا بنی کی سی تھی، شاید اسی لئے جامع مسجد کے حجروں والی تجویز بجائے درباب شوروی کے براہ راست حاجی صاحب مرحوم کی طرف روداد میں منسوب کی گئی ہے، مدرسہ کی تاریخ میں آئندہ بعض ناگفتہ بہ ہنگامی اختلافات جو پیش آئے، بظاہر ان کی ابتدا شاید اسی واقعہ سے ہوئی، کچھ نہ کچھ جس کی کسک آج تک قلوب میں باقی ہے، مگر میری بحث کے موضوع سے یہ مسئلہ ہی خارج ہے، میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ درو قاسمی میں مدرسہ کن منزلوں کو طے کر چکا تھا۔ مدرسہ کی مستقل تعمیر کے لئے ۱۲۹۱ھ میں زمین خریدی گئی، اور ۲۲ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ میں جیسا کہ ۹۲ھ کی روداد میں اطلاع دی گئی ہے، تقسیم اسناد و انعامات کا رسمی جلسہ منعقد ہوا، جس میں غیر معمولی طور پر علاوہ دیوبند کے کافی تعداد باہر سے آنے والے معزز مہمانوں کی بھی تھی، ان میں وقت کے بعض سربراہ درودہ علماء، اور امراء بھی تھے، آخر میں لکھا ہے کہ

”کل اہالیان جلسہ اس موقع پر شریف لائے، جہاں تعمیر مکان مدرسہ کی بنیاد کھدی ہوئی تھی، اول تپھر بنیاد کا جناب مولانا مولوی احمد علی صاحب سہارنپوری نے اپنے دست مبارک سے رکھا، اور بعد میں جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب و مولانا مولوی رشید احمد صاحب و مولانا مولوی محمد مظہر صاحب نے ایک ایک اینٹ رکھی“ ص ۱۷ روداد ۱۲۹۲ھ

لے تعمیر مدرسہ کی تاریخ کی یہ معلومات تو وہ ہیں جو براہ راست مدرسہ کی قدیم رودادوں سے فراہم کی گئی ہیں، مدارالعلوم کی تاریخ کے لکھنے والے مزید معلومات کا کبھی اضافہ کر سکتے ہیں۔ فقیر نے بقدر ضرورت چیزوں کا انتخاب کر لیا ہے، اس موقع پر ادراج تلاش کی اس روایت کا قدرتا خیال آتا ہے جس کے بعض اجزاء کا کتاب میں مختلف موقعوں پر ذکر گزرنے لگا ہے، ادراج تلاش کی اس روایت میں سنگ بنیاد کے متعلق یہ اضافہ پایا جاتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کے اشارہ سے حضرت مولانا اصف حسین صاحب کے نانا جو میاں جی منے شاہ صاحب کے نام سے مشہور تھے، وہی طلب کئے گئے اور پہلی اینٹ ان ہی کے دست مبارک سے رکھی گئی۔ لکھا ہے کہ میاں جی منے شاہ صاحب علاوہ مہد ہونے کے خود بڑے بزرگ تھے۔ بلکہ میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو یاد آتا ہے کہ میر شاہ خان مرحوم حضرت نانوتویؒ کے حوالہ سے یہ بیان کرتے تھے کہ ”میاں جی منے شاہ ایسے آدمی ہیں جن کے دل پر گناہ کا شاید خطرہ بھی نہیں گذرا۔“ (واللہ اعلم) (بقی اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد درستی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا، دور دراز مقامات سے بھیجنے والے تعمیری مدین رقوم مسلسل ارسال کر رہے تھے۔ خصوصاً حیدر آباد دکن کے ارباب خیر نے تو ٹویا ایک مجلس ہی بنائی تھی، جو درستی تعمیر کے لئے زراعت وصول کرتے تھے، اور بھیجتے جاتے تھے، اس باب میں اسلامیان دکن کی دلچسپیاں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ ۱۲۹۶ھ کی عام روداد کے علاوہ خاص، حیدر آباد کے مسلمانوں کے امدادی چندوں کی تفصیل کے لئے ایک علیحدہ کتابچہ ۲۶ صفحوں کا مدرسہ کوشاں لکھ کر اپڑا، جس کا ایک مطبوعہ نسخہ اس وقت میرے سامنے بھی ہے، تہمدی عبارت اس ”دکنی کتابچہ“ کی یہ ہے، حمد و نعت کے بعد عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے لکھا گیا تھا،

”ان دنوں چند بزرگواران والاہمت مفصلہ ذیل ساکنان بلوہ خجستہ (نیباد) حیدر آباد دکن نے اپنے وجود باوجود کو ابتغاء لوجه اللہ و مرضاتہ تائید مدرسہ عربیہ دیوبند کے لئے گویا وقف کر دیا ہے، اور اس کی اعانت کے واسطے کمرہت چست باندھی ہے۔“

آگے ہندوستان کے دوسرے شہروں کے مسلمانوں کو حیدر آباد کے خیور، اولوالعزم والامادہ ایمانیوں کے نقش قدم پر چلنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، کہ فریبی چندہ کے لئے جیسے حیدر آباد میں ایک مستقل

(گذشتہ صفحہ سے) یہ ہے کہ میاں جی صاحب مرحوم کے بعد حضرت نانوتوی ہی کی انتہا پر حاجی عابد صاحب نے دوسری اینٹ دکھی۔ پھر حضرت لنگوئی نے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ روداد کی روایت اور اس روایت میں کتنا فرق ہے، ترجمہ کے لحاظ سے ظاہر ہے کہ تحریری وثیقہ کی روایت کا مقابلہ زبانی سینہ بسینہ والی روایت نہیں کر سکتی، اور تطبیق کی راہ اگر اختیار کی جائے تو اولیت کو بجائے حقیقی کے اضافی قرار دے کر کہہ دیا جاسکتا ہے کہ میاں جی صاحب تو صاحب اولیت کی حیثیت سے اول تھے۔ علماء میں حضرت مولانا احمد علی صاحب اول اور شوریٰ کی مجلس کے ارکان میں اول حاجی عابد صاحب تھے۔ اوراق ثلاثہ میں حاجی عابد صاحب مرحوم کے اخلاقی نقطہ نظر کو بھی واضح نظروں میں بیان کیا گیا ہے، لکھا ہے کہ جلسہ تقسیم انعام میں سیدنا الامام اکیبیر نے جب رنگ بنیاد کوئی کی تقریب میں شریک ہوئے کیلئے حاضرین جلسہ کو دعوت دی، تو حاجی عابد صاحب نے انھیں خاص چھتہ کی مسجد میں بلانے کو، سیدنا الامام اکیبیر نے کھانا دیا، ان کی طرف چل پڑے، مجمع آگے بڑھ گیا اور خود چھتہ کی مسجد میں پہنچ کر حاجی صاحب سے منت سماجت کی، جس پر وہ رد پڑے دونوں بغیر ہمتے صفائی ہو گئی۔ ان کو ساتھ لیکر سیدنا الامام اکیبیر بھی مجمع میں تشریف لائے، دیکھ کر عابد صاحب نے ثلاثہ کی روایت کا یہ ہے کہ بایں ہر شکاشی مدرسہ کی یہ بین حاجی عابد صاحب مرحوم ہی کے نام خریدی گئی تھی، لکھا ہے کہ ”بیچ نامہ“ ان ہی کے نام لکھوایا گیا تھا۔ اسی میں بھی ہے ہر گز پہلی دفعہ زمین کا یہ قطعہ خرید گیا تھا۔

مجلس قائم کر دی گئی ہے، چاہئے کہ دوسرے شہروں میں بھی اس کی پیروی کی جائے۔

مدرسہ کی تعمیر کا کام بھی جاری رہا، اور اسی کے ساتھ ان ہی دنوں میں وقتاً فوقتاً بعض اصلاحی اقدامات کی طرف بھی توجہ کی گئی، خصوصاً عربی اور دینی تعلیم کے ساتھ ”معاشی ذرائع“ کے سکھانے کا انتظام ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ شروع ہی سے اس کا خیال بھی سامنے تھا، اس سلسلہ میں ہم دیکھتے ہیں، کہ خالص دینی و عربی تعلیم کی حد تک اس کا تجربہ ہوئے لگاتار دنیا میں ان علوم کے جاننے والوں کی مانگ ہے۔ ۱۲۹۳ھ کی روداد میں یہ لکھتے ہوئے کہ مدرسہ کی تعلیم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ نکلے ہو کہ بیٹھ جائیں، حکومت قائمہ کے دفاتر کی نوکری معاش کے بے شمار ذرائع میں ایک مختصر ترین محدود ذریعہ ہے، لیکن اس کے سوا

”اور بھی اعلیٰ و افضل طریقے ہیں، مثلاً تجارت، زراعت، حرفت“ ص ۱۱

آگے یہ اطلاع بھی دی گئی ہے۔

”اس بات کے سننے سے اور بھی تعجب ہوگا، کہ خدا کے فضل و عنایت سے اکثر علاقہ

(علاقہ ملازمت، واسطے فارغ التحصیل طلبہ کے اطراف ہندوستان سے بمشاورہ معقول

مدرسہ ہذا میں آتے رہتے ہیں، اور نوکری ان لوگوں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہے“

پھر اس زمانہ میں ریاست بھاول پور، اور گجرات کے کسی مقام لاچپور سے جو مطالبے آئے ہوئے

تھے، ان کا تذکرہ کر کے اطلاع دی گئی ہے، کہ باوجود (اس نوکری کے)، ملنے کے دارالعلوم کے فاسخ التحصیل

طلبہ میں کوئی ان نوکریوں کے قبول کرنے پر اب تک آمادہ نہیں ہوا ہے۔

بہر حال بات وہی ہے، جس کا ذکر شاید پہلے بھی کر چکا ہوں، اور اپنے متعدد مقالات و مضامین

میں اس خیال کو فقیر نے ظاہر کیا ہے، کہ تقریباً اپنی صد سالہ زندگی میں دارالعلوم دیوبند سے دینی و

علمی منافع جو حاصل ہوئے، وہ تو خیر بجائے خود ہیں، واقعہ یہ ہے، کہ معاشی حیثیت سے بھی مسلمانوں

میں پست ماندہ طبقات کے خدا جانے کتنے گھرانوں کو اس کا موقع مل گیا کہ اگر دارالعلوم کے تعلیمی

نظام سے استفادہ کا موقع ان کو نہ ملتا تو خوش حالی و فارغ البالی کی جو زندگی آج گزار رہے ہیں۔ ظاہر

اسباب کی رو سے شاید اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ معاشی منافع دارالعلوم کی بدولت جن لوگوں کو حاصل ہوئے ہیں۔ ابتدا بتا سکیں سے اس وقت تک ان افراد کی تعداد شاید لاکھوں سے متجاوز ہو چکی ہوگی۔ جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سلسلہ میں مستفید ہوئے ہیں۔ ان میں بعضوں کو تو کافی بلند ہونی کے مواقع مل گئے، جن کی داستان طویل ہے۔

قطع نظر اس عام معاشی منافع کے عہد فائمی ہی میں بعض ایسے امور کی طرف جیسا کہ رودادوں سے معلوم ہوتا ہے، توجہ مبذول ہو چکی تھی، جن کو سیکھ کر خدا ہی جانتا ہے، کتنوں کو روزی کمانے میں سہولتیں میسر آئیں۔ مثلاً ۹۰ یعنی قیام دارالعلوم کے چھٹے سال ہی میں لکھا ہے کہ

”حافظ محمد کوثر علی صاحب خوشنویس ساکن نگینہ نے..... تعلیم خوش خطی طلبہ اپنے دفتر کر لی“ ص ۷۱

ظاہر ہے کہ مطابع اور پریس، خصوصاً ہندوستان جہاں بجائے ٹائپ کے اس وقت تک لیتھو پریس ہی کے مطبوعات کو عوام بھی پسند کرتے ہیں، اور کتابوں کے نشر و اشاعت کے کام کرنے والوں کا بیان ہے کہ ٹائپ کے حساب سے لیتھو کی طباعت پر نسبتاً کم مصارف عائد ہوتے ہیں۔ اسی لہٰذا خوشنویسی کا ہنر اس زمانہ میں روزگار کا ایک مستقل ذریعہ ہے، خصوصاً پڑھے لکھے عربی و فارسی کے جاننے والے خوشنویس چاہتے تو یہ کہ عام اردو خاں کتابوں کے مقابلہ میں کتابت کے فرائض کو زیادہ بہتر طریقہ سے انجام دیں۔ یہ ایک ایسا معاشی پیشہ ہے، جو علم کے ساتھ کافی مناسبت رکھتا ہے، اور علم سے اس پیشہ کے فروغ میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

اسی طرح ۱۲۹۵ھ کی روداد کے آخر میں ایک اعلان میں اس کی خبر بھی دی گئی ہے، کہ جنی علوم کے ساتھ ساتھ دارالعلوم میں ”طب یونانی“ کے پڑھانے کا نظم کیا گیا ہے، لکھا ہے کہ

”مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس اول اس علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں“ ص ۷۲

اور گواس خیال کی تکمیل کی طرف بعد کو توجہ نہیں کی گئی، لیکن اس راہ میں جن بلند حوصلوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا اندازہ اسی اعلان کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو اسی طبی تعلیم کے شعبہ کی طرف ابواب خیر کو متوجہ

کرتے ہوئے ضرورت ظاہر کی گئی تھی کہ

”اس فی لطیف کے لئے ایک بڑا کتب خانہ کتب و بیاض ہائے مستنیرہ حکماء و حاذق،
 و اطباء کامل“

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ

”آلات عمدہ جراحی و غیرہ طبیب و جراح تجربہ کار کا واسطے سکھانے طریقہ مطب و فن جراحی
 وغیرہ کے نہایت ضرور ہے“ ص ۲۹۵ روداد ۱۲۹۵ھ

دیکھ رہے ہیں، عہد قاسمی کے دارالعلوم کی امتگوں اور اولوالعزمیوں کا حال، وقت نے مساعرت
 کی، باغ کے لگانے والے کے سامنے جو ارادے تھے، اولاً سب ظاہر نہ ہو سکے، اور ادھر ادھر
 جن کا کچھ پتہ چل جاتا ہے، تو ان پر عمل کی توفیق میسر نہ آئی، ۱۲۹۱ھ کی روداد کے اس جز کو ملا خطہ
 فرمائیے۔ اخبار و مطالع کے ان کارپردازوں کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے جو مدرسہ کی امداد اپنی اخبار اور
 کتابوں سے کرتے تھے۔ قسطنطنیہ کے ایک عربی اخبار ”البحار“ نامی کے متعلق یہ اطلاع
 دیتے ہوئے کہ

”بلا افتخیت محض، بنظر خیر خواہی اس مدرسہ اسلامی وفائدہ طلبہ اہل اسلام کے غنایت
 کرتے ہیں“ ص ۲۵۵

سب سے بڑا فائدہ عربی زبان کے اس اخبار کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ

”طلبہ عربی خوان کو زبان دانی کا فائدہ علاوہ فائدہ اخبار کے کمال درجہ حاصل ہوتا ہے“

ص ۲۵۵ روداد ۱۲۹۱ھ ہجری

عربی زبان دانی، اور اخبار بینی کے ان منافع کی طرف عہد قاسمی کے بعد کتنی توجہ کی گئی، اس کا جواب
 ”صورت بیس حالت میرس“ ”باغیاں را چہ بیاں“ کے سوا اور کیا دیا جاسکتا ہے؟

بہر حال دارالعلوم کی عمر کی یہ مدت جو عہد قاسمی میں گزری، خواہ جتنی بھی مختصر ہو، لیکن جوشہا دتیں
 آپ کے سامنے گزر چکیں، ان کی روشنی میں دیکھئے بعد کو دارالعلوم نے تاریخ کے جس طویل دور کو

بدایا، قریب قریب ایک صدی گویا ختم ہو رہی ہے، اس غرض میں طولا و عرضاً اس کے مختلف شعبوں میں جو ہر جہتی ترقیاں ہوئی ہیں۔ ان کا بھلا کون اسکا کر سکتا ہے، لیکن بنیادی سالوں میں جن جن تخمیں کو بونے والے بو کر چلے گئے، سچ تو یہ ہے کہ ابھی صحیح معنوں میں ان ہی کی نشو و نما میں کامیابی نہیں ہوئی ہے، اسی لئے دارالعلوم کی حد تک اپنا خیال تو یہی ہے، کہ نئی تجویزوں سے زیادہ ضرورت اس کی ہے، کہ عہد قاسمی کے کلیات کی روشنی میں عملی اقدامات کی طرف توجہ کی جائے، جو کچھ اس وقت تک سوچا جا چکا تھا، اسی کو عمل کا قالب عطا کیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ ماضی کی تاریخ کا صحیح اور مفید مطالعہ وہی ہو سکتا ہے، جس سے مستقبل کے سلجھانے میں مدد ملی جائے ورنہ گزرے ہوئے واقعات کا اعادہ، واقعات ہی کا اعادہ کیوں نہ ہو، نتیجہً ایک افسانہ سے زیادہ انصاف کی بات یہی ہے کہ وہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

بحث کو ختم کرتے ہوئے آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہد قاسمی کی جن رودادوں سے جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، ان کو مرتب کر کے شائع کرنے والے یعنی حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حاجی عابد حسین صاحب مرحوم کے بعد جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، دارالعلوم کے متمم مقرر ہوئے تھے ان ہی کے بعض ذاتی اعتراضات یہاں نقل کر دیئے جائیں۔ زبانی روایت تو اس باب میں ان ہی کو حوالہ سے اردو حاشیہ میں یہ پائی جاتی ہے، فرماتے تھے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ دیوبند کا اہتمام کبھی خود نہیں فرمایا، بلکہ اہتمام کیلئے

مجھے طلب فرمایا، اور میں دہی کرتا ہوں، جو انہیں مکشوف ہوتا ہے۔“

صاف اور واضح لفظوں میں اپنے مافی الضمیر کی شرح خود مولانا رفیع الدین صاحب یہ کرتے تھے کہ

”علم ان کا (مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا) عمل میرا ہے۔“ ۱۸۳۱

یہ روایت مولانا طیب حسنی ہے، جسے موصوف نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے اسی کتاب میں درج کیا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ واضح و روشن، خود مولانا رفیع الدین قدس اللہ سرہ العزیز کی خود نوشتہ تحریر شہادت ہے، جو ۱۲۹۶ھ کی روداد میں سیدنا امام اکبر

کی وفات کے تذکرہ کے بعد قلم بند کی گئی ہے،

حضرت مرحوم کے دینی جذبات عالیہ، اور عام اسلامی خدمات جلیلہ کی طرف اجمالی اشارہ کرنے کے بعد ولنسار فیج الدین مرحوم نے لکھا تھا۔

”خصوصاً اس مدرسہ (دیوبند) کو، کیونکہ اس چشمہ فیض کے منبع، اور اس آب حیات کے مصدر، اور اس آفتاب عالمیہ کے منظر، آپ (یعنی سیدنا الامام الکبیر) ہی تھے۔“

آگے یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

”انشاء اللہ اس کارخانہ خیر (یعنی مدرسہ) کی ترقی میں کیسی کیسی ہمتیں لگائیں۔“

اپنی اعترافی شہادت وہی یہ درج کرتے ہیں

”حق تو یہ ہے کہ اس شمس الاسلام ہی کے حسن سہی کا یہ نتیجہ ہے، کہ ملک ہند میں بائیس

ضعف اسلام، و اسلامیان، علم دین کو کس زور شور سے پھیلایا کہ باید و شاید۔“

روداد ۱۲۹۴ھ

اس کے بعد، عہد قاسمی کی رودادوں کی تجرہ زوں کا حقیقی سرچشمہ حضرت والا کی فکر حکیمانہ کے سوا، خود ہی بتائیے، کہ اور کس چیز کو قرار دیا جائے۔ صراحتاً جو باتیں آپ کی طرف نہ بھی منسوب کی گئی ہوں، ماننا یہی چاہئے، کہ ان کی تہ میں بھی حضرت والا کے چشم وابدو کے اشارے کام کر رہے تھے،

انچہ استاذ ازل گفت ہماں می گویم

خود پس آئینہ والے طوطی ہی کا جب یہ اقرار ہو، تو سمجھنے والے آپ ہی بتائیے کہ آخر اذ کیا سمجھیں۔

خلاصہ یہ ہے، کہ دین و دنیا قدیم و جدید علوم کی پیوستگی و وابستگی یعنی باہم ایک کو دوسرے کے ساتھ ہم رشتہ کرنے کے لئے نصاب کی ترمیم و اصلاح کا مسئلہ، انتشار و پرانندگی کی جگہ سرزمین ہند کی اسلامی تعلیم گاہوں کو جامعاتی قالب میں لانے کے لئے کسی ایک مرکز پران کو مجتمع کرنا، دینی مدارس کے طلبہ اور فاضلین کے معاشی سوال کا حل، ان کلی مسائل کے ساتھ ساتھ دوسرے تعلیمی جزئیات مثلاً کتابوں کی حفاظت و طباعت و اشاعت کے متعلق کافی راہ نمائیاں ان معلومات سے حاصل ہو سکتی ہیں جو عہد قاسمی کی

رودادوں سے فراہم کر کے پیش کی گئی ہیں۔ بلکہ آج مسلمانان ہند کے سامنے سب سے بڑا سوال اس ملک کے دوسرے آبادکاروں کے تعلقات کی بنیاد پر جو پیدا ہو گیا ہے، چاہا جائے، تو اس سوال کے حل کی راہیں بھی ان ہی معلومات کی روشنی میں ڈھونڈھی جاسکتی ہیں۔ لمن کان له قلب او القی السمعم وھو شھید۔ واقعہ تو یہ ہے، سیدنا الامام الکبیر کی زندگی کے جس پہلو کو اب پیش کرنا چاہتا ہوں، ایک حیثیت سے یہ سمجھنا چاہئے، کہ مجہم بن کر جو چنگاری آج ملک میں بھڑک اٹھی ہے، یہ چنگاری کیسے پیدا ہوئی؟ شاید آئندہ جو کچھ عرض کیا جائے گا، اسی میں اس سوال کا جواب بھی آپ کو مل جائے۔

آپ دیکھ چکے، سنئے سنائے افواہی قصوں، اور زبانوں ہی کی بنیاد پر نہیں، بلکہ مسلمانان ہند کے سب سے بڑے مقدس دینی ادارہ کے متعلق یہ تحریری وثیقہ آپ کی نظر سے گزر چکا کہ وقت اسی ملک پر وہ بھی گزر چکا ہے، کہ ہندوؤں کے اخباروں (اودھ اخبار اور سفیر بوڈھانہ) کے لئے یہ دعا کی جاتی تھی کہ

حُشدا

”ان کی قوت اور آزادی کو قائم رکھے“

گزر چکا کہ زرا عانت یا چندہ کے متعلق بالالترام ہر سال کی روداد میں ہی اعلان مسلسل کیا جاتا تھا

”چندہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں، اور نہ خصوصیت مذہب و ملت“

اعلان بھی یہی کیا جاتا تھا، اور عمل بھی اسی پر ہوتا رہا، اسی بنیاد پر بخوشی ان ہندوؤں کی مالی امداد بھی قبول ہوتی رہی، جو ان کی طرف سے پیش ہوتی تھی، خصوصاً کتابوں کی شکل میں بار بار ان رودادوں میں اس کا اعتراف کیا جاتا رہا، کہ اس باب میں غیر معمولی فیاضیوں کا تجربہ ایک ہندو مالک مطلع ہی کے متعلق مددہ والوں کو ہوتا رہا۔ کتابوں کے سوانحی اردو روزنامہ جو شاید ہندوستان میں وہی پہلا روزنامہ تھا، اسی سیرچشم، فراخ دل ہندو کی طرف سے ہدیہ پیش ہوتا رہا، جیسا کہ چاہئے تھا۔ مدرسہ کی طرف سے یہی بار بار اس بذل و نوال کا شکر یہ ادا کیا جاتا تھا۔ الغرض دنیاوی علوم و فنون کی تعلیم کے مدارس کا بلکہ حکومت کے خزانے پر ڈال کر دینی و ملی تعلیم کے لئے ہندوستان کے قومی خزانہ سے استفادہ کا ارادہ جو کیا گیا تھا۔ اس میں باشندگان ملک کے دینی نظریات، اور مذہبی احساسات کی قید کو یا اٹھا دی گئی تھی، اسی لنو

ہر طرح کے لوگ دے بھی رہے تھے، اور مدرسے بھی رہا تھا، بلکہ اس کا اظہار کرتے ہوئے کہ گو مقصود اصلی اس مدرسہ کے بانی کا دینی علوم ہی کی اشاعت ہے۔ لیکن بقدر ضرورت فارسی اور کچھ حساب و کتاب یعنی ریاضی کی تعلیم کا بھی مدرسہ کے ابتدائی کلاسوں میں انتظام کیا گیا ہے۔ ۱۲۹۴ھ کی روداد میں اطلاع بھی دی گئی ہے کہ

”یہاں تک کہ بعض بعض ہندو لڑکے بھی پڑھتے ہیں“ ۱۳۱ روداد ۱۲۹۴ھ

”ہندو لڑکے پڑھتے تھے“ ظاہر ہے، کہ مطلب اس کا یہی ہو سکتا ہے، اور یہی ہے بھی، کہ خاص ہو لڑکوں کی وجہ سے دیوبند کے مقامی ہندو باشندے کبھی کبھی فارسی اور حساب وغیرہ کے پڑھنے اور سیکھنے کے لئے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بچوں کو مدرسہ کی ان ابتدائی کلاسوں میں شریک کر دیتے تھے جن میں ان مضامین کی تعلیم ہوتی تھی، اس سے کچھ اڑنا ثابت ہوتا ہو، یا نہ ثابت ہوتا ہو، لیکن تعلقات کی شکستگی کا اس سے زیادہ واضح ثبوت کیا ہو سکتا ہے، کہ دارالعلوم دیوبند جیسی خالص دینی و اسلامی درسگاہ میں ان بچوں کو ملوث اور پیشانی شریک کر لیا جاتا تھا، اور کتنے کھلے دل کے ساتھ شریک کر لیا جاتا تھا، کہ روداد تک میں تذکرہ کر کے سارے مسلمانان ہند کو اس سے مطلع کیا جاتا تھا، اس سے بھی زیادہ عبرت آموز سبق اسی اطلاع سے یہ ملتا ہے، کہ مسلمانوں کی ایک ایسی تعلیم گاہ میں جو مسلمانوں کے دین اور صرف دین کا خالص تعلیمی مرکز ہے، اس میں بغیر کسی دغدغہ کے اپنے بچوں کو ہندو شریک کرتے تھے، اور شریک کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں محسوس کرتے تھے۔ دلوں اور دماغوں پر آج جو تلے چڑھا دی گئے ہیں، ان کو دیکھیے، اور اندازہ کیجیے کہ اسی ہندوستان میں وہی آسمان کے نیچے اسی سرزمین پر اس تماشا شے کو بھی دیکھا جاتا تھا، اور بخوشی دیکھا جاتا تھا۔ جس کا تصور کرنا بھی آج شاید دشوار ہے، ایسا کیوں؟ وہی ملک جس میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا وہی کرڈٹیں بدلتے ہوئے موجودہ حالات تک کیسی پہنچا، ان سوالوں کی صحیح جواب تاریخ کے جن اوراق میں لکھے ہوئے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ پھاڑ دیئے گئے، ان ہی لوگوں نے ان کو پھاڑ دیا جو دوسروں پر قوی تاریخ کے اوراق کے پھاڑنے کا جرم الزام لگاتے ہیں۔

۱۴ شاید اب تو ندامت کے ساتھ کچھ سر جھک بھی رہے ہیں، ورنہ پلٹنے وغیرہ نے ہندوستان کی باقی اس کے صفحہ پر

۳۳م ان ہی پاک شدہ اوراق کے کچھ ٹکڑے کبھی کبھی ادھر ادھر مل جاتے ہیں جس کے مدح کرنے کی اور ان سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ان تفصیلی بحث کی تو اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے لیکن ان میں بعض ٹکڑوں کو خاص ترتیب سے درج کر دیتا ہوں پڑھنے اور نتیجے ان سے پیدا ہوتے ہیں ان کو خود سوچئے۔

کتاب کے مقدمہ میں بھی اور اصل کتاب میں بھی اس کا تذکرہ مختلف مقامات میں گزر چکا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت ختم کر کے اس ملک کی سیاسی باگ ڈور جس قوم کے ہاتھ میں آگئی تھی اس قوم کے ان حکمرانوں کی طرف سے پہلی کوشش تو اسی کی کی گئی کہ

”جس طرح سے ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے اسی طرح یہاں (ہندوستان میں) بھی سب کے سب ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے“ (تاریخ التعلیم ڈاکٹر سید محمود منقول از مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۲۱)

اور اسی نصب العین کے پیش نظر منجملہ اہل دیوبند کے جوہری تدبیر انگریزی تعلیم تھی۔ لارڈ میکالے جنہوں نے اپنے ایک ووٹ سے ہندوستان کے مشرقی نظام تعلیم کو مغربی نظام کے قالب میں

(گذشتہ صفحہ سے) تاریخ جس زمانہ میں لکھی ہے عموماً اس زمانہ میں یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ سرزمین ہند کی مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پیشتر کی کوئی مسلسل تاریخ نہیں ملتی ”ایلفنسٹن صاحب کا دعویٰ تھا، مشہور جرمنی فلسفی شاعر کا قول نقل کیا جاتا تھا کہ تاریخ تو صرف روم اور یونان ہی کی تاریخ ہے، باقی قدیم قوموں میں مصر، یا چین، یا ہندوستان کسی حالت میں ان کے حالات عجائبات سے زیادہ نہیں (سمتھ کی تاریخ قدیم ہند ص ۲۱)

سمتھ ہی نے اپنی اسی کتاب میں یہ عجیب و غریب دعوے کئے ہیں کہ سکندر اعظم کا ہندوستان پر جو حملہ ہوا اسی کا نہیں بلکہ سومات پرمجود وغرنوی کی چڑھائی تک کے ذکر سے ہندوستان حتیٰ کہ گجرات تک کی تاریخیں خالی ہیں، اسکا بیان ہے کہ ہندوستان پر یاہر سے جو حملے ہوئے ان کے متعلق خاموشی کی ایک سازش پائی جاتی ہے (دیکھو تاریخ قدیم ہند ص ۲۲۲ ترجمہ اردو) ان باتوں پر مجھے خیال آیا کہ آج کل یورپ والوں نے جو پھیلا رکھا ہے کہ مصر کی قدیم تاریخ کے جو وثائق مختلف شکلوں میں ملتے ہیں، ان میں بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان تعلقات کا ذکر نہیں ملتا، جن کے قصے تورات اور قرآن میں پائے جاتے ہیں، خیال بھی گذرا کہ قدیم قوموں کی سازش ہی جب تھی جس کا سمتھ صاحب نے دعویٰ کیا ہے، تو مصری تاریخوں کا بنی اسرائیل اور موسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے خالی ہونا محض تعجب کیوں ہو۔ اگرچہ پچھلے دنوں بعض لوگوں نے ثابت کیا ہے کہ مصر کی تاریخ میں بنی اسرائیل کے آثار کا بھی سراغ ملتا ہے لیکن نہیں بھی ملتا تو خاموشی کی مذکورہ بالا سازش کے بعد ملنے کی توقع ہی کیا ہو سکتی تھی ۱۲

ڈھال دیا۔ انہوں نے اپنی اس کامیابی کے بعد اپنے والد کے نام جو خط لکھا تھا۔ شاید پہلے بھی نقل کر چکا ہوں جس میں پیشگوئی کی گئی تھی کہ

”تیس سال بعد ایک بت پرست یعنی ہندو بنگال میں باقی نہ رہے گا“ (روشن مستقبل ص ۳۷)

اسی کا اندازہ کرنے کے لئے کہ انگریزی تعلیم کس حد تک اس نصب العین کے لحاظ سے بار آور ہو رہی ہے عموماً کام اور نتیجہ کا جائزہ بھی وقتاً فوقتاً لیا جاتا تھا۔ سرچارلس تریلین جو اس مسئلہ سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے اور ترقی کر کے گورنری کو عہدہ تک پہنچے تھے، انہوں نے لکھا تھا کہ

”کلکتہ چھوڑنے سے قبل میں نے تمام ان تعلیم یافتہ لوگوں کی فہرست بنوائی جو عیسائی ہوئے“ ص ۱۴۱ روشن مستقبل

اور گویا عیسائیت کے قبول کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں بڑھی تھی۔ لیکن سلبی نتیجہ بہت زیادہ کامیاب تھا، لارڈ میکالے کے الفاظ میں جس کی تفسیر یہ تھی کہ

”کوئی ہندو جو انگریزی دان ہے، کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا“

الغرض انگریزی تعلیم کا یہ ”سلبی اثر“ کہ ”اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا“ جہاں اس کا پتہ چلتا تھا، اسی کے ساتھ ایجابی نتائج کے متعلق لاٹ صاحب ہی نے یہ بھی لکھا تھا کہ پھر

”ان میں بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں، یا مذہب عیسوی اختیار کر لیتے ہیں“

”موحد ہو جاتے ہیں“ بظاہر ان الفاظ سے اشارہ شاید ان ہندوؤں کی طرف کیا گیا ہے۔ جو انگریزی تعلیم پانے کے بعد بنگال میں راجہ رام موہن رائے کے قائم کئے ہوئے ”برہم سماج“ یا علاحدہ بمبئی کے ”پرارتھنا سماج“ والی سوسائٹیوں میں شریک ہو کر موحد بن جاتے تھے جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے جاننے والے ان سے کم و بیش واقف بھی ہیں، لیکن اسی سلسلہ میں اندرونی طور پر بے پاؤں ایک اور سیلاب بھی اس زمانہ میں جو دمکیاں دے رہا تھا۔ تاریخ کے اسی حصہ کے متعلق ”خاموشی والی سازش“ شاید اختیار کی گئی۔

مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے عام مشرکانہ اوہام کا ازالہ کر کے یہ جو سمجھ لیا گیا تھا کہ قدرت ناؤگ عیسائی

مذہب کو قبول کر لیں گے، ایک تو یوں بھی صحیح نہیں تھا کہ عیسائیت کی توحید خود تثلیث کے معنی میں اچھ کر
 چیتان بنی ہوئی تھی، اور گو اس ملک میں اسلام کے نمائندے اسلام سے زیادہ خود اس ملک کے مشرکانہ
 ادہام ہی میں لفظوں کے بر پھر سے غوطے کھا رہے تھے۔ لیکن مسلمان نہ ہی، مسلمانوں کی آسانی کتاب
 اور اس آسانی کتاب کے لانے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان کی کتابوں میں موجود تھی، اسی
 کے ساتھ ایک غیبی لطیفہ اس ملک میں ٹھیک اسی زمانہ میں حضرت مولانا سید شہید بریلوی اور ان کے
 رفقاء صدیقین و شہداء رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شکل میں اچانک ظاہر ہوا تھا۔ یہ حضرات خالص اسلامی
 توحید کے مجسم نمونہ بھی تھے، اور اسی کی منادی بھی ملک کے طول و عرض میں کمال جوش و خروش
 کے ساتھ کر رہے تھے۔

پس ہندوؤں کا وہ طبقہ، جو اپنے آبائی مشرکانہ دین کی صداقت سے جیسا کہ میکالے نے لکھا
 ہے، ہٹ رہا تھا۔ ان میں عیسائیت، یا عیسائیت کے بغیر توحید کے قبول کرنے والوں کے ساتھ ساتھ
 واقعہ یہ پیش آیا تھا۔ ایک بڑا طبقہ تھا، جو اپنے ملک کے خالص توحیدی دین اسلام کو قبول کر رہا تھا،
 کس بیبا نے پر قبول کر رہا تھا، اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے، کہ ۱۸۵۷ء میں تحفۃ الہند نامی مشہور کتاب
 ایک نو مسلم مولوی محمد عبید اللہ صاحب کی جو خالچ ہوئی تھی، اس میں مولوی صاحب نے اپنے قصبہ
 پاٹل (مقتل بودھیانہ پنجاب) اور اسی کے گرد و نواح میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد جو بتائی ہے
 قریب قریب ستر تو وہی پہنچ جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے، کہ انگریزی حکومت کی بدولت ملک ایک نئے ماحول سے آشنا ہوا تھا، اس ماحول کو
 دوسرے نتائج جو قصداً پیدا کئے جا رہے تھے۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ قصداً اور مادہ کے بغیر اندہی
 اندہ اسلام اور اسلامی توحید کی طرف بھی لوگ گھنچنے لگے۔ اسی کتاب میں بعض ایسے واقعات بھی
 مصنف کتاب نے نقل کئے ہیں، کہ اعلان اسلام سے پہلے اپنے خاندانی پردہ بہت برہمن سے مذاقاً
 لکھا ہے کہ میں نے کہا کہ پردہ بہت جی میں تو مسلمان ہو گیا۔ اس فقرے کو سن کر بجائے بگڑنے کے
 لکھا ہے کہ پردہ بہت صاحب نے کہا کہ

”ہمارا جہاں جہان دہیں پروہت“

یعنی جو مرید کا دین وہی پیہ کا دین بھی ہے۔ پہلے تو سمجھا گیا کہ یہ گفتگو دل لگی کے طور پر ہوئی لیکن بعد کو عیسا کہ مولوی عبید اللہ نے لکھا ہے کہ پروہت جی

”گھر با چھوڑ کر مسلمان ہوئے“ ۵۱

مولوی عبید اللہ صاحب نے اسی کتاب میں مختلف طریقہ سے اپنے بعض ذاتی مشاہدات و تجربات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جن سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ علانیہ دین اسلام قبول کرنے والوں کے سوا کافی تعداد اس زمانہ میں اس قسم کے لوگوں کی بھی تھی، جو بظاہر اپنی شکل و صورت سے مسلمان نہیں معلوم ہوتے تھے۔ لیکن واقعہ میں اسلام کو اپنا دین بنا چکے تھے، ایک دل چسپ قصہ اسی سلسلہ میں انہوں نے لاہور کا درج کیا ہے، یہ وہ زمانہ تھا کہ خود مولوی عبید اللہ صاحب نے اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا۔ لکھا ہے کہ

”ایک مسافر ذی عزت، صاحب کمنت ساکن شاہ جہاں آباد (دہلی) سے ملاقات

ہوئی، وے ظاہر میں سراوگی تھے، اور میں ان دنوں میں اپنا اسلام مخفی رکھتا تھا“

خلاصہ یہ ہے کہ اسی دہلوی مسافر سے ان کی ملاقات ہوئی۔ درمیان میں کچھ مذہبی گفتگو چھڑی، تاہم ان کے آخر میں اس سراوگی نے اقرار کیا کہ

”میں مدت سے پردہ میں مشرف باسلام ہوں اور نماز پنجگانہ ادا کرتا ہوں“ ۵۵

لیکن مصلحت و دسروں پر اس کو ظاہر نہیں کیا ہے، اس قسم کے متعدد واقعات کا تذکرہ مختلف مقامات پر اس کتاب میں کیا گیا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ مغل حکومت کے زوال کے بعد انگریزوں کی حکومت اس ملک میں جب قائم ہوئی، تو اسلام کی طرف غیر معمولی رجحان یا شندوں کے قلوب میں پیدا ہو گیا تھا۔ خود مولوی عبید اللہ صاحب نے اسی کتاب میں ایک موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ

”پروہت کا مطلب مولوی صاحب نے خود ہی لکھا ہے کہ خاندانی بیروں کی یہ ہندو تفسیر ہے، شادی بیاہ اور منڈن وغیرہ میں ان سے کام پڑتا ہے۔ جہان یعنی مرید لوگ اپنے اپنے پروہتوں کو ان تقریروں میں زندہ نیاز دیتے ہیں ۱۲

”باوجودیکہ فرنگی لوگ لکھا روپیہ خرچ کرتے ہیں، اس بات پر کہ لوگ ان کا دین (عیسائیت) اختیار کریں، چنانچہ پادریوں کو نوکر رکھنا، اور مدرسوں کا تعمیر کرنا، اور کتاہوں کا تقسیم کرنا، اسی واسطے ہے۔“

پھر یہی نہیں وہی آگے لکھتے ہیں

”اور جو کوئی ان کا (فرنگیوں کا) دین اختیار کرتا ہے، اس سے نان و نفقہ کی بھی مروت کرتے ہیں۔“

مگر ان ہی کا بیان ہے کہ بجز ”بے عقل حوادث زدہ“ لوگوں کے عیسائی دین قبول کرنے والوں میں ”کوئی ہزار میں ایک آدمہ ہوتا ہے۔“

برخلاف اس کے اسلام کے متعلق وہی لکھتے ہیں کہ

”اسلام باوجودیکہ بہ سبب نہ ہونے سلطنت اہل اسلام کے اس ملک میں ضعیف ہو گیا ہے اور اکثر اہل اسلام کہ متقی، و اہل مروت میں چنداں اسباب دنیاوی موجود نہیں رکھتے کہ کسی شخص مشرف باسلام کا ردی اور کپڑا اپنے اوپر کر لیں۔“

مگر بایں ہمہ اپنے زمانہ کا یہ حال انہوں نے درج کیا ہے کہ اس ضعف اور بے نوائی، و بے کسی کے باوجود ”بہت سے آدمی اپنی حشمت دنیاوی چھوڑ کر دین اسلام کو اختیار کرتا، اور درویشی و مفلسی میں

آنا غنیمت جانتے ہیں۔“

واقعات جو سننے میں آتے ہیں، واقعی ان کو سن کر حیرت ہوتی ہے، ایک طرف بہار کی ایک راجپوت ریاست کھیرانا می کے راجہ کے بھائی جو بجد کو راجہ عبدالرحمن آف مرچا کے نام سے مشہور ہوئے، اور اس وقت ان کے خاندان کے لوگ مرچا میں موجود ہیں۔ تو دوسری طرف مولوی عبید اللہ صاحب نے ایک پہاڑی سردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پہلے ان کا نام

”کنور جوالا سنگھ تھا۔“

اپنی متعدد بیویوں اور ملازم کے ساتھ مسلمان ہوئے۔ شیخ غلام محمد اب ان کا نام ہے۔

سچی بات یہ ہے، کہ جس قسم کی نئی ذہنی پھل انگریزی حکومت کے قیام کے بعد اس ملک میں پیدا ہوئی، علاوہ ان یونیورسٹیوں کے، جن کے ذریعہ جدید مغربی علوم سے ملک کو آشنایا جا رہا تھا، بقول سرچارلس ٹریلین

”بالواسطہ کتابوں، اخباروں، یورپیوں سے بات چیت وغیرہ“

سے دلوں اور دماغوں پر جو رنگ قدرتی طور پر چڑھ رہا تھا، یا قصداً حکومت اپنے خاص باطنی اغراض سے چڑھا رہی تھی۔ اب اس کو کیا کہئے، کہ خالی تو کئے جا رہے تھے لوگوں کے دل اور دماغ بپتسمہ کے پانی سے بھرنے کے لئے، لیکن عین اسی زمانہ میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اُس مقدس پانی سے دیکھا جا رہا تھا وہ بھرتے چلے جا رہے ہیں، جو اسلامی دین کے سرچشمے سے ابل رہا تھا، افسوس ہے کہ باوجود تلاش و جستجو کے حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کی متعلقہ کتابوں میں اس قسم کی اجمالی اطلاعیں جو دی گئی ہیں، کہ جو دریائی سفر آپ کا دی سے کلکتہ تک ہوا تھا۔ اس سفر میں مسلمانوں کی دینی اصلاح و تربیت کے ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے، کہ اسلام کے قبول کرنے والوں کی تعداد بھی لاٹھوں سے تجاوز نہ تھی۔ لیکن اس اجمال کی تفصیل کیا تھی، بجز مولوی عبید اللہ صاحب حوم کی اسی کتاب ”تحفۃ الہند“ کے جس میں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء کا ذکر غیر معمولی احترام سے کیا گیا ہے، اور اسی سے کچھ میں آتا ہے، کہ خود مولوی عبید اللہ صاحب بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ سید شہید کی تحریک کے اثر پذیروں میں تھے۔ بس اس کے سوا اس زمانہ کی کسی تصنیف میں اب تک تفصیلات کا پتہ نہیں چل سکتا ہے۔

سوال یہی ہے کہ گورنری تک پہنچنے والے حکام جس حکومت کے فہرست ان لوگوں کی جب تیار کر رہے تھے، جو حکومت کی نئی تدبیروں کے زیر اثر اپنے آبائی دین سے روگرداں ہو کر عیسائی دین قبول کر رہے تھے۔ کیا اسی حکومت کی نظر اس پر نہیں پڑ رہی تھی کہ زمین تو حکومت اپنی بالواسطہ یا بلاواسطہ مصارف سے تیار کر رہی ہے، لیکن اسی کی تیار کی ہوئی زمین سے فائدہ دوسرے اٹھا رہے ہیں، گویا پھل توڑنے کا موقع ان کو مل گیا ہے، جنہوں نے نہ درخت ہی لگائے، نہ ان درختوں کی

آبیاری و نشوونما میں کوشش کی تھی، مطلب یہی ہے کہ اپنے مورد فی دین سے بدگمان اور بظن کرنے کا کام تو حکومت انجام دے رہی تھی، اور اسی لئے دے رہی تھی تاکہ اس ملک کے باشندوں کا مذہب بھی وہی ہو جائے جو اس کے حکمرانوں کا ہے، یعنی لوگ عیسائی ہو جائیں۔ لیکن بیچ میں یکایک اس صورتِ حال سے اسلامی دین کے دائرہ کی وسعت میں جو مدد مل رہی تھی، اور جو ق در جو ق لوگ اس زمانہ میں حلقہ بگوش اسلام جو ہو رہے تھے، کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے، کہ دن کی روشنی میں اپنی کتہ و کاوش کے اس عجیب و غریب نتیجے سے حکومت اندھی بنی بیٹھی رہ سکتی تھی۔

میں نے جو عرض کیا تھا کہ تاریخ کے اوراق پھلٹوئیے گئے ہیں۔ ان پھٹے ہوئے اوراق میں ایک درق یہ بھی ہے۔ اس زمانہ کی معمولی معمولی جزئیات سے بھی نتائج اس وقت جو پیدا ہو سکتے تھے، یا آئندہ جن کے پیدا ہونے کا احتمال ہو سکتا تھا۔ کتابیں اٹھا کر دیکھئے، سب ہی پر بحث کی گئی ہے اور حکمت و دانش کے دریا بہا دیئے گئے ہیں۔ لیکن جہاں تک اس سلسلہ کی کتابوں کا مطالعہ فقیر نے کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اس کا خطرہ بھی حکومت اور حکومت کے کارندوں کے دلوں پر کبھی نہیں گذرا، سب کچھ ہو رہا تھا، لیکن حکومت کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس کی سنگاہوں میں کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ طریقہ عمل سے خواہ کچھ بھی باور کرایا جا رہا ہو لیکن یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا حکومت اس کے سلسلہ کو یوں ہی آگے بڑھنے کے لئے چھوڑ دیتی۔ عقل کا اقتضا تو یہی ہے لیکن اس عقلی نتیجے کے لئے جن تاریخی شہادتوں کی ضرورت ہے، مجھے اعتراف کرنا چاہئے کہ تفصیلاً ان کے پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ صرف چند گروے پڑے مگر طے مل گئے ہیں، انہیں آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں، ان ہی کو جوڑ کر کچھ پڑھ سکتے ہوں تو پڑھ

(۱)

پہلی بات تو اس سلسلہ کی یہ ہے، کہ وہی کلکتہ جو اس زمانہ میں اس قسم کی کارروائیوں کا مرکز تھا، اسی شہر میں کچھ دن بعد یعنی ان ہی دنوں کے بعد جن میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں، اور شادیاں بچانے جا رہے تھے، کہ

”تیس سال بعد بنگال میں ایک ہندو باقی مذہب ہے گا“

بنگال ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر ہند کے متعلق توقعات قائم کی جا رہی تھیں، کہ

”جیسے ہمارے آباء و اجداد ایک دفعہ عیسائی ہو گئے تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی

سب کے سب ایک دفعہ عیسائی ہو جائیں گے“

انگریزی نظام تعلیم کے نفاذ میں کامیاب ہونے والے صاحبزادے لال صاحب اپنے بوڑھے مسیحی

باپ کو شرمندہ سنا رہے تھے کہ

”کوئی ہندو جو انگریزی دان ہے، کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا“

جس کلکتہ میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے، کہ اسی کلکتہ میں دیکھا جاتا ہے، کہ گوری

کھال، گورے رنگ کا آدمی یہ کہتے ہوئے، کہ

”میری رگوں میں ایک بوند بھی غلامی کے خون کا نہیں ہے“

انگریزی زبان میں ہندوؤں کے ایک مجمع کو خطاب کر کے احسان جتلا رہا ہے، کہ انگریزی حکمران

انگریزی نظام تعلیم کو جاری کر کے ہندوؤں کی عام ذہنیت میں جو انقلابی کیفیت پیدا کر دی تھی، ان الفاظ میں

یاد دلاتے ہوئے کہ

مذہب کی تعلیم دلوں سے قریب قریب دور ہو چکی تھی، مغربی تعلیم، اور مغربی تعلیم یافتہ

ستادوں کا اثر اس قدر حاوی ہو گیا تھا، کہ ہندو تعلیم یافتوں کا پچاس فی صدی حصہ

مادہ پرست اور روحانیت کا منکر، ۲۵ فی صدی سنشی دان (بتلائے شک)، اور باقی ۲۵

فی صدی کٹر ہندو رہ گئے تھے“

صرف بنگال ہی نہیں، اس نے کہا

”کل ہندوستان میں تعلیم یافتہ جماعت کی یہ کیفیت ہو گئی تھی“

اسی نے کہا کہ اس زمانہ میں

”تعلیم یافتہ ہندوؤں کی چٹکی لی جاتی تھی، اور جب کبھی اہل مغرب کے سامنے اپنے

مذہبی عقائد اور قومی دھرم کا اظہار کرتے تھے، طعن و تشنیع کی صدا گوش زد ہوتی تھی۔“

اس کے بعد یہی مقرر یہ اطلاع دیتے ہوئے، کہ

”مگر اب زمانہ بدل گیا“

بدلے ہوئے زمانہ میں جو کچھ ہندو ہاتھا، اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے، کہ اب

”زیادہ تر تعلیم یافتہ ہندو اپنے مذہب پر وشواش کرتے ہیں، اور لائق سے لائق جماعتوں

میں اپنے عقیدوں کے ثابت کرنے میں مطلق شرم نہیں کرتے“

پھر اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ ہندو مذہب کے شائستروں اور کتابوں کی کس مہر سی کا زمانہ گزر گیا۔

اور اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ

”قدیم کتابوں کا مطالعہ کیا جا رہا ہے، غور سے وہ پڑھی جا رہی ہیں۔ بہت اعلیٰ درجہ کی

کتابیں چھپ گئیں، اور چھپتی چلی جا رہی ہیں۔ بہتوں کا انگریزی اور روسی بھاشاؤں میں ترجمہ

بھی ہو گیا ہے، اور زمانہ حال کی تحقیقاتی معلومات کے زیر اثر ان کی تشریح کی جاتی ہے۔“

یہ ہے تاریخ کے دریدہ اوراق کا ایک ٹکڑا۔ یہ اقتباسات جن صاحب کی تقریر کے ہیں، ان کا نام

تھا، کرنل اسکاٹ صاحب، یہ کون تھے، کہاں کے تھے۔ ان تفصیلات کو تو چھوڑیے۔ لیکن کرنل

کے نام کا جو جزو ہے، اسی سے معلوم ہوتا ہے، کہ کسی زمانہ میں شاید فوجی خدمت سے تعلق رکھتا

یہی صاحب ہیں، جو دنیا کی مشہور نام نہاد مذہبی سوسائٹی تھیسا سوفیل کے بانی تھے میڈم بلیوٹ

کی مددگار اور معاون تھیں۔ ہندوستان میں تو خود ان کی تشریف فرمائی ۱۸۵۷ء میں ہوئی، لیکن ان

سوسائٹی اور اس کی شاخیں ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے امریکہ اور یورپ میں قائم ہو چکی تھیں۔ ۱۸۵۷ء

ہی میں انہوں نے اعلان کیا تھا کہ میں ہندوستان کے ”بودھ مذہب“ کا پیرو ہوں۔ مسز انی بیسنٹ

ان ہی کرنل اسکاٹ کی ہندوستان میں جانشین بن کر نمایاں ہوئی تھیں۔ ہندو کالج بنارس جو اب ہندو

یونیورسٹی ہے، اس کے سوا مسز انی بیسنٹ ہی نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں نئے نئے ناموں

سے مختلف تعلیمی اور دینی ادارے جاری کئے۔ مدراس میں بمقام ادیار میلوں میل کے رقبہ میں سمندر کے

کے کنارے ایک آشرم یا خانقاہ بھی ان کی قائم کی ہوئی، اس وقت تک موجود ہے، جس میں گو دنیا کے اکثر مذاہب کی نمائندگی کا دعویٰ کیا جاتا ہے، لیکن دراصل چھاپ اس پر ہندو دھرم ہی کی ہے۔

بہر حال یہی کرنل اسکاٹ صاحب ہیں، جنہوں نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے، ہندوؤں کی نئی انقلابی ذہنیت کا اعلان مذکورہ بالا الفاظ میں کیا۔ اور یہ سب کچھ فرمانے کے بعد آخر میں مجمع کے واقف کار شریف ہندو صاحبوں کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ یہ ذہنی انقلاب جو ہندوؤں میں پیدا ہوا، اور بیداری کی نئی لہر اپنے آبائی اور موروثی دین کے متعلق ان میں جو اٹھی، اور جو نتیجے اس سے پیدا ہوئے۔

”ان تسکین بخش نتیجوں کی تکمیل کہاں تک تھیا سونیکل سوسائٹی کے ذریعہ ہوئی ہے، آپ خود کہہ سکتے ہیں، میرے کہنے کی ضرورت نہیں ہے“ مک

تاریخ کے پچھٹے ہوئے ورق کا تو یہ ایک ٹکڑا تھا۔ دوسرا ٹکڑا بھی ملاحظہ فرمائیے۔

(۲)

تھیا سونیکل سوسائٹی اور اس کی شاخیں امریکہ اور یورپ میں قائم ہو رہی تھیں، لیکن اس سوسائٹی اور اس کی مختلف شاخیں چین کا جال یورپ و امریکہ کے شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے لئے سردار اور امام، حاکم، گرو اور استاد کی جگہ خالی تھی، کہ اچانک امریکہ و یورپ کے اخباروں میں ایک اعلان شائع ہوتا ہے، یہی کرنل اسکاٹ صاحب جو سوسائٹی کے بانی مبنی اور روح رواں تھے، ان ہی کا اعلان شائع ہوتا ہے، کہ ایک شخص، جو قطعی طور پر انگریزی زبان کے ایک حرف سے بھی آشنا نہ تھا۔ نہ یورپ کی دوسری زبانوں میں سے کسی زبان سے کسی قسم کا لگاؤ رکھتا تھا۔ جس نے نہ یورپ ہی کو دیکھا تھا، اور نہ امریکہ کو اور شاید امریکہ و یورپ کے باشندوں سے اس کے تعلقات بھی نہ تھے، وہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوا تھا۔ ہندوستان کی عام بولی جانی والی زبانوں میں بجز گجراتی زبان کے اور کسی زبان کو نہیں جانتا تھا۔ خانگی طور پر پتھر کے بعض پنڈتوں سے البتہ سنسکرت زبان کی ادبی تعلیم اس نے کچھ

حاصل کی تھی۔ خود اس کی زندگی میں ایسی عام باتیں کہیں کا رہنے والا ہے، کس خاندان کا تعلق ہو، ان باتوں کا صحیح علم لوگوں کو نہ تھا، اہل باوجود مبلغ کو مشنوں کے آج تک اس کی زندگی کے یہ ابتدائی سوالات تقریباً کچھ نا فیصل شدہ شکل ہی میں ہیں۔ سناٹا چھا گیا، دنیا میں سناٹا چھا گیا، جب تھیا سو فیمل سوسائٹی اور یورپ و امریکہ میں اس کی پھیلی ہوئی ساری شاخوں کی طرف سے یہ اعلان پڑھا گیا، کہ ہندوستان کے اسی شخص کو

”ہم اس سوسائٹی کا سرور اور اپنا بڑا اگر د رہنا اور حاکم قبول کرتے ہیں“

(کتاب سوامی دیانند اور ان کی تعلیم ص ۲۵۴)

یہ پراسرار شخصیت پنڈت دیانند سرسوتی مہاراج کی تھی، جو آریہ سماج کے مشہور بانی اور بزرگ سمجھے جاتے ہیں وہی غریب مشرقی اور مشرقیوں میں بھی سکین ہندوستانی جس کے سینے تقریباً ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ زمانہ سے چھیدے جارہے تھے۔ بے دردی کے ساتھ برسانو الے اس قسم کے تحقیری تیروں کے برسانیکے عادی تھے، مثلاً کہا جاتا تھا کہ

”یورپ کے کسی اچھے کتب خانہ کی ایک الماری کی کتابیں ہندوستان و عرب کے سارے

علم و ادب کے برابر ہیں“

دلوں میں تجلی نیزوں کی ایسی انیاں بھی ہوئی تھیں۔ کہنے والے کہتے پھرتے تھے کہ

”ایک انگریز نیم حکیم عطائی کے لئے (ہندوستانی طب) موجب ننگ و عار ہے“

صبح و شام قہم قہم کے ساتھ اس قسم کے فقرے دہرانے والے دہراتے رہتے تھے، کہ

”ان کو دہندی معلومات نجوم و افلاک کی پڑھ کر انھلستان کے زمانہ مددہ کی لڑکیوں کی

ہنسی رک نہیں سکتی“

یہ فقرے لارڈ میکالے کی اس مشہور تعلیمی رپورٹ میں استعمال کئے گئے ہیں، جو ہندوستان کے متعلق

لاٹ صاحب مددوح نے تیار کر کے حکومت میں پیش کی تھی۔

اور یہ تو ادنیٰ نمونہ ہے، ان نکو سیدہ کو مشنوں کا جن کے ذریعہ ہندوستان کے باشندوں کے

قلب میں اپنی اور اپنے اسلاف کی بیچ میٹری، کم مائیگی کی تخم پاشی میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور نئی قائم ہونے والی حکومت لگاری تھی۔ درود کی یہ داستان کافی طویل ہے۔

یہاں مجھے کہنا یہ ہے، کہ جس یورپ و امریکہ کے متعلق یہ یاد کر لیا جا رہا تھا۔ کہ وہاں کے زنانہ مدرسوں کی لڑکیاں بھی اپنی ہنسی کو ہندوستانی دل و دماغ کے علمی اور فکری نتائج کو سن کر روک نہیں سکتیں تاریخ کے ہزار ہا ہزار سال کی سرمنیزیوں اور دماغ کا دیوں کے بعد بھی علم کی جن شاخوں کے متعلق اس ملک کے باشندوں نے جو کچھ بھی سوچا سمجھا، لکھا پڑھا تھا، اعلان کر دیا گیا تھا، کہ یورپ و امریکہ کی موجودہ تحقیقاتی تالیفات و تصنیفات کے مقابلہ میں ان کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی ہے، جہل و حماقت کے سوا وہ اور کچھ نہ تھے، سوچنے کی بات ہے کہ اچانک اسی جہل کدہ اور حق زار ہند کی ایک انفرادی شخصیت کے علم و فضل کا صرف اعتراف ہی نہیں کیا گیا، بلکہ تھیا سوفیل سوسائٹی جو اس زمانہ میں قدیم و جدید علوم و معارف کے بڑے بڑے مستند ماہرین اور مسلم الثبوت فضلا کی یورپ و امریکہ میں کافی با عظمت سوسائٹی سمجھی جاتی تھی، اسی سوسائٹی کا ”بڑا گرد، رہ نما، حاکم“ تسلیم کر لیا گیا، ہندوستان کے اخباروں میں یورپ کے اخباروں سے منقول ہو کر جب یہ خبر شائع ہوئی ہوگی، ہندو قوم کے دل شکستہ، پست حوصلہ تعلیم یافتہ طبقات کے نفیات پر اس خبر کا جو اثر مرتب ہو سکتا تھا، شاید موجودہ حالات میں ہم اس کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ ملک کے اس سپوت فرزند کی علمی عظمتوں سے قلب اگر لب ریز ہو گئے، تو جس طریقہ سے خبر کی اشاعت کی گئی تھی، اس کا یہ لازمی منطقی نتیجہ تھا خصوصاً جب یہ سوچا جاتا تھا کہ دوسروں سے کچھ لٹے بغیر صرف اپنے خانہ ساز گھر کے علوم سے اس غیر معمولی وقار و عزت کے حاصل کرنے میں وہ ان مالک میں کامیاب ہوا ہے، جہاں سمجھا جاتا تھا کہ جہل و حماقت، اہلی اور نادانی کے سوا ہندوستان میں نہ پہلے کچھ تھا، اور نہ اب کچھ ہے۔ بہر حال دیکھا گیا کہ متھل کے ایک نابینا پنڈت ورجاند جنھیں پندرہ روپے کی امداد کسی راجہ سے ملتی تھی، ان ہی کے خانگی پاٹھ شالہ کا ایک طالب علم یا برہمنچریہ جس نے سنسکرت کے سوا کسی سے کچھ نہ پڑھا تھا، نہ سیکھا تھا۔ اچانک وہی، بمبئی کے جٹس راناٹے کے کبھی یہاں ہیں، اور کبھی احمد آباد میں ایک دوسرے مرہٹہ

جج رائے بہادر پنڈت گوپال راؤ ہری دیش مکھ کی دعوت پر ایک مہینہ ان کے ساتھ رازدنیاز میں بسر کرتے ہیں۔ کلکتہ کے مشہور ممتاز تعلیم یافتہ افراد کیشپ چندر سین مہرشی، ہندو ناتھ ٹیگور، بابوراج نارائن بوس وغیرہ سب ان کے دست بنے ہوئے ہیں۔ الغرض جس بڑے شہر میں جاتے ہیں، وہاں کے تعلیم یافتہ ہندو جن میں پچھتر فی صدی افراد کا بقول اسکاٹ صاحب اپنے موروثی دھرم پر اعتماد باقی نہ رہا تھا، اور اپنے مذہبی جذبات کی تسکین کے لئے اطمینان کے کسی نئے سرمایہ کی تلاش میں تھے، ان کو دیکھا جا رہا تھا کہ وہ پنڈت جی کو شمع محفل بنا کر خود پروانے بن کر ان پر اس لئے ٹوٹ رہے ہیں، کہ ان کو اپنے گھری میں ایک ایسی شخصیت مل گئی۔ جسے یورپ و امریکہ کے اہل علم و فضل اپنا گرد، اپنا رہ نما، اپنا حاکم تسلیم کر چکے ہیں، ان ہندو تعلیم یافتوں میں اس وقت تک زیادہ سے زیادہ ایسے اشخاص تو پیدا ہو چکے تھے۔ جنہوں نے فنا گرد بن کر یورپ و امریکہ کی جدید یونیورسٹیوں سے سند حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی، لیکن مغربی ممالک کی ان جدید یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتوں نے بھی جسے اپنا گرد اور استاد مان لیا ہو۔ ان ہی میں کیا شاید پورے مشرق میں پنڈت دیانند سروتی جی اس کی اپنی آپ مثال تھے۔

پنڈت جی کو یورپ کے ان نئے تعلیم یافتہ ہندو مفکرین، جن میں مذہبی اور سیاسی مختلف مذاق رکھنے والی ہستیاں تھیں، ان سے کیا کیا مشورے ملے، یا ان کے طرز عمل کو دیکھ دیکھ کر خود پنڈت جی کے دماغ میں کس کس قسم کے نئے خیالات پیدا ہوئے۔ میرے لئے اپنی اس کتاب میں سب کی نہ تفصیل کا موقع ہی ہے، اور سچی بات یہ ہے، کہ درون پردہ کی ان سرگوشیوں تک ہر کردار کی رسائی آسان بھی نہ تھی، لکھنے والوں نے پنڈت جی کی سوانح عمریوں میں کچھ لکھا بھی ہے، تو مشتے اندر خود ارے سے زیادہ نہ وہ ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔

پنڈت جی کو یورپ و امریکہ کی تھیا سوفیل سوسائٹیوں کے صدور الصدور یا رئیس اکبر بنانے کے بعد جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، کرنل اسکاٹ زمانہ تک ہندوستان سے باہر وہی رہ کر کام کرتے رہے۔ اس عرصہ میں دیکھا گیا، کہ پنڈت جی جو پہلے سنسکرت زبان میں تقریر کیا کرتے تھے، کلکتہ کے

بابو کیش چند سین کے مشورے کے مطابق ایسی عام فہم زبان میں تقریر کی مشق ہم پہنچائی، جسے تعلیم یافتہ طبقہ ہندوؤں کا سمجھ سکتا تھا، ان تقریروں میں کیا ہوتا تھا۔ ان کا اندازہ رگ وید اور بھگوت گیتہ کی انگریزی (بھاشیہ) سے ہوتا ہے، جسے لکھ لکھ کر اس زمانہ میں پنڈت جی شائع کرتے رہتے تھے، اور پروفیسر سیکس مولر نے جن کو ”عجائبات کا ذخیرہ“ قرار دیا تھا۔ اور سنسکرت زبان و علوم کے مستند اتادو پروفیسر ڈاکٹر ایچ۔ ڈی گروسلوڈ ایم۔ اے نے اپنی رائے یہ دی تھی کہ

”سوامی جی وید کے وہی معنی لگا لیتے ہیں، جن سے ان کا مطلب نکلتا ہے (گویا ان کو وید

الفاظ پر حاکیانہ تصرف کے اختیارات حاصل ہیں)۔“ ۱۹۹

گر وید کا صاحب ہی نے یہ لکھتے ہوئے کہ

”تفسیر کا یہ مطلب نہیں ہے، کہ اپنے خیالات ان کتابوں میں داخل کر دیئے جائیں بلکہ

مطلب یہ ہے کہ مصنف کے خیالات کو کتاب کی عبارت سے اخذ کیا جائے۔“

پنڈت جی کی تفسیری خصوصیت کی تعبیر یہ کی تھی کہ وہ یعنی پنڈت جی

”جس عبارت سے جو مطلب چاہتے ہیں نکال لیتے ہیں۔“

جیسا کہ پنڈت پانڈورنگ صاحب ایم۔ اے نے جو سنسکرت کے مستند قاضی تھے، اپنی رائے پنڈت جی کی تفسیروں کے متعلق یہ ظاہر کی تھی۔

”ان کی تفسیر میں وید کا اصل مطلب تو نہیں ہے، بلکہ وہی مطلب ہے جس کو وہ چاہتے تھے،

کہ وید میں ہونا چاہئے۔“ ۲۰۰

واقعہ یہ ہے، کہ تمدن و تہذیب، سیاست و تدبیر تحقیق و تلاش کے جن نتائج تک یورپ پنڈت جی کے زمانہ میں پہنچ چکا تھا، صرف ان ہی کے متعلق نہیں بلکہ قیامت تک ان راہوں میں جن نتائج تک پہنچنے کا عقلی امکان ہے، یا آدمی جن کو فرض کر سکتا ہے۔ کھلے کھلے صاف صاف لفظوں میں پنڈت جی نے اصرار کے ساتھ اس دعوے کا اعلان کیا کہ ہمارے ویدوں میں سب کا ذکر موجود ہے، اور گزشتہ زمانہ میں وید کی ماننے والی قوم یہ سب کچھ کر کے ختم کر چکی ہے۔

دید کی عبارتوں سے مطلب برآری کے حاکم اذ انداز کے بعد ظاہر ہے کہ پنڈت جی نے جو کچھ کیا اس سے بھی زیادہ کیا جاسکتا ہے، اور خواہ دید کی عبارتوں سے واقعی وہی مطالب نکلتے ہوں جنہیں پنڈت جی نکالتے تھے، یا نہ نکلتے ہوں، لیکن اپنے آبائی دھرم کے دائرے سے ہندوؤں کا جو تعلیم یافتہ طبقہ باہر نکل چکا تھا، اور نکلنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی، جیسا کہ کرنل اسکاٹ صاحب کی شہادت گزر چکی، نکلنے کے بعد نکلے ہوئے بھی واپس ہونے لگے، اور آئندہ نکل جانے کا خطرہ بہت حد تک کم ہو گیا۔

بعد کو کرنل اسکاٹ صاحب اپنے مائے ہوئے گرو، حاکم ورنہنا سے ملنے کے لئے ہندوستان بھی پہنچے۔ سہارنپور اور میرٹھ جو زیادہ تر پنڈت جی کی علمی جدوجہد کی آماجگاہ تھے۔ کرنل صاحب کی ڈائری سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان ہی دونوں مقامات میں باہم دونوں کی ملاقات ہوئی، یہ لکھتے ہوئے کہ ”۳۱ اپریل کو بہ مقام سہارنپور واقع مالک مغربی و شمالی سوامی (پنڈت دیانند) سے پہلے پہل ہماری ملاقات ہوئی“

آگے کرنل صاحب کی ڈائری کے الفاظ ہیں

”ہمارے اور سوامی جی کے درمیان لمبی اور پرجوش بحثیں ہوئیں“

سہارنپور کے بعد لکھا ہے کہ

”۳۱ مارچ ۱۸۹۱ء کو میرٹھ میں ہوتی رہیں“ ۲۵۷

یہ قصہ کہ براہ راست ملاقات کے بعد اسکاٹ صاحب اور پنڈت جی کے تعلقات میں کیا تبدیلیاں ہوئیں اور ان تبدیلیوں کا کیا مطلب تھا، یہ ارادی تبدیلیاں تھیں، یا بخت و اتفاق کی پیداوار تھیں یہ سارے مسائل میرے دائرہ بحث سے خارج ہیں۔ اس موقع پر ذکر کرنے کی بات یہ ہے، کہ کرنل اسکاٹ اور سوامی جی کی ملاقات سے چار پانچ سال پہلے، جب سارا ہندوستان پنڈت جی کے ان عجیب و غریب لکچروں، تقریروں، مکتوبوں کے ذکر سے گونج رہا تھا۔ جن میں ثابت کیا جاتا تھا کہ آج یورپ اب ان کے پاس توپ بندوق، دھانی سکاڑی، دھانی جہاز تار بستی جو کچھ دیکھا جا رہا ہے، یا آئندہ جن اکتشافات

کی توقع کی جاتی ہے، یہ سب کچھ ہندوستان میں موجود تھا، ساری دنیا کا پائنجٹ ہندوستان ہی تھا، یورپ و امریکہ افریقہ اور ایشیا کے سارے ممالک ہندوستان کے باجگذار مقبوضات تھے، لہک لہک کر سنسکرت کے مجہول نفروں سے اسی قسم کے معلومہ نتائج پنڈت جی پیدا کرتے تھے، گو اس زمانہ میں اردو اور ہندی اخباروں کا چرچا زیادہ تو ملک میں نہ تھا۔ لیکن ہفتہ وار اخبار مسلمانوں اور ہندوؤں کے مختلف شہروں سے شائع ہوتے تھے، جن میں پنڈت جی کی ان محیر العقول تقریروں کا تذکرہ کیسا جاتا تھا۔

ان تقریروں کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً پنڈت جی کی تصنیف کردہ کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی تھیں، ٹھیک ۱۹۱۷ء جو بھجری کے حساب سے ۱۹۷۶ء کا سال تھا۔ بنارس سے بربان ہندی ایک کتاب شائع ہوئی، اسی کا نام ”ستیا رتھ پرکاش“ تھا۔ اور لکھا ہوا تھا ”شری سوامی دیانند جیٹ“ یعنی سوامی دیانند جی کی لکھی ہوئی ہے۔ نویدین یا بشارت کے عنوان کے نیچے یہ عبارت درج تھی۔

”یہ لپٹک شری سوامی دیانند سرسوتی نے میرے ذریعہ (خرچ) سے برچی ہے۔ میرے ہی ذریعہ (خرچ) سے یہ ملات ہوئی (یعنی شائع ہوئی)“

نویدین کے عنوان سے یہ اعلان نئی قائم ہونے والی حکومت کی ایک بڑی خطاب یافتہ ہستی

”شری راجہ کرشن داس بہادر سی، ایس۔ آئی“

کی طرف سے کیا گیا تھا جن کی مہر بھی کتاب پر ثبت ہے،

جس سے معلوم ہوا کہ حکومت کے یہی سی۔ ایس۔ آئی راجہ صاحب بہادر نے باضابطہ اجرت دے کر یہ کتاب پنڈت جی سے لکھوائی اور اپنے ذاتی مصارف سے ان ہی راجہ صاحب نے اس کو طبع کرا کر شائع بھی کیا تھا۔

یوں تو اردو اور ہندی اخباروں کے ذریعہ پنڈت جی اور ان کے خیالات کی عام اشاعت سے لوگوں کی عام توجہ ان کی طرف منحطف ہو ہی چکی تھی۔ آج پنڈت جی نے سہارنپور میں یہ کہا۔ میرے ٹھہیں یہ بولے، کانپور میں یہ اشتہار شائع کیا۔ دانا پور (بہار) میں ان کی تقریر اس موضوع پر ہوئی، ان عام

خبروں کے ساتھ ساتھ جوں ہی کہ یہ کتاب طبع و شائع ہو کر سبک کے ہاتھوں میں پہنچی، تو ایک طرف خود ہندوؤں اور ان کے مختلف فرقوں میں تہلکہ مچا ہوا تھا، ان کے دینی پیشواؤں، ان کی کتابوں، ان کے عقائد پر تنقید ہی نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ شرفاء کے کان جن الفاظ کے سننے کے عادی نہ تھے، اور جن فقروں کو شاید بے غیرت سے بے غیرت آدمی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا، نہ معلوم پنڈت جی نے اپنی بھٹیوں سے ان کے استعمال میں غیر معمولی فیاضی و کام لیا تھا، خیر یہ تو جو کچھ تھا، گویا پنڈت جی کا خانگی جھگڑا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی مشہور ہو گیا کہ اپنی اسی کتاب میں پنڈت جی نے علاوہ ہندوؤں کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے دین، ان کی آسانی کتابوں، اور ان کے پیغمبروں کی بھی خبر لی ہے۔ ستیا رتھ پرکاش کا پہلا ایڈیشن ہندی زبان میں شائع ہوا تھا۔ اسی لئے براہ راست عام مسلمانوں کے مطالعہ میں وہ کتاب تونے آ سکی، لیکن بعد کو اسی کتاب کے اردو ایڈیشن میں پڑھنے والوں نے وہ سب کچھ پڑھا، جس کا وہ شاید تصور بھی نہیں کر سکتے۔

کچھ بھی ہو، سہیہ کے ہنگامہ کے بعد پندرہ بیس سال کے اندر چھوڑے بہت سکون کی کیفیت ملک میں جو پیدا ہو گئی تھی۔ پنڈت دیانند جی کی تقریروں اور تحریروں کی بدولت پھر ملک میں نیا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جو باتیں پنڈت جی کی طرف منسوب ہو ہو کر مسلمانوں میں پھیل رہی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ انوکھا اور زالا بلکہ صحیح معنوں میں حد سے زیادہ طیش آفرین، بوکھلا دینے والا غیظ انگیز الزام یہ تھا جو ستیا رتھ پرکاش میں آج بھی بایں الفاظ پایا جاتا ہے۔

”خدا اور مسلمان بڑے بت پرست اور پورانی (یعنی سابق دھرمی ہندو) اور جینی یعنی جین مت کے پیرو چھوٹے بت پرست ہیں“ (سمولاس مگلہ - ۷۱۲ - ۱۱۲)

اسلام اور مسلمانوں کے دین پر تنقیدوں یا اعتراضات کے قصوں میں کہنے والے بہت کچھ کہتے چلے آ رہے تھے، لیکن اس کی طرف تو شاید اسلام کے بڑے بڑے ائمہ انجمن کا دھیان بھی نہیں کیا ہو گا کہ اسلام جیسے خالص توحیدی دین پر مشرک کی بدترین شکل بت پرستی کا بہتان بھی کہی باندھا جاسکتا ہے۔ اپنی ساری ذہنی بلند پروازیوں، اور افتراء و بہتان کی انتہائی چالیکدستیوں کے باوجود یورپ والوں کے

حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی۔

لیکن پنڈت جی کی ذہانت واقعی قابلِ داد ہے کہ دن کی روشنی کیلئے جو سب کے سامنے پھیلی ہوئی تھی، دعویٰ لے کر اٹھے کہ وہی صرف رات ہے، سخن سازی کہنے یا منہ زوری کی یہ اپنی آپ مثال تھی، ہندوستان کی اسلامی آبادی پنڈت جی کے اس اعتراض سے تزلزل اٹھی۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ سوانحِ مخطوطہ کی مصنف نے پنڈت جی اور ان کی ”آریہ سماجی“ تحریک کا ذکر کرتے ہوئے، جو کچھ لکھا ہے صرف یہی لکھا ہے، کہ

”ہندوؤں میں ایک نیا فرقہ پیدا ہوا جو مسلمان جیسے موحِدوں کو مشرک بتلانے لگا“ ۱۵

پنڈت جی کی اس ستم ظریفی کے نتائج و آثار کا تخمینہ آج مشکل ہے۔ لیکن اپنی سیزدہ صد سالہ تاریخ میں اس اچھوتے الزام کی پہلی آواز تھی۔ جو مسلمانوں کے کانوں کو ٹکرائی تھی۔ اس زمانہ کے اخباروں کے پرانے فائل کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ شمال سے جنوب تک اور شرق سے مغرب تک ہندوستان کے طول و عرض میں ہلچل مچی ہوئی تھی، مسلمانوں کے ہر گھر میں اسی کا چرچا تھا۔ ادھر مدت کے بعد ہندوستان میں پادریوں کے بازاری داعیوں کے ساتھ ساتھ مذہبی چھیڑ چھاڑ کے سلسلہ میں اس ملک کی ایک رسم کہن نے تازہ جنم لیا تھا، قصہ تو اس کا طویل ہے مختصر لفظوں میں یہ سمجھئے، کہ مناظرہ یعنی مختلف عقائد اعمال رکھنے والے مذہبی فرقوں کا تحریراً یا تقریراً واقعی اس لئے بحث و مباحثہ کہ حتی الوسع حق تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاریخ کے نامعلوم زمانہ سے اس کا سلسلہ جاری ہے، اور جاری رہے گا۔ لیکن مناظرے کے مقابلہ میں دوسرا اصطلاحی لفظ ”مکابرہ“ کا جو پایا جاتا ہے جس میں بحث کرنے والوں کے سامنے صرف ”ہم بڑے کہ تم بڑے“ کے سوا اور کوئی بلند نقطہ نظر نہیں ہوتا۔ ہر فریق پہلے ہی سے طے کئے ہوتا ہے، کہ کچھ بھی ہو، بہر حال فلاں مذہب کو غالب کر کے دکھانا ہی اسی پر کوشش مرکوز رہے گی، گویا مذہب کی طرف سے وہی فرض انجام دیا جاتا ہے، جو کام آج کل کی عصری عدالتوں میں وکلاء اور بیرسٹروں کا طبقہ انجام دیتا ہے جس کی فیس لے لی جاتی ہے۔ اسی کی حمایت سمجھا جاتا ہے، کہ وکیلوں

اور بیسٹروں کا منصفی فریضہ ہے۔

دوسرے ممالک سے اس وقت بحث نہیں، لیکن ہندوستان کی دینی تاریخ کی ممتاز ہستی شکر آچاریہ کی مذہبی معرکہ آرائیوں کی داستانیں جن کتابوں میں ملتی ہیں۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے سارا ملک مذہبی اور دینی کشتی گیروں کا گویا ذنگل بنا ہوا تھا، اور مسلمانوں کے عہد حکومت میں تو مختلف مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کے درمیان اس قسم کی مکارانہ یا دکیلانہ کش مکشوں کا پتہ نہیں چلتا، لیکن پنڈت دیانند سرسوتی جی کے گرو متھرا نواسی پنڈت ورجانند کے جو حالات سوامی دیانند کی سوانح عمریوں میں ملتے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس ملک کے پنڈتوں میں شاید موردی طور پر مذہبی مباحثوں کا ذوق منتقل ہوتا چلا آتا تھا، پنڈت دیانند سرسوتی نے

۱۷۷۷ء کہتے ہیں کہ بدھ مذہب اور جین متی کے ماننے والے اہل علم و فضل سے سارے ہندوستان میں گھوم گھوم کر شکر آچاریہ نے مقابلہ کیا تھا، بڑی بڑی راجے، مہاراجے اپنی سرپرستی میں لگھو کراتے تھے، اور شکست خوردہ ہو دی اور جینی و دووانوں کے متعلق دانشور عالم بال صواب یہ قصے کہاں تک صحیح ہیں، کہ کھوتے ہوئے گرم تیل کے کڑھوں میں ان کو تلوادیا جاتا تھا، سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی ہے کہ سنگدلی اور قساوت قلبی میں انسانیت گرتے ہوئے اس حد تک بھگا بیچ سکتی ہے شکر آچاریہ کے ان مباحثوں کا تذکرہ ”دگ دجے“ یا ”مشکر دجے“ منسکرت زبان کی جن کتابوں میں کیا گیا ہے۔ براہ راست ان کتابوں تک تو میری رسائی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ان ہی کتابوں کے حوالے سے بیان کرنے والوں نے کچھ باتیں بیان کی ہیں۔ پچھلے موصیٰ کا ایک طبقہ ان دونوں کتابوں کے تاریخی استناد کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس کو متوجہ فرمنا ایک بات کا خیال آگیا، ویدانتی وحدت الوجود جسے ہندوستان کے مذہبی حلقوں میں کافی حسن قبول حاصل ہوا۔ کہتے ہیں کہ شکر آچاریہ ہی نے وید یا گیتا کے بعض اشارات کو بنیاد بنا کر ایک مستقل نظریہ کا قالب عطا کیا۔ سنی ہوئی افواہی روایات سے متاثر ہونے والے بعض مسلمانوں میں یہ مشہور ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کے صوفیوں میں وحدت الوجود کا خیال ہندوستان کے اسی ویدانتی نظریہ کا عکس ہے، مگر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ خود شکر آچاریہ لمبار میں اس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، جب اسی لمبار میں تقریباً دو سو سال پہلے اسلام پھیل چکا تھا، اور مسئلہ وحدۃ الوجود کی کافی اشاعت ہو چکی تھی۔ ۱۲

۱۷۷۷ء انگریزی زبان میں پنڈت دیانند سرسوتی جی کی ایک ضخیم سوانح عمری باوا چھو سنگھ کی لکھی ہوئی پائی جاتی ہے، اسی کتاب کے حوالے سے کتاب ”سوامی دیانند جی امدان کی تعلیم“ میں پنڈت ورجانند سرسوتی جی کے گرو کے متعلق اس قسم کے قصے نقل کئے گئے ہیں کہ مسٹر لکھنؤ رگھو پر سے پنڈت ورجانند نے مل کر یہ درخواست کی کہ کرشن شاستری جو ان کا مقابل تھا، اس سے میرا مباحثہ کرایا جائے، ورنہ سیٹھ جو شام کرشن شاستری کا طرفدار تھا اس سے (باقی اگلے صفحہ پر)

جو کچھ بھی پڑھا تھا، پنڈت درجاندھی سے پڑھا تھا۔

پنڈت درجاندھی کی سیرت و کردار سے ان کا متاثر ہونا محلِ تعجب نہیں ہو سکتا، ان کی زندگی کا بڑا حصہ جب شروع شروع میں پڑھ کر وہ باہر نکلے، پتہ چلتا ہے کہ پنڈتوں سے مناظرہ اور مباحثہ ہی میں گزارتا تھا، خود اپنی خود نوشت سوانح عمری میں پنڈت دیانند جی نے ریاست جے پور میں اپنے کارنامہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ

”وہاں (یعنی جے پور میں) میں نے پرچم دیشنومت کا کھنڈن کر کے (یعنی اس کو غلط ثابت کر کے) شیشومت کی استھاپنا کی (یعنی اس کو مقبول اور اعزیز بنادیا)۔“

جے پور ہی میں دیشنومت کے ایک پنڈت رنگاچاریہ نامی سے ”شاستر ارتھ“ یعنی مباحثہ یا مونچوں کی لڑائی کا پنڈت جی نے چیلنج دے رکھا تھا، اور بے چارے رنگاچاریہ کو پنڈت جی ۱۰ سال زمانہ میں لکھا ہے کہ رنڈاچاریہ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ پنڈتوں کے خاص دائرے کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا، لیکن مسلمانوں کی حکومت کی پوری تاریخ میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ مختلف مذاہب و ادیان کے ماننے والوں میں مسابہ اور بجا دلہ کا بازار کبھی گرم ہوا ہو۔ نہ عوام ہی میں اس نوعیت کے عام مذاق کا پتہ چلتا ہے، اور نہ ملاطین و امرا کی دوسری بازوؤں کے ساتھ مذہبی نمائندوں کی گتھم گتھا کی اس بازی کا کسی نے ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ اکبر تک کے زمانہ میں بھی حالات کے سب سے کچھ ہوا۔ ظاہر سب عالم کے نمائندے اکٹھے کئے گئے، لیکن بادشاہ کی سرپرستی میں مناظرہ کا کوئی ذمہ ناسل قائم ہوا تھا، کم از کم مجھے اس کا علم نہیں ہے۔

(گزشتہ صفحہ سے) پانچ سو روپے کی پوری رقم مجھے دلائی جائے۔ یہ بھی اسی کتاب میں ہے کہ درجاندھ جہنم و مذہب کے شیوہ فرقہ کے پنڈت تھے۔ ان کا مقابلہ دوسرے فرقہ و دشنومت کے پنڈت سے ہوا اور جاندھ کی شکست ہوئی۔ شکست کے بعد نفرت اور خصم کی حالت یہ تھی کہ دیشنومت کی کتابوں کو درجاندھ اپنی چارپائی کے نیچے ڈال دیا کرتے تھے، اور دیشنومت کی ایک کتاب ”مدھانت کو مدی“ کے مصنف کے متعلق درجاندھ اپنے چیلوں کو حکم دیتے تھے کہ اس مصنف کے نام پر بھی انھیں کی تصویر پر بھی جو تیاں لگائیں، دیکھو سوائی دیانند اور ان کی تعلیم ملے مصنفہ خواجہ غلام الحسنین یانی جی ۱۲

۱۳ یہ ساری باتیں آپ کو اسی کتاب ”سوامی دیانند اور ان کی تعلیم“ میں کتابوں کے حوالے سے مل جائیں گی۔ ۱۴

مسلمانوں کے ذوقِ اہل کے ختم ہونے کے بعد سب سے پہلے پادریوں کو دیکھا جاتا ہے کہ باز ان کے
اور سیلوں ٹھیلوں میں پہنچ کر دوسروں کے عقائد و اعمال پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ جس کے بعد تھانوں کے
مقابلہ کے لئے بھی لوگ کھڑے ہو جاتے تھے۔ لیکن عموماً یہ پادری جن میں زیادہ تر دیسی کا لے رنگ
والے پادری ہوتے تھے، جن کا علمی مراد بھی معمولی ہوتا تھا، اور کیا کہا جائے۔ لیکن جو واقعہ تھا، اس
کا کیسے انکار کیا جائے کہ جن خاندانوں سے ان دیسی پادریوں کے حاصل کرنے میں عیسائی مشنری
کے لوگ کامیاب ہو کر رہے تھے، ایک تو موروئی روایات، ہی ان کی حد درجہ پست ہوتی تھیں بنانا
محض رفع حاجت کے لئے دین قبول کرنے والوں سے کردار کی بلندی کی توقع عام طور پر کرنی بھی نہ
چاہئے۔

ہندوستان کے مردہ مذاہب راویان پر اعتراضات کی ایک فہرست تیار کر لی گئی تھی یہی فہرست
ان کو ٹادی جاتی تھی جس کا اعادہ کوہ و بازار میں وہ کرتے پھرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ دل دکھانے والی
اعتراضوں کے ان گراموفونوں کی طرف اسلام کے سنجیدہ علماء، فوجہ توڑ کیا کرتے، سچی بات یہ ہے کہ
ان سے گفتگو یا بحث و مباحثہ کو علمی وقار کے مناسب بھی عموماً خیال نہیں کیا جاتا تھا۔

صرف غدر سے پہلے فنڈر نامی ایک مغربی نژاد پادری جو عربی و فارسی یعنی مسلمانوں کی زبانوں
کا ماہر تھا جب وہ دند چچا نے لگا، اور شورش زیادہ بڑھی، تو پس پردہ گو ایک اہل صاحب تھے لیکن
گٹھکڑ کرنے کے لئے مدرسہ صولتیمہ مکہ مکرمہ کے مشہور بانی حضرت مولانا رحمت اللہ کی راوی میدان
میں اتر آئے تھے جہان میں ایک تاریخی مناظرہ بمقام آگرہ عیسائیوں اور مسلمانوں کا جو ہوا تھا اس
میں ایک طرف ہی فنڈر، اور دوسری طرف مولانا رحمت اللہ صاحب مرحوم تھے، اس مذہبی مناظرے
میں جیسا کہ مشہور ہے، فنڈر کو شکست فاش ہوئی تھی۔ مولانا رحمت اللہ نے عربی و فارسی دونوں زبانوں
میں کافی کتابیں عیسائیوں کے موجودہ تیشی دین کی تنقید و تردید میں لکھیں، جن میں بعض مصرعیں بھی
شائع ہوئیں، بلکہ مناسبہ کہ ان کی کتاب دعوت الحق کسی زمانہ میں مصر کے دینی مدرسوں کے نصاب میں
بھی مشتمل تھی۔

البتہ مسلمانوں میں بعض غیرت مند افراد جو چند دستوں کے باضابطہ ممتاز عناصر ہیں، پوشیدہ کارانہ ہوتے تھے، لیکن انہوں نے اسلامیات کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کے دین کے متعلق بھی کافی معلومات فراہم کر لی تھیں۔ انہوں نے گویا اس زمانہ میں پادریوں سے جیسے جیسے مناظر دی کو اپنا پیشہ بنالیا تھا، جن میں وہی کے مولوی، مسعود علی صاحب نے خاص شہرت حاصل کی کہ جبکہ انہیں اہل غنم مناظر کے خطاب سے مسلمانوں میں مشہور ہوئے، اس زمانہ میں بعض دلچسپ افراد بھی مسلمانوں میں پیدا ہو گئے تھے، جن میں ایک صاحب نوان بن لقمان نامی بھی تھے، جو اپنے آپ کو

زبان سے بھی کہا کرتے تھے ادا ان کی ہر سہیلی بی افغان تھی۔
آج تو یہ ہے کہ جوں

کافیصلہ کھڑن اپنے ترازو کو دکھا کر کہتی ہے: اور اسی پر فتح کی تالی پٹ جاتی ہے، اس قسم کی مجلسوں میں

۱۲

سجیدگی اور متانت و وقار کی گنجائش ہی کیا تھی، گویا جیسی روح تھی، ویسے ہی فرشتے۔ ہمارے مصنف امام نے بازاری پادریوں کا ذکر کر کے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

”اسی زمانہ کے درمیان میں دہلی میں پادریوں کے وعظ کا چرچا تھا، اور مسلمانوں میں سے بعض بے چارے اپنی بہت سے ان سے مقابلہ کرتے تھے۔ کوئی اہل علم جن کا یہ کام تھا اس طرف توجہ نہ کرتا تھا۔“ ص ۲۲

اس عدم توجہ کا راز زیادہ تر یہی تھا کہ صحیح علمی طریقہ سے بحث و مباحثہ پادری کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ مخالف بازیوں، مضحکہ انگیزیوں پر ان کی ساری کاروائیوں کا دار و مدار تھا۔ لیکن بایں ہمہ اسلام، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کی تحقیر و توہین میں بھی بازاری پادری اپنی ہرزہ درائیوں، تراژخائیوں کو آخری حد تک پہنچا دیا کرتے تھے۔

سیدنا امام الکبیر کے سینے میں جو دل تھا جب تک وہی دل اور دل کا وہی درد کسی میں نہ ہو، اندازہ ہی نہیں کر سکتا، کہ حضرت والا پر ان یادہ گویوں کی ان خبروں کو سنا سن کر کیا گزر رہی تھی، کیا کیا جائے، ان دیدہ دہنوں کے منہ کس طرح بند کئے جائیں، منہ لگانے کے لائق ہوتے، تو خود ہی میدان میں اتر آتے۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ شہرِ دہلی میں جب ضبط کا یا ر نہ رہا، تو جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے۔

”مولوی صاحب (سیدنا امام الکبیر) نے اپنے شاگردوں کو فرمایا کہ تم بھی کھڑے ہو کر بازار میں کچھ بیان کیا کرو۔“

اور یہ کہ

”جہاں وہ لوگ (یعنی مسلمانوں کے وکلاء) بمقابلہ نصاریٰ بیان کرتے ہیں ان کی امداد کیا کرو۔“ ص ۲۲

یہ قصہ کس زمانہ کا ہے مصنف امام نے اس کی تصریح تو نہیں کی ہے، لیکن بظاہر یہ اسی زمانہ کی بات ہے، جب مفتی ممتاز علی مرحوم کے مطبع مجتہبائی میں ۱۲۵۶ھ کے بعد ان ہی کے اصرار سے حضرت والا نے

تقصیح کا کام اپنے ذمہ لیا تھا، اور دلی میں دوبارہ قیام آپ کا اسی تعلق سے کچھ دنوں تک رہا تھا۔ کیونکہ عموماً اسی زمانہ میں شاگردوں کا ایک گروہ آپ کے گرد جمع ہو گیا تھا۔

مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ حسب ارشاد گرامی آپ کے شاگردوں نے بھی پادریوں کے مباحثوں میں حصہ لینا شروع کیا، بات نے غالباً طول کھینچا، اور باضابطہ مناظرہ یعنی وہی مکابروہ کا چیلنج پادریوں کی طرف سے دیا گیا، اس زمانہ میں ایک کالے پادری ماسٹر تارا چند نامی کی دلی میں خاصی شہرت تھی۔ مشہور ہو کر عیسائیوں کی وکالت ماسٹر تارا چند صاحب ہی کریں گے۔ اس خبر سے لوگوں میں گو نہ تشویش پیدا ہوئی۔ خبر حضرت والا تک بھی پہنچی، حالانکہ ساری زندگی میں اس قسم کے بازاری غل غپاڑے مچانے والوں سے آدیزش کا موقعہ بھی آپ کو کبھی نہیں ملا تھا، اور آپ کی بلند علمی شان کے مناسب بھی نہ تھا، کہ اس قسم کے بازاری لوگوں کو اپنا مخاطب بنائیں۔ لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ دلی میں کسی وجہ سے اس مباحثہ کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی، حالانکہ خود اسی دلی میں عیسائیوں کے مناظرے کی امام مولوی منصور علی صاحب موجود تھے۔ موجود ہی نہ تھے بلکہ مصنف امام نے خبر دی ہے کہ مناظرہ جب ہوا، تو دنگل میں دوسروں کے ساتھ یہ امام فن مناظرہ بھی مسلمانوں کی طرف سے وہاں حاضر تھے، مولوی منصور علی صاحب کا ان الفاظ میں تعارف کراتے ہوئے کہ وہ

”فن مناظرہ اہل کتاب میں یکتا ہیں“

اور یہ کہ

”بائبل (توریت و انجیل وغیرہ) کے گویا حافظ ہیں، اور ان کا طرز مناظرہ بھی جداگانہ ہی، آپ ان ہی کے (یعنی مولوی منصور علی صاحب کے) رشتہ گرد ہوتا بلکہ پادریوں کے دہلی میں دغظ کیا کرتے ہیں“

مصنف امام نے یہ اطلاع دی ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی مولوی منصور علی صاحب سے

”اسی زمانہ سے (یعنی جس زمانہ میں یہ مناظرہ ہوا) ملاقات ہوئی“ ص ۲۲

بہر حال باز جودان تمام باتوں کے صورت حال کچھ ایسی تھی کہ خود سیدنا امام الکبیر کا فیصلہ ہوا،
 یا دوسروں نے آپ کو آمادہ کیا، کہ جس طرح بھی ممکن ہو، پادریوں کے اس مناظرہ میں حضرت دالام کی
 شرکت ضروری ہے،

اللہ اللہ جوٹے کٹے ہوئے تھا کہ اپنے آپ کو خاک میں ملا کر رہوں گا، تاکہ مجھے کوئی نہ جانیے، اور
 جو کہتا ہو کہ جانوروں کے بھی گھونسلے ہوتے ہیں، لیکن میرے لئے یہ بھی نہ ہوتا، ساری زندگی جس کی
 اسی آرزو میں تھی کہ ہمیشہ کوئی میری ہوا تک نہ پاتا، عرض کر چکا ہوں، بار بار اسی کو دہرا چکا ہوں،
 وہ جتنا گھٹنا چاہتا تھا، بڑھانے والا اسی نسبت سے اس کو بڑھا رہا تھا۔ اس نے امامت کا انکار
 کیا، امام بنا گیا۔ اس نے وعدہ گوئی سے بچنا چاہا، ہندوستان کے سحرالعیان خطیبوں میں وہی شمار
 کیا گیا، وہ پڑھتا نہیں چاہتا تھا، لیکن سارے ہندوستان بلکہ ہندوستان کے باہر بھی دینی علوم
 کے پڑھنے پڑھانے کی سنت اسی سے زندہ ہوئی، جو کسی کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا، اسی لئے
 غیر تو غیر خود مولویوں کے دائرے کے اختلافی مباحث و مسائل سے بھی اس نے بہت کم دلچسپی
 لی، لیکن آج ایک غیر مذہب کے مجادل و منکابیر کا مقابل بن کر وقت کا تقاضا ہو رہا ہے کہ وہی میدان
 میں اترے۔ بقول شخصے

کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے۔

افسوس ہے کہ سیدنا امام الکبیر کی زندگی میں پہلی دفعہ یہ صورت دئی میں جو پیش آئی تھی، جیسا کہ
 چاہئے اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ مصنف امام کے بیان سے بس اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ بہر حال
 آپ پادری تارا چند سے گفتگو کرنے پر تو آمادہ ہو گئے، شرط صرف یہ رکھی گئی، کہ نہ تارا چند ہی کو میرے
 نام اور میری شخصیت کا علم ہو، اور نہ عام پیاک کو۔ ایک عام مسلمان کی حیثیت سے میں حاضر ہو جاؤنگا
 اور جو کچھ بھی میں آئے گا، عرض کروں گا۔ مصنف امام کی سوانح عمری میں اسی مناظرے کے متعلق یہ الفاظ
 جو پائے جاتے ہیں یعنی

آخر مباحثہ کی ٹھہری اور مولوی صاحب (یعنی سیدنا امام الکبیر) بے کسی صورت و مشکل بنائے

اور اپنا نام چھپا جا موجود ہوئے۔

ان الفاظ سے یہی سمجھیں آتا ہے، آگے وہی اسی پادری تارا چند کا ذکر ان الفاظ میں کر کے کہ
 ”ایک پادری تارا چند نام تھا۔“

وہی سامنے آیا، زور ٹے رٹا سنے اختر، ان کی فہرست جیسا کہ دستہ تھا، اسی کا آموختہ منانے لگا،
 جواب دینے کے لئے مسلمانوں کی طرف سے ایک ایسا آدمی کھڑا ہوا، جو اپنی شکل صورت سے مولوی
 بھی معلوم نہ ہوتا تھا، اور نہ پادریوں سے بحث و مباحثہ کرتے ہوئے دلی دالوں نے کبھی اس کو دیکھا تھا،
 خود تارا چند پادری کے لئے بھی اس کی شخصیت اجنبی تھی، جو اپنی تقریر جس وقت ختم ہوئی، جیسا کہ چاہی
 تھا، مجلس پر سناٹا چھایا ہوا تھا مصنف امام کی خبر کے الفاظ میں کہ

”اس سے (یعنی تارا چند پادری سے) گفتگو ہوئی، آخر وہ بند ہوا، اور گفتگو سے بھاگا۔“ ۲۲

امام فن مناظرہ مولوی منصور علی صاحب کا سیدنا الامام البکیر سے تعارف نہ تھا۔ قدس تاتقریر اور جواب
 کے نئے رنگ نئے ڈھنگ کو دیکھ کر حضرت سے آکر ملے، ظاہر ہے کہ ان سے اپنے آپ کو
 چھپانے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی حضرت والا اور مولوی صاحب سے پھر دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے،
 ان کو بڑی خوشی ہوئی، کہ ان کی پشت پناہی کے لئے ایک غیر معمولی علمی توت میسر آگئی۔ آئندہ بھی
 ان کا ذکر آئے گا۔

دوسری خدا داد ودیعوں کے ساتھ سیدنا الامام البکیر کی ”فطرت فائتہ“ اور ”حجیہ بدیعہ“ کا ایک
 نیا پہلو تھا، جو پہلی دفعہ تارا چند پادری سے گفتگو کرنے کے بعد دلی کے مسلمانوں کے سامنے آیا،
 صحیح طور پر دلی کے اس پہلے مباحثہ کی تاریخ تو معلوم نہ ہو سکی، لیکن عرض کر چکا ہوں کہ قرآن اقتصاد
 یہی ہے، کہ مشائخ کے خلفشار کے فرو ہونے کے بعد جب گو نہ اسن اور اطمینان کا ماحول ملک میں پیدا
 ہوا، اسی زمانہ کی یہ بات ہے،

ادھر پادریوں کے رد و قدح، بلکہ اسلام کی تحقیق و تدوین، اور مسلمانوں کی دل آزادی، اذیت سانی
 کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ان ہی کی دیکھا دیکھی، جہاں تک میں جانتا ہوں، مراد آباد کے ایک گنہگار آدمی

ہندوستان میں جو تھوڑی بہت اردو فارسی زبانوں کے ذریعہ اسلامی تعلیمات اور روایات کا مطالعہ کر سکتے تھے، ان کے دل میں بھی ہلک اٹھی، اور مسلمان جنہوں نے اپنے ایام حکومت میں آج تک ہندوؤں کے دین اور دھرم کی تنقید یا تردید، جرح و اعتراض کو موضوع بنا کر نہ کوئی مستقل کتاب ہی لکھی تھی، اور اپنی محدود معلومات کی بناء پر یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ضمناً بھی اس قسم کی باتوں کا تذکرہ ان کی کتابوں میں مشکل ہی سے کیا گیا تھا۔ بلکہ برعکس اس کے کافی ذخیرہ ایسا موجود ہے، جس میں ہندوؤں کے دین و آئین کے متعلق ہمدردی اور حسن ظن ہی کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ابوالفضل کی آئین اکبری ہی میں نہیں، بلکہ نقشبندیہ طریقہ جو اتباع سنت اور دینی صلابت میں تمام دوسرے صوفیانہ طریقوں میں ممتاز سمجھا جاتا ہے، جس رنگ کو حضرت مجدد الف ثانی کی مجددیت نے بہت زیادہ نکھا کر چمکا دیا ہے، اسی نقشبندی مجددی طریقہ کے سرخیل حضرت مرزا جان جاناں اور ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہم جیسے بزرگوں کے کلام میں ڈھونڈھنے والوں کو آج بھی اس سلسلہ میں بہت کچھ مل سکتا ہے، جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

کچھ بھی ہو، دوسرے ادیان و مذاہب کے ماننے والوں کی دل آزاری، اولاً اسلامی دین کی روح کے بھی خلاف ہے، اور مسلمان مصنفوں نے اس روح کی رعایت کسی اور مذہب و دین کے ساتھ کی ہو یا نہ کی ہو، لیکن ہندو دھرم کے ماننے والوں کو انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اس باب میں مسلمانوں کے مشکلات کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، اس قوم سے مسلمانوں کا تعلق تقریباً ہزار سال سے قائم ہے، اور تعلق بھی حاکمیت و حکومت کا، لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، عام طور سے ہمارے مصنفین اس سلسلہ میں احتیاط ہی سے کام لیتے رہے، اور مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے، کہ جب تک مسلمانوں کا دور حکومت ہندوستان میں رہا، شاید ہندو مصنفین نے بھی اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ناگوارانہ کلمات کے استعمال سے پرہیزی کیا، کم از کم میری واقفیت یہی ہے، جن زبانوں سے میں واقف نہیں ہوں، ان میں کچھ کہا گیا ہو۔ تو یہ الگ بات ہے۔

پہلی دفعہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی چھیڑ چھاڑ، ٹوک جھونک کا مسئلہ بظاہر ہی معلوم ہوتا ہے،

۱۱۲
۱۱۳

عزیزان سے طلب کیا گیا۔ لکھتے ہیں کہ مقدمہ کی اپیل کی گئی، اور جج نے برمانہ کے متعلق فیصلہ میں لکھا کہ ”چونکہ وہ (اندھن) غریب ہے اس لئے چار سو روپے مواف کئے گئے،“ جرم اس پر ثابت ہے، اس لئے سزا روپے بجا لے رہے۔

ممکن ہے کہ اندھن جیسے کچھ دوسرے ناپربسان حال گناہ لوگوں کی طرف سے بھی اسلام کے خلاف تقریر یا تحریر ابولہئے یا لکھنے کا سلسلہ نئی حکومت اور نئے قانون کی وجہ سے ہلادی رہا ہو لیکن جہن تک میں جانتا ہوں، اس ملک کے عام آبادکاروں میں نہ کسی قسم کی پلچل ہی پیدا ہوئی، اور نہ عوام کی توجہ ہی ان مذہبی جھگڑوں رگڑوں کی طرف جیسا کہ چاہئے منعطف ہوئی۔

مگھوں ہی کہہ رہا نے پندتوں کے اس حلقہ سے نکل کر جس کا سب سے بڑا مشغلہ ہندوؤں کے مختلف فرقوں کے عقائد اور طہارت کے منڈن اور کھنڈن، نانید و تردید کے سوا اور کچھ نہ تھا، اچانک اسی حلقہ کے محدود دائرہ سے نکل کر یورپ، امریکہ کی تھیا سوفیکل سوسائٹیوں کے گروہ حاکم کی شہرت کے ساتھ میدان میں پندت دیا ند مسرتی جی تشریف لائے۔ جن کو ہندوؤں کے بڑے بڑے سرکاری حکام اور لیڈروں کی سرپرستی بھی حاصل تھی، اور اچانک وہی جو ابھی چند دن پہلے وشنو مت کے مقابل میں ہندوؤں کے شیو مت والے فرقہ کی حمایت میں اپنے علم اور بیانی قوت کا زور دکھا رہے تھے۔ ان کو دیکھا گیا کہ دنیا کے سارے مذاہب ادیان کے ماننے والوں پر برس رہے ہیں، ان کے مذاہب کی بھی اور ان کو پیشواؤں کی بھی دھجیاں بکھیر رہے ہیں۔

نہ گھروالوں کو چھوڑتے ہیں اور نہ باہروالوں کو، ایک طرف ہندوستان کے مقامی مذاہب سائق دھرم، جین مت، بودھ مت والوں کو جو جی میں آتا تھا کہتے چلے جاتے تھے، اور دوسری طرف یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی کتاب قرآن اور ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں پتختاشا ایسے الفاظ استعمال کر رہے ہیں، جنہیں ان سے پہلے نہ کانوں نے سنا تھا، اور نہ نگاہوں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا، دنیا دم بخود تھی، بکھر میں نہیں آ رہا تھا، کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اور کیوں ہو رہا ہے، مسلمان اور ہندو

لفظ منقول از بنائے شامتر غازی محمود دھرم پال ۱۹۵۹ انہوں نے یہ الفاظ دیا ند جی کی سوانح عمری سے نقل کئے ہیں ۱۲

تو خیر مجبور تھے، معذور تھے، نہتے تھے، لیکن جس قوم کے ہاتھ میں ہندوستان کی حکومت کی باگ تھی، اسی حکومت کے اس شاہی فرمان کی سیاہی بھی شاید ابھی خشک نہ ہوئی تھی، جس میں دقت کے حکمران نے اپنے آپ کو عیسائی مذہب کی پشت پناہ قرار دیتے ہوئے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ

”ہم کو مذہب عیسائی کے صدق کی نسبت یقین کئی حاصل ہے اور جو تسلی خاطر اس سے ہوتی ہے، اس کا کمال شکر گزاری اعتراف ہے۔“

۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد ملکہ وکٹوریہ کا جو عام فرمان باشندگان ہند کے نام شائع ہوا تھا۔ یہ فقرہ اسی میں موجود ہے، مگر بایں ہمہ خدا ہی جانتا ہے، کہ پنڈت جی کو آزادی کا ایسا پروانہ کیسے اللہ کہاں مل گیا تھا کہ اسی عیسائی مذہب اور اس مذہب کے پیشواؤں کے متعلق وہ ایسی باتیں نہ صرف عام جموں میں کہنے پر جری تھے، بلکہ لکھ کر چھاپتے تھے، جنہیں نقل کرتے ہوئے آدمی کی انگلیاں کانپنے لگتی ہیں، آج بھی متیار تھ پرکاش میں وہ موجود ہیں۔ لیکن وہی حکومت جو غریب اندھین کی کتابوں کو معمولی ایک اخبار جام جمشید نامی کے مطالبہ پر ضائع کر چکی تھی اسی کے کان پر جو بھی نہ رہتی۔ حالانکہ یہ کتاب ہندی اردو گورکھی، اندانگریزی زبان میں مسلسل شائع ہوتی رہی۔

۱۷ شلا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر لکھا گیا ہے کہ ”وہ غصہ برد تھا..... اس کی جنگی آدمیوں کی اسی فہمیت تھی“ یا یہ نام ممکن باتیں یسوع کی جہالت پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر اسے (یعنی یسوع) کو کچھ بھی تمیز ہوتی تو ایسی پھر بوج دھیانہ باتیں کیوں کہتا۔“ یا یہ کہ ”یوسف بخار بڑھتی تھا، اس لئے عیسیٰ بھی بڑھتی تھا، کئی ایک برس تک بڑھتی کا کام کرتا رہا بعد، پیغمبر بنانا خدا کا بیٹا بھی بن بیٹھا“ یہ اور اسی قسم کے الفاظ حضرت مسیح علیہ السلام کی شان میں استعمال کئے گئے ہیں، اسی طرح موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام لے کر لکھا ہے، اس کا چال چلن غصہ وغیرہ بصفات سے پر ہے، وہ انسان کی جان کشی کرنے والا جو چور کے مانند بدکار سزا سے گریز کرنے والا تھا،.... درد لگے بھی ضرور ہو گا“ العیاذ باللہ ”زنا کار“ تک کا لفظ ان کے متعلق استعمال کیا گیا ہے، عیسائی مذہب کو ردی مذہب لمبے چوڑے گھوڑے پھر عیسائی مذہب، وحشیانہ مذہب، یہ سب جابلوں کی باتیں ہیں، بجز خدا ایک کے تمام خرافات سے بھرا ہوا، حد یہ ہے کہ عیسائیوں کے خدا تک کو نہ چھوڑا گیا۔ ”وہ ایک گوشت خور شرمزدادی کے مانند ہے۔ متیار تھ پرکاش کے باب میں یہ سارے الفاظ آپ کو مل جائیں گے۔ دل پر جبر کے خرواہ سے چند انے مشکل مجھ سے چنے گئے۔“

۱۸۱۶ء تک بیان کیا جاتا ہے کہ ایک لاکھ پینتالیس ہزار نسخے مختلف زبانوں میں اس کتاب کے شائع ہو چکے تھے، ہندی ادیشن گیارہ مرتبہ اردو ادیشن دس مرتبہ انگریزی چار مرتبہ گورکھی چار مرتبہ اس وقت تک چھپ چکا تھا۔ ۱۲

یوں تو پنڈت جی کے لکچروں کا یہ سلسلہ کئی سال سے جاری تھا۔ ہندوؤں اور عیسائیوں وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مناظرے اور مباحثے بھی ہوتے تھے۔ مناظرے اور مباحثے کے سلسلہ میں مدراس کے رہنے والے ڈاکٹر مرڈک ایم، اے نے اپنی کتاب ”ویدک ہندو ازم اینڈ آریہ سماج“ میں پنڈت جی کے طریقہ کار کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ

”مباحثہ میں ان کا (یعنی سوامی دیانند کا) طریقہ یہ تھا کہ تعریف کرنے والوں کی ایک منڈلی اپنے ساتھ رکھتے تھے، جب وہ باؤا زبیلند اپنے مخالفین کی ہنسی اڑاتے اور تہقہ لگاتے تھے، تو اس کام میں یہ لوگ (منڈلی والے) ان کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔“
(منقول از سوامی دیانند اودھ ان کی تعلیم)

لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، پنڈت جی کی کتاب ستیا رتھ پرکاش ۱۸۵۵ء عیسوی مطابق ۱۲۹۲ء میں بنارس سے شائع ہوئی، اور جو کچھ پنڈت جی زبانی اپنی تقریروں میں اب تک کہتے پھرتے تھے، اسی نے مستقل تحریری لباس بھی پہن لیا، حکومت میں اس کی رجسٹری بھی کرائی گئی تھی، راجہ جے کرشن داس سی، ایس، آئی کے دستخط سے اسی اڈیشن میں یہ عبارت چھپی ہوئی ہے

”میری اور سے اس پستک کی رجسٹری قانون ۱۸۵۷ء کے انوسار ہوئی ہے، سوائے میرے دوسری آگیا کے اس پستک کے چھاپنے کا کسی کو ادھیکار نہیں ہے۔“

اسی سال اور یہ کتاب شائع ہوئی، اور ٹھیک اسی سال یعنی ۱۲۹۲ء مطابق ۱۸۵۷ء میں ایک عام اعلان اخباروں میں بھی کیا گیا، اور علیحدہ اشتہارات بھی مختلف زبانوں میں تقسیم کئے گئے، عنوان تو ان اعلانوں اور اشتہاروں کا تھا

”میلہ خدا شناسی“

اصل مضمون تو مجھے نہ مل سکا، خلاصہ اس کا جیسا کہ کتاب ”گفتگوئے مذہبی میں لکھا ہے، یہ تھا کہ ”پادری نولس صاحب انگلستانی، پادری شاہ جہاں پور، اور منشی پیارے لال کبیر پتھی ساکن موضع چاندا پور متعلقہ شہر شاہ جہاں پور سے مل کر ۱۸۵۷ء میں ایک میلہ بنام میلہ خدا شناسی

موضع چانداپور میں جو شہر شاہجہاں پور سے چھ کوس فاصلہ پر لب دریا واقع ہے، مقرر کیا اور تاریخ میلے مئی ٹھیرائی۔ ص ۲

یہ پادری نولس صاحب انگلستانی اور منشی پیارے لال کبیریتھی کون تھے، دونوں کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی، مختصر لفظوں میں اس کی کچھ تفصیل ”مباحثہ شاہ جہاں پور“ نامی رسالے میں جو کچھ لکھی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ پادری نولس صاحب درحقیقت شاہ جہاں پور کے مشن اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، ہیڈ ماسٹری کے ساتھ ساتھ مشن کا کام بھی شاہ جہاں پور کے اطراف و نواح کی آبادیوں میں گھوم پھر کر کیا کرتے تھے، اسی سلسلے میں ”چانداپور“ جو شاہ جہاں پور کے متصل قصبائی آبادی تھی، وہاں بھی پادری صاحب کا وعظ ہوا کرتا تھا۔ چانداپور کے ایک خوش حال اندوخش باش باشندے منشی پیارے لال صاحب جو کبیریتھی تھے، ان کی تقریروں میں شریک ہوا کرتے تھے، پادری صاحب اور منشی جی میں تعارف پیدا ہوا، میل جول بڑھا، پادری صاحب کے توسط سے معلوم ہوتا ہے، کہ انگریز حکام تک بھی منشی جی کی رہائی ہونے لگی۔ صاحب رسالہ نے لکھا ہے، کہ

”پادری صاحب کی ملاقات سے ان کی عزت و توقیر بھی بڑھ گئی“ ص ۳

غالباً ان الفاظ سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کچھ اس کا بھی پتہ چلتا ہے، کہ منشی پیارے لال نے عیسائی دین تو قبول نہیں کیا، لیکن پادری اس حد تک ان کو متاثر کرنے میں غالباً کامیاب ہو چکے تھے، کہ منشی پیارے لال کے

”غیر خواہوں نے دیکھا کہ منشی صاحب اپنی حالت دیرینہ کی طرح اپنے آبائی عقیدہ کو بھی پارینہ سمجھنے لگے۔“ ص ۳

الغرض بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو پادری نولس صاحب کی تحریک اور کچھ منشی پیارے لال کے احباب اور دوستوں کے مشورہ سے طے پایا کہ چانداپور کے متصل منشی پیارے لال کی زمینداری میں ایک گاؤں سارنگ پور نامی میں جہاں بقول مصنف رسالہ ”مباحثہ شاہ جہاں پور“ منشی جی کی

”ملوکہ زمین اور یاغات“

تھے، اور ان کی اسی ملوکہ زمین و باغات کے درمیان ایک بڑی ندی بہتی تھی جس کا نام اسی رسالہ میں
 ”دریائے گرا“

بتایا گیا ہے، اسی ندی کے کنارے

”میلہ خدا شناسی“

کے نام سے ایک میلہ کیا جائے اور یہ کہ علاوہ عام لوگوں کے خصوصیت کے ساتھ جیسا کہ اسی رسالہ میں ہے
 ”علماء مذاہب مختلفہ کا مناظرہ ہو“

خدا شناسی کے اس میلہ جانے کا بظاہر مقصد تو یہ رکھا گیا کہ علماء مذاہب مختلفہ کے باہمی مشاعرہ و
 مباحثہ سے

”تحقیق مذہب بھی ہو جائے گی“

یعنی دنیا کے مروجہ مذاہب میں سچا مذہب ”جو نشی جی“ کے لئے قابل تسلیم ہو، اس کا پتہ بھی مل جائے گا،
 مگر ظاہر ہے کہ زمیندار طبقہ کے ایک سرمایہ دار آدمی کے لئے صرف یہی وجہ کافی نہیں ہو سکتی تھی، ایسے علماء
 ہوتا ہے، کہ مستقبل میں میلہ کا سنہراغ بھی ان کو دکھایا گیا، شاید باور کرایا گیا کہ بیسیوں میلے ہندوستان میں
 معمولی معمولی بنیادوں یا حیلوں پر جتے ہوئے بالآخر عظیم الشان میلوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اپنی تہی
 شور زمینوں کو ان ہی تدبیروں سے لوگ ”بہشتی قطعہ“ اسی زمانہ میں بنا رہے تھے۔

”اس میلہ سے کچھ امد فائدہ کی صورت ہوگی“

منشی جی کے خیر خواہوں کے مشورے کا یہ جزو جسے ”مباحثہ شاہجہانپور“ والے رسالہ کے مصنف نے نقل کیا
 ہے۔ اس سے تو کچھ بھی سمجھ میں آتا ہے۔

کچھ بھی ہو، میلہ کی پہلی روداد جو میرٹھ کے مطبع ضیائی کے کارپردازوں محمد ہاشم علی اور محمد حیات صاحبان
 کی مرتب کی ہوئی ہے، اور گفتگوئے مذہبی یا ”واقعہ میلہ خدا شناسی“ جس کا نام رکھا گیا تھا، اس میں اگرچہ منشی
 پیالے لال کے متعلق لکھا ہے کہ

”دولت مند اور وہاں کے (یعنی چاندپور کے) رئیس ہیں۔“ ص ۱۷۱

تاہم ان کی طرف سے میلہ کے قیام کا انتظام ہی نہیں، بلکہ جیسا کہ اسی رسالہ میں خبر دی گئی ہے کہ ”سب کو کھانا اور خیمے وغیرہ انہیں (یعنی منشی پیرائے لال) کی طرف سے ملے گا۔“

اس خبر میں ”سب“ کا لفظ اگرچہ حد سے زیادہ محمل ہے۔ ہر وہ شخص جو میلہ میں شریک ہوا تھا سب کو کھانا منشی جی کی طرف سے دیا جاتا تھا، اس کو واقعہ قرار دینا تو مشکل ہے۔ لیکن ”سب“ کے لفظ کو مناسب کے نمائندوں ہی کی حد تک محدود رکھا جائے، تو ان کی تعداد بھی کافی تھی۔ مسلمانوں کے جن نمائندوں کا ذکر اس رسالہ میں اجزورت کیا گیا ہے، میرے خیال میں بیس پچیس تک تو ان ہی کی تعداد پہنچ جاتی ہے، اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ پادریوں کا بھی کافی مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ منشی جی خود ہندو تھے۔ قدرتا ہندو مذہب کے نمائندوں کی تعداد بھی چاہئے تو یہی کم نہ ہو، میلہ دو دن تک رہا، ایسی صورت میں ناشتہ نہ ہی کم از کم کھانا سب مہانوں کے چار وقت تو ضرور کھلایا گیا ہوگا۔ دودھ ای سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی نمائندوں کے سوا دوسرے ہندو مسلمان معزز مہان بھی میلہ میں موجود تھے، جن میں عدالت کے وکلاء اور حکومت کے حکام مثلاً ڈپٹی کلکٹر وغیرہ بھی تھے چاندپور کی بستی شاہ بہان پور کے شہر سے لکھا ہے کہ

”پانچ چھ کو س کے فاصلہ پر لب دریا واقع ہے“

موتو وغیرہ سربراہ السیر سوار یوں کا زمانہ تھا کہ میلہ میں شریک ہونے والوں کے متعلق یہ توقع کی جائے کہ کھانا کھانے کے لئے شہر چلے آتے تھے۔ اسی لئے کم و بیش میرا تخمینہ یہی ہے کہ تین چار سو آدمیوں کو فی وقت منشی جی کو کھانا کھلانا پڑا ہوگا۔ مہان بھی معمولی لوگ نہ تھے۔ دستور کے مطابق کچھ نہ کچھ تکلف ہی سے کام لیا ہوگا۔ پھر مزید برآں خیمہ و خرگاہ اور دوسری قسم کی آسائشوں کی فراہمی میں منشی جی پر چاہئے تو یہی کہ کم مائی بارعائد نہ ہوا ہوگا، اسی سے سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ میلہ کے پیچھے محرکات معمولی نہ تھے، اب یا یہ مان لیا جائے کہ ”تلاش حق“ کا کوئی غیر معمولی جذبہ منشی جی میں اشتعال پذیر ہوا تھا، جس سے اس درجہ متلو ہو گئے تھے کہ خرچ کے متعلق کم و بیش کا سوال ہی ان کے سامنے باقی نہ رہا تھا، اگرچہ آئندہ ان کے جس طرز عمل کا ذکر رہا ہے اس سے اس خیال کی چنداں تائید نہیں ہوتی، یا پھر مادی منافع کا جو سبز باغ ان کو دکھایا گیا تھا، ان منافع کی امید پر بطرز جو پار یا تجارتی کاروبار کے ان مصارف کا بار انہوں نے اٹھایا تھا،

بہر حال کئی شہادتوں کی حد تک تو بس ان ہی دو باتوں کا پتہ چلتا ہے، اور دلیل و شہادت کے بغیر کسی تیسرے احتمال کے اظہار کی جرأت کیسے کی جائے۔

دوسرے میلہ کی روداد سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے، کہ ”یہ میلہ“ حکومت کے استخراج اور رضا مندی سے منعقد کیا گیا تھا، اسی روداد میں جس کا نام ”مباحثہ شاہ جہاں پور“ ہے، سیدنا امام اکبر کے ایک تلمیذ سعید مولنا فخر الحسن گنگوہی کے قلم کی مرتب کی ہوئی یہ روداد ہے، اسی میں لکھا ہے، کہ منشی پیارے لال صاحب نے

”مسٹر رابرٹ جارج گری صاحب بہادر گلشٹر و مجسٹریٹ شاہ جہاں پور سے اجازت حاصل کر کے پارسال (یعنی ۱۸۷۷ء) میں کو جس شباب کی گرمی میں یہ میلہ منعقد کیا گیا، صرف اجازت ہی نہیں بلکہ نظم و ضبط کی تمام ضرورتوں کے لئے پولیس کے سوا اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ کرسیوں، منڈھوں وغیرہ کا انتظام بھی غالباً حکومت ہی کی طرف سے کیا گیا تھا،

الغرض شاہ جہاں پور کے مشن اسکول کے انگریز ہیڈ ماسٹر جناب پادری نولس صاحب کی ابتدا اور مسٹر رابرٹ جارج گری گلشٹر شاہ جہاں پور کی اجازت و رضا مندی اور ان کی اخلاقی و قدرے مالی امداد سے یہ میلہ دریاے گنگا کے سانگے گاؤں میں منعقد ہوا، اسی ہی دو ابتدائی اور انتہائی قوتوں کے درمیان چاند پور کے رئیس اور دولت مند منشی پیارے لال صاحب تھے، جن کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ پادری نولس کی دوستی کی بدولت حکومت میں عزت و توقیر حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

قابل توجہ اور مستحق فکر و نظر یہ سب بھی ہے، جیسا کہ مولنا فخر الحسن صاحب گنگوہی نے کچھ اشارہ بھی کیا ہے کہ پہلی دفعہ میلہ کے انعقاد کی تاریخ ۱۷ مئی مقرر کی گئی، جب بقول ان ہی کے ہندوستان میں گرمی کے شباب کا زمانہ ہوتا ہے، گرمی بھی صوبہ بونہ پی کے بالائی اضلاع یعنی روہیل کھنڈ کی

۱۔ میلہ خدا شناسی نامی وادی روداد میں لکھا ہے کہ تقریباً دو اڑھائی سو کرسیاں وغیرہ اس زمین میں مباحثہ ہوتا تھا، علامہ بھگتی گیس ۲۲۰ جن زمانہ کی یہ بات ہے امداد عام تمدن اس ملک کے باشندوں کا جو تھا اسکو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ شہر سے دو ایک صحرائی مقام میں حکومت کی امداد کے بغیر دو اڑھائی سو کرسیاں کسی اجلاس میں مہیا ہو سکتی تھیں ۱۲

موسم بھی گرم اور مسلمانوں کی آبادی کے لحاظ سے نسبتاً خون کی گرمی اس گئے گذرے زمانے میں بھی ناقابلِ توجہ نہیں ٹھہرائی جاسکتی۔ امیر الامراء نجیب الدولہ اور حافظ الملک رحمت خاں اور محمد علی خاں و ہیلہ کے سرحدی چٹھانوں کی نو آبادی جو ان ہی کے قومی نام کی طرف منسوب ہو کر رو سیل کھنڈ کھلانے لگی تھی، گذرے ہوئے دنوں کی گرمی کے سوا چند سال بھی تو نہیں گذرے تھے کہ شہر میں سب سے زیادہ اہلِ کاتجربہ اسی علاقہ کے مسلمانوں کے بجھے ہوئے خون میں حکومت کو ہوجکا تھا۔

قدرتاً یہ سوال دلوں میں اگر پیدا ہو کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مناظرہ اور مباہلہ تو خیر کوئی نئی بات نہ تھی، ہندوستان کے مختلف مقامات میں اس میلہ سے پہلے ان دونوں نہ ہی جماعتوں میں کافی مقابلے ہو چکے تھے۔ شاید کوئی شہر بلکہ قصبہ اس زمانہ میں ایسا ہوگا، جس میں پادریوں کے پنجدہ آزمائی کے لئے مسلمانوں میں بھی کچھ افراد نہ پائے جاتے ہوں، عرض ہی کر چکا ہوں کہ اپنی ترازو کے وزنی پلڑے کو دکھا کر کھنڈ نہیں تک پادریوں کے اعتراض کے جواب پر اس زمانہ میں جبری ہو چکی تھیں، مولوی نعمان بن لقمان وہی جو اپنے آپ کو ”وکیل سرکار ابد قرار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ کے نام سے مشہور کئے ہوئے تھے ان کا شعر

معاذ اللہ فرزندِ خدا کہتے ہو عیسائی کو

تو دادا کون ہے ان کا بتائے جس کا جی چاہے

پادریوں کا مذاق اڑانے کے لئے زبان زدِ عام ہو چکا تھا۔ اس نوعیت کے بیسیوں لطیفے نقل کئے

ملہ صرف یہی نہیں بلکہ اسی رسالہ واقعہ میلہ خفا شناسی میں یہ لکھتے ہوئے ”گزگرمی کا موسم تھا، گرمی ہی کا وقت تھا“ یہ اطلاع دی ہے کہ ”مکان جلسہ ایک صحرا شہر سے دور سایہ کے لئے خیمہ یا دھت آج میں کاسایہ آدھا، آدھی دھوپ، غرض نہ پیش سے بچنے کا کوئی عمدہ سامان نہ لو سے بچنے کے لئے کوئی مکان۔ ص ۳۱

۳۱ بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیری قدس اللہ سرہ العزیز سے خاکسار نے سنا تھا کہ مملکت میں بھی ایک دفعہ پادریوں اور مسلمانوں کے مولویوں سے مقابلہ کی ٹھہری، طے ہوا کہ بند کمرے یا ایسے مکان میں جلسہ ہو۔ جہاں عوام کی رسائی نہ ہو، طرفین کے لوگ جمع تھے، باہر ایک دربان مقرر کر دیا گیا تھا کہ آنے والوں سے نام پتہ پوچھ کر پہلے اندر کے لوگوں کو اطلاع دے، تب جلسہ میں شرکت کی اجازت دی جاتی تھی، بجز مشہور پادریوں اور مولویوں کے اس اجلاس میں دوسرے شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ اتنے میں عربی لغت کی مشہور کتاب انتہی الادب کے مصنف (باقی اگلے صفحہ پر)

جاتے ہیں۔ گویا لوگ مولویوں اور پادریوں کی چھیڑ چھاڑ کے عادی ہو چکے تھے۔ اب اس میں کوئی نکتہ وحدت باقی نہ رہی تھی، برعکس اس کے منشی پیارے لال کا یہ میلہ جو اپنے موضوع بحث کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ تھا۔ ”مذہب وادیان کی تحقیق“ کے لئے بھی یہ میلہ جلا یا جاسکتا تھا، بجائے خود یہ ایک اچھوتا خیال اور نیا اقدام تھا، اور اس سے بھی زیادہ اہم خصوصیت اس میلہ کی یہ تھی کہ دو فریق، مسلمانوں کے مولوی اور عیسائیوں کے پادری میں اب کی مقابلہ نہ تھا، بلکہ بقول مصنف رسالہ ”واقعہ میلہ خدا شناسی“ کہ اس مذہبی میلہ یا مناظرہ کی مجلس میں

”مناظرہ کرنے والے تین فریق قرار پائے تھے، مسلمان۔ عیسائی۔ ہندو۔“ ۵

جہاں تک میں جانتا ہوں، ہندوستان کو وطن بنانے کے بعد مسلمان اس ملک میں جس زمانہ میں آباد ہوئے تھے، صدیوں پر صدیاں گزر چکی تھیں، لیکن تاریخ کے اس طویل عہد میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہب اور دین کے موضوع پر اس قسم کے مناظرے اور مباحثے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اسی زمانہ میں نہیں جب اس ملک کی حکمرانی کا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، بلکہ محکوم بن جانے کے بعد اور جو صورتیں بھی ان کے ساتھ پیش آئی ہوں لیکن فریق بن کر مسلمانوں کے دین پر اعتراض اور تنقید کرنے اور ان کے مولویوں سے مناظرہ و مباحثہ کرنے کے لئے ہندو کسی مجلس میں اب تک کھڑے نہیں ہوئے تھے۔ مراد آبادی پنڈت اندرسن کے قصبے میں صرف رسالوں اعلیٰ کتابوں کی حد تک محدود تھے، اور پچھلے دنوں سے پنڈت یا نادر سمرسوتی جی نے اپنی تنقیدی یا تحقیری زور آزمائیوں کے سلسلہ میں مسلمانوں اور ان کے دین کو بھی جو گھسیٹ لیا تھا، تو تنہا پیش قاضی دہلی دہلی لکھی، ہی کی حد تک ان کے تقریری و تحریری ہنگامے محدود تھے، باوجود مناظرہ کی کسی مجلس میں پنڈت جی کا مسلمانوں اور ان کے علماء سے مقابلہ کی نوبت میرا ظم یہی ہے کہ ابھی تک

۱۲۷ صفحہ ۷۷) مولوی عبدالرحیم صفی پوری جو اپنی سندھ زندگی اور علمی و صوفی میں بدنام بھی تھے، یہ بھی پہلے ”دبان“ نے نام اور پتہ پر چھاپا کہ ”سچ کا نام“ چوں کہ یہی جگہ انہوں سے کہہ دیا کہ ”دبان“ تو آگے روانہ ہوا، اور مولوی عبدالرحیم اس کے پیچھے پیچھے بغیر اجازت و راتے چلے گئے ”دبان“ نے جلسہ میں کہا کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو مسیح کا دادا کہتا ہے، آنے کی اجازت چاہتا ہے، پادریوں میں غل جھا۔ مولوی عبدالرحیم ساتھ ہی گئے آ رہے تھے، نہایت اطمینان سے کہنے لگے، جب مسیح کا باپ ہو سکتا ہے تو دادا میں کیا خرابی ہے، زندہ کا تہقید ۱۲۸

نہیں آئی تھی، اور تاریخ میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ ہندو کو بھی مسلمانوں کے مقابلہ میں دریا گئے گرا کر ساحل پر منعقد ہونے والے اس صحرائی میلہ میں کھڑ کیا گیا تھا۔

ایسی صورت میں یہ دوسو سالوں میں اگر پیدا ہو، کہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں اس میلہ کے لئے جس میں پہلی بار مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو ایک دینی فریق بن کر شریک ہو رہے تھے روہیلکھنڈ ہی کا انتخاب کیوں کیا گیا، اور فرض بھی کیا جائے کہ منشی پیارے لال جیسے فیاض، مہمان نواز، سیر چشم رئیس بجز چاند پور کے اور دوسری جگہ نہیں مل سکتے تھے۔ لیکن مناظرے کے لئے بجائے سحرانی علاقہ کے منشی جی کے وطن چاند پور کا مستقر ضلع شاہ جہاں پور میں کیا ایسا میدان یا ایسی جگہ نہیں مل سکتی تھی جہاں اس میلہ کو منعقد کیا جائے۔ شہر ہونے کی وجہ سے چو آسانیاں شریک ہونے والوں کو میسر آ سکتی تھیں۔ یقیناً سارا نگپور جیسے کوڑھ گاؤں میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چاند پور سے شاہ جہاں پور کا فاصلہ بھی زیادہ نہ تھا۔ گویا شہر کی نواحی آبادی ہم اس کو کہہ سکتے ہیں۔ سنی جی اپنے قصبہ سے شہر میں ضرورت کی چیزیں آسانی سے حاصل کر سکتے تھے۔ جیسے سارا نگپور تک آ کر ان کی کو چیزیں پہنچانی پڑیں۔ صحیحاً بے چارے مسلمان لڑنے مرنے کے مسئلہ میں یوں ہی بدنام ہیں، اور جیسا کہ اسی سالہ واقعہ میلہ خدا شہی کے مصنف نے ایک موقع پر لکھا بھی ہے کہ پادریوں میں شہر بھی تھا کہ

”مسلمانوں کو جواب نہیں آتا، لڑنے کو دوڑتے ہیں“ ۱۹

مسلمانوں پر اس الزام کی شہرت پادریوں ہی کے حلقہ تک محدود نہ تھی، بلکہ خود پنڈت دیانند جی بھی مسلمانوں کی طرف اسی قسم کی زیادتیوں کو منسوب کیا کرتے تھے۔ رڈکی میں پنڈت جی اور سید اللہ امام الکبیر کے درمیان جو واقعات پیش آئے ہیں جن کی تفصیل اپنے موقع پر آگے آرہی ہے، اس موقع پر بھی پنڈت جی نے رڈکی چھاؤنی کے مجسٹریٹ کے سامنے کہا تھا کہ مسلمانوں سے مجھے ”فساد کا خوف ہے“

۱۹ حضرت مولانا تھانوی رح کے والد سے رڈکی کی مرگہ منت قصص کا کتابیں درج کی گئی ہے۔ یہ فقرہ پنڈت جی کی طرف اسی میں منسوب کیا گیا ہے۔ ۲۰

رسالہ ترکی بہ ترکی میں بھی پنڈت جی کے متعلق لکھا ہے کہ

”فساد کا کھٹکا زبان پر آتا تھا“ ۳۷۱

بہر حال لڑنے کو دوڑنے، یا فساد برپا کرنے کے یہ الزامات جو مسلمانوں پر لگائے جاتے تھے بجائے خود ان کی نوعیت کچھ ہی ہو، لیکن پادریوں، اور ہندوؤں دونوں کے دلوں میں کچھ بھی خطرہ اگر اس کا تھا، تو حیرت ہوتی ہے، کہ اس خطرہ کے باوجود بقول اسی رسالہ ترکی بہ ترکی کے مصنف کے ”فساد ہوتا تو چاند پور میں ہوتا، جہاں کی بات کی حکام کو خبر بھی ہوتی تو بدیر ہوتی“ ۳۷۲

لیکن اب اسے کیا کہئے کہ وہی خطرات جنہیں پادری بھی اپنے دلوں میں پاتے تھے، اور پنڈتوں کے پنڈت سوامی دیانند جی مہاراج کا بھی وہی قلبی تاثر تھا۔ ان خطرات کے باوجود ”چاند پور“ جیسی جگہ کا انتخاب اس ”مذہبی مقابلہ“ کے لئے کیا گیا۔ اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ میلہ کے لئے خدا ہی جانتا ہے کس مصلحت یا مجبوری کے زیر اثر گرم ترین موسم مئی کے مہینے کو ترجیح دی گئی، اور تاریخ بھی مئی مقرر کی گئی، حساب سے معلوم ہوتا ہے، چاندنی راتیں گزر چکی تھیں۔ اسی لئے قدر تا رات میں بھی جلسہ کی گنجائش نہ تھی۔ ”واقعہ میلہ خدا شناسی“ میں خاص طور پر اسی بے ضابطگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا بھی ہے

”گرمی کا موسم تھا، گرمی ہی کا وقت تھا“ (یعنی جلسہ کا وقت دن کے اس حصہ میں مقرر کیا گیا

تھا جس میں گرمی شدت پذیر ہو جاتی ہے۔)

آگے ہے کہ

”مکان جلسہ ایک صحرا، شہر سے دور، سایہ کے لئے خیمہ یا درخت آم جس کا سایہ آدھا سایہ

آدھی دھوپ“

اور طرفہ تماشا یہ تھا کہ ممکنہ حد تک گرمی کی تکلیفوں سے بچنے کی ممکنہ تدبیریں جو کی جاسکتی تھیں، ان کی

طرف بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی، جیسا کہ اسی میں یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ

”نہ تپش سے بچنے کا کوئی عمدہ سامان، نہ لوس سے بچنے کے لئے کوئی مکان“

لوگوں کی تکلیف جب حد سے گزر گئی تو فوری طور پر یہ کیا گیا تھا، جیسا کہ اسی رسالہ میں ہے کہ
 ”قنات خیمہ کو جس کو بمنزلہ دیوار خیمہ کہئے“

ان ہی قناتوں کے پردوں کو

”اٹھا کر پتلی پتلی چوبیوں پر استادہ کیا، جس سے سایہ میں وسعت ہو گئی اور بہت سے شائق
 اس میں اکھڑے ہوئے“

لیکن باوجود اس کے قنات کے پردوں کا یہ سایہ بھی کافی نہ ہوا، اسی رسالہ میں ہے کہ
 ”بہت کثرت سے آدمی تھے شوق گفتگو میں نہ لو کا خیال تھا، اور نہ دھوپ کا۔ جہاں جہاں
 تک آواز کے پہنچنے کا احتمال تھا آدمی ہی آدمی تھے“

بہر حال اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، سوچ کر یہ سب کچھ کیا گیا تھا، یا بے سوچے کچھ اس قسم کے
 اتفاقات پیش آ گئے، لیکن اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود اس ہجوم کے جس کا ذکر صاحب رسالہ نے کیا ہے
 ان ہی کو یہ خبر بھی دینی پڑی کہ

”اگر یہ خرابیاں (زمانی و مکانی) نہ ہوتیں تو خدا جانے کس قدر انبوہ ہوتا“ ص ۲۳
 میرے پاس کوئی تحریری وثیقہ تو نہیں ہے، لیکن ہندوستان کے عام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے
 یہی خیال گذرتا ہے، اور صاحب رسالہ کی اطلاع کا یہ حصہ یعنی ”آدمی ہی آدمی تھے“ غالباً اس میں
 زیادہ کثرت ان ہی لوگوں کی ہوگی جو چاند پور قصبہ اور اس کے ارد گرد کے گادوں اور کھیرٹوں کے رہنچ
 والے تھے، کیونکہ اس سخت موسم میں دور دور سے لوگوں کا پہنچنا آسان نہ تھا، خود شہر شاہ جہاں پور
 بھی جب پانچ چھ کوس کے فاصلے پر تھا تو سواری پر آنے والوں کے سوا پیش اور لو کے موسم میں پیادہ
 پا آنے والوں کے پہنچنے کی مشکل ہی سے توقع کی جاسکتی ہے۔ صاحب رسالہ نے سچ لکھا ہے، کہ
 ”یہ خرابیاں نہ ہوتیں تو خدا جانے کس قدر انبوہ ہوتا“ جلسہ تھا ہی اس رنگ کا کہ لوگ دور دور سے آتے
 خود بھی میلہ دوسری دفعہ اسی مقام پر صرف تاریخ کی تبدیلی سے جب منعقد ہوا، یعنی بجائے مئی کے
 مارچ کی ۱۹-۲۰ تاریخ رکھی گئی تو اس دوسرے سال والے میلہ کی روداد میں اس کا تذکرہ بھی کیا

کیا ہے کہ

”غلادہ ساکنان شاہ جہاں پور، نواح شاہ جہاں پور، تلہر، میرٹھ، دلی، غورجہ، سنبھل،
مراد آباد، رامپور، بریلی، دیریندنگ سے بعض بعض شائقین تشریف لائے تھے“ ۵۵
مباحثہ شاہ جہاں پور

اس کا بھی پتہ اسی روداد سے چلتا ہے، کہ سال گذشتہ کی طرح منشی بیارے لال صاحب ان کو آنیوے
مہانوں کی مہمانی برداشت نہ کر سکے بلکہ لکھا ہے کہ

”موتی میاں نے مہان نوازی کو کام فرمایا، خاطر تواضع سے سب کو مکلف کھانا کھلایا“
۵۶
اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ روہیلی کھنڈ کے مختلف مرکزی مقامات سے دوسرے سال جو لوگ
آئے تھے، وہ عموماً مسلمان تھے، اسی لئے بے چارے موتی میاں کی موردی سیرجشی اور دریادی
سکام آئی۔

۵۷
موتی میاں کا ذکر خدا شناسی کے ان دونوں میلوں کی روداد میں کیا گیا ہے۔ میلہ خدا شناسی والی روداد میں
لکھا ہے کہ ان کا اصلی نام محمد طاہر تھا عرف میں موتی میاں کے نام سے مشہور تھے۔ اسی میں یہ بھی ہے کہ موتی میاں
رئیس شاہ جہاں پور جو مولوی مدن صاحب کی اولاد میں سے ہیں... اور یہ کہ بالفعل عہدہ آنریری مجسٹریٹ پیپر متاز
ہیں، میلہ میں مذہبی مباحثہ جو ہونے والا تھا۔ ہندوؤں کی طرف سے تو منشی بیارے لال بانی میلہ ہی ذمہ دار تھے، اور
عیسائیوں کی نمائندگی پادری نوس صاحب منشی جی کے دوست سے ہوئی تھی۔ شاید حکومت نے اسی لئے ایک مسلمان
یعنی موتی میاں کو جلسہ کے نظم کا ذمہ دار بنایا تھا، لکھا ہے کہ ”میرکار کی طرف سے موتی میاں کو اہم تقریر پڑھنے کے لئے“
پہلے سال کے میلہ کے بھی، اور دوسرے سال کے بھی۔ باقی میں نے موتی میاں کی روایاتی سیرجشی کی طرف جو اشارہ
کیا، اس کا تعلق ان کے چچا علی مولوی مدن صاحب سے ہے۔ غالباً یہی مولوی مدن صاحب ہیں، جن کا ذکر اوڑھی
والے شعر یعنی ۵۸ بڑھائی شیخ نے دائرہ ہی ہے گرچہ سن کی سی + مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی - کیا گیا ہے -
مغل حکومت کی مرکزیت ٹوٹ کر طوائف الملوک کے دور سے ہندوستان جب گزند ہاتھا۔ اس زمانہ کی چند اہم شخصیتوں
میں ایک یہ مولوی مدن صاحب بھی تھے عمالو السجادات نامی کتاب میں ہے کہ مولوی مدن کا شاہ جہاں پور کے قریب
تھہرہ آباد میں مقام تھا۔ مشہور تھا کہ حضرت غوث پاک شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے۔ ایک
زمانہ تک کھنڈ کے نواب وزیر صفدر جنگ کے شیرازہ محرم اسرار ہے۔ صفدر جنگ کے مرنے کے بعد ناظم ہنگال بہت
جنگ کے پاس مرشد آباد چلے گئے۔ وہاں بھی بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے۔ مانی دلی (باقی اگلے صفحہ پر)

بہر حال دوسرے سال والے میلہ کے متعلق تو نہیں، لیکن شروع شروع میں پہلا میلہ جن خاص خصوصیتوں سے ہوتا تھا، قریبہ کا اقتضا یہی ہے کہ چاندی اور اداس کے ارد گرد کے دیہاتیوں کے سوا باہر سے آنے والوں کی تعداد زیادہ نہ تھی، اور گوجاندا پورا اداس کے اطراف و نواح کی آبادیوں کے متعلق کوئی صحیح ذاتی علم مجھے نہیں ہے۔ لیکن یوپی کے عام حالات کے لحاظ سے خیال یہی گذرتا ہے کہ پہلے سال کے میلے میں مسلمانوں سے زیادہ بہت زیادہ تعداد چاہئے تو یہی کہ دیہاتی ہندوؤں کی ہی ہو۔ میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ دریائے گرا کے ساحل پر یہ صورت حال جو پیش آگئی تھی، کسی سوچے ہوئے بائناطیل پر وگرام کا نتیجہ تھی۔ لیکن اب اتفاق کہئے، یا باہمی اتفاق سے جو تہ سیریں اختیار کی گئی تھیں، ان کا

گذشتہ صفحہ سے، معاملات میں مہابت جنگ ان ہی سے رائے لیا کرتا تھا۔ جنگ لڑی حکومت جب ختم ہو گئی تو پھر گھنٹوں کے نوجوان حکمران شجاع الدولہ سے تعلق قائم ہوا۔ شاہ آباد ضلع شاہ جہاں پور جو مکہ لکھنؤ سے کافی فاصلہ پر تھا۔ اسی لئے لکھنؤ کے پاس ایک آبادی خالص پوزیں مولوی دن نے مکان تعمیر کرایا۔ جہاں کہیں رہے جو دو کرم کی بارش برساتے رہے۔ خالص پور کے قیام کے زمانہ میں صاحب عمار السعادات کا بیان ہے کہ ہر سال درانجام عرس حضرت غوث ثقلین می کرد، اس عرس میں کیا ہوتا تھا۔ اسی مورخ کے الفاظ میں اس کا جواب سنئے، لکھا ہے

”جو جوق جوق ملّا و طلبہ علم و فوج فوج مشائخ و اولاد شیوخ و از اطراف و اکناف..... در اس عرس جمع می شدند“

لیکن اطراف و اکناف کا مطلب آپ نے سمجھا؟ وہی اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ

”منش عظیم آباد، ہسرام، جرنپور، دارالآباد، وادودھ و شاہ آباد و شاہ جہاں پور و کورہ جہاں آباد و کالپی و اٹا وہ و خیر آباد و سندیلہ و کاکوہری و لکھنؤ و سلون و بریلی و دلتو“

لطیفہ یہ تھا کہ لکھنؤ کے شمال و جنوب مشرق و مغرب سے یہ آنے والے جاتے تھے تو پہلی کاکڑیہ آمد حضرت دونوں کا شاہ جہاں کی سرکار کی طرف سے ادا کیا جاتا تھا۔ آخر میں لکھا ہے کہ ”سانسہ روز عجیب انبوہ و طرقتما شاہی بود و بدینی داشت چند نفر قاتل تراز و در دست گرفتہ می نشستہ از صبح تا شام جنس و لفظ کوہ مردم می دادند، بعضے مذہب الطبعان و دہاد و بعضے سہارا و دیگر مذہبی گرفتند بقالان دم نمی نذریر کہ ہر آدمی در سرکار شاہ صاحب می یافتند“

بہر حال لکھا ہے کہ تھینا تھی ہزار آدم فراہم می آمدند، گویا تین ہونک ۱۰ ہزار آدمیوں کو راض شاہ صاحب کی سرکار سے تقسیم ہو جاتا تھا۔ کیا کیا چیزیں ملتی تھیں ان کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے جو مصنف نے بیان کیا ہے کہ جوگیوں، بیراگیوں کو علاوہ جنس و ذراک کے نقد بھی گانجہ بھانگ چرس پینے کے لئے دیا جاتا تھا۔ ملا عمار السعادات

لے یہ لفظ میرا نہیں ہے، بلکہ دوسرے سال کے میلے میں معنی ایسے خاص حالات جب پیش آئے (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ منطقی اور لازمی نتیجہ تھا۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پر لطف اظہر قیام پنجاب یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب میلہ جو اپنے نام اور عنوان ہی کے لحاظ سے شہرت پذیری کی کافی ضمانت اپنے اندر رکھتا تھا۔ پھر باضابطہ اشتہاروں اور اخباروں سے عام اعلان اس میلہ کے انعقاد کا سارے ہندوستان میں نہ سہی، لیکن یوپی میں کیا جا چکا تھا۔ لیکن رسالہ ”واقعہ میلہ خدا شناسی“ میں یہ عجیب و غریب اطلاع درج کی گئی ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر تک جب یہ خبر پہنچی کہ شاہ جہاں پور کے پاس ”نذہبی میلہ“ قائم ہونے والا ہے، جس میں مختلف ادیان کے نمائندوں میں بحث و مباحثہ بھی ہوگا تو آپ نے اپنے دوست اور عزیز مولوی محمد منیر صاحب کو جو اس زمانہ میں بریلی رہتے تھے۔ یہ ارقام فرمایا کہ

”کیفیت مناظرہ اور محل نزاع سے اطلاع دیجئے“

اور مولوی منیر صاحب نے غایت احتیاط سے کام لیتے ہوئے براہ راست شاہ جہاں پور کی پولیس کے انسپکٹر جن کا نام مولوی عبدالحی تھا، ان ہی سے واقعہ کی پوری تفصیل دریافت کی تو انسپکٹر صاحب جزئیات کی تفصیل تو کیا فرماتے بجائے اس کے جواب میں لکھا تو یہ لکھا کہ

”یقہہ بے اصل ہے، علماء کے آئے کی کچھ حاجت نہیں۔“

مولوی عبدالحی صاحب شاہ جہاں پور کے انسپکٹر پولیس کی شخصیت سے میں واقف نہیں ہوں۔ مگر حیرت ہوتی ہے کہ آخر یہ جواب ان کی طرف سے مولوی منیر صاحب کو جو دیا گیا۔ آخر اس کا منشا کیا تھا۔ بظاہر نام سے وہ مسلمان آدمی معلوم ہوتے ہیں، اور جب تک کسی شخص کا حال معلوم نہ ہو جس فتنہ ہی سے کام لینا ایمان اور اسلام بلکہ شاید شرافت کا بھی اقتضا ہے۔ مگر کیا کیجئے، یاد ہو گا اس زمانہ کی

گذشتہ صفحہ سے، جن سے پتہ چلا کہ بظاہر گویا مسلمانوں، ہندوؤں تین مذہبی فرقوں میں مقابلہ ہے، لیکن درحقیقت عیسائی اور ہندو اندرونی طور پر ملے ہوئے ہیں، آگے اس کی تفصیل بھی کی جائیگی۔ ”مباحثہ شاہ جہانپور“ میں لکھا ہے کہ منشی پیارے لال سے موتی میاں نے ”ترش رو ہو کر فرمایا کہ میں آئندہ سال شریک جلسہ نہ ہوں گا۔“ پھر سلسلہ کارروائیوں کے رنگ و رخ کو دیکھتے دیکھتے جس نتیجہ تک موتی میاں پہنچے تھے نصیب میں اسے چھپانے لگا اور بولے ”یہ بات بالکل سازش اور اتفاق باہمی پر دلالت کرتی ہے۔“ ص ۷

پولیس ہی کے ایک افسر تو وہ صاحب بھی تھے، جن کا نام بھی مسلمانوں ہی کے ناموں کی طرح ”محمد بخش“ تھا، اور تصدیق دیندیں حکومت کی طرف سے ”کوئوال شہر تھے۔ پنچایت کے ذریعہ دیوبند والوں کو مقدمات کے باہمی تصفیہ پر سیدنا الامام الکبیر نے جس زمانہ میں آمادہ فرمایا تھا، تو باوجود ”محمد بخش“ ہونے کے حضرت دالاکو مخاطب کر کے ان ہی کوئوال صاحب نے کہا تھا کہ

”میں ابھی سرکار میں رپورٹ کرتا ہوں، کہ مولویوں نے سرکار کے خلاف میں محمدی جھنڈا کھڑا کیا ہے“ (سوانح محظوظہ ص ۷۷)

کچھ بھی ہو، ایک ایسا معاملہ جس کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ شاہ جہاں پور کے انگریز کلکٹر مسٹر رابرٹ جارج گری صاحب کی باضابطہ منظوری نہیں حاصل تھی، بلکہ قرائن کا اقتضا ہے کہ اس مذہبی میلہ کو سرکار کے اشارہ یا سرپرستی کا شرف اگر حاصل نہ تھا تو حکومت کی عملی ہمدردیاں اس کے انعقاد میں حلوم ہوتا ہے کسی حد تک ضرورت شریک تھیں۔ بلکہ ”واقعہ میلہ خدا شناسی“ والے رسالہ میں غفلت کے عیوم کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک موقع پر جو یہ لکھا ہے کہ

”سپاہیان پولیس اگر نہ روکتے تو (عوام الناس) سب اندر (خیمہ مباحثہ ہی) میں پہنچتے“ ص ۲۲

اس سے جیسا کہ ظاہر ہے یہی ثابت ہوتا ہے، کہ نظم و انتظام کے لئے جیسے شاہ جہاں پور کے مقامی رئیس اور آئری مجسٹریٹ موتی میاں کو حکومت نے ذمہ دار بنایا تھا، اسی طرح شاہ جہاں پور کی پولیس بھی ذمہ دار ٹھہرائی گئی تھی، کہ میلہ میں کسی قسم کی بے ترتیبی اور گرہ نہ پیدا ہو، اب آپ ہی بتائیے کہ اسی پولیس کے ایک ممتاز افسر انسپکٹر صاحب کو بھی اس کی خبر نہ تھی کہ اس میلہ میں کیا ہونے والا ہے، اور کس مقصد سے یہ میلہ یہاں قائم کیا جا رہا ہے، کسی طرح یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔؟

بہر حال حقیقت تو یہ ہے، کہ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ انسپکٹر صاحب کی یہ اطلاع خدا نخواستہ اگر ملے گا کہ ہو جاتی، اور ہو جاتی کیا معنی، وہ تو کاگر گویا ایک حیثیت سے ہو ہی چکی تھی۔ اسی رسالہ کی تمہید میں ہے، کہ جب میلہ کے انعقاد کی خبر شہر ہوئی، تو شاہ جہاں پور کے مسلمانوں نے حالات کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کو واقعہ کی نوعیت سے مطلع کرتے ہوئے، قدم رنج فرماتے کی زحمت

دی تھی۔ دوسرے ذرائع سے بھی حضرت دلائی لاما کی مسلسل خبریں پہنچ رہی تھیں۔ جب شاہ جہاں پور کے مسلمانوں کا دعوت نامہ پہنچا، تو نانوتہ جہاں اس زمانہ میں مقیم تھے۔ پیادہ پا وہاں سے روانہ ہوئے، ایک شب کے لئے دیوبند میں قیام فرمایا۔ یوں ہی ایک ایک رات راستہ میں مظفرنگر، اور میرٹھ میں گذرتے ہوئے دہلی پہنچے، دلی میں شاہ جہاں پور کے انسپکٹر مولوی عبدالحی صاحب کا یہ پیغام آپ تک پہنچا کہ

”علماء کے آنے کی کچھ حاجت نہیں“

جیسا کہ چاہئے تھا، وہی اثر اس پیغام کا آپ پر پہلے مرتب ہوا، کہ شاہ جہاں پور جانے کا جیسا کہ لکھا ہے ارادہ سست ہو گیا۔“

مگر ایک طرف انسپکٹر صاحب کا یہ پیغام تھا، اور دوسری طرف عام پھیلی ہوئی میلہ کی مشہور خبر، پھر شاہ جہاں پور کے مسلمانوں کا دعوت نامہ، اسی دعوت نامہ کی بنیاد پر آپ کا چل پڑنا کہیں ذکر کر چکا ہوں کہ ٹھیک اسی سال یعنی ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں بنارس سے ستیا رتھ پرکاش پنڈت دیانند کا شاہکار پریس سے باہر آیا تھا، جس میں دنیا کے سارے مذاہب و ادیان کو جیسا کہ آپ سن چکے وہ لکھ سنایا گیا تھا، جسے دنیا کے کانوں نے کبھی نہیں سنا تھا۔

ادھر یہ کتاب پریس سے باہر آتی ہے، اور اسی سال شاہ جہاں پور کے ایک ایسے میلہ کے انعقاد کی خبر پھیلتی ہے، جس میں مذاہب و ادیان کے نمائندوں کے درمیان اعلان کیا گیا تھا کہ مباحثہ اور مناظرہ ہوگا، اعلان ایک ہندوؤں کی طرف سے تھا، اور اطلاع دی گئی تھی کہ پہلی دفعہ ہندو مذہب کے نمائندے بھی اس اکھاڑے میں اتریں گے، یا اتارے جائیں گے۔

نانوتہ تو خیر ذرا ایک مفصلاتی آبادی تھی، لیکن میرٹھ مظفرنگر دہلی وغیرہ جیسے شہروں میں جوچر میگزینیں اس سلسلہ میں ہو رہی ہوں گی، ہم ان کا شاید آج صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے، خصوصاً میرٹھ تو ایک حیثیت سے سوامی دیانند کا گویا گھر ہی تھا۔ میرٹھ ہی سے پنڈت جی کے قائم کئے ہوئے نئے ”سماج“ یعنی آریہ سماج کا آرگن ”آریہ سماچار“ نامی اخبار نکلتا تھا، کچھ ان ہی باتوں کا اثر غالباً یہ ہوا کہ گو شاہ جہاں پور کے

سفر کا ارادہ مست پڑ چکا تھا، لیکن جیسا کہ اسی رسالہ میں ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے دہلی سے
 بہ نظر احتیاط ایک خط شاہ جہاں پور کو لکھا کہ آپ بلا تے ہیں، اور مولوی منیر صاحب (جن کے
 ذریعہ انسپکٹر صاحب کا پیغام پہنچا تھا وہی) یوں لکھتے ہیں (یعنی علماء کے آنے کی کچھ حاجت
 نہیں) اس لئے تردد ہے۔ ص ۳۱

جن صاحب کے نام حضرت والا کا گرامی نامہ تھا، ان کو خاص طور پر تاکید کی گئی تھی کہ اس مذہبی میلہ
 کی واقعی نوعیت کیا ہے۔

”مفصل لکھئے“

میلہ، مہرئی کو منعقد ہونے والا تھا، اور یہ خط ولی سے شاہ جہاں پور اتنے تنگ وقت میں پہنچا کہ انعقاد
 میلہ کی تاریخ سے کل تین دن پہلے یعنی ۴ مہرئی کو اسی دن

”۴ مہرئی کو (شاہ جہاں پور سے) اول تو ایک تار برقی آیا“

یہ وہ زمانہ تھا کہ تار کے پڑھنے والے دہلی جیسے شہر میں بھی باسانی بہر جگہ نہیں میسر آتے تھے، ۴ مہرئی کو اسی دن
 بھی گذر گیا، اور پتہ نہ چلا کہ تار کا مضمون کیا ہے، بہ شکل تلاش کرنے کے بعد انگریزی جاننے والے
 کوئی صاحب ملے تب

”قریب شام، یہ معلوم ہوا کہ ”ضروری آؤ“

یہی اس تار برقی کا مضمون ہے۔ شام کو یہ خبر ملی، اور دوسرے دن یعنی ۵ مہرئی کو تار کے سوا ایک خط بھی
 شاہ جہاں پور کا ملا جس میں لکھا تھا کہ

مولوی عبدالحی (انسپکٹر پولیس شاہ جہاں پور) کو غلطی ہوئی، آپ آئیں، اور مولوی سید
 ابو المنصور صاحب کو ساتھ لائیں، ص ۳۲

یہ سید ابو المنصور صاحب وہی امام فن مناظرہ کے لقب والے صاحب ہیں۔ پادریوں سے مقابلہ اور مناظرہ
 میں جنہوں نے اس زمانہ میں خاص شہرت حاصل کی تھی، ان کو خاص طور پر اپنی رفاقت میں لائے کی
 وجہ شاہ جہاں پور کے اس خط میں یہ بتائی گئی تھی کہ

”پادری نول (نولس) صاحب کو جو بڑے لسان اور مقرر ہیں، یہ دعوے سے کہ بتقابلہ دین عیسوی دین محمدی کی کچھ حقیقت نہیں،“ ص ۳۱

اور اسی سے معلوم ہوتا ہے، کہ سیدنا امام الکبیر کی طلبی میں پادریوں کا مغالبہ شاید خود شاہ جہاں پور والوں کے پیش نظر بھی نہ تھا، اور بظاہر اس لئے آپ کو بلانے کی چنداں کوئی خاص وجہ ہو بھی نہیں سکتی تھی، کیونکہ اولاً مناظرہ کہنے یا مکالمہ کے جو اکھاڑے اس زمانہ میں پادریوں کی بدولت قائم ہو گئے تھے، بجز ایک دفعہ کے جس کا ذکر کر چکا ہوں، یعنی تاراج چند نامی پادری سے دلی میں اور وہ بھی باخفا، نام آپ کی گفتگو ہوئی تھی۔ آپ نے کبھی اس قسم کی دوراز کار اور لاف حاصل قصوں میں کبھی دل چسپی ہی نہیں لی تھی اور دلی والا ساجدہ اولاً ایک مقامی معاملہ تھا۔ ثانیاً اخفا نام کی وجہ سے آپ کی طرف اس کے منسوب ہونے کی بھی کوئی وجہ نہ تھی۔

تاہم الپکٹر صاحب شاہ جہاں پور کی مخالفت کے باوجود خود شاہ جہاں پور کے مسلمانوں کا آپ کی تشریف آوری پر اصرار اور کیسا اصرار؟ کہ خط ہی نہیں، بلکہ جس زمانہ میں تار پڑھنے والے دلی جیسے شہر میں بھی آسانی نہیں مل سکتے تھے، اس زمانہ میں تار کے ذریعہ سے آپ کی طلبی جو اس زمانہ کے لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل تھی بجائے خود خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔

مگر کوئی تحریری دثیقہ، یا ایسا بیان اب تک مجھے نہیں مل سکا، جس کی روشنی میں اس سوال کا صحیح جواب دوں۔

یہ صحیح ہے، کہ جن خصوصیتوں کے ساتھ یہ میلہ چاند پور میں منعقد ہو رہا تھا، وہ دینی اور مذہبی نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے بھی خاص اہمیت رکھتا تھا۔ مذہب اور دھرم کا معاملہ اس ملک کے باشندوں کی سب سے زیادہ دکھتی رگ ہے، ابھی چند سال ہی تو گزرے تھے کہ مشہد میں حکومت کو اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ عقیقی اسباب و محرکات کچھ ہی ہوں، لیکن پھٹا تھا تو زخم صرف ”چربی لگے ہوئے کار توں ہی کے قہے سے“ مذہبی زخم ہی سے چوٹ لگانی لگی تھی، جس سے سارا ملک گونج اٹھا اور فتنہ و فساد کی آگ بالآخر اسی ”گونج“ نے اختیار کی۔ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ

چند سال پہلے جس ملک میں یہ تماشا دیکھا جا چکا تھا، اسی ملک کے ایک ایسے علاقہ میں جیسا کہ روسکیفٹ ہے، اور اس کے بھی کسی شہر میں نہیں، بلکہ ایک صحرائی مقام میں جمع کیا جاتا ہے۔ باشندگان ملک کے مختلف مذاہب و ادیان کے نمائندوں کو، جن میں پادری عیسائیوں کے نمائندوں کے متعلق تو خیر کیا جاسکتا ہے کہ لوگ گوند عادی ہو چکے تھے، بقول سرسید مرحوم

”پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ غیر مذاہب کے مقدس لوگوں کو، اور مقدس مقاموں کو بہت بُرائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے، جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی۔“ ص ۱۷ اسباب بغاوت ہند و ضمیر حیات جاوید

یہ تو خیر روزمرہ کا مشغلہ ہی بن چکا تھا۔ بار بار ایک ہی چیز سے انسان کب تک بھرکتا رہے۔ لوگوں میں گویا پادریوں کے طرز عمل کی طرف سے گوند جمود کی ہی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن سوال اس نئے فرقے کا تھا، جو پہلی دفعہ اس دنگل میں اتر آیا، اتارا گیا تھا۔ میری مراد ہندوؤں سے ہے۔

انصاف کی بات یہی ہے کہ مسلمانوں کے عہد حکمرانی میں ہندوؤں کا اسلامی دین اور اس دین کے پیشواؤں کے ساتھ جو سلوک بھی ہو، اس عہد کے متعلق تو بہت کچھ کہنے کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے، لیکن جہاں تک میری معلومات ہیں۔ مسلمانوں کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد بھی کم از کم ہندو مذہب کے فضلاء اور مذہبی زندگی بسر کرنے والے اس باب میں عموماً احتیاط ہی سے کام لینے کے عادی تھے ”تختہ الہند“ نامی کتاب جو اٹھارہویں صدی میں لکھی گئی ہے، یعنی ہنگامہ غدر سے چھ سال پہلے اس کتاب میں بھی ضمت کتاب کے نو مسلم مصنف مولوی عبید اللہ صاحب نے اس زمانہ کے بعض واقعات کا ذکر کیا ہے، جن کا تجربہ اظہار اسلام سے پہلے ان کو ہوا، جن سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے، منجملہ دوسرے قصوں کے ایک قصہ جو ان ہی کے ساتھ پیش آیا، خلاصہ جس کا یہ ہے، کہ اظہار اسلام سے پہلے بھی مذہبی امور کے متعلق اپنے بھائی برادری کے لوگوں سے گفتگو کرنے کے مواقع پیش آتے رہتے تھے، ایک دفعہ ایک ایسے دو دو ان ہندو پنڈت سے جو ہندو مذہب کے چھ شاستروں کا عالم تھا، اس سے بھی ان کی گفتگو

ہوئی، لکھا ہے کہ

”اس پنڈت کو میرا (در پر در) مسلمان ہونا معلوم نہ تھا، بلکہ یہ جانتا تھا کہ یوں ہی مناظرہ

کرتا ہے“ ۶۳

اسی لئے منہ دیکھی بات کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی، سلسلہ گفتگو میں اسی پنڈت سے ایک دفعہ مولوی عبید اللہ نو مسلم کا یہ کالم ہوا۔

مولوی عبید اللہ نو مسلم - پنڈت جی آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر مسلمان اپنے دین و طریق پر قائم رہیں، تو ان کی ملکیت (نجات) ہوگی یا نہیں؟

شاستری پنڈت - ہاں کیوں نہیں ہوگی۔

مولوی عبید اللہ نو مسلم - مسلمانوں کا دین حق ہے یا نہیں؟

شاستری پنڈت - ہاں! ان کے لئے حق ہے۔

مولوی عبید اللہ نو مسلم - ان کے (یعنی مسلمانوں کے) دین کی اصل قرآن شریف ہے، سو قرآن شریف

بھی کتاب ہے یا نہیں؟

شاستری پنڈت - کیوں نہیں سچی ہی کتاب ہے۔

مولوی عبید اللہ نے لکھا ہے کہ اس آخری سوالی کو ذرا زیادہ زور دے کر میں نے پھر ان سے پوچھا کہ

واقعہ تم قرآن کو سچی کتاب مانتے ہو، ان کا بیان ہے، کہ پنڈت جی نے جو میں دہرا کر پھر رہی کہا کہ

”ہاں قرآن سچا ہے“ ۶۴

ہے تو یہ ایک انفرادی بات، لیکن جس خاص طریقہ سے خاص موقع پر گفتگو ہوئی ہے، اس کو پیش نظر

رکتے ہوئے، اس کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ پنڈت جی جو کچھ اس وقت کہہ رہے تھے، یہی ان کا

بھی مذہبی عقیدہ تھا، اور خواہ واقعہ کے لحاظ سے یہ خیال غلط ہو، یا صحیح، لیکن کہا جاسکتا ہے، کہ

ملہ مطلب یہ ہے کہ قرآن کو سچی کتاب مان لینے کے بعد پھر نہلت جی کا خیال کہ اسلامی دین ان کے لئے (یعنی صرف

مسلمانوں کے لئے) حق ہے، اسی لئے مسلمانوں کی نجات کے لئے تو یہ دین کافی ہے، لیکن (باقی اگلے صفحہ پر)

ہندوؤں کے اعلیٰ طبقات برہمنوں اور پندتوں کا احساس اسلام کے متعلق کچھ اسی نوعیت کا تھا۔

سب سے پہلے دیانند کے زمانہ میں ہندو قوم کی اس موردنی روایت کے برخلاف اسلام اور اسلام کی کتاب، اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں نئی جرأت اور جسارت اس قوم میں پیدا کی گئی تھی نئی بات تھی، نیا جوش تھا۔ یہ میل چاند پور میں ٹھیک اسی زمانہ میں قائم کیا جا رہا تھا۔ اسی سال پنڈت جی کی کتاب ستیارتھ پرکاش پریس سے باہر آئی تھی۔ مذہبی مباحثہ کے سلسلے میں ہندوؤں کے نئے عنصر کا ہوا اضافہ اس میل میں ہوا تھا، اور جن حالات میں ہوا تھا، اور جن خطرات کا اندیشہ ایسی صورت میں کیا جاسکتا ہے، کیا حکومت جس کی طرف سے باضابطہ اس میلہ کے انعقاد کی اجازت دی گئی تھی، اس اندیشہ کی رعایت اس کے فرائض میں داخل نہ تھی؟

حجرت تو اس پر ہوتی ہے، کہ بھی پادری دوسروں کو جو جی میں آتا تھا، جیسے سناتے تھے، اسی طرح دوسروں سے بھی سب کچھ سننے کے عادی ہو چکے تھے، آخر ستیارتھ پرکاش میں عیسائی مذہب اور اس مذہب کے پیشواؤں کو جو کچھ کہا جا چکا تھا، جب حکومت کے ساتھ پادریوں کا طبقہ بھی اس کو سن کر خواہش تھا، ستیارتھ

(گزشتہ صفحہ سے) مسلمانوں کے موادہ سرے اوپان دذامب کی طرف جو لوگ منسوب ہیں۔ ان کی نجات کیلئے اسلامی دین کا قبول کرنا ضروری نہیں، بلکہ اسلام قبول کئے بغیر بھی ان کی مکتی (نجات) ہو جائے گی، سچ پوچھئے تو یہ پنڈت جی کے اس دعوے کی تردید ہے، یعنی قرآن مجید کتاب ہے۔ ان کا یہ دعویٰ غلط ہوتا ہے۔ مولوی عبید اللہ صاحب مرحوم نے بھی لکھا ہے کہ پنڈت جی کو میں نے مطلع کیا کہ جناب والا جس کتاب (قرآن) کو آپ سچی کتاب من رہے ہیں، اسی میں لکھا ہے کہ اسلام کے سوا جس دین کی بھی کوئی پیروی کرے گا، اس سے اس کا دین قبول نہ کیا جائے گا یعنی وہ من مدیتہ غیر اللہ ہے دنیا فانی یقبل منہ کا جو مطلب ہے۔ بہر حال اسلام کو دین العرب اور غیر اسلام کو رسول العرب یا رسول الاممین تو ہندوئی ہونے والے حقیقتہً نہ اسلام ہی کو سچ مانتے ہیں، اور نہ اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے ہیں۔ ایک دلچسپ محاشاف تحفۃ الہندی کے مصنف کے بیان سے یہ ہوتا ہے کہ برہمنوں نے عام ہندوؤں کو یہ باور کرا دیا تھا کہ گیتا میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اپنا دین اگر چہ دانی کے خلاف اپنی خودی کے دانہ کے برابر ہو، اور دوسرا دین بہت سارے دینی پیرا کے برابر ہو، جب بھی اپنا دین نہ چھوڑنا چاہئے، خدا عالم گیتا میں یہ بات پائی گئی جاتی ہے یا نہیں۔ لیکن اس سے اس کا تو پتہ چلا کہ مذہب کے متعلق کتنے غلط فہم نظریہ ہندوؤں میں پھیلا دیے گئے تھے، واقعہ یہ ہے کہ مذہب کسی خاص قوم کی وراثت ہے اور نہ کسی مخصوص است کی ذاتی جائیداد۔ بلکہ پیدا کرنے والے خالق نے اپنے بندوں کو ان کی زندگی کے جس قدر حق آمین اور دستور العمل سے آگاہ کیا ہے، انسانیت اپنے صحیح انجام تک جس کی پابندی کرنے بغیر نہیں پہنچ سکتی (باقی اگلے صفحہ پر)

پرجاکش ۱۵۷۶ء میں چھپ کر پبلک کے سامنے آئی تھی۔ مولوی ابوالوفائشا رائے جہنوں نے آریوں کے ساتھ مناظرانہ کش مکش میں کافی حصہ لیا تھا، وہی اپنی کتاب ”حق پرکاش“ میں جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی تھی، اسی میں یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ

”ہندوؤں نے اپنے مضمون کے متعلق (یعنی ستیارتھ پرکاش کے جس حصہ میں ہندوؤں کے مختلف فرقوں پر اعتراضات کئے گئے تھے، ان کی طرف سے)، اس کتاب (ستیارتھ پرکاش) کے متعدد جوابات دیئے ہیں چنانچہ بعض کے نام یہ ہیں۔ دیانند ترمکھاسکر، دیانند بھاسکر، دیانند بھاسکر، دیانند بھاسکر“

آخر میں لکھتے ہیں کہ

”عیسائیوں کا جواب کوئی سننے میں نہیں آیا“

مولوی صاحب کو عیسائیوں کی اس عجیب و غریب خاموشی پر حیرت ہوئی ہے، اپنے اسی استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے، لکھا ہے کہ

”مشربو! کہاں ہو“ (حق پرکاش ص ۷)

کم از کم اس سے اس کا توبہ چلا کہ تین سال تک کوئی جواب عیسائیوں کی طرف سے دیانند جی کی کتاب کے اس حصہ کا نہیں دیا گیا تھا، جس میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ عیسائیوں، ادران کے دین کے متعلق کیا کچھ نہیں کہا گیا تھا۔

مگر یہی بے حس پادری جن کے کان پر ستیارتھ پرکاش کے نفروں سے بھی جوں نہیں رنگی، وہی نام نہاد خدا شناسی کے اس میل میں اتنے ذکی الحس بن کر شریک ہوئے تھے کہ ایک موقع پر بابل کی تحریف کا قصہ چھڑا، خود پادری نوس نے یہ تسلیم کر لیا کہ ”انجیل میں یہ فقرہ باہر سے بڑھا دیا گیا ہے“ ان کے اس

(گزشتہ صفحے سے)، اسی کا نام مذہب اور دین ہے اصولاً اول سے آخر تک ہر قوم اور ہر امت میں اسی دین کو خدا کے نیکو حضرات انبیاء و رسول علیہم السلام پہنچاتے رہے ہیں۔ اسی کی آخری شکل ترین شکل کا نام الاسلام ہے جو پیغمبروں کے خاتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے تاریخ کے آخری دور میں دنیا کو دیا گیا ہے ۱۲

لے تفصیل کے لئے تو ”مباحثہ شایعہ انہور“ کی روداد ہی کو پڑھنا چاہئے، خلاصہ یہ ہے کہ انجیل کے اس (باقی اگلے صفحہ پر)

اعتراف پر سیدنا الامام اکیبرؑ نے ان ہی سے صرف اتنی بات پوچھی کہ

”ایک پیالے پانی میں ایک قطرہ بیشاب کا گر جائے تو وہ قطرہ سارے پانی کو ناپاک بنا دیتا ہے“

بے ساختہ زبان مبارک سے تشبیہی فقرہ کیا نکلا کہ پادریوں کے حلقہ میں غل جچ گیا کہ
”انجیل خدا کا کلام ہے، اس قابل نہیں کہ اس میں ناپاکی ملائی جائے“

حالانکہ سیدنا الامام اکیبرؑ فرماتے رہے کہ باہر سے ملائے جانے والے جزو کو کس نے بیشاب و تشبیہ دی ہے۔ انجیل کو تو پاک پانی ہی ٹھہرا رہا ہوں، لیکن پادریوں نے شور اور ہنگامہ کر کے اتنا دباؤ ڈالا کہ اس تشبیہ کو واپس لیتے ہوئے حضرت والا نے فرمایا کہ

”یہ مثال نہ سنئے، دوسری مثال سنئے“ ص ۱۷۱ مباحثہ شامیہاں پور

الغرض ہندو بھی اب وہ ہندو نہ تھے، جو سو امی دیانند سے پہلے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خاص میلہ کی حد تک پادری بھی اپنی مصنوعی بردباری و علم کے جذبات کے برخلاف دوسرے رنگ میں آکر شریک ہوئے تھے۔

رہا تیسرا فرق مسلمانوں کا، سوان کی آتش فزا جیوں، اور دینی معاملات میں ان کی اشتغال پذیریوں کے پھیلائے ہوئے عام چرچوں کے سوا، جب ہندو مذہب ہی نہیں، بلکہ اس مذہب کی کتابیں، عموماً جس زبان میں ہیں یعنی سنسکرت زبان تک کے متعلق یہ باور کرایا جا رہا ہو کہ
”عام طور پر مسلمان اس کو (سنسکرت زبان کو) بت پرستوں کی زبان سمجھتے رہے، اسی لئے ان کے نزدیک وہ (سنسکرت زبان) قابل نفرت ہی رہی۔“ (سنسکرت اسمتھ ص ۱۷۱ کی تاریخ قدیم ہندوستان ص ۱۷۱)

(گندیشہ صفحہ ۷۷) اندو ترجمہ کو جو پہلی دفعہ مرزا ابی مشری والوں نے چھاپا تھا، اسی کو لیکر سیدنا الامام اکیبرؑ کے اشارے سے عام فنی طور مولوی ابوالمنصور صاحب کھڑے ہوئے اور بوڑھا کی انجیل بابت درس میں جو تقریر پڑھایا جاتا ہے، گنتین میں جو ایمان پر گروہی دیتے ہیں، آپ کا کلام اور روح القدس اور تینوں ایک ہیں“ اسی پر چاشیہ خود مرزا ابی کی مشنری والوں کی طرف سے لکھا گیا تھا کہ ”یہ الفاظ کسی قدیم نسخہ میں نہیں پائے جاتے“ گویا پادریوں کی اعتراضی شہادت تھی۔ خود پادری نوٹس نے بھی تصدیق کی کہ واقعی یہ الحاقی فقرہ ہے۔ دیکھو ص ۱۷۱
۱۷۱ اس میں شک نہیں کہ یورپ کی جدید علمی نشاات میں مختلف قدیم زبانوں اور ان کے حروف کے (باقی اگلے صفحہ پر)

بجائے خود، یا اسی نوعیت کے پھیلائے ہوئے دوسرے الزامات یا اتہامات کی واقعی حقیقت جو کچھ بھی ہو، لیکن جس زمانہ میں یہی سمجھا بھی جاتا تھا، اور یہی سمجھا یا بھی جاتا تھا، اسی زمانہ میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلہ میں دیانندی جبارتوں کی بہت افزائیوں کے بعد لاکھ لاکھ کر دینے کا منطقی انجام خود ہی سوچنا چاہئے کہ کیا ہو سکتا تھا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ کھڑے کرنے والوں نے چاندپور کے اس میلہ میں جن مختلف ادیان مذاہب کے نمائندوں کو لا کر جمع کیا تھا، پہلے سے کچھ اسی قسم کے انجام کا تصور کر کے خدائشناہی کے نام نہاد نام سے اس میلہ کے جانے کا نظم چاندپور میں کیا تھا۔ پہلے بھی شاید کہہ چکا ہوں کہ اس کی کوئی واضح شہادت ہمارے پاس نہیں ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ جب اس میلہ کی ان دونوں رودادوں کو پڑھتا ہوں جن میں دو سالوں کی کارروائیوں کو مغیرہ مستند صاحبان ہوش و گوش نے مرتب کر کے شائع کر دیا تھا، اور جہاں تک میں جانتا ہوں، واقعات جن کا تذکرہ ان رودادوں میں کیا گیا ہے، ان پر نہ اسی زمانہ میں کسی نے کسی قسم کی تنقید کی تھی، اور نہ آج تک ان کے خلاف کوئی آواز کسی طرف سے بلند ہوئی ہے، ان واقعات کے جاننے کے بعد نیتوں کے متعلق میرا خیال تو یہی ہے کہ اپنے حن ظن کو مشکل ہی سمجھو ظ

(گزشتہ صفحہ سے) پڑھنے کا عام مذاق خصوصاً یورپ و امریکہ کے علمی حلقوں میں جو پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے زمانہ میں اس مذاق کی عمومیت کا پتہ نہیں چلتا، سنسکرت ہی کیا یونانی زبان اور اس زبان کے حروف کے جاننے والے اور پڑھنے والے مسلمانوں میں کم ہی پیدا ہوئے ہیں، لیکن باوجود اس کے جیسے یہ مسلم ہے کہ یونانیوں کا سارا علمی سرمایہ جو یورپ والوں تک پہنچا، اس سرمایہ کی منتقلی میں واسطہ کا کام زیادہ تر مسلمانوں ہی نے انجام دیا ہے۔ اسی طرح سنسکرت زبان کے جاننے والے یہ بھیج ہے کہ مسلمانوں میں محدودے چند افراد مثلاً البیرونی وغیرہ ملتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے علوم و فنون طب و نجوم ہیئت فلسفہ اور اس ملک کی ادبی کتابوں کے ترجموں سے یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے کافی فائدہ اٹھایا ہے، تقریباً اسی قدر جتنا نفع یونانیوں کے علوم و فنون سے ان کو پہنچا ہے، ایسی صورت میں سنسکرت زبان کے جاننے والوں کی کمی کو نفرت کا نتیجہ قرار دینا بجز تہمت تراشی کے اور بھی کچھ ہے۔ نفرت ہوتی تو پھر ہندوستان کے علوم و فنون کو مسلمان ہاتھوں ہاتھ کیوں لیتے، بغداد کا دارالحکمت ان کی کتابوں سے کیوں بھر جاتا؟

بت پرستی کا لطیفہ اکتہ صاحب نے جو پیش کیا ہے، میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یونان کی بت پرستی کیا ہندوستان کی بت پرستی سے کچھ کم تھی؟

رکھنے میں کوئی کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں رودادیں عام طور پر ملتے ہیں، ان کو پڑھئے۔

اس میں شک نہیں کہ میلہ میں شرکت کی دعوت، ”خدا شناسی“ ہی کے نام پر دی گئی تھی، اشتہار جس میں میلہ کے قائم کرنے کی غرض دعاغیت بیان کی گئی تھی، پہلے بھی نقص کر چکا ہوں، ”اے ہا مضمون یہ تھا“ ”میلے کے نام سے آپ کو میلہ کی غرض دعاغیت معلوم ہو گئی ہوگی، مگر مزید وضاحت کے لئے عرض ہے، کہ اصلی غرض ”تحقیق مذہبی“ ہے، اور اشتہار کا اشاریہ ہے، کہ میلہ میں ہر مذہب کے آدمی آئیں، اور اپنے دلائل سنائیں، قواعد کی تفصیل آئندہ ملے ہوگی“۔

لیکن ہوا کیا؟ پہلا سال جس میں باوجود توقع کے پنڈت دیانند سرسوتی جی شریک نہ ہو سکے، حالانکہ اسی سال ان کی کتاب سستیارتھ پرکاش شائع ہوئی تھی۔ جس میں ہندوستان کے سارے مذاہب پر اعتراض کیا گیا تھا، یوں بھی سارے ہندوستان میں ہلچل وہ اسی زمانہ میں مچائے ہوئے تھے، اور اپنے ساختہ پر داختمذہب جس کا نام انہوں نے ویدک دھرم رکھ دیا تھا، جلیج کرتے پھرتے تھے، کہ سارے ادیان و مذاہب کے مقابلہ میں صرف یہی ایک سچا دھرم اور صادق دین ہے۔ لیکن اب اسے کیا کہئے، کہ نہ صرف پنڈت جی ہی اس میلہ میں غائب تھے بلکہ شاہ جہاں پور کے قریب ہی اسی روہیل کھنڈ میں منشی اندرسن جو زبان سے تو نہیں، لیکن قلم سے ہنگامہ برپا کئے ہوئے تھے۔ ان کو بھی میلے کے اس پہلے سال میں ہم نہیں پاتے بلکہ بجائے ان دونوں کے ہندو مذہب کی نمائندگی یا وکالت کرنے کے لئے جو آئے تھے، وہ اسی قسم کے لوگ تھے، کہ نہ ان رودادوں ہی میں ان کے ناموں کا اس زمانہ میں تذکرہ کیا گیا ہے، اور نہ باوجود تلاش کے کسی دوسرے ذریعہ ہی سے اس وقت تک مجھے کچھ نشان پتہ ان بے چاروں کا چل سکا۔ کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کون لوگ تھے، اور ان کی علمی حیثیت کیا تھی؟ ورنہ تک جلسہ ہوتا رہا، ان پورے دونوں میں ان کی طرف سے کوئی گویا اٹھا ہی نہیں، اسی سال کی روداد میں ہے کہ دوسرے دن آخری جلسہ میں پادری نولس صاحب نے کہا کہ ”اب بھائی ہندو اپنا بیان کریں“۔ یہ سن کر بے چارہ ایک پنڈت اٹھا ہی تھا کہ اچانک بقول صاحب روداد کے

”ایک دیسی پادری جو بڑے پادری صاحب (نولس صاحب) کے قریب ہی بیٹھ تھے او

ان کے اٹھنے بیٹھنے سے یہ نمایاں تھا کہ بعد پادری نول صاحب کے انہیں کا رتبہ ہے ،
 وہی پادری صاحب (یعنی پادری نول صاحب) کی طرف جھک کر کان میں کچھ فرمانے لگو، ۳۸
 کان میں کیا کہا گیا، دوسروں کے لئے اس کے جاننے کی صورت ہی کیا تھی۔ البتہ یہ دیکھا گیا کہ بیچائے
 پنڈت صاحب کو تقریر کے اس مقام سے جہاں وہ آکر کھڑے ہوئے تھے ہٹا دیا گیا، اور کان
 میں جھک کر بولنے والے پادری کو نول صاحب نے پنڈت جی کی جگہ تقریر کرنے کا حکم دیا، وہ تقریر
 بھی کیا تھی، کچھ مجذوب کی سی بڑھتی جس کا نہ سر تھا نہ پیر۔ وقت ٹالنے کے سوا بظاہر پادری صاحب
 کی اس تقریر کا شاید کوئی دوسرا منشا، معلوم بھی نہیں ہوتا۔ لکھا ہے کہ اسی کے بعد دُوج گئے، اور
 جب دوسرے دن کا آخری اجلاس ختم ہو رہا تھا جس کو بعد میں ہی اس سال کا ختم ہو جاتا۔ اسی تنگ
 وقت میں دیکھا گیا کہ وہی پنڈت جی جو بڑھادیئے گئے تھے، وہ آئے اور بجائے تقریر کے جس کے لئے
 وہ کھڑے ہوئے تھے دیکھا گیا کہ ایک تحریر پڑھ رہے ہیں

”وہ تحریر ناگری میں لکھی ہوئی تھی۔“ ۳۹

ناگری تو حرف تھا، باقی زبان سو لکھا ہے کہ

”اکثر الفاظ زبان سنسکرت کے تھے۔“

جسے سلمان کیا جس علاقہ میں تحریر سنائی جا رہی تھی، اس علاقہ کے ہندو بھی عموماً نہیں سمجھ سکتے تھے لکھا
 ہے کہ ان پنڈت جی کے بعد

”ایک فقیر سوہنگ آئے، اور ایک تحریر طویل جو بچھناگری لکھی ہوئی تھی، لائے اور چڑھنی

شروع کی، اکثر الفاظ سنسکرت کے تھے اور اسی زبان کے دوسرے اس میں مرقوم

تھے۔“ ۴۰

گویا یہ دونوں تحریریں پڑھی تو ضرور گئیں، لیکن جب کسی نے ان کا مطلب ہی نہ سمجھا تو بجز اس بات کے
 کہ ہندوؤں کے نمائندوں نے بھی مباحثہ میں حصہ لیا، خانہ پری کی حد تک اتنی بات تو صادق آگئی، اور
 کوئی مال یا مقصد ان تقریروں کا معلوم نہیں ہوتا۔

ہاں! ایک سال بعد جب یہی میلہ اسی میدان میں جما، تو بالکل گزشتہ سال کے برعکس اس سال پنڈت دیناند سرسوتی جی بھی تشریف لاتے ہیں، اور پنڈت اندرن کو بھی ہم مجلس میں جلوہ فرما دیکھتے ہیں۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ گزشتہ سال ان دونوں صاحبوں میں سے ایک بھی نہ آیا۔ اور اس سال آئے تو دونوں ہی آئے، اور کس شان کے ساتھ آئے؟

”مباحثہ شاہچھاپہ“ نامی دوسرے سال کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہفتہ پہلے سے پنڈت جی چاند پور پہنچے ہوئے تھے، مباحثہ کی مجلس میں منشی پیارے لال کی طرف سے بزبان اردو پانچ سوالات اس مطالبہ کے ساتھ جو رکھے گئے کہ پہلے ان سوالوں کا جواب دیا جائے، لکھا ہے کہ ”نحب بیان بعض معتبرین سوالات مذکورہ پنڈت دیناند کے تجویز کئے ہوئے تھے“ ص ۳۵ اسی کے بعد یہ بھی ہے کہ

”جو شخص خود سوالات کرے گا، اور وہ بھی اس طور پر کہ ایک ہفتہ پہلے اسی کام کے لئے آیا ہوا ہو“ ص ۳۵

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میلہ کے بانی منشی پیارے لال رئیس چاند پور کا تعلق جیسے شاہ جہانپور شہری اسکول کے ہیڈ ماسٹر پادری نوس صاحب سے تھا، اسی طرح پنڈت جی سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے، منشی جی بے تعلق نہ تھے۔ بلکہ اسی روداد سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ دوسرے سال کے اس میلے کے برخواست ہو جانے کے بعد مسلمانوں کے نمائندے علماء وغیرہ تو شاہ جہاں پور

”حسب خواہش مولوی محمد طاہر صاحب (یعنی مولوی مدن دالے موتی میاں کے) مکان پر فروکش ہوئے“ ص ۳۵

اور انہیں کے یہاں بھی رہے، اپنی موروثی روایت کے مطابق موتی میاں نے ان کی خاطر مدارات میں خاندانی خصوصیات کا اظہار جس یہاں پر کیا تھا، اس کا اندازہ صاحب روداد کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ

”ان کی مہمان نوازی اور دل جوئی، اس وقت آنکھوں میں پھرتی ہے“ ص ۳۵

مگر اس کے برخلاف سارنگپور جہاں کے باغ میں سیلا جایا گیا تھا، بجائے شہر یعنی شاہ جہاں پور آنے کے لکھا ہے کہ

”پنڈت صاحب یعنی سوامی دیانند سرسوتی، اور منشی اندرمن چاندا پور کو چل دیئے“ ص ۷۸

یہ بھی اسی میں ہے کہ موتی میاں نے بعض لوگوں کی تحریک سے جن میں سیدنا الامام الکیبر کا اشارہ بھی تحریک تھا۔ منشی اندرمن کے پاس شاہ جہاں پور سے اپنا خاص آدمی چاندا پور یہ دعوت نامہ دے کر روانہ کیا کہ ”آپ براہ کرم بھراہی پنڈت دیانند صاحب تشریف لاکر قبول دعوت سے مرہون منت فرمائیں“

غرض بلانے کی یہ بھی تھی، کہ بعض تشنہ مسائل پر پنڈت جی اور منشی اندرمن سے گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ دعوت نامہ میں اس کی اطلاع بھی دے دی گئی تھی، مگر جواب میں منشی اندرمن نے بجائے شاہ جہاں پور کے لکھا کہ اپنے مولویوں کو لے کر آپ ہی چاندا پور آئیے، جہاں منشی پیارے لال کے مہمان بن کر منشی جی بھی اور پنڈت جی بھی فروکش تھے۔

ان ساری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی اور منشی اندرمن دونوں ایک طرح سے منشی پیارے لال کو اپنا سرپرست سمجھتے تھے۔ اسی صورت میں طرفین کے متعلق بے گانگی کا خیال خود ہی سوچا جاتا ہے کہ کس حد تک درست ہو سکتا ہے۔

مگر باوجود اس کے میلہ جو پہلی دفعہ دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا، اسی میں دونوں کا نہ آنا، اور ان کی جگہ گنام پنڈتوں کا پہنچنا، آخر اس کی توجیہ کیا کی جائے۔ پنڈت جی کے ساتھ جب ہم جانتے ہیں کہ کام کرنے والوں کی کافی تعداد تھی۔ ڈاکٹر مرٹوک صاحب ایم۔ اے کی شہادت بھی گزربھی جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ”سوامی جی تعریف کرنے والوں کی ایک جماعت اپنے ساتھ رکھتے تھے“ بلکہ کتاب ”جواب ترکی برکی“

۱۷ منشی اندرمن کے جوابی خط میں یہ بھی تھا کہ میں آپ کے (یعنی مولوی طاہر عرف موتی میاں کے) مکان پر نہیں آتا، ہاں منشی گنگا پرشاد ہوتے جن کی تبدیلی عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر یہ مقام شاہ جہاں پور ہو گئی ہے، تو ان کے مکان پر آ سکتا تھا۔ مباحثہ شاہ جہاں پور شاید ان منشی گنگا پرشاد سے بھی منشی جی کا وہ ہی سرپرستی کا تعلق تھا جو منشی پیارے لال تعلق دار چاندا پور کے زیر سایہ ان کو حاصل تھی۔ ۱۲

سے تو معلوم ہوتا ہے، کہ دوسروں کو آگے بڑھا کر کام مکالنا، یہ بھی سوامی جی کے مختلف طریقوں میں ایک خاص طریقہ تھا، میرٹھ کے ایک آریہ منشی اندلال تھے۔ اس کتاب میں ان ہی کے سوالوں کا جواب دیا گیا ہے، مگر یہ کہتے ہوئے کہ

”کون نہیں جانتا کہ پنڈت جی (یعنی سوامی دیانند جی) منشی جی (اندلال) کے سر بول ہو

ہیں“ ص ۷

اس موقع پر یہ مشہور شعر

چرخ کو گب پیلے تھے ستم گاری میں

کوئی مشتوق ہے اس پردہ رنگاریں

”جواب ترکی بترکی“ کے مصنف نے استعمال کیا ہے۔

کون کہہ سکتا ہے، کہ پہلے میلے میں پنڈت جی اور منشی جی کی عدم شرکت کی تہ میں کچھ ترقی ہم کی بات تھی ہو واقعی مذاہب کی تحقیق میلے کی غرض تھی تو ہندوؤں کی طرف سے جن سربراہان اور وہ ذمہ دار لوگوں کی شرکت کی توقع کی جاسکتی تھی، وہ اس میلے سے غیر حاضر کیوں ہوئے، اور ان میں جو آئے بھی، تو گو ابتدا میں ہندوؤں کی طرف سے منشی پیارے لال صاحب نے پہلی جو تقریر کی، وہ عام فہم تھی، لیکن اٹھنے کے بعد چون پنڈت صاحب کو بٹھا دیا گیا، اور پادری نولس کی سرگوشی دوسرے پادری سے جو گویا ان کے نائب تھے جب ہوئی تو اس کے بعد ہندوؤں کے نمائندوں نے اولاً تقریر ہی نہ کی، بلکہ ان کی طرف سے تحریر پڑھی گئی، اور تحریر بھی اسی زبان میں جسے جلسہ کے عام شرکا، بھی نہ سمجھتے تھے، اور نہ دوسرے مذاہب کے نمائندے اس زبان سے واقف تھے۔ اسی طرح دوسرے سال پنڈت دیانند جی اور منشی اندر من حسب توقع تشریف تو ضرور لائے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے، کہ اس سال کے میلے میں جیسا کہ ”مباحثہ شاہ جہاں پور“ میں لکھا ہے

”ہندو میں سوائے پنڈت صاحب کے اور کوئی صاحب اول سے آخر تک کھڑے ہی

نہیں ہوئے“ ص ۷۲

ادراں کی تقریر کا رنگ جو رہا اس کا اندازہ اسی ردود کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ
 ”ان کی زبان میں الفاظ سنسکرت بہت ملے ہوئے تھے، بلکہ اکثر جملے کے جملے سوائے کے
 کا وغیرہ حروف ربط کے سنسکرت میں ہوتے تھے“ ص ۶۱

جس کا نتیجہ جیسا کہ ہونا چاہئے تھا، یہی ہوا کہ

”سوائے دو چار آدمیوں کے حاضران جلسہ میں سے ان کے مطلب کو کوئی نہ سمجھا ہوگا۔“

ان دو چار آدمیوں کا حال یہی تھا کہ سوط اللہ الحجار کے مصنف بچھریوں کے مولانا محمد علی صاحب
 جن کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ہندو ادبیات کا کافی مطالعہ کئے ہوئے ہیں۔ اسی لئے سیدنا الامام الکبیر
 نے ان سے کہا

”یہ نیاز مند تو پنڈت بنی کی تقریر کچھ سمجھا نہیں، اس لئے اب آپ ہی کو تکلیف کرنی پڑے گی۔“

مگر مولانا محمد علی صاحب نے جواب میں کہا کہ

”میں بھی پورا پورا نہیں سمجھا“

دل چسپ لطیفہ اسی ردود میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ

”مولوی محمد قاسم صاحب نے عین اس وقت جس وقت پنڈت صاحب تقریر کر رہے تھے، اپنی
 کرسی سے اٹھ کر آہستہ سے منشی اندرمن صاحب سے یہ کہا کہ آپ اگر خود کچھ نہیں بیان فرماتے
 تو یوں ہی کیجئے کہ آدھے وقت میں تو پنڈت صاحب جو کچھ ان کو بیان کرنا ہو، کر لیا کریں اور
 آدھے وقت میں آپ اس کا ترجمہ کر دیا کریں، جو ہم بھی کچھ سمجھیں“

اردو اور فارسی زبان کے مصنف منشی اندرمن یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ جلسہ کے حاضرین جس زبان کو
 سمجھتے ہیں، ہم اس سے ناواقف ہیں۔ اس لئے انہوں نے مولانا کی پیش کش کے جواب میں فرمایا کہ
 ”سچ تو یہ ہے کہ مجھ کو کبھی لکھ دینے کا اتفاق نہیں ہوا، جو لوگ یہ کام کرتے رہتے ہیں، انہیں

سے ہو سکتا ہے، اس لئے میں معذور ہوں“ ص ۶۱

یوں منشی جی بھی کترات گئے، حاصل یہی ہوا کہ شریک ہوئے اور نظا ہر کچھ گفتگو میں ہندوؤں نے حصہ

ضروریاً، لیکن میلے کے ان دونوں سالوں میں نتیجہ کے لحاظ سے ہندوؤں کی حیثیت کو یا صاف ہو ہی نہ کر رہ گئی تھی۔

اور یہ حال تو مباحثہ میں حصہ لینے والے فریقوں کا تھا کہ مسلم ایک فریق کا وجود قریب کا عدم ہی کے رہا۔ اب سنئے انعقاد میلہ اور مباحثہ میں حصہ لینے والے حضرات جب ”محاسن مباحثہ“ میں جمع ہو گئے، تو پادری نولس صاحب کی طرف سے گفتگو کی شرطوں اور قیدوں کا سوان اٹھایا گیا، اور سب سے پہلے اس سلسلہ میں وقت کے مسئلہ کو اہمیت دی گئی، اصولاً خود سیدنا الامام الکبیرؒ بھی تحدید وقت کے قاعدے کے حامی تھے۔ حضرت نے پادری نولس سے کہا بھی تھا کہ تعین وقت کی وجہ یہ ہے کہ

”مبادا کوئی شخص مفت مغز زنی کرنے لگے، اگر وقت محدود نہ کیا جائے گا، تو ایسا شخص

بے وجہ مغز کھائے گا، اور اس کے سوا (دوسروں کو) بولنے کی گنجائش نہ ملیگی۔“ (سنہ ۱۸۵۷ء)

آپ ہی کی طرف سے یہ تجویز بھی پیش ہوئی تھی، کہ واقعی دین کی تحقیق مقصود ہے تو ایک صورت اوقات کی تعین و تقسیم کی یہ ہو سکتی ہے کہ

”مباحثہ تین دن تک اس طور پر رہے کہ ایک روز ایک مذہب والا اپنے دین کے

فضائل گھنٹہ دو گھنٹے بیان کرے، اور پھر اس پر دوسرے مذہب والے اعتراض

کریں اور جواب سنیں۔“

اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو، یعنی مباحثہ کے تینوں فریق (ہندو، مسلمان، عیسائی) کے لئے ایک ایک

دن نہیں دیا جاسکتا، تو آپ ہی نے دوسری متبادل تجویز پادری صاحب کے سامنے یہ رکھی، کہ

”درس (یعنی تقریر) کے لئے کم از کم ایک گھنٹہ، اور زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے دیئے

جانا مقرر ہوں، اور سوال و جواب (تنقیدی اعتراضوں) کے لئے دس منٹ سے بیس

منٹ تک۔“

لیکن ہوا یہی کہ پہلے سال کے میلے میں تو خیر

”مدت وعظ (درس) پندرہ منٹ، اور سوال و جواب کی مدت ۱۰ منٹ قرار پائی“

لکھا ہے کہ

”اگرچہ اس امر میں مولوی محمد قاسم صاحب نے چاہا کہ مدت وعظ اور بڑھادی جلئے، اور یہ بھی فرمایا کہ اتنے عرصہ میں حقیقت مذہب کا حقت ثابت نہ ہو سکے گی مگر عیسائیوں نے نہ مانا“ —

تاہم ۱۵ منٹ کی مدت بھی غنیمت تھی، دوسرے سال کے میلے میں توحید پر کردی گئی، کہ ”پادری نولس صاحب نے کہا کہ ہر ایک شخص کے درس و سوال و جواب کے لئے ۵ منٹ کی مدت مقرر ہو۔“

گھنٹہ دو گھنٹے کی جگہ درس یعنی تقریر، اور سوال و جواب (تنقیدی اعتراضوں) دونوں کے لئے پندرہ منٹ اور دس منٹ بھی، بلکہ یہ حکم کہ سب کچھ تقریر بھی، اور سوال و جواب بھی، ان سارے قصوں کو ۵ منٹ میں ختم کر دیا جائے، لکھا ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے لاکھ کہا گیا کہ ”۵ منٹ میں تو کچھ بھی بیان نہیں ہو سکتا“

سمجھایا جاتا تھا کہ

”ذبیو جھگڑے جو فروغ سمجھے جاتے ہیں، ان میں ہفتوں پنچایت و بحث ہوتی ہے، یہ

تحقیق مذہب ۵ منٹ میں کیونکر ہو سکتی ہے“ —

مسلمانوں کے نمائندے یہ بھی کہتے رہے کہ

”ہم لوگ بھی تو اس جلسہ کے ایک رکن ہیں، ہماری رائے کی رعایت ضرور ہے“ — مباحثہ

شاہ جہاں پور

سیدنا الامام الکبیر بار بار فرماتے تھے کہ

”پہلے سے کون اپنے مطالب کو ناپ تول کر لاتا ہے، جو دقت قلیل محدود الطرفین میں بیان

کرے“ — ۴۵

لکھا ہے کہ ایک دفعہ تو آپ نے یہ بھی فرمایا کہ

”جس مذہب میں ایک دو فضیلت ہو، تو وہ دو چار منٹ میں بیان کر سکتا ہے، پر جس کے

مذہب میں ہزاروں فضائل ہوں، وہ اتنے تھوڑے عرصہ میں کس طرح بیان کر سکتا ہے؟“ ۴۹

طرفہ ماجرایہ ہے، کہ پہلے ہی میلہ میں خود پادری نولس صاحب جنہوں نے بضد ہو کر ۱۵ منٹ سے زیادہ

درس یا تقریر کے لئے دینے سے انکار کیا تھا، وہی خود جب درس دینے کیلئے کھڑے ہوئے اور ۱۵ منٹ

ختم ہو گئے، اپنے خیال میں پادری صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کی تقریر برپوری نہ ہو سکی، تو لکھا ہے، کہ

”مولوی محمد قاسم صاحب غیرہ کی طرف مخاطب ہو کر کیا کہتے ہیں“

سنئے کیا کہتے ہیں؟

”اگر آپ صاحب مہربانی فرما کر کچھ اور مہلت دیں، تو ہم کچھ اور بیان کر لیں“

مولویوں کے عام طبقہ کی طرف سے پادری صاحب کی اس درخواست کے جواب میں جو کچھ کہا گیا تھا،

اس کا ذکر تو میں کسی دوسرے موقعہ پر کر چکا ہوں، لیکن سیدنا الامام البکیر نے آگے بڑھ کر اس وقت۔

فرمایا تھا کہ

”پادری صاحب ہم آپ کی طرح نہیں کہ اجازت ہی نہ دیں، ہماری طرف سے اجازت ہے۔

آپ پندرہ منٹ کی جگہ بیس منٹ بیان کریں، پچیس منٹ بیان کریں، تیس منٹ بیان کر دیں،

آپ حسب دل خواہ بیان کر لیں“ ۵۰ میلہ خدا شناسی

مگر اس تجربہ کے بعد بھی دوسرے میلہ میں جب وقت کا سلسلہ چھڑا تو انہیں پادری نولس صاحب نے ۱۵

منٹ کو گھٹا کر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں پانچ منٹ کر دیا۔ اگرچہ اسی دوسرے میلے میں دوسرے دن ایک اور

پادری صاحب کو نولس صاحب نے اپنی امداد کے لئے طلب کیا تھا، جن کا نام پادری اسکاٹ تھا، اور

مشہور تھا کہ وہ منطق کی کسی کتاب کے مصنف ہیں، ایسی اچھی کتاب فن منطق میں لکھی ہے کہ حکومت کی طرف

سے مشہور تھا کہ پانسور و پے انعام کے طور پر ان کو دیئے گئے ہیں، بہر حال کہنا یہ ہے کہ جب یہی پادری

اسکاٹ آئے اور ان کو معلوم ہوا کہ تقریر دوسری کے لئے کل ۵ منٹ کا وقت دیا گیا ہے، تو انہوں نے

اس کی مخالفت کی اور کہا

”درس کے لئے ایک گھنٹہ سے کم نہ ہونا چاہئے، اس باب میں مسلمانوں کی رائے ٹھیک ہے“

اسکاٹ صاحب بار بار کہتے تھے کہ

”ایک گھنٹہ سے کم میں کوئی کیا بیان کرے گا“ ص ۱۲

خیر یہ قصہ تو وقت کی تحدید و تعین کے متعلق تھے، گویا میلہ خدا شامی کے اشتہار میں جن شرائط کی تفصیل کا وعدہ کیا گیا تھا، ان میں ایک شرط کا ہنجا تو یہ ہوا۔ دوسری شرط جس کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے میلے میں اسے کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی، لیکن دوسرے میلے میں دیکھا جاتا ہے کہ تمام شرطوں میں اسی کو اہم ترین شرط قرار دیا جا رہا ہے، یعنی یہ چاہا گیا کہ مباحثہ سے پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ کس ترتیب سے بحث ہوگی، مباحثہ شاہ جہاں پور سے معلوم ہوتا ہے، کہ سیدنا امام الکبیر فرماتے رہے کہ واقعی مقصد اس میلہ کا اگر اثبات تحقیق مذہب ہے، تو اس کی طبعی ترتیب یہ ہونی چاہئے کہ

”اول ذات باری میں گفتگو ہو، کہ وہ ہے یا نہیں، اور ہے تو ایک ہے یا متعدد، پھر صفات

باری میں گفتگو ہو کہ صفات مخصوصہ ذات خالق کیا ہیں، اور کون کون سی صفات اس میں پائی

جاتی ہیں، کون سی نہیں پائی جاتیں، پھر تجلیات باری میں گفتگو ہو“

تجلیات باری کا کیا مطلب ہے، اس کی طرف اجمالی اشارہ کے بعد فرمایا گیا کہ

”نبوت میں گفتگو ہو، کہ انبیاء علیہم السلام کی ضرورت ہے کہ نہیں، اور کون ہے، کون نہیں،

اس کے بعد احکام میں مباحثہ ہو، کہ کون سا حکم اصول مذکورہ پر منطبق ہو سکتا ہے، اور کون سا حکم

منطبق نہیں ہو سکتا، اور کون سا قابل تسلیم ہے“ ص ۵۲

۱۵ بحث کی حد تک آپ نے آخر میں اس سوال کو بھی فہرست مباحثہ میں شریک کر دیا تھا، لیکن اسی کے ساتھ جو اصل حقیقت اس باب میں ہے اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا تھا۔ لکھا ہے کہ حضرت والا نے یہ بھی اسی کے ساتھ فرمایا تھا، کہ اگرچہ بروئے انصاف ”بعض نبوت نبوت شخص معین و صحت و روایت“ یعنی ثابت ہو جائے فلاں شخص نبوت کے دعوے میں صادق ہے، اس کی طرف جو حکم اور جو بات بھی صحیح ذریعہ سے منسوب ہو، بہر حال فرمایا گیا تھا کہ ان دونوں باتوں سے مطمئن ہو جانے کے بعد عقل و نار سے احکام کی بھلائی اور برائی کی تفتیش امر لا ظالم بلکہ نازیبا ہو (باقی ص ۳۹۶ پر)

مگر بجائے اس ترتیب کے آغاز جلسہ ہی میں جیسا کہ لکھا ہے کہ منشی پیارے لال بانی جلسہ نے ایک کاغذ اردو لکھا ہوا پیش کیا کہ یہ پانچ سوال ہماری طرف سے پیش ہوتے ہیں سیدنا الامام الکبیر کے پیش کردہ سوالات کے درج کرنے کو بعد مناسب معلوم ہوتا ہے، ان سوالوں کو بھی ملاحظہ فرمایا جا (۱) دنیا کو پریشور (خداوند تعالیٰ) نے کس چیز سے بنایا، اور کس وقت اور کس واسطے - (۲) پریشور کی ذات محیط کل ہے یا نہیں، (۳) پریشور عادل ہے، اور رحیم ہے، دونوں کس طرح - (۴) وید، بایبل، اور قرآن کے کلام الہی ہونے کی کیا دلیل ہے - (۵) نجات کیا چیز ہے، اور کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔

یہی وہ سوالات ہیں، جن کے متعلق عرض کر چکا ہوں، سمجھا جاتا تھا کہ پنڈت دیاستدجی نے ایک ہفتہ پہلے منشی اندمن کے ساتھ چاندپور پہنچ کر کافی غور و خوض کے بعد مرتب کر کے منشی پیارے لال کے حوالہ کیا تھا۔

حیرت ہوتی ہے، کہ دوسرے میلہ میں بھی کل دو دن ہی خدا شناسی پر بحث کرنے کے لئے مقرر کئے گئے تھے، لیکن ان دو دنوں میں ہی اب اسے کیا کہئے، کہ تجدید وقت، اور سوالات کی ترتیب ہی کے قصوں میں جیسا کہ مباحثہ شاہجہانپور میں لکھا ہے کہ

”روز اول اصرار اور احکام ہی میں وقت جلسہ گذر گیا اور گفتگو نہ ہونے پائی“ ۵۴

خود سوچنا چاہئے کہ جہاں اتنی بے دردی کے ساتھ غیر ضروری، اور ذیلی رگڑوں جھگڑوں میں وقت کو

(گذشتہ صفحے سے) پتہ کی بات اسی کے بعد یہ فرمائی گئی کہ عقل سے یہ کام (یعنی احکام کی برائی بھلائی کا پتہ پرانا، ممکن ہو سکتا تھا تو انبیاء علیہم السلام کی ضرورت ہی کیا تھی، اور نبی کا کہنا سب واجب التحظیم ہو گا تو پھر جو کچھ وہ فرمائیں بہ سر و چشم۔ مگر مباحثہ شاہجہانپور

۱۵ پنڈت جی کو شاید اپنے اسی سوال پر سب سے زیادہ ناز تھا۔ سیدنا الامام الکبیر کی ”تجلیات باری“ پر بحث کرنے سے غرض ان کے اسی سرمایہ ناز سوال کی بیج کئی مقصود تھی۔ کائنات حق تعالیٰ کی تجلی گاہ ہے۔ اسی میں اس سوال کا جواب پوشیدہ ہے کہ خدا نے عالم کو کس چیز سے بنایا۔ تفصیل کے لئے حضرت دالاکئی کتابوں کو پڑھئے تو فقیر کی مختصر کتاب ”الدر الثمین“ کو دیکھ لیا جائے ۱۶

ضائع کیا جائے، وہاں آدمی اپنے اس ظن کو کہاں تک قائم رکھ سکتا ہے کہ ”خدا شناسی“ کے نام سے لوگوں کو جو جمع کیا گیا تھا۔ واقعی مقصد اس اجتماع کا ”خدا شناسی“ ہی کی صحیح راہ کا پتہ چلانا تھا، سیدنا الامام الکبیرؑ تو کبھی کبھی ان ہی حالات کو دیکھ دیکھ کر فرما دیا بھی کرتے تھے، کہ واقعی خدا شناسی اگر مطلب ہے، تو اس کا طریقہ یہ نہیں ہوتا، مباحثہ شاہ جہان پور میں حضرت والا کا یہ فقرہ نقل بھی کیا ہے، کہ ایک دفعہ منشی پیارے لال کو مخاطب کر کے آپ نے کہہ بھی دیا تھا کہ یہ جو کچھ کیا جا رہا ہے، صرف جیلہ ادبہا نہ ہے، حضرت والا کے مجنبہ الفاظ یہ تھے کہ

”منشی صاحب آپ نے دیکھا پادری صاحب نے کیسے کیسے جیلہ ادبہا نہ کئے۔“

سوالات کی ترتیب کے قصے میں بھی آپ نے اسی جیلہ ادبہا نہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

”اگر اثبات و تحقیق مذہب پر نظر ہے تو ترتیب عقلی (ان سوالوں) کی یہ ہے، جو ہم نے کل عرض کی، اور اگر اثبات مذہب سے کچھ بحث نہیں تو منشی پیارے لال صاحب ہی کے فرمانے کا اتباع ٹھیک ہے۔“

کل دو دن ان میں بھی کامل ایک دن کو اس قسم کے لایعنی مشاغل میں صرف ہوتے ہوئے دیکھ کر سیدنا الامام الکبیرؑ نے جب یہ تجویز پیش کی کہ ایک دن بڑھا کر تین دن کر دیجئے، اور اس پر حبیب اللہ لکھا ہے،

”پادری نولس کا یہ کہنا کہ ہم کو زیادہ فرصت نہیں آج ادکل ہی ٹھہر سکتے ہیں۔“

سیدنا الامام الکبیرؑ سے نہ رہا گیا، جھنجھلا کر آپ نے پادری نولس کو خطاب کر کے کہا تھا

”یہ بات (یعنی عدم الفرصتی کا عذر) ہمارے کہنے کی تھی، باوجود افلاس و بے سروسامانی

قرض دام لے کر اپنی ضرورتوں پر خاک ڈال کر ایک مسافت دور دراز قطع کر کے یہاں

پہنچے ہیں، اور اس پر یہ قول ہے کہ جب تک حسب دل خواہ فیصلہ نہ ہو جائے گا، نہ

جائیں گے۔“

اپنے اس حال کو بیان کرنے کے بعد جس میں جہاں تک میر خیال ہے، واقعہ ہی کا اظہار کیا گیا تھا جس کی تائید کتاب ”جواب ترکی بہ ترکی“ کی اس اطلاع سے بھی ہوتی ہے، کہ چاند پوری نہیں، بلکہ اس کے بعد رڑکی میں پنڈت دیانند سرسوتی اور سیدنا الامام الکبیر کے درمیان جو معرکہ پیش آیا دونوں کی مرتبہ رودادیں سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے چھپ کر شائع نہ ہو سکیں، لکھا ہے کہ

”بوجہ تہی دستی یہ امید ہی نہیں، کہ روداد مباحثہ کو چھاپیں، ورنہ چاند پور، اور رڑکی کا واقعہ ہی کیوں آج تک یوں پڑا رہتا۔“ ۳

ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں چند وقتوں کے ان مختصر رسالوں کی چھاپی کا سرمایہ مہیا نہیں ہو سکتا تھا، اسی زمانہ میں کیوں تعجب کیجئے اگر نانوۃ سے چاند پور تک پہنچنے کے لئے قرض دام سے کام لینا پڑا ہو۔ بہر حال اپنے اس حال کو پیش کر کے پادری صاحب سے فرمایا گیا تھا کہ اب آپ اپنے حال کو ملاحظہ فرمائیے، کہ

”آپ صاحب تو اسی کام کے نوکر، آنے جانے میں کوئی دقت نہیں،“ مگر مباحثہ شاہجہا پور لیکن باایں ہمہ جیسا کہ آگے لکھا ہے

”پادری صاحبوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔“

خیر اس حد تک تو جو کچھ کیا جا رہا تھا، اس سے صرف یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ”تلاش حق“ اور ”تحقیق مذہب“ کے نصب العین کا اعلان کر کے لوگوں کو جو بلایا گیا تھا، منت نئے شاخسار نے نکال نکال کر حیلوں اور جوالوں سے اسی کو پس پشت ڈالنے کی کوشش ہو رہی تھی، لیکن قصہ اسی پر ختم نہیں ہو جاتا، عرض کر چکا ہوں کہ مباحثہ کے فرتق بظاہر خدا شناسی کے اس میلے میں تین تھے ہندو مسلمان عیسائی لیکن ان دونوں میلوں میں سے پہلے میلے میں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ہندوؤں کی طرف سے ابتدا میں مثنیٰ پیارے لال صاحب بانی میلہ نے اردو ہی میں تقریر شروع کی، لیکن پادری نوس اور ایک دوسرے پادری جن کا مرتبہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کے بعد ہے، ان دونوں کی باہمی سرگوشی کے بعد بجائے تقریر کے ہندوؤں کی طرف سے پڑھنے والوں نے ایسی تحریریں پڑھیں جن کی زبان کے سمجھنے والے پورے

میلے میں تین چار آدمی سے زیادہ نہ تھے، یہ تو خیر بجائے خود تھا، دل چسپ لطیفہ یہ پیش آیا، کہ پہلے میلے میں دوسرے دن یہ سوال اٹھایا گیا کہ مباحثہ کے ہر فرقہ کی طرف سے گفتگو میں حصہ لینے والوں کی تعداد معین کر دی جائے۔ بات معقول تھی، تسلیم کر لی گئی، طے ہو گیا کہ ہر فرقہ کی طرف سے پانچ پانچ آدمی اس کام کے لئے چن لئے جائیں، مسلمانوں نے تو پانچ آدمی اپنے چن لئے، مگر ہندوؤں کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا،

”ہمارا ہر فرقہ جدا ہے، ہر ایک فرقہ میں سے پانچ پانچ آدمی چاہئیں۔“

مطلب جس کا یہی ہوا کہ دو فرقے بھی اگر ہندوؤں کی طرف سے جلسہ میں شریک تھے، تو ان کی تعداد مجموعی طور پر اس طریقہ سے دس ہو گئی، لیکن اس کا پتہ نہ چلا کہ کتنے فرقے ہندوؤں کے قرار پائے، بہر حال مطالبہ پیش ہوا، لکھا ہے کہ

”چنانچہ اسی کے موافق قرار پایا۔“ ملا میلہ خدا شناسی

اس میلے کی حد تک تو معاملہ اسی پر ختم ہو گیا۔ لیکن دوسرے میلے میں جو کچھ دیکھا گیا، اس کا سراغ ان اطلاعات سے ملتا ہے، جنہیں اس میلے کی روداد میں ہم پاتے ہیں۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ مشرانط وغیرہ کے طے و تصفیہ کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ ایک سبکدوش کمیٹی بنادی جائے جس کے لئے ہر فرقہ کے چند اشخاص چن لئے جائیں۔ یہی کیا گیا۔ ہندوؤں کی طرف سے سبکدوش کمیٹی میں بجائے منشی سیارے لال بانی جلسہ اور ان کے ایک رفیق منشی رکتا پرشاد کے پنڈت دیا تندر سوتی اور منشی اندرن پہلے شریک کئے گئے تھے، لیکن جب تعین اوقات وغیرہ کے مسئلے پر گفتگو ہونے لگی، تو لکھا ہے کہ

”پادری صاحب یہ چال چلے کہ منشی پیارے لال اور رکتا پرشاد کو بھی رکن شوریٰ قرار دیا جائے

اور یہ کہا کہ وہ بانی مبنی جلسہ میں، ان کی رائے یعنی بھی ضروری ہے۔“

یہ بات بھی مان لی گئی، جب یہ سب کچھ ہوا، تب سنئے، بیان کیا ہے کہ پادری نولس صاحب نے سب کو خیمہ میں بلالیا، اور وہی پرانا حریہ جو ہندوستان کے مسلمانوں کے مقابلہ میں اول سے آخر تک استعمال ہوتا رہا ہے وہی ہتھیار نکل آیا، یعنی پادری نولس نے کہا۔

”اعتبار کثرت آراء کا چاہئے“ ۱۔

ادھر پادری صاحب کی طرف سے یہ اعلان ہوا، اور اس کے بعد اول سے آخر تک مسلمانوں کو مسلسل جبر کا تجربہ ہوتا رہا۔ مباحثہ شاہجہاں پور میں بار بار مختلف پیرایوں میں اس کا اظہار کیا گیا ہے، خلائی تحدید وقت ہی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ منشی پیارے لال

”بوجہ توافق پنہانی اور نیز سنڈت صاحب بھی اُن کی پادری صاحب کی، ہاں میں ہاں ملنے لگے“ ۲۔

آگے اسی کے بعد تقریباً اسی واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ

”غرض جس بات کو پادری نولس صاحب کہتے تھے، حضرات ہندو بھی ہاں میں ہاں ملا دیتے اور تسلیم کرتے تھے“ ۳۔

ایسے مواقع بھی پیش آئے کہ منشی پیارے لال کو براہ راست مخاطب کر کے سیدنا امام الکبیر کو یہ کہنا پڑا،

”منشی صاحب ہم کو آپ سے بڑی شکایت ہے کہ ہم ادھر پادری صاحب دونوں آپ کے بلائے ہوئے، دونوں آپ کے مہمان ہیں، آپ کو لازم تھا کہ دونوں کو برابر سمجھتے، مگر جب آپ ڈھلتے ہیں، انہیں کی طرف ڈھلتے ہیں، جب تائید کرتے ہیں، ان ہی کی کرتے ہیں، انہیں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں“ ۴۔

اور مولوی محمد طاہر یعنی مولوی مدن دالے موتی میاں جو میلے کے مہتمم تھے۔ انہوں نے تو کھڑے کھڑے صاف و صریح الفاظ میں منشی پیارے لال سے لکھا ہے کہ ترش رو ہو کر کہا کہ

”میں آئندہ سال شریک جلسہ نہ ہوں گا، اس کے کیا معنی کہ مسلمان جو کہتے ہیں، ان کے کہنے پر تو التفات بھی نہیں کرتے، اور پادری صاحبوں کے کہنے پر بے سوچے سمجھے ہاتھ اٹھا کر تسلیم کر لیتے ہو“

اور اسی موقعہ پر موتی میاں کی زبان سے بے ساختہ وہ فقرہ نکل گیا تھا، جسے پہلے بھی نقل کر چکا ہوں، یعنی

”یہ بات بالکل سازش اور اتفاق باہمی پر دلالت کرتی ہے“ ۵۔

منشی بیارے لال ان باتوں کو سنتے تھے اور عذر و معذرت کے بارد الفاظ میں مختلف قسم کی مجبوریوں کا ذکر کرتے بہر حال خدا شناسی کے میلے کے پہلے سال ہی میں جو دیکھا گیا تھا، جیسا کہ اس سال کی روداد کے مرتب کرنے والوں نے لکھا ہے کہ

”اگرچہ بظاہر مناظرہ کرنے والے تین فریق قرار پائے تھے، مسلمان، عیسائی، ہندو، مگر درحقیقت اصل گفتگو مسلمان اور عیسائیوں میں تھی“ ص ۵

کھل کر اس کا جو مطلب تھا، وہ دوسرے سال کے میلے میں لوگوں کے سامنے اس شکل میں آگیا کہ عیسائی اور ہندو دونوں کو ایک فریق بنا کر مسلمانوں کے مقابلہ میں گویا کھڑا کر دیا گیا ہے، اور وہی ہندوستان جہاں کچھ ہی دن پہلے عیسائی پادریوں کی تبلیغی جدوجہد کے مقابلہ میں سمجھا جا رہا تھا کہ ”ہر ہندوستانی (خواہ مسلمان ہو یا ہندو) عیسائیت کے عروج اور ترقی کو اپننا ہے“ کی بربادی سمجھتا تھا، اسی لئے ردنصاری میں جو کتابیں چھپتی تھیں، ان کو ہندو مسلمان سب پڑھتے تھے“

اور صرف پڑھتے ہی نہ تھے، بلکہ ردنصاری میں جو کتابیں لکھی جاتی تھیں، عموماً جن کے لکھنے والے مسلمان ہی ہوتے تھے، لکھا ہے کہ ان ہی کتابوں کو ہندو اپنے پریسوں میں چھپو کر اشاعت کرتے تھے، اس سلسلہ کی ایک مشہور کتاب ”غایۃ الشیوخۃ فی الحج المبرور“ جسے لکھنؤ کے ایک عالم مولوی محمد شاہ لکھنوی نے لکھی تھی، یہ کتاب

”منشی نول کشور نے ۱۲۹۷ھ میں چھپوائی“ فرنگیوں کا جال ص ۳۸

چھپوائی کے لفظ کا بظاہر مطلب یہی ہے، کہ طباعت کے سارے مصارف منشی نول کشور نے خود برداشت کئے تھے

اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز مثال اسی سلسلہ کی اسی کتاب میں نقل کی گئی ہے کہ ٹانڈہ بچا، ضلع ہوشیار پور کے ایک صاحب جن کا نام مولوی شیخ احمد تھا، اور پادریوں نے جو طوفان ملک میں برپا کر رکھا تھا، جانتے تھے کہ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ بمخلہ دوسری سیاسی چالوں کے ایک

جال بھی ہے، اسی نے لکھا ہے کہ

”ان کا طریقہ تھا، جس جگہ شام کو پادری جاتا، اسی جگہ پر صبح کو جاتے، اور وہ (یعنی پادری) پھنسا
کا جو جال بچھا کر آتا اس کو پاش پاش کرتے“

سننے کی بات یہ ہے کہ یہی شیخ احمد صرف مسلمانوں ہی کو نہیں، بلکہ

”ہندو مسلمانوں دونوں کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی تلقین کرتے“، ۳۰ فرنگیوں کا جال

اللہ اللہ وہی ہندوستان جہاں ۱۹۲۹ء میں دیکھا گیا تھا کہ رد نصاریٰ میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو اپنے
خریج سے ہندو چھاپ رہے ہیں، وہیں چند ہی سال کے ہیر پھیر میں یہ کیسا دردناک انقلابی نظارہ تھا کہ
عیسائی پادری اور ہندوؤں کے پنڈت ایک صف میں بیٹھے ہیں، اور مسلمان دوسری صف میں اپنی دیدہ
عبرت نگاہ سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ جو تجویز بھی ان کی طرف سے پیش ہوتی ہے، اس کو مسترد کرنے میں
عیسائیوں کے پادری اور ہندوؤں کے پنڈت دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گویا کوئی اندر دنی مواہد
کئے ہوئے ہیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں، میلہ کس نام سے جمع کیا گیا تھا، اور اس سے کام کیا لیا جا رہا تھا، اور یہ قصہ
تو شرائط و قیود کے تھے، باقی میلے کا حقیقی موضوع یعنی خدا شناسی پر مباحثہ، سو جہاں تک واقعات سے
معلوم ہوتا ہے، اور مباحثہ شاہ جہاں پور میں لکھا بھی ہے، کہ

”قلت فرصت کا بہانہ کر کے مباحثہ کو مختصر کر دینا“ ص ۱۷

پادری زیادہ تر اسی کے درپے تھے، بہ مشکل تھوڑا بہت وقت جو ملا بھی، اس میں سچ پوچھتے، تو سر جوڑ کر
کسی مسئلہ کی تحقیق و تلاش کا جو عام طریقہ ہے، اس سے گریز ہی کی کوشش کی گئی، ہمارے مصنف امام نے
اس میلہ کا جہاں تذکرہ اپنی کتاب میں کیا ہے، وہاں شرائط و قیود کے اجالی ذکر کے بعد جو یہ ارقام
فرمایا ہے، کہ

”آخر گفتگو ہوئی، طرز گفتگو کی نہ تھی، بلکہ ہر شخص اپنی باری پر کچھ بیان کرتا تھا“ ص ۱۸

سوانح قدیم

اس سے ان کی غرض یہی ہے کہ حق کی تلاش و جستجو کا اس قسم کی مجلسوں میں جو علمی یا طبعی طریقہ ہے، وہ اختیار نہ کیا گیا، بلکہ وہی بات کہ اپنی اپنی باری پر بولنے یا لکھی ہوئی تحریروں کے پڑھنے کا صرف موقعہ لوگوں کو دیا گیا، مگر یہ گفتگو جو بطرز گفتگو نہ ہوئی، ”آپ سن ہی چکے، کہ ایک مستقل فریق یعنی ہندوؤں کی طرف سے اگرچہ ابتدائی تقریر منشی پیارے لال کی اسی زبان میں شروع ہوئی جسے میلہ والے سمجھ سکتے تھے، لیکن پادری نولس اور ان کے نائب دوسرے پادری کی سرگوشی کے بعد یہ قصہ بھی ختم ہو گیا، اور منشی پیارے لال دانی تقریر جو سمجھی گئی، اس کا رنگ بھی جو کچھ تھا، اس کا اندازہ اسی نمونہ سے ہو سکتا ہے، جو پہلے سال کے میلے کی روداد میں درج ہے، لکھا ہے، کہ منشی جی نے کھڑے ہو کر ایک تحریر پڑھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ

”میاں کبیر نے کنول کے پھول میں جنم لیا، اور ان کے پتھ میں جا گئے سوتے، برابر اسانا

چلتا رہتا ہے“ ص ۵

اسی سے سمجھا جاسکتا ہے، کہ میلہ کے انعقاد کا جو نصب العین بتایا گیا تھا، خود منشی جی کو اس سے کتنی دل چسپی تھی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا، کہ جس شخص کے دینی احساسات اتنے سطحی اور لپٹ ہوں، اسی میں ایسے عظیم الشان مقصد کے لئے میلہ قائم کرنے کا تصور پیدا ہی کیسے ہو سکتا ہے، اسی روداد میں لکھا ہے، کہ جب جلسہ ختم ہو رہا تھا، تو منشی جی نے ایک دوسری تحریر بھی پڑھی جس میں

”گوشت کے حلال ہونے پر اعتراض تھا“ ص ۱۱

جس کے معنی یہی ہوئے، کہ دین اور مذہب کی حقیقی روح اور انسانی فطرت کی گہرائیوں میں جن پوشیدہ سوالات کا حل مذہب ہے، منشی جی بے چارے کو ان باتوں کی ہوا بھی نہیں لگی تھی، اور ”بادی خانہ میں لاکر مذہب کو بند کر دینا“ اس عامیانہ خیال سے آگے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔

بہر حال یہ بھی غنیمت تھا کہ جو کچھ بھی انہوں نے پڑھا، ایسی زبان میں پڑھا جسے سننے والے سمجھ تو رہے تھے، لیکن ان کے سوا ہندوؤں کی طرف سے پہلے میلے میں بھی، اور دوسرے میلے میں بھی ”زبان یارن ترکی و ن ترکی نمی دانم“ کے سبق کی مشق کی گئی۔ پہلے میلے میں ”فقر سرہنگ“ کے

تام سے جس تحریری بیان کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے متعلق روداد میں لکھا ہے کہ اس کے سوا اور کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ

”ہندوؤں کی نسبت دربارہ اعمال و اقوال کچھ دور دبک تھی“ ص ۷۱

انتہا تو یہ ہے کہ دوسرے سال کا میلہ جس میں خصوصیت کے ساتھ جیسا کہ لکھا ہے اشتہاروں اور اخباروں کے ذریعہ سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اب کی یادریوں کے سوا بڑے بڑے نامی گرامی پنڈت بھی آئیں گے، مشہور تھا کہ

”مجمع بڑے بڑے ویدانیتوں اور مشاہیر کا ہوگا“ ص ۷۱ مباحثہ شاہ جہاں پور

اور اس میں شک نہیں کہ شہرت کے مطابق وقت کی سب سے بڑی مشہور ہستی خود پنڈت دیانند سرسوتی جی ہی میلہ میں جلوہ افروز ہوئے، اور ان کے ساتھ منشی اندرمن بھی موجود تھے۔ اپنی چند خاص کتابوں کی وجہ سے ان کا نام بھی کافی ادنیٰ ہو چکا تھا، مگر عرض ہی کر چکا ہوں کہ منشی اندرمن مجھوں میں تقریر سے معذوری کا عذر کر کے جیسے آئے تھے، اسی طرح واپس ہو گئے، رہے پنڈت جی سوا آپ سن چکے کہ ”کے کا“ کے سوا سننے والے ان کی تقریر کا ایک لفظ نہ سمجھ سکے۔ عام طور پر چونکہ یہ مشہور تھا کہ پنڈت جی کا یہ عقیدہ ہے کہ مادہ اور روح یہ دونوں بھی خدا ہی کی طرح غیر مخلوق ہیں، اور کہار یا بڑھئی وغیرہ کاریگروں پر خدا کو قیاس کر کے کہتے ہیں کہ جیسے مٹی کے بغیر کہار برتن، اور کلڑی کے بغیر بڑھئی کر سی نہیں بنا سکتا، اسی طرح مادہ کے بغیر خدا بھی عالم کی کار سازی پر قادر نہیں ہے، اسی وجہ سے لکھا ہے،

”ہاں ایک دو بات اس قسم کی سمجھ میں آئیں، کہ جیسے کہار گھڑا وغیرہ برتن بناتا ہے“

اسی کے ساتھ اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے

”مگر ان دو ایک بات کے سوا اور کچھ کسی کی سمجھ میں نہ آیا“ ص ۷۲

الغرض ایک مسلم فریق کی نوعیت دونوں میلوں میں کچھ ایسی رہی، کہ اس کی طرف سے جو کچھ بیان کیا گیا مطلب اس کا یہی تھا کہ گویا کچھ بیان نہیں کیا گیا، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ پھر ان کو خدا شناسی کی تحقیق

کے اس میلے میں شریک ہی کیوں کیا گیا تھا، یا خود وہ کیوں اس میں شریک ہوئے، مگر وہی بات کہ خدا
خدا سنی کا یہ میلہ خدا شناسی کے لئے جمایا بھی گیا ہو؟

سچی بات تو یہ ہے، کہ ہندوؤں کی طرف سے تو خیر یہ طرز عمل جس وجہ سے بھی اختیار کیا گیا ہو، مرد و دادوں
کے پڑھنے سے تو صیرت ہوتی ہے کہ سب سے زیادہ پیش پیش پادریوں کا فریق اس میلے میں تھا، لیکن
ان کے نمائندوں میں بھی پادری نولس صاحب جن کے متعلق مشہور تھا کہ

”بڑے لسان، اور مقرر ہیں، (ان کا) دعویٰ ہے کہ یہ مقابلہ دین عیسوی دین محمدی کی
کچھ حقیقت نہیں“ ص ۳

اور اگر پادریوں کے عام بیانات اور تقریروں کو سن کر جن میں خود پادری نولس صاحب بھی تھے، سیدنا
الامام الکبیر نے فرمادیا تھا کہ

”پادریوں میں کوئی اس قابل نہیں معلوم ہوتا جس سے بظاہر کچھ اندیشہ خاطر ہو، ہاں ان
کی بے انصافی سے دل افسردہ ہوتا ہے“ ص ۲ میلہ خدا شناسی

لیکن باایں ہمہ دوسرے پادریوں کے مقابلہ میں پادری نولس صاحب کی تعریف بھی حضرت والا نے ان
الفاظ میں کی تھی

”پادری صاحبوں کی طرف سے وہ لوگ کھڑے ہوئے تھے جن کو گفتگو کا سلیقہ نہ تھا، الفاظ
سے اوقات کی خانہ پری کر دیتے تھے۔ مگر ہاں آج ہماری طبیعت مخطوط ہوئی، پادری صاحب
(یعنی نولس صاحب) بہت خوش تقریر اور صاحب سلیقہ ہیں“ ص ۳ میلہ خدا شناسی

مگر ان لسان مقرر جن کی خوش تقریری اور حسن سلیقہ کا سیدنا الامام الکبیر نے اعتراف بھی فرمایا تھا،
انہوں نے دونوں میلوں میں وقت تو کافی لیا۔ پندرہ منٹ کی مدت کی توسیع کی التجا بھی بے شرمی
کے ساتھ ان کی طرف سے جو پیش ہوئی تھی، اس کا ذکر تو کری چکا ہوں۔ لیکن باایں ہمہ دونوں میلوں میں
انہوں نے جو کچھ فرمایا، کیا عرض کیا جائے کہ کیا فرمایا

دین عیسوی کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل یہ بیان کی کہ دین عیسوی کی کتاب انجیل،

”دو ڈھائی سو زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے“ ص ۷

جس پر مولوی ابوالمنصور نے چبھتا ہوا فقر کہا بھی کہ

”قیوں کہو کہ اٹھارہویں صدی سے پہلے پہلے انجیل آسمانی کتاب نہ تھی“ ص ۹

مولوی صاحب نے جب دعویٰ کیا کہ انجیل کے ترجموں کی کثرت اٹھارہویں صدی اور اس کے بعد ہی ہوئی ہے، تو پادری صاحب نے مان بھی لیا کہ

”ہاں ترجموں کی کثرت تو اٹھارہویں صدی ہی میں ہوئی ہے“ ص ۹

اور اس سے بھی دل چسپ برہانی استدلال پادری نولس صاحب کا کرشمہ نیٹی کے بنیادی عقیدہ تثلیث کے ثبوت میں یہ تھا کہ

”دیکھو درخت ایک ہے پر اس میں جڑ بھی ہے، شاخیں بھی ہیں، پتے بھی ہیں“ ص ۳۸

اور بھی کئی چیزوں میں تین پہلو نکال کر کہنے لگے کہ اس سے بڑھ کر تثلیث کے ثبوت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے، اسی پر سیدنا الامام البکیر نے فرمایا تھا کہ تثلیث ہی کیا، مثالوں ہی پر بات ٹھہری تو درخت ہی میں

”ہزاروں شاخیں، ہزاروں پتے، ہزاروں پھول، ادبھر ہر شاخ، دہرگ ادبھل پھول میں کس قدر رنگیں انگتیں ہیں“ ص ۳۲

فرمایا کہ

”خیر پادری صاحب نے تثلیث ہی پر کیوں قناعت فرمائی۔ تریج، تخمیس، بلکہ تسدیس، تسبیح، دتین، بلکہ تالیف وغیرہ“

سب ہی کو عقیدہ بنا کر اسی قسم کی پیش پا افتادہ مثالوں سے باسانی ثابت کر دیا جاسکتا ہے۔

یہ حال تو پادری نولس کی استدلالی قوت کا تھا، امدان پر کسی نے جب اعتراض کیا کہ مسیح علیہ السلام نے تو فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کی کھوٹی ہوئی بھینٹوں کے لئے میں آیا ہوں، تو آپ بنی اسرائیل کے سواد مسزوں میں سمیحت کی تبلیغ کیوں کرتے پھرتے ہیں، شاید اس لطیفہ کی طرف کہیں پہلے بھی اشارہ گزرا ہے کہ اپنے ہاتھ

کی چھتری یا لٹھی کی طرف اشارہ کر کے پادری صاحب نے فرمایا
 ”دیکھو! یہ لکڑی بھی ہے اور لٹھی بھی ہے۔ لکڑی عام ہے اور لٹھی خاص“

پس نتیجہ یہ ہوا کہ

”عیسیٰ علیہ السلام خاص بنی اسرائیل ہی کے لئے آئے تھے، مگر جہاں خاص ہوتا ہے وہاں
 عام بھی ہوتا ہے“

کہنے والے نے سچ کہا تھا کہ جب پادری نولس عیسائی ہو چکے تو انسان جو ان سے عام ہے وہ بھی عیسائی
 ہو گیا، اب تبلیغ کی حاجت ہی کیا رہی۔ میں ان تفصیلات کو اس لئے نقل کر رہا ہوں، تاکہ اندازہ ہو کہ خدا
 شناسی ”کیا واقعی اس میلے کی غرض تھی، کیا ایسے عظیم اور اہم ترین موضوع پر گفتگو کر لئے کا یہی طریقہ
 ہو سکتا ہے۔

اور یہ مختصر داستان تو پادری نولس صاحب کی تھی، اب سنئے اسکاٹ صاحب جن کو دوسرے سیلر
 میں خاص طور سے میلے میں آنے کے بعد دعوت دی گئی تھی، وہی صاحب جن کو حکومت کی طرف سے
 پانسو روپے کا انعام منطق کی کسی کتاب کے ارقام فرمانے پر ارازا فی ہوا تھا۔ ان کی آمد آمد کی خبر جب
 میلے میں گرم ہوئی، اور اسکاٹ صاحب کی خواہش پر پادری نولس نے ۵ منٹ کے طے شدہ
 وقت کی جگہ چاہا کہ ایک گھنٹہ تقریر کا وقت کر دیا جائے، اس وقت سیدنا الامام الکبیر نے برہم ہو کر پادری
 نولس سے کہا تھا کہ

”کل ہم بہر ارمنت آپ سے اس بات کے خواستگار رہے کہ کم سے کم درس کے لئے
 ایک گھنٹہ عنایت کیجئے، ہمارے التماس اور مجز و نیاز پر تو آپ نے نظریہ فرمائی، آج اگر
 کسی کے کہنے سے اپنا نفع نظر آیا تو آپ ہم سے اسی بات کے خواستگار ہوتے ہیں جس کا ہم
 سے انکار کر چکے ہیں“

اور ذرا تیز و تندہی میں فرمایا کہ

”جو ہو چکا سو ہو چکا، اب کیا ہوتا ہے نہ وقت مقررہ میں تبدیلی ہو سکتی ہے، اور نہ پادری

اسکاٹ صاحب کو اجازت ہو سکتی ہے، یہ بات وقت شرائط کی تجویز کے ساتھ گئی،
اب کچھ نہیں ہو سکتا، ورنہ اس کے معنی یہ ہوئے، کہ ہم باوجودیکہ رکن مباحثہ میں، مباحثہ کے
حساب سے کالعدم ہیں، جو کچھ ہوئے آپ ہی ہوئے۔“

خیر یہ تو ایک ذیلی بات تھی سیدنا الامام الکبیر نے خلاف دستور یہ رویہ کیوں اختیار کیا تھا، اسے تو
چھوڑیے، کہنا یہ ہے کہ اسکاٹ صاحب کے علم و فضل سے پادری نولس صاحب اس قدر متاثر تھے، کہ
سیدنا الامام الکبیر کے اصرار کو دیکھ کر بولے

”آپ پادری اسکاٹ صاحب سڑتے ہیں“

گرچہ جواب بھی وقت پر خود سیدنا الامام الکبیر نے ان کو دے دیا تھا کہ
”خدا کی عنایت سے پادری اسکاٹ کے استاد ہوں، تو ان سے بھی مذہبوں، بلکہ انشا اللہ
تمام پادری بھی اکٹھے ہو جائیں تو نہیں ڈرتا۔“

پھر اصرار کی وجہ بھی آپ نے ظاہر کر دی

”مجھ کو فقط یہ جلتا تھا کہ بات مقرر کر کے کون قائم رہتا ہے اور کون پھر جاتا ہے۔“

پادری نولس صاحب کی بے انصافی اور استبداد کے پردے کو چاک کرنے کے بعد ان کی التجار کی
پذیرائی کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ

”گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ، دو گھنٹہ جس قدر چاہیں آپ درس مقرر کریں اور جسے چاہیں درس کے
لئے مقرر کریں۔“ ص ۵۵

بہر حال کہنا یہ ہے، کہ آئے تو اسکاٹ صاحب اس دھوم دھام سے، اور اپنے دین کی سچائی کے ثبوت
میں سب سے بڑی منطقی دلیل جو پیش کی وہ یہ تھی کہ

”جب تک عیسائیوں کی عملداری ہندوستان میں نہ تھی، ہندوستان میں کیسی کسی غارتگری
اور فتنہ و فساد اور رہزنی ہوا کرتی تھی، جب سے عیسائیوں کی عملداری ہوئی، کس قدر امن
وامان ہو گیا، سونا اچھا لیتے چلے جاؤ، کوئی پوچھتا نہیں، دیکھو گناہوں میں کتنی کمی آگئی۔“ ص ۵۶

جواب میں تو اس کے جیسا کہ واقعہ تھا، سیدنا امام الکبیرؑ ہی نے فرما دیا تھا

”یہ امن و امان عیسائی عملداری کی برکت نہیں ہے، اس امن و امان کی علت بجز پاس ملک اور آرزوئے ترقی تجارت اور کچھ نہیں، مذہب سے ۳۱ بات کو کچھ علاقہ نہیں،“ ص ۱۱۱

شاہ جہاں پور

اور گناہوں کی کمی کا جو ذکر پادری اسکاٹ نے کیا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت والا نے ام الخبائث (شراب، اور ام الخبائث زنا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ شراب خواری سزا کا لاکھ مذہبان کے یہاں بھی ممنوع ہے،

”نصرانیوں میں شاید ہی ایسا کوئی ہو جو اس گناہ سے بچا ہوا ہو“

اور پام الخبائث زنا و سو آپ نے دریافت کیا

”کیا پادری صاحبوں کو لندن کے اخباروں کی اب تک خبر نہیں، کہ وہ کیا لکھتے ہیں، اور

ہر روز کئی سو بچے ولد الزنا پیدا ہوتے ہیں، اور صبح کو راستوں پر پڑے ہوئے ملتے ہیں۔“ ص ۱۱۲

خبر سوال و جواب کی تفصیلات تو اصل روداد میں پڑھئے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پادری نوس کی تقریر

کے محوری عناصر اور اسکاٹ صاحب کے بیان کی روح جو آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے، کیا ان

سے واقف ہونے کے بعد دل میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ چاند پور کا یہ میلہ خدا شناسی کے لٹو

قائم کیا گیا تھا یا بقول سیدنا امام الکبیرؑ ”پاس ملک“ کے جذبات ہی کی یہ کار فرمایاں تھیں؟

اور بڑے پادری صاحبوں نے تو خیر جو کچھ کہا، کہا۔ میرے دوستوں تو اس وقت کھڑے ہو جاتے

ہیں، جب سوچا ہوں کہ سرزمین روہیل کھنڈ کے صحرائی مقام کے اسی میلے میں جس میں موسمی حالات کی

وجہ سے کم از کم پہلے سال شہر کے لوگوں کو شرکت کا موقعہ قدر تا کم ہی ملا تھا، زیادہ تر قرب و جوار کے

دیہاتوں کے لوگ میلے میں بھرے ہوئے تھے، کہ مباحثہ کی اس مجلس میں دیکھا گیا کہ ایک کالا پادری

مولاد ادا نامی اپنی کورنجی میں کورنجی کا اضافہ (العیاذ باللہ) ان گندے الفاظ سے کر رہا ہے، یعنی مصرعہ

کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے نبوت کا ذکر کر کے اپنی زبان اور اپنے دہن کو ان نجس الفاظ سے

آلودہ کر رہا تھا کہ (استغفر اللہ)

”بھنگیوں کا لالہ گوردی بھی ایسا ہی کہتا تھا“

اور اسی پر اس تیرہ نصیب نے اکتفا نہیں کیا، بلکہ خود اپنے آپ کو رسوا کرنے کے لئے انجیل کی ایک آیت کا غلط ترجمہ کر کے کہنے لگا کہ

”حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا ہے، کہ میرے بعد جو آئیں گے چور اور بٹ مار

ہوں گے“ ۱۹

قطع نظر اس سے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر افتراء پر دازی کر رہا تھا، اور اسی وقت امام فن مناظرہ مولانا ابوالمنصور نے ٹوک بھی دیا تھا کہ انجیل کی جس آیت کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے، اس میں تو ”یہ نہیں ہے کہ جو میرے بعد آئیں گے چور اور بٹ مار ہوں گے“

بلکہ برعکس اس کے اس کا مفہوم تو یہ ہے کہ

”جو مجھ سے پیش تر آئے، وہ چور اور بٹ مار تھے“

لیکن اس کو تو جانے دیجئے، سوچئے اس بات کو جس ماحول میں یہ جلسہ ہو رہا تھا، اچانک اسی جلسہ میں ایک دیدہ دہن کا لمے پادری کی زبان سے نکلے ہوئے ان نفروں کا انجام کیا ہو سکتا تھا۔ مسلمان سب کچھ برداشت کر سکتے تھے۔ ان کے مقرروں کو تقریر کے لئے وقت نہیں دیا جا رہا تھا، ان کی پیش کردہ ترتیب کے مطابق بحث کرنے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی۔ ان کے مقابلہ میں ہندوؤں کو نمائندہ پنڈتوں کو بھی ملا کر پادریوں اور ہندوؤں کی ایک صف قائم کر لی گئی تھی۔ ان کے عہد حکمت پر لعنت ملاتے ہوئے، برطانوی راج کی قصیدہ خوانی ہو رہی تھی۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا، وہ برداشت کرتے چلے جاتے تھے، لیکن اس سیاہ سینہ، سیاہ دل کا لمے پادری کی نجس اور گندی زبان سے ان کو اب جو کچھ سنایا گیا تھا، کیا اس کو وہ برداشت کر سکتے تھے، ہوش و حواس ان کے اس کے بعد کیا بجا رہ سکتے تھے۔

تاریخ شاہد ہے، کہ اسی قسم کا کوئی واقعہ چنگاری بن کر اڑا ہے، اور آبادیوں، ملکوں، قوموں کو اس نے

جلا کر خاک سیاہ کر دیا ہے۔ اب میں کیا عرض کروں، دوسروں کے متعلق تو نہیں کہہ سکتا، لیکن خدا شناسی کے ان دونوں میلوں کے مشتملات اور جو کچھ ان میں کہا گیا، اودھ لایا، سب کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اشقی القوم مولاداد کی تقریر کے ان الفاظ کو جب سوچتا ہوں، تو کچھ ایسا خیال گزرنے لگتا ہے، کہ دیوبندی حلقہ میں مکہ معظمہ کے نیم مجذوب کی وہ پیش گوئی جس کا پہلے بھی کہیں شاید ذکر گزرا ہے، یعنی غدر کے بعد حکیم عبدالسلام ملیح آبادی مکہ معظمہ گئے تھے، وہاں ان سے ایک صاحب جو نیم مجذوب سے آدمی تھے، حکیم صاحب کا بیان ہے کہ

”بہت شدہ دہ سے یہ فرمادیا کہ تم ہمیں (مکہ) میں رہو، ہندوستان مت جاؤ، اس واسطے کہ

وہاں انقلاب ہو رہا ہے، جو غدر سابق سے بڑھ کر ہوگا۔“ ۲۳۵ ارداع ثلثہ

مولانا محمد یعقوب ہمارے مصنف امام نے جیسا کہ اسی کتاب ارداع ثلثہ میں لکھا ہے، اس کو سن کر فرمایا تھا کہ

”یہاں کچھ نہیں ہوگا“

لیکن غدر کے اٹھارہ انیس سال بعد نام نہاد خدا شناسی کے نام سے قائم کئے جانے والے میلوں میں جو کار فرمائیاں ہوئیں، اور جن کا اب تک ذکر کر چکا ہوں، ان کو دیکھتے ہوئے، کیسے کہا جائے کہ مکہ کے نیم مجذوب کی واقفیت جس کا ذریعہ خواہ کچھ ہی ہو، کشفی ہو، یا غیر کشفی، کلیۃً بے بنیاد تھی، آخر وہ بے چارے نیم مجذوب ہی تو تھے۔ بجائے ”کل“ کے واقعہ کا ”کچھ حصہ“ ہی ان کے سامنے آیا، اور اسی کو دیکھ کر کوئی رائے قائم کر لی ہو، تو جو کچھ ہو رہا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے کیا وہی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی تھی، جو اس نیم مجذوب آدمی نے کی۔

واقعہ اب گزر چکا ہے، اور اسی طرز سے گذرا، جیسا کہ ہمارے مصنف امام نے فرمایا۔ بارود کے میگزین میں چنگا دی دالی جا چکی تھی، لیکن دھماکہ کیوں نہیں ہوا، میں اسی کو اب کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، اور اسی سے معلوم ہوگا کہ شاید یہ ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ تھا، ارحم الراحمین نے اپنے بندوں پر رحم فرمایا، خدا کی اسی رحمت کا باعث گانہ ہند کے ساتھ کس مشکل میں ظہور ہوا۔ آئیے اور

واقعات کی روشنی میں اسی کا تماشا کیجئے۔ ان فی ذلک لذكری لمن کان له قلب واولی السمع وهو شهید

بات ذرا طویل ہو گئی، لیکن جو کچھ سمجھانا چاہتا تھا، شاید ان تفصیلات کے بغیر اسے ذہن نشین بھی نہیں کر سکتا، یاد ہوگا، گفتگو یہ ہو رہی تھی کہ پہلی دفعہ چاندپور کے اس مذہبی میسل کی شہرت ہوئی، سید الامام الکبیر اس زمانہ میں اپنے قدیم آبائی وطن نانوتہ میں تھے۔ وہیں آپ کے پاس خطوط پہنچے، آپ پیادہ پا چل پڑے، دیوبند مظفرنگر میرٹھ ہوتے ہوئے دلی پہنچے، یہاں آپ کو یہ اطلاع دی گئی کہ شاہ جہاں پور کے انسپکٹر پولیس مولوی عبدالحی نے کہلا بھیجا ہے کہ قصہ بے اصل ہے، علماء کے آنے کی کچھ حاجت نہیں۔ دلی میں جس وقت یہ خبر آپ کو ملی تو شاہ جہاں پور کے سفر کا ارادہ مضطحل ہو گیا، لیکن شاہ جہاں پور والوں کے ناراض خط کے بعد آپ کا وہی ارادہ جو سست پڑ چکا تھا، نئے سرے سے پھر تروتازہ ہوا، لکھا ہے کہ

”ہرمئی کو بعد عشا، بمعیت مولوی فخر الحسن صاحب ساکن گنگوہ ضلع سہارنپور و مولوی محمود حسن صاحب ساکن دیوبند (ضلع سہارنپور) و مولوی رحیم اللہ صاحب ساکن بجنور ریل پر پہنچے“ ۳

ریل سے مراد یہ ہے کہ اسٹیشن پر پہنچے، کیونکہ آگے ہے کہ

”ادھر سے حسب وعدہ مولوی سید ابوالمنصور صاحب دہلوی امام فن مناظرہ اہل کتاب بمعیت مولوی سید احمد علی صاحب دہلوی، و میرحید علی صاحب دہلوی تشریف لائے، اور سب ریل مل کر گیارہ بجے ریل میں سوار ہو کر روزِ شنبہ ۶ ہرمئی کو بعد عصر شاہ جہاں پور پہنچے“

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تشریف آوری کی تاریخ اور وقت سے شاہ جہاں پور والوں کو غالباً آپ نے قصداً اطلاع نہ دی تھی، اسی لئے اسٹیشن پر استقبال کے لئے کوئی نہ آسکا۔ شاہ جہاں پور والوں کو تو اس کی بھی خبر نہ ہو گئی کہ آپ آئیں گے بھی یا نہیں آئیں گے، اس کو مغتنم موقعہ خیال کر کے

لکھا ہے کہ

”مولوی صاحب یعنی سیدنا الامام الکبیرؒ نے آپ کو چھپانا چاہا اور یہ ارادہ کیا کہ رات کو سرانے میں گزر کر لو علی الصبح مجلس مناظرہ میں جا بیٹھیں گے۔“

اور یہی طے کر کے سفر کے دوسرے رفیقوں کو تو اجازت دے دی کہ بجائے سرانے کے شہر چلے جائیں، اور خود جیسا کہ ”میلہ خدا شناسی“ نام والی روداد میں لکھا ہے، سرانے جاتے ہوئے شیش سے اپنے ساتھ رفقا و تلامذہ کی جماعت میں سے صرف اپنے عاشق زار، جاں نثار خادم شیخ الہند مولانا محمود حسن کا خود انتخاب فرمایا تھا۔ یا ساتھ چلنے کی اجازت ان کو مل گئی، اس کے الفاظ ہیں کہ شیش

شاہ جہاں پور پر

”مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیرؒ) سب ساتھیوں کو چھوڑ کر مولوی محمود حسن صاحب کو اپنے

ہمراہ لے کر چپکے سے شہر کو ہو لئے قصہ مختصر رات کو ایک سرانے میں آرام فرمایا۔“

الغرض شیش سے سرانے تشریف لے گئے، شیخ الہند مولانا محمود حسن بھی ساتھ تھے۔

اس سلسلہ میں کچھ اور روایتیں بھی پائی جاتی ہیں مگر وہ ثبوت کے لحاظ سے اس درجہ کی نہیں ہیں اس لئے انہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے، یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ پہلے میلے کے موقع پر شاہ جہاں پور کے اسٹیشن پر یہ پاکر شہر سے کوئی آدمی استقبال وغیرہ کے لئے نہیں پہنچ سکا، روداد میں لکھا ہے کہ

”مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیرؒ) نے اپنے آپ کو چھپانا چاہا اور یہ ارادہ کیا کہ رات کو سرانے

میں گزر کر لو علی الصبح مجلس مناظرہ میں جا بیٹھیں گے۔“

”اپنے آپ کو چھپانے کی“ فطری آرزو آج بھی آپ پر اسی طرح مسلط ہے، جیسے ساری زندگی اسی تمنا اور اسی کوشش میں بسر ہوئی، اسی آرزو کے زیر اثر سفر کے معزز رفیقوں، اور اپنے چیتے شاگردوں سے جدا ہونے پر بھی آمادہ ہو گئے، خدا ہی جانتا ہے کہ کتنی کش مکش کے بعد حضرت دالاکو اپنے حال پر چھوڑ دینے

کا فیصلہ سفر کے ان رفیقوں اور شاگردوں نے کیا ہوگا، اگر روداد والی ہی روایت صحیح ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکل حضرت مولانا محمود حسن کو ساتھ رہنے کی اجازت دی گئی، ذرا اس اخفار کے جذبہ کی شدت کو

ملاحظہ فرمائیے کہ سرائے میں بھی اپنے آپ کو بجائے مشہور نام کے ”خود شید حسین“ غیر معروف تاریخی نام سے روشناس کرایا گیا۔ تاکہ دریافت کرنے والوں کو پوچھنے کے بعد بھی پتہ نہ چلے، مگر جیسا تھا، ذکر کی کوشش بندے کی طرف سے سلسل جاری تھی، اسی بندے کے رفع ذکر کا فیصلہ اس کا مالک کئے ہوئے تھا۔ بعد کو جو کچھ ہوا وہ تو خیر آپ سنیں ہی گئے، لیکن سرائے کی اس رات میں بھی کیا ہوا، رجو اد میں لکھا ہے کہ

”مگر ایک دو شخص دبا شدگان شاہ جہاں پور کو خبر ہو ہی گئی، قریب دو بجے رات کے سرائے میں جا کر مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کو جا گھیرا“

خدا ہی جانتا ہے کہ خود شید حسین نام کے پرے کو چاک کر کے ”مولنا محمد قاسم“ تک پہنچنے میں یہ بے چارے کیسے کامیاب ہوئے، بہر حال کسی نہ کسی طرح پہنچے، لکھا ہے کہ

”پس ازا سرار“ ناچار مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) ان کے مکان پر تشریف لے گئے“ ص ۷

یوں سرائے سے اٹھ کر آپ شاہ جہاں پور والوں کے گھر تک تو کسی نہ کسی طرح آگئے، ۶ مئی کا دن گذر چکا تھا، کل ۷ مئی کو میلہ کے افتتاح کی تاریخ تھی، چاندپور کا فاصلہ عرض کر چکا ہوں، اگر کافی تھا، سرائے میں تو جو کچھ چاہتے کر سکتے تھے، لیکن شہر والوں میں پہنچ جانے کے بعد کون راضی ہو سکتا تھا کہ آپ گرمی کے اس موسم میں پانچ چھ کوس کا فاصلہ پیادہ پا طے کریں۔ لیکن روداد کی روایت میں بھی اودار و احثالثہ میں مولنا احمد حسن امردہ ہوی کی زبانی جو روایت درج کی گئی ہے، دونوں ہی میں یہ الفاظ روداد کے ہیں،

”مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) صبح کی نماز پڑھ کر پیادہ پا ہی، چاندپور میں جا چکے“ ص ۷

گویا میلے کی خبر یا کر جیسے پیادہ پا آپ نانوتہ سے دیوبند بارہ کوس کا فاصلہ طے کر کے پہنچے تھے، اسی طرح ریل سے اترنے کے بعد شاہ جہاں پور سے چاندپور تک جو پانچ چھ کوس کا فاصلہ تھا، اسکو بھی پیادہ پا ہی

طے فرمایا، اور اسی پیادہ پانی کی وجہ سے شاید وہ لطیفہ پیش آیا۔ جس کا ذکر میلے میں بھی اور میلے کے بعد بھی اب تک لوگ مزے لے لے کر کرتے ہیں۔

عرض کر چکا ہوں کہ میلہ چاند پور میں بھی نہیں، بلکہ اسی کے قریب ایک کھنڈرے سارنگپور نامی سرزمین میں قائم کیا گیا تھا، جہاں سے ایک ندی جو ”دریائے گرتا“ کے نام سے مشہور ہے گزرتی ہے۔ حالانکہ مٹی کا مہینہ تھا، لیکن ندی پایاب نہیں ہوئی تھی، شاید اس کے ساحل کے انتخاب میں آب رسانی کی سہولت بھی میلہ قائم کرنے والوں کے پیش نظر ہو۔ شاہ جہاں پور سے سارنگپور جاتے ہوئے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راستہ میں یہی ندی ملتی تھی۔ مولانا احمد حسن امر دہوی رحمۃ اللہ علیہ جو اب رفیق سفر ہو چکے تھے، کی ہدایت میں ہے کہ

”راستہ میں ایک دریا پڑتا تھا“

غالباً یہی دریا لے گرتا تھا چونکہ بقول حضرت امر دہوی

”مولانا پیدل تھے“

شاید سواری میں یہ صورت پیش نہ آتی، بہر حال پیادہ پا چلنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دریا جس میں پانی تھا اس کو عبور کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ

”مولانا پا جامہ پہنے ہوئے دریا میں اتر پڑے، جس سے پا جامہ بھیگ گیا“

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ جلسہ میں شریک ہونے کے لئے قصداً کوئی خاص قسم کا بانا آپ نے ایسا اختیار نہیں کیا تھا، جس کی وجہ سے امتیازی نظر لوگوں کی آپ پر پڑے، بلکہ پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ ضلع سہانپور کے شیخ زادوں اور شرفاء کا جو عام لباس تھا۔ اسی لباس میں عموماً رہتے بھی تھے، اور آج بھی وہی لباس میں جا رہے تھے۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ پیدل چلنے کی وجہ سے آپ کو دریا میں اترنا پڑا، پانی اتنا تھا کہ پا جامہ آپ کا بھیگ گیا۔ حضر ہی میں جس کے پاس بیان کر چکا ہوں، بقول حضرت شیخ

الہند رحمۃ اللہ علیہ

”نکوئی صندوق تھا، نہ کپڑوں کی کوئی گٹھری“ اوداع ثلاثہ ص ۱۸۱

تو سفر میں بھلا اس کے بعد زائد کپڑوں کے ہونے کی کیا توقع کی جاسکتی تھی، حضرت شیخ الہندؒ فرمایا بھی کہتے تھے کہ

”عموماً اسی ایک جوڑے میں سفر پورا ہوتا، جو حضریں پہنے ہوتے تھے“

مگر اسی کے ساتھ وہی کہا کرتے تھے کہ

”البتہ ایک نیلی لنگی ساتھ رہتی تھی، جب کپڑے زیادہ میلے ہو گئے، تو لنگی باندھ کر کپڑے

اتار لئے، اور خود ہی دھو لئے“

دریائیں اترنے کے بعد پاجامہ مبارک جب بھیگ گیا تو آپ کی یہی دوا می رفیق ”نیلی لنگی“ بے چاری کام آئی مولانا اہر و جوی کی روایت میں ہے کہ

”مولانا نے پاراٹر کر لگی باندھی، اور پاجامہ اتار کر پھوڑ کر پیچھے لٹھی پر جیسے سگاؤں کے رہزنی لے

ڈال لیا کرتے ہیں، ڈال لیا“

اور اسی شان کے ساتھ آپ میلے کے میدان میں پہنچ گئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریا پار کرنے کے بعد

میلہ کا میدان کچھ زیادہ دور نہ تھا، اتنا وقفہ نہ گذر سکا کہ بھیگ گیا ہو پاجامہ آپ کا خشک ہو جاتا، دراصل یہی

جبوری تھی کہ بجائے پاجامہ کے ”نیلی لنگی“ ہی کے ساتھ آپ میلہ میں شریک ہو گئے، مگر جیسے قصد اور

ارادہ نمائش کے لئے نیسی لنگی نہیں باندھی گئی تھی، اسی طرح اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ کسی خاص قسم

کے لباس کا پابند اپنے آپ کو بنا کر عموماً کسی مجمع یا محفل کی شرکت سے لوگ ہچکچاتے ہیں۔ جب

تک وہی زبردستی اپنے اوپر عائد کیا ہو لباس فراہم نہ ہو جائے، مجمع میں جانا ان کے لئے گویا ناممکن

ہوتا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں، پاجامہ تو آپ نے بھی تھا کہ جس لباس کے پہننے کے عادی تھے، اسی کے

ساتھ میلے میں شریک ہوں، لیکن بھیگ جانے کی وجہ سے بجائے پاجامہ کے لنگی باندھنی پڑی، تو

ہچکچائے بغیر آپ لنگی ہی کے ساتھ مجمع میں علماء کے تشریف فرما ہوئے۔ بلکہ خدا شناسی کے اسی میلے

کے پہلے سال کی روداد کے آخر میں بریلی کے رہنے والے ایک ہندو کا یہ بیان جو نقل کیا گیا ہے کہ

”مسلمانوں کی طرف سے ایک پتلا سا آدی میلے سے کپڑے نیلی لنگی بغل میں دبی ہوئی بیان

کرنے کھڑا ہوا“ ۱۷

ان الفاظ سے سیدنا الامام الکبیر کی طرف یہ ہندو وزیر اشارہ کر رہا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خشک ہو جانے کے بعد پانچاگرہ پہن لیا گیا تھا، اور حسب دستور لنگی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ یہی ”نیلی لنگی“ بعد کو ”سارنجی نیلی لنگی“ بن گئی۔ اسی کا تذکرہ فرماتے ہوئے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ بھی فرمایا کرتے تھے۔

”مباحثہ شاہ جہاں پور میں مخالفین اسلام کے مقابلہ میں بڑا عظیم الشان مناظرہ تھا، بڑے بڑے عباد و قبا والے موجود تھے، اور حضرت مولانا (نانوتوی) اسی معمولی کرتہ اور لنگی میں تھے“ (قصص الاکابر الہادی ماہ جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ)

مطلب یہی ہے، کہ قیمت ”منظر“ کی ہوتی ہے، چھلکے کی نوعیت خواہ کچھ ہی ہو ”بے منظر“ پھلوں کو کون خریدتا ہے۔

کچھ بھی ہو، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ روک دینے کی جو کوشش شاہ جہاں پور کے پولیس اسپیکٹر مولوی عبدالحی صاحب کی طرف سے کی گئی تھی، وہ کوشش کامیاب نہ ہوئی، شاہ جہاں پور والوں نے اس کو مولوی عبدالحی کی غلطی قرار دیا، اور ان کے علی الرغم سیدنا الامام الکبیرؒ کا شناسی کے اس میلے تک بہر حال پہنچ ہی گئے۔

سچ تو یہ ہے کہ مولوی عبدالحی صاحب کے طرز عمل کی تعبیر ”غلطی“ کے لفظ سے شاہ جہاں پور والوں نے جو کی تھی۔ میری سمجھ میں تو اس کا مطلب بھی نہیں آتا۔ گذر چکا کہ دلی اور شاہ جہاں پور کے درمیان تار اور خط کے ذریعہ اس سلسلہ میں سوال و جواب ہم رٹی کو پیش آیا، اور میلہ کے افتتاح کی تاریخ مقرر ہو گئی تھی۔ اتنے قریب زمانہ میں شاہ جہاں پور کی پولیس کے ایک ذمہ دار افسر کا اس میلہ اور اس کی تفصیلات سے ناواقف ہونا جو اسی کے علاقہ میں منعقد ہو رہا تھا جس کی نگرانی بہر حال ان کے فرائض میں تھی، بلکہ نقل ہی کر چکا ہوں، کہ میلے میں پولیس موجود تھی۔ دوسرے سال کے میلے میں تو ان کے نام مولوی عبدالحی کی تصریح کے ساتھ اطلاع دی گئی ہے، کہ وہ بھی میلے میں موجود تھے (مباحثہ شاہجہاں پور ۱۳۵۷ھ)، پھر ان کا سرے سے قصہ ہی کو بے اصل ٹھہرانا، اور اس کو بے اصل ٹھہراتے ہوئے، اپنی یہ رائے پیش کرنا کہ ”علماء کے آنے کی حاجت

نہیں بتایا جائے کہ آخر اس کا کیا مطلب سمجھا جائے۔ اور غلطی کے لفظ کے اطلاق کی گنجائش کس چیز میں اس طریقہ سے سکائی جائے۔

کچھ بھی ہو، میرا ذاتی احساس تو یہی ہے کہ خدا نخواستہ ”مولوی عبدالحی کی غلطی“ اگر صحیح ہو جاتی اور ان کی اطلاع سے سفر کا جو ارادہ سست ہو گیا تھا، وہ ختم ہو جاتا۔ یعنی سیدنا الامام الکبیر ان کی رائے کے مطابق دلی سے بجائے شاہ جہاں پوچھ جانے کے، گھر واپس ہو جاتے، تو ظاہر ہے کہ جس قصہ کو بے اصل ٹھہرایا گیا تھا، واقع میں بے اصل تو تھا نہیں۔ خدا شناسی کا یہ میلہ چاندپور میں منعقد ہو کر رہتا، اور پہلے سال کے میلے میں جیسے ہندوؤں کی طرف سے اسی قسم کے نمائندے اور وکلاء شریک ہوئے تھے، جن کے نام کا اب تک پتہ نہ چلا۔ کچھ اسی قسم کے گنام، خام کار، ناتجربہ کار چند مولوی مسلمانوں کی طرف سے بھی اس میلے میں ادھر ادھر کٹھے ہو جاتے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس میلہ کا کیا انجام ہوتا۔ اللہ اللہ کہ بخت مولا داد کا لے پادری کی شرارت خانی جس رنگ میں ہوئی تھی مسلمانوں کے جذبہ و صبر کی کتنی بڑی آزمائش تھی، شعلہ سامانیوں کی بڑاگ اس دریدہ دہن مودی کے الفاظ میں دہی ہوئی تھی، کیا ان غریب مولویوں کے بس کی بات تھی کہ بھڑکنے سے اس کو روک دیتے۔

یہاں تو حال یہ تھا کہ جس وقت ۱۵ منٹ وقت درس و تقریر کے لئے مقرر کرنے کے بعد پادری نولس کو اپنی تقریر کی توسیع وقت کی ضرورت محسوس ہوئی، اور انتہائی وضاحت سے کام لیتے ہوئے وقت کے ہی سلسلے میں مسلمانوں کے جن نمائندوں کی مسلسل تجویزوں اور درخواستوں کو انتہائی لاپرواہی کے ساتھ برابر ٹھکراتا ہی چلا جاتا تھا۔ ان ہی سے التجا کرنے لگا کہ مزید پندرہ منٹ اور تقریر کر کرنے کا موقع اسے دیا جائے۔ تو علاوہ سیدنا الامام الکبیر کے مسلمانوں کے نمائندوں کی اس جماعت میں حالانکہ بعض کا فی سرد گرم چشیدہ، آزمودہ کار ہستیاں موجود تھیں، تاہم کھٹا ہے سیدنا الامام الکبیر کے سوا جتنے بھی تھے ان کی

”رائے نہ تھی کہ ان کو (پادری نولس کو) مہلت دی جائے“

سب مولوی اور جوان کے ساتھ وہاں تھے یہی کہتے تھے کہ

”جب وہ ہم کو مہلت نہیں دیتے، تو ہم کیوں دیں“

انتقام کا جذبہ پوری قوت سے ابھرایا تھا، دل کی بھڑاس نکالنے کا موقعہ سمجھا گیا تھا کہ یہی ہے، آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ

”اچھا ان کا (نولس صاحب کا) مضمون بھی نامتام ہی رہے۔“ ۲۹

مگر آپ سن چکے، ذکر کر چکا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر نے عام مولویوں کے اس فیصلہ کے برعکس پادری نولس کو بخندہ جبینی مزید وقت صرف کرنے کی اجازت دی، جس کا نتیجہ بھی اسی وقت اس رنگ میں سامنے آیا کہ مقررہ وقت سے زیادہ وقت لے کر جو کچھ کہنا تھا پادری نولس صاحب کہہ چکے، تو دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر کھڑے ہیں، اور مسکراتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ

”لیجئے پادری صاحب اب ہم کو بھی تیس منٹ کی اجازت دیجئے۔“

چارہ کاری اب پادری صاحب کے لئے کیا تھا، اپنے دامن میں خود گرفتار ہو چکے تھے، منت و سہانت حق و انصاف جن مسئلہ کے حل میں بے کار ثابت ہو چکا تھا، ٹھیک وقت نی ایک کا آمد سوجھ سے وہی مسئلہ کتنی سہولت کے ساتھ حل ہو گیا، لکھا ہے کہ

”لاچار ہو کر پادری صاحب کو بھی اجازت دینی پڑی۔“

میرے خیال میں اس حکم اور علم کی یہ ایک مثال تھی جس کے متعلق قرآن میں ایک سوزنازد مقامات پر یہ اطلاع دی گئی ہے، کہ دین میں مقام انسان تک پہنچنے میں جو کامیاب ہوتے ہیں، یعنی المحسنین ہی کو حکم و علم کی یہ نعمت ارزانی ہوتی ہے۔ اس لاہوتی دولت کی صرف معلومات والے علماء میں توقع نہ رکھنی چاہئے۔

احسانی حکم و علم کے آثار کا تجربہ کچھ اسی ایک واقعہ کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ اسی سلسلے میں مسلسل ایسے مواقع پیش آتے رہے جن میں دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر کے ضمیر کی یہ روشنی چمک اٹھی، اور تاریکیوں کا ازالہ ہو گیا۔ اسکاٹ صاحب منطقی پادری کے قہر میں جب ان کی خواہش کے مطابق یہ مسئلہ پیش ہوا کہ ان کو تقویٰ کا بھی موقع دیا جائے، اور وقت کم از کم ایک گھنٹہ ملنا چاہئے۔ عرض کر چکا ہوں کہ اس مسئلہ کے پیش ہونے پر خلاف دستور سیدنا الامام الکبیر اسکی مخالفت کرتے رہے،

بڑے رود کہ کے بعد راضی بھی ہوئے تو نظر اہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ منشی پیارے لانی وغیرہ کی سعی و
 سفارش سے آپ راضی ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی وقت کی ایک سوچہ ہی کا تھا ذاتھا، قصہ تو طویل
 ہے تفصیل کے لئے اصل روداد ہی کا مطالعہ کیجئے۔ حاصل یہ ہے کہ پہلے سال کے سینہ میں دوسرے
 دن جب مباحثہ کی مجلس میں لوگ جمع ہوئے اور طرہ بچکا تھا کہ ہر فریق کی طرف سے صرف پانچ پانچ آدمیوں
 کو بولنے کی اجازت دی جائے گی۔ لیکن اتفاقاً ایک صاحب جن کا نام قاضی سرفراز علی تھا، نکلا ہے کہ
 شاہ جہاں پور کے بڑے رئیسوں میں تھے، غدر میں مالی حالت ان کی خراب ہو گئی تھی، پادریوں سے
 مقابلہ اور مناظرہ کا ذوق رکھتے تھے، وہی ایک لکھی ہوئی تحریر لائے، اور خواہش ظاہر کی کہ اپنی تحریر
 کے منانے کا موقعہ ان کو بھی دیا جائے۔ سیدنا الامام الکبیر نے اپنی جگہ ان ہی کو کھڑا کر دیا، ان کو دیکھ کر
 پادری نولس نے کہا کہ کیا

”آپ بھی ان ہی پختن میں ہیں جو اس کام کے لئے مخصوص ہوئے ہیں؟“

جواب میں قاضی صاحب نے جب کہا کہ ان میں تو میں نہیں ہوں، لیکن فلاں صاحب یعنی سیدنا الامام الکبیر
 کی طرف اشارہ کر کے بولے کہ

”ان کو اجازت ہے اور یہ مجھ کو اجازت دیتے ہیں۔“

جس پر نولس نے نہایت سختی کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کہ

”ان کو اجازت نہیں ہو سکتی۔“

بے چارے قاضی صاحب کو کھڑے ہونے کے بعد بیٹھ جانے پر مجبور کیا۔

اس سال تو خیر یہ بات گذر گئی، میلہ جب دوسرے سال منعقد ہوا، اور اب کے بھی پانچ پانچ
 آدمی ہر فریق کی طرف سے مقرر ہو چکے تھے، لیکن بعد کو یہی اسکاٹ منطقی پادری نولس صاحب کے
 بلانے پر جب پہنچے، اور چاہا گیا کہ گفتگو میں ان کو بھی حصہ لینے کے لئے موقعہ دیا جائے، اور ایک گھنٹہ
 تقریر کے لئے اسکاٹ صاحب طالب ہوئے، یہی موقعہ تھا کہ قاضی سرفراز علی صاحب کے واقعہ
 کا بھی جواب دیا جائے۔ نیز پھر ایوں والے مولانا محمد علی بھی اسی عرصہ میں پہنچ چکے تھے، جن کا نام

مسلمانوں کی طرف سے مقرر کئے ہوئے پانچ آدمیوں کی فہرست میں نہ تھا، قاضی سرفراز علی کے سلسلے میں تجربہ ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے مزید کسی آدمی کو بولنے کی اجازت پادری نہیں دیں گے حالانکہ سیدنا الامام الکبیر ان کو بھی گفتگو میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ درحقیقت اسکاٹ صاحب کے قصہ میں رد و کد کار از یہی تھا، اسی لئے راضی ہو جانے کے بعد سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا بھی کہ ”پادری اسکاٹ صاحب جب داخل منظرہ کئے جاتے ہیں تو ہم غائب مولوی محمد علی صاحب کو شامل کریں گے۔“ ملا مباحثہ شاہ جہاں پور

توسیع وقت، اور پادری اسکاٹ صاحب کی شرکت کے مسئلہ میں جب حضرت والا کے پاس پادری نولس صاحب کی طرف سے منشی پیارے لال تنگ و دوکر رہے تھے، تو ایک دفعہ منشی جی سے سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا ”وہ کیا تھا“

”منشی صاحب مجھ کو کسی بات پر خواہ مخواہ اڑائیں، مگر ہاں پادری صاحب کو اس کج رائی پر کہ ہم منتیں کریں اور وہ تسلیم نہ کریں، اسی لئے بالفعل جہاں کی طرف سے یہی جواب ہے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا آپ ان کو سنا دیں“

آخر میں یہ سمجھاتے ہوئے کہ اس قسم کی معمولی باتوں کی کوئی قدر و قیمت میری نظر میں نہیں ہے، منشی جی کے کان میں یہ بات بھی آپ نے ڈال دی تھی کہ

”باقی جو کچھ ہو گا وقت پر دیکھا جائے گا“ ۴۹

وقت جب آیا تو دیکھا بھی گیا کہ جو کچھ پادری نولس نے چاہا سب ہی کچھ منظور کر لیا گیا۔

اور یہ تو اس احسانی حکم و علم کی ایسی جزئی مثالیں ہیں، جن کا شاید ذکر بھی نہ کرتا۔ اگر اس راہ کے ان چند کلی نتائج کے ذہن نشین کرانے میں مدد نہ ملتی، جیسا اب پیش کرنا چاہتا ہوں، اور یہ ایسے کلی نتائج ہیں، جن سے سیدنا الامام الکبیر کی سیرت ہی کا ایک خاص پہلو نمایاں نہیں ہوتا، بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے، اسلامی ہند آج جن مشکلات سے دوچار ہے، چاہا جائے تو ان مشکلات کے حل میں بھی ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

کہنا یہ ہے، کہ مذہب کے نام سے شاہ جہاں پور کے علاقہ میں اس میلہ کے انعقاد کا ہوا اعلان کیا گیا تھا، اس میں شک نہیں، کہ اس کے متعلق کبھی کبھی سیدنا الامام الکبیر کی زبان مبارک سے اس قسم کے الفاظ جنھیں نقل بھی کر چکا ہوں نکل جاتے تھے، مثلاً وہی بات کہ

”اگر اثبات و بحیثیت مذہب پر نظر ہے تو ترتیب عقلی (ان سوالوں) کی یہ ہے، جو کل میں تے

عرض کی، اور اگر اثبات مذہب سے کچھ بحث نہیں، تو منشی پیرا رے لال کے فرمانے کا

اتباع ہے“ ج ۵

کہنے والے چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں، کہ میلے کے مقصد کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کے دل میں بھی شک پیدا ہو جاتا تھا، اسی بنا پر ان کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ

”بہتر ہے کہ ہر فریق میں سے چند آدمی منتخب کئے جائیں“

دوسرے فرقوں کے نمائندوں نے بھی مسلمانوں کی یہ تجویز مان لی، اور عرض کر چکا ہوں کہ پانچ پانچ آدمی ملے ہو کہ ہر فریق سے تقریر کرنے کے لئے چن لئے جائیں۔ اور اسی سلسلہ میں مسلمانوں کی طرف سے پانچ آدمی جو مقرر ہوئے، ان میں دوسروں کے ساتھ ایک نام سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا بھی تھا۔ لیکن بایں ہمہ مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے، کہ اس میلے کی غیا دیں آج جو چیزیں ہیں نظر آتی ہیں، جن کے مختلف پہلوؤں کی طرف اب تک اشارے کرنا چلا آیا ہوں، ایسی کوئی صاف اور صریح شہادت میرے پاس نہیں ہے، جس پر اعتماد کر کے یہ دعویٰ کروں کہ سیدنا الامام الکبیر نے ان میلوں میں جو کچھ کہا یا جو کیا، اس میں ان امور کا خیال بھی آپ کے سامنے کسی نہ کسی حیثیت سے تھا، بلکہ بیان کرنیوالوں نے جو چیزیں مجھ تک پہنچائی ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ پہلا میلہ ہو، یا دوسرا، ہر ایک میں آپ کی شرکت مذہب ہی کے نام پر ہوئی۔ اسی کے نام پر اس میلے میں لوگ بلائے گئے تھے۔ پس مذہب ہی کے نام پر آپ ان میلوں میں داخل بھی ہوئے، اور ان میلوں سے نکلے بھی تو اسی خیال کے ساتھ نکلے کہ ”مذہبی کاروبار“ کے سوا ان کے پیچھے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، پس باہر سے تو مذہب ہی کے نام نے آپ کو کھینچا تھا، باقی آپ کے اندر کیا تھا، جو بیٹھ جانیکے

بعد بھی آپ کو اٹھا اٹھا دیتا تھا، دوسرے سال کے میلے کی اطلاع کھا ہے کہ جب آپ تک پہنچی تو پہلے میلے میں پاروں کی بے انصافیوں کا خیال کر کے لکھا ہے کہ

”تہی دستی میں مفت کی زیر باری، اور بے فائدہ بیج اوقات ہے“ ارادہ جانے کا نہیں کیا“

منہ مباحثہ شاہ جہاں پور

مگر بیٹھ جانے کے بعد پھر اچانک اٹھ کھڑے ہوئے، کیوں اٹھ کھڑے ہوئے، اپنے ذاتی نام و نمود کا تو خیر اس شخص کے متعلق سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ جس کی ساری زندگی اسی کے دبانے میں گزری، عرض ہی کر چکا ہوں کہ پہلی دفعہ میلے میں شاہ جہاں پور تک تو رفقاء کے ساتھ پہنچے، لیکن ریل سے اترنے کو ساتھ ہی، ہم سفروں کو شہر روانہ کر دیا، اور خود تنہا حضرت شیخ الہندؒ کو ساتھ لے کر شب گزاری کے لٹی کسی سرائے میں تشریف لے گئے، اور سرائے میں بھی اسی لئے کہ مشہور نام سے پتہ چلانے والے پتہ چلائیں گے۔ ”خورشید حسین“ اپنے تاریخی نام کے ساتھ داخل ہوئے، میلے میں جب ہر فریق سے طے ہوا کہ پانچ پانچ آدمیوں کا انتخاب تقریر وغیرہ کرنے کے لئے کیا جائے، اور مسلمانوں کی طرف سے پانچ ناموں میں سے ایک نام آپ کا بھی تھا تو اس وقت بھی فہرست جو بنی لکھا ہے کہ

یہ (مولوی محمد قاسم)، نام ان کا نہیں لکھا گیا، بجائے مولوی محمد قاسم کے حافظ خورشید حسین

صاحب لکھا گیا، ۲۳ میلہ خدا شناسی

مطلب وہی تھا کہ تقریر کی وجہ سے شہرت میلے میں اگر ہوگی بھی تو خورشید حسین کی ہوگی، محمد قاسم کی نہ ہوگی، اف! کسی کے ”نام“ پر جو اپنا سب کچھ لٹا اور مٹا چکا تھا۔ اپنا اور اپنے نام کا سارا ہی اس کے لئے کیا باقی رہا تھا۔ حالانکہ یہ دل کی بات تھی، دوسروں کو کیا معلوم کہ نانوتہ سے اٹھا رہا انیس کو س پیدل چل کر دہلی پہنچنے والا، اور وہاں سے سرگرداں مظفرنگر، میرٹھ دلی ہوتا ہوا، شاہ جہاں پور، شاہ جہاں پور سے پیادہ پاسارنگپور کے اس میدان تک دھاوا کرتا ہوا کیوں پہنچا تھا، پہلی دفعہ بھی پہنچا، اور ارادہ ملتوی کرنے کے بعد دوسرے میلے میں بھی آدھمکا، ظاہر ہے کہ اس کا تعلق دل کی باطنی کیفیت سے تھا۔

”تاہم جو کچھ اندر بھرا ہوا تھا، کبھی کبھی وہی چھلک پڑتا تھا۔ کس کی آبرو اور عزت کا سوال، سمر بے چین اور بے قرار کئے ہوئے یہاں سے وہاں، وہاں سے وہاں لے پھرتا تھا۔

پہلے سال کی روداد میں تو نہیں، لیکن دوسرے سال والے میلے کی روداد مباحثہ شاہ جہاں پور نامی والے میں نقل کیا ہے کہ شاہ جہاں پور کے اسٹیشن سے تو سیدنا الامام الکبیرؑ کو مولوی حفیظ اللہ خاں وغیرہ شہر لے گئے، اور اس دفعہ شاہ جہاں پور کی یہ رات بجائے سرسے کے مولوی عبدالغفور حسنا کے مکان پر گزری، لیکن کیا پوری رات گزری؟ لکھا ہے کہ

”مناظرین اسلام آخر رات ہی سے راہی میدان مباحثہ ہوئے“

اللہ اللہ یہ کچلی رات کا وقت، سننے کی بات ہے، راوی کا بیان ہے کہ یہ میدان مباحثہ ”جو شاہ جہاں پور سے چھ سات کو س کے فاصلے پر تھا“

اس فاصلہ کو طے کرنے کے لئے

”سب صاحب سوار“

جار ہے تھے، لیکن

”مولوی محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ پیادہ پا“ مش

راستہ میں پھر وہی ندی غالباً گڑانا می آئی، اس کے بہتے ہوئے پانی میں طہارت وضو سے فارغ ہوئے، مارچ کا مہینہ تھا، ۱۹ تاریخ تھی، وضو کر کے بیان کیا ہے کہ

”نوافل ادا کئے اور نہایت خشوع و خضوع سے دعا مانگی“

گڑا گڑا کر کسی کے قدموں پر سر رکھ کر مانگنے والا کیا مانگ رہا تھا، جس سے مانگ رہا تھا، اور جو مانگ رہا تھا، ان دونوں کے درمیان کا یہ راز تھا۔ لیکن آگے چند اوراق کے بعد صاحب رذاد نے یہ خبر دیتے ہوئے کہ

”مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیرؑ) نے جب سے شاہ جہاں پور کا ارادہ کیا تھا، جس سے

ملتے تھے، یا جس کو اہل دعا سمجھتے تھے، استدعا دعا کرتے تھے“

آگے اس کے بعد لکھا ہے کہ

”خود یہ کہتے تھے کہ ہر چند ہماری نیت اور ہمارے اعمال اسی قابل ہیں کہ ہم مجمع عمام میں ذلیل و خوار ہوں۔“

سیاسی حیثیت سے ذلت و خواری جو کچھ ہو چکی تھی وہ بجا لے کر خود بھی لے دے کر مسلمانوں کی دینی زندگی کا کچھ ذلت و خوار ہونا تھا، اب اس مذہبی میلے میں اس وزنی کے زوال کا خطرہ سامنے آ گیا تھا، اللہ جل جلالہ جگر شق ہو جاتا ہے، جرم اور جرم کی سزا و عقوبت کے استحقاق کا اقرار کرتے ہوئے، عرض کرنے والے کے اس معروضہ کو جب ہم پڑھتے ہیں۔

”مگر ہماری ذلت و خواری میں دین برحق کی ذلت“

اور آہ کہ اسی کے بعد یہ جگر شکستہ، روح گداز الفاظ نقل کرنا چاہتا ہوں اوقل نہیں ہوتے۔

”اس رسول پاک کی ذلت متصور ہے، جو تمام عالم کا سردار اور تمام انبیاء کا قافلہ سالار ہے۔“

۔۔۔ یہی باطنی احساس، اور آپ کا اندرونی جذبہ تھا، جو آپ کو ٹرپا لے ہوئے تھا، خود بھی ٹرپو تھے، اور دوسروں کو بھی ٹرپا لے تھے۔ اور یہ دعا یعنی

”الہی! ہماری وجہ سے اپنے دین، اور اپنے حبیب پاک، شہ لولاک کو ذلیل و خوار مت کر، اور اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت اور طفیل میں ہم کو عزت و انتخا سے مشرف فرما۔“

لکھا ہے کہ

”خود بھی یہی دعا کرتے تھے، اور اوروں سے بھی یہی دعا کرتے تھے۔“

ہنگ و دو، کوشش و کوشش، اضطراب اور بے چینی کے ان سارے قصوں کی تہ میں دل کی جو لگن، قلب کا جو سوز، روح کا جو قلق پوشیدہ تھا، اس کا کچھ اندازہ دعا کے ان الفاظ سے ہوتا ہے، بس ایک ہی نام تھا، جس کی عزت کے لئے جینے والا جی رہا تھا، اور اسی کے نام کی حرمت پر وہ مر گیا،

رحمۃ اللہ علیہ دنورائندہ مرقدہ۔

کچھ بھی ہو: میلے تک یہی آپ کا باطنی جذبہ کھینچ کر لاتا رہا، لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میلے میں پہنچنے کے بعد اس قسم کے نمائشے جو آپ کے سامنے پیش ہوئے، کہ پنڈت صاحبان تو اپنی پنڈتائی کے کمالات کی نمائشوں میں مصروف ہیں۔ سنسکرت الفاظ کے استعمال کے شوق کو پورا کر رہے ہیں، اور سیاسیوں کی طرف سے کالے پادری جو شریک تھے، بقول صاحب روداد ”میلہ خدا شناسی“ ان کی تقریر کا کمال یہ تھا کہ

”قالب میں الفاظ کے ایسی معانی ڈالنے کی نوبت نہ آئی تھی، اور الفاظ ہی سے خانہ پری

اوقات کرتے تھے۔ ص ۷۱

خود سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کا بے پادریوں کی تقریروں پر تنقید یاد ہو گا، کچھ اسی قسم کے الفاظ میں فرمائی تھی، باقی ان کے لسان اور طرزِ اقرار مقرر پادری نولس صاحب سوائے ”شمکۃ نیر مغالطوں“ مثلاً لکڑی اور لاشی والے عام دھماکے، یا جڑ شاخ پتہ والے تشلیشی مغالطہ وغیرہ کے سوا زیادہ وقت قواعد و قوانین کی ترتیب، ہی میں خرچ کر رہے تھے، اسی طرح منطق کی کتাব پر پانسو روپے سرکاری انعام پانے والے پادری اسکاٹ صاحب وہ حکومت برطانیہ کی بھاث خوانی کو عیسائی مذہب کی وکالت قرار دے رہے تھے، الغرض یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے حالات سنجیدہ نفوس کو کبیدہ و انسردہ کرنے کے لئے کافی تھے، دوسرے سال میلے کے منعقد ہونے کی خبر پانے کے بعد اپنی شہرت کو بے حد بڑھانے اور ضیاع اوقات، سیدنا الامام الکبیر نے اہتمام میں جو قرار دیا تھا، تو اسباب آپ کے احساس کے اسی قسم کی باتیں تھیں۔

بایں ہمہ اسی عجیب و غریب میلے کی بدولت جس کے انعقاد کے درپردہ محرکات خواہ کچھ ہی ہوں، ایک منقسم موقعہ بھی سامنے آگیا تھا، دنیا کے دو بڑے مذہب عیسائیت، اور ہندو دھرم کے ماننے والوں کو ایک ساتھ مخاطب بنانے، اور دین کے آخری پیغام اور اس پیغام کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے روشناس کرائے کا اس سے زیادہ موزوں ترین وقت اور کیا ہو سکتا تھا، کہا تو یہی جاتا تھا کہ

”تحقیق حق“ کے لئے ایک ہی جگہ شانہ سے شانہ ملا کر سب بیٹھے ہیں، میلے میں پہنچنے کے بعد اس اتفاقی اجتماع سے فائدہ اٹھانے کے خیال ہی کا بظاہر یہ نتیجہ معلوم ہوتا ہے، کہ پنڈت اور پادری توجہ شنغول میں بھی ہوں، لیکن سیدنا الامام الکبیرؑ کو دیکھتے ہیں، کہ شرائط و قیود کے قصوں سے بالا ہو کر اپنی توجہ کو اتنی تبلیغی نصب العین پر مرکوز کر کے صرف اسی کوشش میں مصروف ہیں، کہ جس طرح بھی ممکن ہو، اپنے خیالات کے پیش کرنے کا موقعہ ان کو دیا جائے۔ پہلے تو آپ نے اسی لئے پتا تھا کہ تقریر کے لئے کافی وقت حاصل کیا جائے، لیکن اس میں جب کامیابی نہ ہوئی، تو جلسہ کے اند، جلسہ کے باہر جس طرح بھی آپ سے بن پڑا، جو کچھ سناتا چاہتے تھے، اس کو سناتے ہی چلے گئے، اسی سے اندازہ کیجئے، کہ دوسرے سال کا میلہ، جس میں پنڈت دیانند سرسوتی جی اور منشی اندرن بھی شریک تھے اور جلسہ سے پہلے سبکٹ کمیٹی میں یہ طے ہو چکا تھا کہ پہلی تقریر درس کرنا سہارا جی پنڈت جی کی ہوگی اور عام مجمع میں تقریر کے لئے مقررین پہنچے، تو لکھا ہے کہ

”پنڈت صاحب (سوامی دیانند جی) سے کہا گیا کہ محفل شوریٰ میں آپ کہہ چکے ہیں کہ آج

ہم درس دیں گے سو آپ بیان کریں۔“

لیکن مجلس شوریٰ کے اس طے شدہ فیصلے کے برخلاف بیان کیا ہے کہ

”انہوں نے (پنڈت جی نے) پہلو تہی کی۔ ص ۵۰

پادری نوٹس بھی حیران ہو گیا، مگر کسی طرح پنڈت جی کو فیصلہ کے مطابق عمل پر آمادہ نہ کر سکا تو لکھا ہے کہ مجبور ہو کر اس نے سیدنا الامام الکبیرؑ سے کہا کہ جب پنڈت جی شروع نہیں کرتے، تو آپ ہی بیان کیجئے، یہاں کیا تھا، اول ہو، یا آخر آپ کے سامنے تو صرف حق کی تبلیغ تھی، صرف میز ماتے ہوئے کہ

”انصاف کا متفقہی اسی کا تھا، کہ سب کے بعد ہم بیان کرتے، کیونکہ ہمارا دین سب سے

پچھلا ہے۔“

جو کچھ پادری نوٹس نے کہا تھا، بلا چون و چرا آپ نے منظور فرمایا۔

اسی طرح توسیع وقت کی جستجو نیز آپ کی طرف سے پیش ہوئی تھی۔ جب کثرت رائے سے مسترد ہو گئی، تو اس وقت پادری نولس سے فرمایا کہ

”ہمارے بار بار کہنے سے افزائش وقت کو تسلیم نہ کیا تو خیر اس کو قبول کیجئے کہ بعد اختتام وقت جلسہ یعنی چار بجے کے بعد کل ہم ایک گھنٹہ وعظ کہیں گے، آپ بھی محفل میں شریک ہوں اور بعد ختم وعظ کے اعتراض کرنے کا بھی اختیار ہے۔“

غرض آپ کی یہ بھی کہ پادری نولس صاحب ہی اس میلے کی سب سے زیادہ ممتاز اور سربراہان ہستی تھے۔ ان کی شرکت کی وجہ سے دوسرے بھی خارج از وقت والی میری تقریر میں شریک ہو سکیں گے اسی لئے آخر میں یہی آپ نے فرمادیا تھا کہ اعتراض کا حق صرف پادری نولس ہی کی حد تک ہیں محدود نہیں کرتا ہوں۔

”بلکہ جس صاحب کے دل میں آئے وہ اعتراض کریں، ہم جواب دیں گے۔“

آپ دیکھ رہے ہیں، جلسہ کے اندر حالانکہ فقہانے لائے پنڈت جی کی جگہ پہلے آپ کا کھڑا ہونا، طر شدہ فیصلے کے خلاف تھا۔ لیکن آپ نے اس کی پروا نہ کی، اور تقریر کرنے پر آمادہ ہو گئے، اسی طرح جب آپ کو محسوس ہوا کہ دل کا حوصلہ وقت کی قید و بند کی پابندیوں میں نہ بٹکے گا، تو خارج از جلسہ آپ نے نولس کو راضی کیا کہ بیان کر لے گا موقعہ آپ کو دیا جائے، اور وہی سب کچھ جلسہ سے باہر کیا جائے جسے جلسہ کے اندر کرنا چاہئے تھا۔

دوسرے میلے میں تو اس حد تک تبلیغ اور غنی رسانی کا یہ دلولہ آپ میں اشتعال پذیر ہو گیا تھا کہ دوسرے دن جلسہ کے اندر تقریر کریں اور سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا۔ آخر میں پنڈت دیانند سرسوتی جی نے مشہور خیر کے مسئلہ کو چھیڑ دیا، جلسہ صبح سے ہو رہا تھا۔ پنڈت جی نے بالکل آخر میں جب گیارہ بج رہے تھے اس مسئلہ کو چھیڑا تھا، لکھا ہے کہ ان کے بعد صیدالانام الکبیر اس مسئلہ پر بحث کرنے کے لئے تقریر کے مقام پر جب پہنچے، تو پادریوں نے اعلان کیا کہ گیارہ بج چکے۔

”بس جلسہ کا وقت ہو چکا۔“

حضرت والا کی بے گلی اس وقت دیکھنے کے قابل تھی، صاحبِ روداد نے نقل کیا ہے، کہ جلسہ والوں کو خطاب کر کے

مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے فرمایا کہ دو چار منٹ ہماری خاطر سے اور ٹھیرے بندہ درگاہ جھٹ پٹ پنڈت جی کے اعتراض کا جواب عرض کئے دیتا ہے۔ ۱۷

لیکن بادرہ کی کسی طرح دو چار منٹ کے لئے ٹھیرنے پر آمادہ نہ ہوئے، اس وقت آپ سے نہ رہا گیا، اور شاید یہ زندگی میں پہلا موقع تھا، کہ پنڈت دیا نند سرسوتی جی کو شخصی مخاطب بنا کر حضرت والا کہتے لگے کہ

”پنڈت صاحب آپ ہی ٹھیر جائیں، وقت جلسہ ہو چکا ہے، تو کیا ہوا“ دو چار منٹ خارج از جلسہ ہی سی ۱۸

مگر حیرت ہوتی ہے، اتنے غیر معمولی اصرار کے باوجود پنڈت جی بھی چند منٹ کی گنجائش نہ بحال سکے، لکھا ہے کہ

”پنڈت جی نے بھی نہ مانا اور یہ فرمایا کہ مجھ کوں کا وقت آگیا ہے، اب ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا“ ۱۹ مباحثہ شاہ جہاں پور

پنڈت جی تو یہ کہتے ہوئے روانہ ہو گئے، سیدنا الامام الکبیر نے جب دیکھا کہ پنڈت جی تو خیر ہاتھ سے نکل گئے، تو غایتِ اضطراب میں بیان کیا ہے، کہ پنڈت جی کے ہمد و ہمراندہ ”منشی اندرین صاحب کا ہاتھ پکڑ کر یہ فرمایا، کہ منشی صاحب! پنڈت صاحب تو نہیں سنتے، آپ ہی سنتے جائیں“

ہاتھ اگر پکڑ نہ لیتے تو شاید منشی جی بھی پنڈت جی کے پیچھے پیچھے چل دیتے، لیکن دستِ گرفتہ ہو جانے کی وجہ سے شاید مجبور ہو گئے، اور سیدنا الامام الکبیر جو کچھ سنا چاہتے تھے ان کو سنا کر رہے۔

اور یہ قصہ تو دوسرے میلے کا ہے، پہلے سال ہی کے میلے میں آپ کے جوشِ تبلیغ کی شدت بڑھتے ہوئے اس نقطہ تک پہنچ چکی تھی، جب میلے کے روزِ ختم ہو چکے، اور اپنی فردگاہوں میں لوگ

واپس ہوئے، طے تھا کہ کل میلہ کے میدان سے لوگ روانہ ہو جائیں گے، اسی عرصہ میں جیسا کہ پہلے سال کی روداد میں لکھا ہے کہ

”مولوی محمد قاسم صاحب نے موتی میار، صاحب سے کہا، یوں جی چاہتا ہے کہ پادری نولس صاحب سے تہذیبی میں ملے، اور دعوت اسلام کیجئے“

آپ نے کچھ اس طریقہ سے اپنے دل کی آرزو بیان کی کہ موتی میار حضرت والا کے مشاور کے مطابق پادری نولس کے نیچے میں اسی وقت چلے گئے، اور کہا کہ

”ہمارے مولوی صاحب آپ سے تنہا ملنا چاہتے ہیں“

نولس بخوشی ملنے پر آمادہ ہو گیا، ادویوں حضرت والا تنہا نولس صاحب کے پاس ان کے خیمہ میں پہنچے ان تہبیدی فقرات کے بعد یعنی

”ہم آپ کے اخلاق سے بہت خوش ہوئے، اور چونکہ اخلاق باعث محبت ہو جاتے ہیں اور محبت باعث خیر خواہی ہو جاتی ہے، اور خیر خواہی چاہتا ہے کہ دوسلے آپ کی خیر خواہی کے آپ سے کہیں اور آپ نہیں“

نولس نے کہا کہ ”ضرور سنائیے“ تب جیسا کہ خود ہی بیان کیا کرتے تھے، پادری کے سامنے تبلیغ کا حق ان الفاظ میں ادا کیا گیا، یعنی فرمانے لگے کہ

”ذین عیسوی سے توبہ کیجئے، اور دین محمدی اختیار کیجئے، دنیا چند روزہ ہے۔ اور عذاب آخرت بہت سخت ہے“

”بیشک“ اس لفظ کے سوا، نولس کی زبان سے کچھ نہ نکلا، وہ خاموش بیٹھا رہا، تب آپ نے فرمایا کہ

”اگر منہوز آپ کو تامل ہے، تو اللہ سے دعا کیجئے کہ حق واضح کر دے“

یہ بھی تاکید کی گئی کہ

”اگر آپ اخلاص سے دعا کریں گے، تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے ضرور حق کو روشن کرے گا“

تب جواب میں نولس صاحب نے کہا کہ

”میں روزِ دعا کرتا ہوں، کہ یا اللہ میرے دل کو روشن کر دے“

کہتے ہیں کہ اس پر آپ نے پادری صاحب کو ہدایت کی کہ

”یوں دعا کیجئے، کہ ان مذاہب مختلفہ میں جو ناسازدہب حق ہو، وہ روشن ہو جائے، اور حق

و باطل تمیز ہو جائے“

تو اس نے یہ سن کر کہا کہ

”میں آپ کا شکر یہ ادا کرتا ہوں، کہ آپ نے میرے حق میں اتنا فکر کیا، اور میں آپ کی اس

بات کو یاد رکھوں گا۔“

بہر حال اس میلے سے جس میں ہر طرح کے لوگ مذہبی احساسات کو بیدار کر کے شریک ہوئے ہیں،

اس سے تبلیغی نفع حاصل کیا جاسکتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ پہلے اجلاس ہی میں اس کی طرف

ذہن مبارک منتقل ہو گیا تھا، کیونکہ لکھا ہے، کہ پہلے اجلاس سے فارغ ہونے کے بعد ہی

”مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے واعظین (یعنی مسلمانوں کی طرف سے مولوی جو

شریک ہوئے تھے اور وعظ کہہ سکتے تھے ان ہی) کو فرمایا کہ میلہ میں متفرق ہو کر وعظ بیان

کرنا چاہئے“

بیان کیا ہے کہ آپ کی اس تجویز کے مطابق

”واعظین (اسلام) نے جاکر بجز مولوی منصور علی صاحب کے علی الاعلان منادی اسلام و ابطال

عیسائیت کو میان کرنا شروع کیا“

عمر کے بعد سے مغرب تک میلہ میں وعظ کہنے والے علماء پھیل گئے تھے، صاحبِ روزِ دعا نے لکھا ہے کہ

”قبل مغرب تک تمام میلہ میں عجب کیفیت رہی اور عنایتِ لڑوی سے کوئی پادری مقابل

نہ ہوا“

گویا جو ہمیشہ پادریوں کا تھا، حضرت والا کے اشارہ سے مسلمان مولویوں نے وہی کام میلہ میں شروع کیا،

خیال یہ تھا کہ گورے نہ سہی، ان کے سکھائے ہوئے کالے پادری ہی مقابلہ میں آئیں گے لیکن بقول

صاحب روداد گورے پادری ہوں یا کالے

”خدا معلوم کہاں جان چرائے پڑے رہے“ ملا واقعہ میلہ خدا شناسی

عصر سے مغرب تک سارے میلے میں بیچا چڑھا ہوتا رہا، مغرب کے بعد اندھیرا ہو چکا تھا، لوگ اپنی اپنی فرودگاہوں میں چلے گئے، علماء اسلام بھی جیسا کہ لکھا ہے، اپنے خیموں میں

”صلاح و مشورہ کرتے رہے“ اسی حالت میں عشاء کی نماز پڑھ کر اور کھانا کھا کر سو رہے۔

دوسرے دن بھی محض مناظرہ منعقد ہونے والی تھی، صبح ہوئی، نماز صبح کے بعد دیکھا گیا کہ ابھی اجلاس میں دیر رہے، اس لئے پھر حضرت نے مولویوں سے کہا کہ کل کی طرح آج بھی عام منادی اسلام کی میلہ میں کرنا چاہئے، یہی کیا گیا، صاحب روداد نے لکھا ہے کہ

”چنانچہ ان حضرات نے میلہ میں جا کر کہا بیعتی حق اسلام ادا کیا۔ جزاہم اللہ عن جمیع المؤمنین

خیر الجزاء“ ۲۲

بیان کیا ہے کہ دوسرے دن بھی

”۹“ رجب تک برابر وعظ و درس کا شور تمام میلہ میں رہا۔“

بہر حال اعلان اور اشتہار کے مطابق اس میلہ میں کارروائیاں ہو رہی ہوں، یا نہ ہو رہی ہوں، لیکن پہنچ جانے کے بعد سیدنا الامام الکبیر نے ایک طرف تو اس کی کوشش کی کہ تبلیغ حق کا فائدہ اس سے اٹھالیا جائے۔ دوسروں کو بھی میلے کی افادیت کے اس پہلو کی طرف متوجہ فرمایا، اور خود ذاتی طور پر کچھ بھی کر سکتے تھے، آپ دیکھ چکے کہ کوئی دقیقہ آپ نے اس راہ میں اٹھانہ رکھا تھا، لیکن آپ کے احسانی حکم و علم کے آئنا اسی حد تک محدود نہ تھے، بلکہ آپ کی اس خداداد نعمت کا مظاہرہ سچ پوچھنے تو ان تقریروں میں چھو، جن کا ذکر دونوں میلوں کی رودادوں میں کیا گیا ہے، حیرت ہوتی ہے کہ میلہ کے درون پردہ محرکات سے نادانف رہتے ہوئے آپ کی ہر تقریر ٹھیک مقتضی حال کے مطابق ہر اجلاس میں کیسے ہوتی رہی۔

میرا مطلب یہ ہے، کہ جن اشتباہی تاریکیوں کا تذکرہ اس میلے کے متعلق کر چکا ہوں، اگر یہ

مان لیا جائے کہ سیدنا الامام الکبیر کے سامنے یہ تاریکیاں تھیں، اور اس میلہ کو صرف ایک مذہبی میلہ ہی سمجھتے ہوئے، آپ تقریر فرماتے رہے، تو اب اس کی توجیہ کیا کی جائے؟ کہ ان تاریکیوں سے کامل آگاہی کے بعد بھی جہاں تک میرا خیال ہے، ان سے زیادہ بر محل تقریروں اور عین موقعہ کے مناسبت بیانوں کا ہم شاید تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہر اجلاس میں آپ نے دہی کہا، جو کہنا چاہئے تھا، اور اس طریقہ سے کہا کہ نتیجہ ان میلوں کا جب سامنے آیا، تو دیکھا گیا کہ اس نتیجہ سے وہ قطعاً مختلف تھا، جس کی توقع اس قسم کے میلہ کے بعد کی جاسکتی تھی۔ میں ان تقریروں کو پڑھتا ہوں اور مبہوت ہو کر رہ جاتا ہوں، اس کے سوا اور کچھ مجھ میں نہیں آتا کہ دراد طور عقل قرار دے کر چپ ہو جاؤں، عقل و قیاس کو اس کی توجیہ سے معذرتا ہوں۔ اس باب میں میرے جو احساسات ہیں، شاید صحیح طور پر ان کی تعبیر عیسیٰ کہ چاہئے مجھ سے بن بھی آئے، لیکن اپنی حد تک کوشش کرتا ہوں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، کہ سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے بھی مرتبہ سوالات کی ایک فہرست مجلس مباحثہ میں اس تجویز کے ساتھ پیش ہوئی تھی، کہ علمی طور پر مذہبی موضوع پر بحث و تحقیق کا یہی طبعی طریقہ ہو سکتا ہے، لیکن آپ کی مجوزہ فہرست کی جگہ کثرت رائے سے اہل مجلس نے یہی طے کیا کہ سوالات کی جو فہرست منشی پیارے لال کی طرف سے پیش ہوئی ہے، سمجھا جاتا تھا کہ سوامی دیانند جی کے مرتب کئے ہوئے سوالات تھے، اسی کے مطابق بحث ہو۔ اس رنگ کو دیکھ کر چارہ کار ہی کیا تھا، کہ اکثریت کے فیصلے کے آگے سر جھک کا دیا جائے، لیکن پھر بھی دونوں میلوں میں جلسوں کے اندر، یا باہر جہاں کہیں بھی جتنی دیر آپ کو بیان و تقریر کے مواقع ملتے رہے، عموماً ان میں وہی باتیں ہوتی تھیں جن کا ذکر آپ کی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے مباحثہ شاہ جہاں پور نامی والی رد داد میں بایں الفاظ کیا ہے، لکھا ہے، کہ

”اس تقریر میں آٹھ باتیں تھیں۔ خدا تعالیٰ کا ثبوت، اس کی وحدانیت، اس کا واجبہ الاماعت ہونا، نبوت کی ضرورت، نبوت کی علامات اور صفات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، ان کی خاتمیت، ان کے ظہور کے بعد انہیں کے اتباع میں نجات کا

منحصر ہو جانا ۳۳

اگرچہ دوا میں ایک ہی تقریر کے مشتملات کا تجزیہ کیا گیا ہے، لیکن جس حد تک آپ کی دوسری تقریروں اور بیانات کا جو حصہ ان رودادوں میں نقل کیا گیا ہے، اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ عموماً اس ہی ہشت گانہ عنوانوں کو محور بنا کر آپ تبلیغ کا حق ادا فرماتے رہے۔ دین کے ان اصحابی عنوانوں میں سے ہر ایک کے متعلق سیدنا الامام الکبیر کے خصوصی افکار اور ان کی اچھوتی تعبیروں کی تفصیل کا صحیح اور مؤثر مقام تو کتاب کا دوسرا حصہ ہے جو حضرت والا کے

”نظریات فائقہ“

کی تشریح و توضیح ہی کے لئے انشاء اللہ مرتب کیا جائے گا۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس جلیل علمی و دینی خدمت کی سعادت کسے حاصل ہوتی ہے، اور توفیق ربانی کس کا انتخاب اس مہم کے لئے کرتی ہے، بجائے خود یہ ایک مستقل کام ہے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے، کہ ٹھیک عصری تقاضوں کے مطابق دین کی تفہیم کا اس سے بہتر طریقہ شاید اس زمانہ میں سوچا بھی نہیں جاسکتا، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان اچھوتے اور نئے خیالات کا لباس بھی نیا کر دیا جائے، خدا ہی جانتا ہے کہ یہ کام کس کے لئے مقدّم ہو چکا ہے۔

بہر حال ”میرت طیبہ“ کے اس حصہ میں ان تقریروں اور بیانات کے صرف اس پہلو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کی وجہ سے شاہ جہاں پور کا دہی میلہ جسے آپ دیکھ چکے کہ اپنے دامن میں ہندو سوز فتنہ تنگ کی چنگاروں کو چھپائے ہوئے تھا، سوچا گیا ہو، یا نہ سوچا گیا ہو، لیکن میلہ کے جلسوں کی کاروائیوں کی رفتار ہی اسی تھی، کہ غدر کے بعد غدر سے بھی زیادہ ہیبت فتنے کا ہندوستان خدا نخواستہ اگر شکار ہو جاتا، تو جو کچھ کہا جا رہا تھا، اور کیا جا رہا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے شاید وہ کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوتی۔ اس سلسلہ میں مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، تفصیل کے ساتھ اسے پیش کر چکا ہوں۔ آپ دیکھ چکے کہ پہلی دفعہ اسی میلے میں ہندوستان کے باشندوں کے ایک طبقہ یعنی ہندوؤں کے نمائندوں کو اسی ملک کے دوسرے دینی فرقہ مسلمانوں سے جدا کر کے عیسائی مذہب کے دکلا یعنی پادریوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا، آج اس ملک میں اکثریت و اقلیت کا جو عفریت گرج رہا ہے، اس کی پرچھائیاں غالباً پہلی دفعہ اسی میلے میں

احساسات کے سامنے نمایاں ہوئی تھیں، اور کون کہہ سکتا ہے، کہ اٹھارہ انیس سال پہلے جس ملک میں ہندو اور مسلمانوں نے مل کر عیسائیوں پر حملہ کیا تھا، اسی ملک میں انتقام کے اس تماشے کو کیا روکا جاسکتا تھا، کہ خود ہندو مسلمان باہم دست و گریبان ہیں۔ مگر اب اسے کیا کہئے، کہ وہ تماشہ تو کیا ہوتا، نتیجہ کی شکل میں جو نظارہ سامنے آیا، وہ اس سے مختلف اور قطعاً مختلف تھا، جس کی توقع میلہ کے بعد کی جاسکتی تھی، کہنے تو کہہ سکتے ہیں کہ دار ہی نہیں کہ خالی گیا، بلکہ جو کچھ آپ پڑھیں گے، اس کو پڑھ کر شاید ہر پڑھنے والا یہی کہہ سکتا ہے، کہ دار کو الٹ دیا گیا، گویا کہا جاسکتا ہے کہ لڑائی کے قانونوں و لایحقیق المکر السیء الاباہلہ کی عملی تفسیر ایک دفعہ شاہ جہاں پور کے اس میلے میں بھی قدرت کی طرف سے کی گئی، اور اب اسی دلچسپ سرگزشت کی میں تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

نہ ماننے والوں تک حق کے پہنچانے کا جو میدان اس میلے میں سیدنا الامام الکبیر کے سامنے آگیا تھا، یہ واقعہ ہے، کہ کسی کی رو رعایت کئے بغیر اگرچہ آپ سب کچھ اپنی ان تقریروں میں فرماتے رہے، عبادت کا مستحق صرف کائنات کا خالق ہے، اس سئلہ کی تشریح و تبلیغ کرتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں آپ اعلان کرتے رہے کہ خالق کے سوا مخلوقات خواہ ان کی نوعیت کچھ ہی ہو، جب مخلوق ہیں تو ان کی عبادت نہ نقلاً جائز ہو سکتی ہے، اور نہ عقلاً، آپ عیسائیوں اور ہندوؤں دونوں طبقتوں کو خطاب کر کے کہا تھا۔

”اسی صورت میں سوا خدا (خالق کائنات کے)، اوروں کی عبادت جیسے ہندو و نصاریٰ کرتے ہیں، بالکل خلاف عقل و نقل ہوگی۔“

پھر اس اجمال کی تفصیل کرتے ہوئے بھری مجلس میں آپ بار بار اس کا اعادہ فرماتے رہے، کہ ”خاص کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سری رام چندر، اور سری کرشن کو معبود کہنا یوں بھی عقل میں نہیں آسکتا، کہ وہ کھانے پینے کے محتاج تھے۔ پاخانہ، پیشاب، مرض اور موت سے

لے ہی لفظ تھا، جس پر پادری نولس صاحب نے نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ پاخانہ، پیشاب کا لفظ فرمائیں موتی میاں جو جلسہ کے مہتمم تھے انہوں نے یوں کر کہا کہ پاخانہ، پیشاب نہ کہئے بول دبر از کہئے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

مجبور تھے ” مثلاً میلہ خدا شناسی

اور جیسے جیسے کھرے کھرے الفاظ میں ” اسلامی توحید “ کی منادی آپ کرتے رہے اسی طرح یہ مسئلہ کہ
” رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب میں (یعنی سارے انبیاء و رسل میں) افضل سمجھتے ہیں، اور بعد
خداوند عالم انہیں کو جانتے ہیں “ ۲۵ میلہ خدا شناسی

اور یہ کہ

” حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب میں افضل و اعلیٰ پایا “ ۲۱

پہلے سال کے میلے میں آپ نے ان ہی الفاظ میں اپنے دعوؤں کو پیش کیا، اور دوسرے سال کے میلے
میں بھی یہ دعوے کرتے ہوئے کہ

” یہ بات واجب التسلم ہے کہ آپ (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تمام انبیاء کے

قافلہ سالار اور سب رسولوں کے سردار، اور سب سے افضل اور سب کے خاتم ہیں “ ۲۳

استدلال کا جو حق تھا، اسے ادا فرمایا، اور یہ میلہ ہندوؤں، عیسائیوں، مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا، بار بار مختلف
پیرایوں میں ان کے کان میں یہ ڈالتے رہے، کہ

” آج کل نجات کا سامان بجز اتباع نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کچھ

نہیں “ ۲۴ مباحثہ شاہ جہاں پور

قطعاً غیر مشتبہ دُورِک الفاظ میں سناتے رہے کہ

” کوئی شخص اس زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر اوروں کا اتباع کرے، تو

بیشک اس کا یہ اصرار اور یہ انکار از قسم بغاوت خداوندی ہوگا، جس کا حاصل کفر و الحاد

ہے “ ۲۵ مباحثہ شاہ جہاں پور

اور یہ فرماتے ہوئے کہ اب دین محمدی ہی کا وقت ہے، سب کو سنا دیا گیا کہ

(گذشتہ صفحہ سے) ایک دوسرے موقع پر بھی تمثیل میں پاخانہ کا لفظ سن کر پادری صاحب نے کہا تھا، میں جانوں

پاخانہ کی مثال اچھی نہیں۔ ۲۶

”عذابِ آخرت اور غضبِ خداوندی سے نجات اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتبار میں منحصر ہے۔“

جن برابریں اور دلائل کی روشنی میں ان اعلانات کو دونوں میلوں میں آپ نے پیش کیا تھا، آج بھی اپنی دل آویزیوں میں شاید وہ اپنی آپ نظیر ہیں، جن کے لئے ان رد و ادوں کا مطالعہ کرنا چاہئے، یا انتظار کیا جائے، سیرتِ قاسمی کے دوسرے حصہ کا جس میں ان ہی باتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش انشاء اللہ تعالیٰ کی جائے گی، اس باب میں سیدنا الامام الکبیر ایک مستقل فکری نظام کے بانی اور مجدد ہیں، جدتِ طرائق کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ باوجود اس شدید نفرت کے جو انگریز اور انگریزی حکومت کی طرف سے آپ کے قلبِ مبارک میں تھی، عرض ہی کر چکا ہوں کہ ساری عمر آپ نے بٹن صرف اسی لئے استعمال نہیں فرمایا کہ بٹن کو انگریزوں کی برآمد کی ہوئی چیزوں میں آپ شمار فرماتے تھے۔ لیکن رسالتِ محمدیہ کی مذکورہ بالا خصوصیتوں کو سمجھاتے ہوئے، دوسرے وجوہ و اسباب کے ساتھ ساتھ انگریزی حکومت کے انگریز و افسروں کا نام لے لے کر ایک سے زائد موقعوں پر تمثیلاً فرماتے تھے کہ

”جیسے اس زمانے میں باوجود فقر و گور ز حال لاڈ لٹن، گورنر سابق لاڈ لٹن نار تھ بروک کے احکام کی تعمیل پر اگر کوئی شخص اصرار کرے اور لاڈ لٹن کے احکام کی تعمیل سے انکار کرے تو باوجود اس کے کہ لاڈ لٹن نار تھ بروک بھی سرکاری کی طرف سے گورنر تھا اس وقت یہ اصرار بیشک منجملہ بغاوت اور مقابلہ سرکاری سمجھا جائے گا“ مثلاً مباحثہ شاہ جہاں پور

کتنا دل چسپ لطیف ہے کہ بٹن کو جس نے کبھی اس لئے استعمال نہیں کیا کہ انگریزوں کا آئندہ ہے، وہی دینی ضرورت کے لئے لٹن انگریزی نام کو بے تحاشہ دھڑلے کے ساتھ استعمال کر رہا ہے۔

بہر حال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ماننے والوں کے ایسے مجمع میں جس میں مسلمان ہی مسلمان ہوں، آدمی سب کچھ کہہ سکتا ہے، لیکن سوچنا چاہئے، کہ ماننے والوں کے ساتھ جس محفل میں نہ ماننے والوں کی بھی کافی تعداد ہو، اور کافی کیا معنی، اپنے محل وقوع کے لحاظ سے عرض کر چکا ہوں کہ اکثریت اس میلے میں نہ ماننے والوں ہی کی تھی، جو یہاں صرف سن لینے ہی کے لئے جمع نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ تنقید و اعتراض کا

حق بھی غیر اسلامی مذاہب کے نمائندوں کو حاصل تھا۔ مگر دیکھ رہے ہیں، آپ کی تقریروں پر کسی قسم کے دباؤ کا ہلکا سا اثر بھی محسوس ہوتا ہے، یقیناً خالص مسلمانوں کے مجمع میں جو کچھ کہا جاسکتا تھا، وہی سب کچھ مختلف مذاہب و ادیان کے ماننے والوں کی اس بھڑکی بے دھڑک کسی رنگ آمیزی کے بغیر آپ فرماتے رہے، مدامت کی توخیر گنجائش ہی کیا تھی، سچی بات تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں آپ نے رواداری اور مسامحت سے بھی کام نہ لیا، یہی نہیں، بلکہ جہاں ایک موقع پر آپ نے یہ فرماتے ہوئے کہ

”ذات مذہبوں کو تو ہم یقیناً دین آسمانی سمجھتے ہیں، ایک دین یہود اور دوسرے دین نصاریٰ“

اسی کے مقابلہ میں ہندوؤں کے سامنے ان کے ہندو دھرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

”اس کی نسبت اگرچہ یقیناً ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ دین بھی آسمانی ہے۔“ ۱۳

گویا ہندو دھرم کے مقابلہ میں عیسائی دین کے ترجیحی پہلو کے اعتراف کی یہ ایک شکل تھی۔ لیکن ایک دوسرے موقع پر جب توحید کے مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی، اور افسانہ پورہ ہاتھ کہ خالق کائنات کی وحدت کا عقیدہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس سے

”کسی ملت اور مذہب والوں کو اس سے انکار نہیں“

اپنے اسی عام دعوے کی تشریح میں ہندوؤں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے جہاں یہ فرمایا تھا کہ

”وہ گوشت پرست اور اوتاروں کے پر جمنے والے ہیں، پر جوتی سرور پر نہ کار ایک ہی

کو کہتے ہیں“ ۱۴

وہیں عیسائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ

”رہے نصرانی، وہ اگرچہ شرک میں سب سے اول نمبر ہیں، اور مشرک تو مشرک صفات

ہیں، پر نصرانی تو مشرک ذات ہیں، یعنی ذات کے مرتبہ میں تین خداؤں کے قائل ہیں“ ۱۵

مطلب جس کا یہی ہوا کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں عیسائیوں کا جرم زیادہ سخت اور زیادہ شرمناک ہے حالانکہ جس زمانہ میں یہ فرمایا گیا تھا، یاد ہو گا اسی زمانہ میں ہندوؤں کے آریہ سماجی گروہ کے پیشوا

پنڈت دیانند کہتے پھرتے تھے کہ ”دنیا کی تمام بت پرست قوموں میں سب سے بڑے بت پرست مسلمان ہیں“ لیکن سیدنا امام الکبیر کا مقام اس قسم کی محاصمتوں، یا بے جا جانب داریوں سے بلند اور بہت زیادہ بلند تھا، جس قوم یا مذہب میں آپ کے نزدیک واقعہ کی رو سے جو کچھ پایا جاتا تھا، صرف اس کا اظہار کر رہے تھے۔ نہ آپ عیسائیوں کو خوش کرنا چاہتے تھے، اور نہ ہندوؤں سے انتقام کا مسئلہ آپ کے سامنے تھا۔ اپنے عقیدے کی رو سے جو چیز جس رنگ میں آپ کے سامنے تھی، سننے والوں کے رجحانات سے آزاد ہو کر اسی کو پیش کر رہے تھے۔

تاہم دونوں میلوں کی رودادوں میں آپ کے بیانات اور تقریروں کے اثر کو جن الفاظ میں پہنچانے والوں نے ہم تک پہنچایا ہے، ایسے اور دیکھئے، وہ کتنا حیرت انگیز اور سوچئے تو عجرت خیز ہونے کے ساتھ ساتھ آج بھی اسلامی ہندوؤں کے لئے کتنا سبق آموز ہے۔

ظاہر ہے کہ چاندپور کے اس میلے میں جو مذہب کے نام سے قائم کیا گیا تھا، اس میں شریک ہونے والے عموماً ہندو مسلمان اور عیسائی تھے۔

مسلمان جس حد تک حضرت والا کی تقریروں سے متاثر ہوئے ہوں، ان کے متعلق تو خیر پوچھنے کی

ضرورت نہیں۔ بقول صاحب روداد

”مسلمانوں کی جو کیفیت تھی سو تھی“ ۱۴ میلہ خدا شناسی

غالباً اسی کیفیت کی تفصیل کی گئی ہے کہ

”لوگوں پر کیفیت تھی، ہر کوئی ہمہ گوش ہو کے ہووی صاحب (سیدنا امام الکبیر) کی جانب تک رہا

تھا، کسی کی آنکھوں میں سننے ہیں آنسو، کسی کی آنکھوں میں حیرت“ ۱۵

مسلمانوں کے دل کی باتیں ہمیں جو کچھ وہ چاہتے تھے، وہی ان کو سنایا جا رہا تھا، ان کے عقائد و مذہبات دلائل و براہین کے زیوروں سے آراستہ پیراستہ ہو کر ان کے سامنے پیش ہو رہے تھے۔ جو حوالہ ان پر طاری ہوتا، اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے۔ جوش میں ایسے الفاظ اگر ان میں سے کسی کی زبان پر جاری ہو گئے ہوں، جیسے اس وقت میں ایک کالے پادری نے خواہ مخواہ اپنی غلط منطق دانی کا ثبوت پیش کیا، اور

سیدنا الامام الکبیر نے اس کے مقابل میں کچھ کہنا چاہا تو لکھا ہے کہ
 ”مولوی احمد علی صاحب ساکن نلگینہ نے روکا اور یہ کہا کہ کس کے مقابل میں کھڑے ہوتے ہو،
 حق واضح ہو گیا، پھر کہا ہے کہ اٹھتے ہو،“ ۳۹ میلہ خدا شناسی
 اسی طرح عیسائیوں میں جو کالے پادری تھے، ان کے متعلق تو نہیں، لیکن نولس صاحب اور اسکاٹ صاحب
 جو یورپین خرد پادری تھے، ان کے متعلق اس قسم کی باتیں مثلاً رخصت ہوتے ہوئے نولس صاحب نے
 حضرت والا سے کہا تھا

”آپ کے اخلاق دس بہت خوش ہوا، پھر نام دشان مکان پوچھا“

یا بیان کیا ہے کہ

”تھوڑی دیر بعد موتی میاں صاحب نے آکر فرمایا، پادری کہتے تھے کہ گویہ صاحب یعنی مولوی
 محمد قاسم صاحب ہمارے خلاف کہتے تھے، پیرانصاف کی بات یہ ہے کہ ایسی تقریریں اور ایسے
 مضامین ہم نے نہ سنے تھے“ (میلہ)

یا ان ہی موتی میاں کے حوالے سے یہ روایت درج کی گئی ہے کہ انہوں نے

”مولوی محمد قاسم صاحب سے فرمایا کہ پادری اسکاٹ صاحب آپ کی تعریف کرتے تھے، اور
 کہتے تھے، کہ اس شخص کی باتیں بہت ٹھکانے کی ہیں، یہ مولوی نہیں یہ صوفی مولوی ہے“

منٹ مباحثہ شاہ جہاں پور

اس سے بھی زیادہ دل چسپ بیان ایک یورپین پادری بیگ نامی کا ہے۔ بریلی کے رہنے والے مولوی
 عبدالوہاب سے ایک دن اس نے اقرار کیا کہ خدا شناسی کے اس میلہ میں میں بھی شریک تھا۔ کہتا تھا کہ
 بہت سے اس قسم کے جلسوں میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا، اور بہت سے علماء اسلام سے اتفاق گفتگو
 ہوا، پر نہ یہ تقریریں سنیں، نہ ایسا عالم دیکھا۔ ایک پتلا دیا آدمی میلے کپڑے، یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ یہ
 کچھ عالم ہیں، ہم جی میں کہتے تھے کہ ”یہ کیا بیان کریں گے۔ لیکن تقریر سننے کے بعد اپنے تاثر کا اظہار
 مولوی عبدالوہاب کے سامنے اسی نے ان الفاظ میں کیا تھا، کہ

”ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ حق کہتے تھے، پر اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے“ ۳۳ میلہ خدا شناسی

مگر بائیں ہمسہ ان ہی رودادوں میں عام پادریوں (خواہ گورے ہوں یا کالے) کے متعلق یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت والا کی تقریر کے بعد دیکھا جاتا تھا کہ

”پادریوں کی یہ حالت کہ ششدر رہے جس و حرکت“ ۳۴ میلہ

یا خاص پادری نولس صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”قہقہہ کوتاہ مولوی محمد قاسم صاحب کی خوش بیانی اور پادری صاحب کی افسردگی قابل

دید تھی“ ۳۵ میلہ خدا شناسی

اور اس کا تجربہ تو عموماً کیا گیا کہ اختتامِ وقت کو بہانہ بنا کر عموماً اکثر تقریروں میں پادریوں نے کوشش کی،

کہ جس طرح ممکن ہو، سیدنا امام الکبیر کی تقریروں کو مکمل ہونے نہ دیا جائے۔ پادری نولس نے تو

یہ حد درجہ پہلے پہلے کے پہلے اجلاس ہی میں آپ کے رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر وہ اس دیدہ دلیری

پر اتر آیا، کہ دوسرے دن کا اجلاس، جب شروع ہوا، اور سیدنا امام الکبیر نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ

”پادری صاحب کے ذمہ ہمارے کل کے اعتراض باقی ہیں، بغرض اتمامِ کلام ان کا

جواب ادل چاہئے“

تو انتہائی بے شری سے کام لیتے ہوئے، بغیر کسی حجاب کے لکھا ہے کہ پادری نولس نے جواب میں

کہا کہ

”کل کی بات کل کے ساتھ گئی“ ۳۶

پادری صاحب کی اس سینہ زدہی کہنے، یا منہ زدہی پر لکھا ہے کہ مسلمانوں میں کافی برہمی پیدا ہو گئی تھی،

لہٰذا اسی پادری نے یہ بھی اسی موقع پر کہا تھا کہ تقدیر کے مسئلہ کو پادری پھیڑتے ہیں جب کوئی تدبیر غلبہ کی باقی نہیں

رہتی، پادری نولس نے لاچار ہو کر یہ باتیں شروع کی تھیں، کہتا تھا کہ پر اس شخص یعنی سیدنا امام الکبیر نے ایسا

ان سب کو اڑایا کہ پتہ نہ لگنے دیا۔ ۱۲

لیکن سیدنا امام الکبیر نے مجمع کو تھا ما' اور اعلان کیا کہ

”صاحبو! کل کے ہمارے اعتراضوں کا جواب پادری صاحب عنایت نہیں فرماتے ہم کو پادری صاحب کے انصاف سے یہ توقع نہ تھی، مگر جب نہیں مانتے تو کیا کیجئے بہ مجبوری ہم صبر کرتے ہیں، اور تازہ گفتگو کی اجازت دیتے ہیں“ ۱۱ میلہ خدا شناسی

بجائے مباحثہ و مناظرہ کے میلہ کو حق کی تبلیغ کا ذریعہ بنالیا جائے سیدنا امام الکبیر کے اس نقطہ نظر کی تائید آپ کے اس طرز عمل سے بھی ہوتی ہے۔

اس طرح دوسرے میلے کے موقعہ پر بھی حالانکہ حضرت والاکئی طرف سے کہنے والوں نے لاکھ

کہا کہ

”دو چار منٹ چار بجے میں باقی ہیں، ان ہی میں ہم کچھ کہہ لیں گے“

مگر بیان کیا ہے کہ

”پادریوں۔۔۔ نے ایک نہ سنی“

اور جلسہ سے اٹھ کر جانے لگے، اور اس بے ترتیبی سے اٹھ کر بھاگے، کہ بقول صاحب روداد

”سراسیمگی اور پریشانی میں جو رنج پہنانی کے باعث پادریوں کو لاحق تھی، پادریوں

اپنی بعض کتابیں بھی وہیں چھوڑ گئے، ان کے اٹھانے کا بھی ان کو ہوش نہ رہا۔“ ۱۲ مباحثہ

اسی موقعہ پر سیدنا امام الکبیر نے جب اعلان کیا کہ پادری نہیں ٹھہرے ہیں، تو نہ ٹھہرے۔ ہم اپنی

طرف سے بیان کئے دیتے ہیں، تو اپنی تہذیب کا یہ نرمہ پادریوں نے پیش کیا کہ

”بغرض یہی جلسہ شروع کرنا شروع کر دیا“ ۱۳

بہر حال عیسائیوں کا جو عنصر میلہ میں شریک تھا، اس پر تو سیدنا امام الکبیر کی تقریروں کا جو اثر مرتب

ہو رہا تھا۔ اس کا اندازہ مذکورہ بالا مثالی واقعات سے ہو سکتا ہے۔

لیکن مسلمانوں کے مقابلہ میں جیسے پادری تھے، ظاہر ہے کہ یہی حیثیت ہندوؤں کی بھی اس منہ

میلہ میں تھی، بلکہ آپ سن چکے کہ یہ ندیک مسلمانوں سے الگ ہوتے ہوئے ہندو دھرم کے نمائندوں کا

یہ طبقہ تقریباً عیسائیوں ہی میں مدغم و مندرج ہو چکا تھا۔ لیکن عام ہندوؤں کے تاثرات آپ کی تقریروں سے عیسائیوں کے تاثرات و احساسات سے اس درجہ مختلف ہیں، کہ حیرت ہوتی ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی کمان سے جو تیر نکل رہے تھے، دو مخالف طبقات میں ان ہی کے تاثری نتائج میں اختلاف اور اتنا شدید اختلاف کیسے پیدا ہو گیا تھا۔

سیدنا امام الکبیر کی تقریروں کا جو رنگ تھا، اسے بھی دیکھ چکے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان میں عیسائیوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کی دل دہی، یا جانب داری کی کوشش کی جاتی تھی، تقریروں کا خلاصہ ان رودادوں میں آج بھی موجود ہے، جو بھی ان کو پڑھے گا، وہ اسی نتیجہ تک پہنچے گا، اور یہ ماننے پر مجبور ہو گا کہ اس قسم کی وقتی سخن سازیوں سے سیدنا امام الکبیر کی تقریریں قطعاً منزرہ اور پاک ہیں۔ اعتراضات آپ نے کئے، تو دونوں ہی پر کئے، اور ترجیحی پہلوؤں کی طرف جو اشارے آپ کی تقریروں میں کئے گئے ہیں۔ اس معاملہ میں بھی کسی ایک فرقہ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ بلکہ جس مذہب میں اس نوعیت کی جو چیز پائی جاتی ہے۔ جہاں جہاں اس کے ذکر کا موقع ملا ہے، انتہائی فراخ چشمیوں کے ہاتھ ان کا اقرار کیا گیا ہے۔ نمونہ کی مثالیں پیش بھی کر چکا ہوں۔

میں شریک ہونے والے عام ہندوؤں کے ان عجیب و غریب تاثرات کی تفصیل تو آگے آرہی ہے، مگر ان کے ذکر سے پہلے سوچنے کی بات یہی ہے کہ دو مختلف مذاہب کے ماننے والے فرقوں کے تاثرات اس کے اس اختلاف کی آخر توجیہ کیا کی جائے، خود ان تقریروں، اور جو کچھ ان تقریروں میں بیان کیا جاتا تھا، اس میں تو اثر پذیر یوں کے اس اختلاف کا سراغ نہیں ملتا، پھر کیا سمجھا جائے؟

کیا حضرت والا کے باطنی تصرفات کا نتیجہ اس کو قرار دیا جائے۔ اس سلسلہ میں جن معلومات کا تذکرہ گذشتہ ادراق میں کیا گیا ہے، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے، یہ توجیہ بھی ناقابل لحاظ نہیں ٹھہرائی جاسکتی۔ اپنے وقت میں باطنی تصرفات و کرامات کی مرکزی ہستی حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت جس کے متعلق یہ ہو، کہ ولایت کی باطنی نعمت سے نوجوانی ہی ہیں

سرفراز ہو چکے تھے۔ اسی سے اس باطنی نعمت کے ثمرات و آثار کا ظہور آخر محل تعجب کیوں ہو! صحیح طور پر تو یاد نہیں رہا کہ براہ راست حضرت شیخ الہند سے خاکسار نے سنا تھا، یا بالواسطہ یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے کہ ایک خاص موقع پر سیدنا الامام الکبیر کو خدا شناسی کے میلے کی ان ہی تقریروں میں سے کسی تقریر میں اپنے قلب کے اس لاہوتی رخ سے کام لینا پڑا تھا۔ بلکہ ان ہی رودادوں میں

۱۵ جہاں تک یاد پڑتا ہے، واقعہ کی نوعیت یہ بیان کی گئی تھی، کہ بے بس ہو کر پادری نوس نے تقدیر کے مسئلہ کو چھیڑ دیا، وہ کہنے لگے کہ تقدیر کی تعلیم دینے کی وجہ سے اسلام اپنی افادیت کو کھو چکا ہے، جو کچھ تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔ بندہ اسی کے کرنے پر حجب مجبور میں، تو دین کی تبلیغ و تکلیف کا فائدہ ہی کیلئے رہا، پہلے سال کی رٹوں میں اس کا تذکرہ کیا بھی گیا ہو شاید کسی موقع پر خود میں نے بھی اس کی طرف کہیں اشارہ کیا ہے، لکھا ہے کہ نوس صاحب نے جب تدریس کے مسئلہ کو چھیڑا تو سیدنا الامام الکبیر نے یہ فرماتے ہوئے کہ پادری صاحبوں کا دستور ہے کہ جب کچھ میں نہیں پڑتی تو مسئلہ تقدیر کو لے کر دیتے ہیں یہ آخری چال اور آخری تدبیر ان صاحبوں کی ہوتی ہے، پادری صاحب کی مغلوبیت کی یہ نشانی ہے جو اس مسئلہ کی نوبت آئی۔ اسی کے بعد آپ نے کہا کہ مگر بنام خدا ہم بھی ان شاء اللہ اس کا جواب شافی دیتے ہیں! ۱۶ صاحب روداد نے آپ کی اس تقریر کو نقل بھی کیا ہے۔ حضرت شیخ الہند سے جو روایت اس باب میں مجھ تک پہنچی ہے وہ یہی ہے کہ ہم جو آستانہ شافی دیتے ہیں، یہ کہتے ہوئے کہ جب حضرت الاستاذ نے تقریر شروع کی، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ایک گروہ مسئلہ کی حکمتی حل جاتی ہے، ایک لایحل عقدہ اتنی آسانی سے حل ہو گیا کہ خواص ہی نہیں، جلسہ میں عوام کا جو مجمع تھا، ہر ایک مطمئن نظر آتا تھا۔ اختتام جلسہ کے بعد میں نے اور مولوی احمد حسن امروہوی نے آپس میں کہا کہ آج حضرت نے عجیب و غریب تقریر کی ہے اس کو فوراً قلم بند کر لینا چاہئے، جب ہم دونوں قلم بند کرنے کے لئے بیٹھے، وہ آپس میں گفتگو ہونے لگی، تو بہتہ چسلا کہ بعض پہلو اس تقریر کے بعد بھی ہم لوگوں کی سمجھ میں آئے۔ حضرت الاستاذ اس کا ذکر ہم لوگوں نے کیا، اور عرض کیا کہ جلسہ میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی قسم کی کوئی پیچیدگی اس مسئلہ کے متعلق باقی نہ رہی، مگر بحث کے بعد بعض الجھنیں نظر آتی ہیں کہ ہنوز باقی ہیں۔ اس پر کہتے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر نے فرمایا تھا کہ تقریر میں عام طور پر یہی کیا جاتا ہے کہ سننے والوں کی سمجھ پر مدہ منطبق ہو، لیکن بضرورت کبھی یہ بھی کر لیا جاتا ہے کہ سننے والوں کی سمجھ کی کوئی تقریر کے مطابق نہ لیا جاتا ہے، گویا اشارہ کیا گیا کہ جلسہ میں شاید اتنی قسم کے تعارف سے کام لیا گیا تھا، اس مسئلہ میں دل چسپ لطیفہ وہ ہے جس کا اسی روداد میں مذکر کیا گیا ہے کہ اختتام جلسہ کے بعد ایک صاحب جو مرزا مودعہ کے نام سے مشہور تھے وہاں پادری نوس کے خیمہ میں پہنچے۔ شاید پہلے سے دونوں میں جان پہچان تھی، کیونکہ مرزا صاحب روداد ہی کی ہم کے حصد دار ہیں تھے۔ بہر حال پادری نوس سے مرزا صاحب نے کہا کہ تقدیر کا ثبوت تو تورات میں موجود ہے، پھر آپ نے اسلام ہی کی طرف اس مسئلہ کو منسوب کر کے کیوں اعتراض کیا؟ نوس صاحب نے کہا کہ ہمارے یہاں دو فرقے ہیں، میرا تعلق عیسائیوں کے اس فرقہ سے ہے جو تقدیر کا منکر ہے ۱۷ غدار باد کے سوا ظاہر ہر جملہ اہل کیا تھا، اور ایک تورات کیا خدا کا اعتقاد جس مذہب میں بھی (باقی اگلے صفحہ پر)

شاہ جہاں پور کے مُنصف صاحب کا جو قصہ نقل کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم منصف صاحب مسلمان تھے، یا ہندو۔ میلے کے کسی جلسہ میں یہ بھی آکر شریک ہوئے۔ اتفاقاً اس وقت گفتگو انجیل کے اسی فقرے کے متعلق ہو رہی تھی، جس میں مسلمانوں کے مولوی تو مدعی تھے کہ یہ جعلی فقرہ ہے، بعد کو بڑھا دیا گیا ہے۔ ثبوت میں وہ خود انجیل کے اس مطبوعہ نسخہ کو پیش کر رہے تھے، جن کے حاشیہ میں چھاپنے والے پادریوں کی طرف سے لکھ دیا گیا تھا کہ

”یہ الفاظ کسی قدیم نسخہ میں نہیں پائے جاتے“

خود پادری نوٹس صاحب نے بھی اقرار کر لیا تھا کہ

”میشک یہ فقرہ زائد ہے، اور جو کچھ پادریاں مرزا پور نے حاشیہ پر لکھا، صحیح و درست

ہے۔“ ص ۲۲ مباحثہ شاہ جہاں پور

اسی مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی، ایسا دلیقہ جس میں جعلی فقرہ ثابت ہو جائے کہ باہر سے ملا دیا گیا ہے بطور مثال کے اسی کا ذکر کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر فرماتے ہیں کہ تمنا ہے کہ مقدمات دنیاوی میں تو ایسی دستاویزیں قابل اعتبار نہ رہیں، حالانکہ متنازع دنیا اہل عقل کے نزدیک

”چندان قابل اہتمام نہیں، اور مقدمہ دینی میں ایسی دستاویز محذوف لائق اعتبار ہو جائے۔“ ص ۲۴

لکھا ہے کہ یہ فقرہ زبان مبارک سے جس وقت نکل رہا تھا، تو دیکھا گیا کہ ہزاروں انسانوں کے اس مجمع میں منصف صاحب جو بیٹھے ہوئے تھے سب بیدار امام الکبیر ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پادری نوٹس کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ

”اس مقدمہ میں ہمارے آپ کے حکم منصف صاحب ہی ہے، اور ان کے مقدمات اور جھگڑے بھی یہی فیصلہ کرتے ہیں۔“

صرف یہی نہیں بلکہ براہ راست منصف صاحب کی طرف رخ کر کے یہی ارشاد فرمایا جا رہا تھا کہ

اگر شہ صفحہ ۱۲ پایا جاتا ہے کسی کسی رنگ میں مسئلہ فقیر کا ماننا اس کے لئے ناگزیر ہے۔ و التفتیل فی المطولات ۱۲

”کیوں منصف صاحب آپ ہی فرمائیں۔ اگر کوئی دستاویز جعلی آپ کے یہاں آئے، اور اس کا جعل کھل جائے، خود دعویٰ اقرار جعل کرے یا اور کسی طریقہ سے اس کا جعلی ہونا ثابت ہو جائے تو قانون سرکاری اس کی نسبت کیا ہے اور آپ اس مقدمہ میں کیا فیصلہ فرمائیں گے؟“

غریب منصف حیران تھا کہ اس سارے مجمع میں کسی سابقہ معرفت کے بغیر میری منصفی اور میری شخصیت کا علم ان صاحب کو کیسے ہو گیا۔ لکھا ہے، کہ واپسی کے بعد شاہ جہاں پور پہنچ کر منصف صاحب لوگوں سے کہتے تھے، کہ

”میں ان کو (سیدنا الامام الکبیر کو) نہیں جانتا تھا، اور وہ مجھ کو نہیں جانتے تھے۔ خدا جانے انہوں نے مجھ کو کاہے سے پہچان لیا جو بار بار میری طرف مخاطب ہو کر کہتے تھے کہ منصف صاحب آپ ہمارے حکم رہے، آپ اوروں کے مقدمے فیصلہ کرتے ہیں، ہمارا مقدمہ بھی آپ ہی فیصلہ کیجئے“ ۴۴

پھر ابو داؤد مولانا محمد علی صاحب سے بھی منصف صاحب کی جب ملاقات ہوئی، تو ان سے بھی اپنے تعجب کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ

”مجھ کو بڑا تعجب ہوتا ہے کہ مولوی صاحب اور میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی، پھر نہ معلوم انہوں نے کس طرح مجھ کو پہچان لیا“ ۴۵

بہر حال نہیں کہا جاسکتا کہ منصف صاحب ہندو تھے یا مسلمان، لیکن منطق کی کتاب کے منصف پانسو روپے انعام پانے والے پادری اسکاٹ صاحب تو قطعاً مسلمان نہ تھے عیسائی، اور عیسائیوں کے پادری تھے، حضرت دالائی تقریروں سے متاثر ہو کر ایک دفعہ نہیں، بلکہ رد و داد سے معلوم ہوتا ہے، کہ بار بار مختلف موقعوں پر کہتے پھرتے تھے کہ

”مولوی صاحب (یعنی سیدنا الامام الکبیر) مولوی نہیں صوفی مولوی ہیں“ ۴۶

سمجھا جائے، تو ان الفاظ میں گویا حضرت دالاکے اسی باطنی پہلو کا اعتراف پر شیدہ نظر آتا ہے، اور سچ تئیر ہے کہ مٹاتے ہوئے جس نے اپنے آپ کو اس حد تک مٹا دیا ہو کہ تقریر سے پہلے اپنے آپ کو ان

الفاظ میں روشناس کر رہا ہو کہ

”میری خستہ حالی پر نظر کیجئے، اس سے بھی کیا کم کہ مجھ کو بھی بمنزلہ ایک بھنگی سمجھئے“

اور کہہ رہا ہو کہ

”منادی کرنے والے کا بھنگی ہونا احکام دنیا کے احکام کے قبول کرنے اور تسلیم کرنے میں

مانع نہیں، اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ منانے والا بھنگی ہے، غریب ہے، یا امیر غلام لڑک ہوں،

یا نواب، بھنگی کی زبان سے احکام پادشاہی سن کر سر نیاز خم کرتے ہیں“ ص ۱۱۱ مباحثہ

ذات وصفات کے اختلا میں جس کی کوشش اس نوبت تک پہنچ چکی ہو، کہ پادری نولس جو حضرت کے علم و

بیان سے غیر معمولی طور پر متاثر تھا، مداح تھا، اس نے جب آپ سے آپ کا نام و نشان دریافت کیا تو لکھا

ہے کہ اس وقت بھی یہی بتایا گیا کہ خورشید حسین نام ہے ضلع سہارنپور کا رہنے والا ہوں مبلغ میلہ خدا شناسی

جو نہیں جانتے ہیں، ان سے کیا کہئے؟ لیکن راہ کے چلنے والے تو یہی کہتے چلے آ رہے ہیں کہ جو واقعی

”عبداللہ“ بن جاتا ہے، دیکھا ہی گیا ہے کہ ”گفتہ“ ”اؤ گفتہ“ ”اللہ“ اس کے لئے اجر نقد بنا ہوا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ بد اعتقادی کے اس زمانہ میں اس کو خواہ مخواہ خوش اعتقادی قرار دینے پر اگر اصرار

کیا جائے، تو یوں بھی ایک بات سمجھ میں آتی ہے، کہ ہندو جو گویا تاریخ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ”مذہبی

مباحثہ کے لئے پہلی دفعہ خدا شناسی کے اس میلہ میں لا کر کھڑے کئے گئے تھے۔ پہلے سے فاسد اعراض

اس میلے کے پیچھے مان بھی لیا جائے کہ پوشیدہ نہ ہوں۔ پھر بھی عام حالات میں ہندو مذہب، اور

ہندوؤں کے پیشواؤں کے متعلق جن خیالات کے اظہار کی توقع مسلمانوں کے عام مولویوں سے پادریوں

کا طبقہ کر سکتا تھا، اور واقعہ یہی ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کے روکے گئے جانے میں اگر خدا خواستہ کامیابی

ہو جاتی، اور اس میلے میں مولاداد جیسے کالے پادری، وہی جس نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان

گراہی میں اپنی یاد گوئیوں، اور ہرزہ سرانیوں سے مسلمانوں کے قلوب کو خواہ مخواہ اذیت پہنچائی تھی کچھ اسی

طرح کے ہلکے بھلکے، خام کار، تاجر بہ کار مولوی ادھر ادھر سے اکٹھے ہو جاتے تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان سے

پادریوں کا اسید پوری نہ ہوتی خصوصاً ایک ایسے زمانے میں جب پنڈت دیانند سرسوتی کے طرز عمل سے

زمین بھی تیار ہو چکی تھی، اور عرض کر چکا ہوں کہ نئی قائم ہونے والی حکومت کے بعد کتابیں بھی ہندو مذہب کی تنقید و اعتراض کے متعلق شائع ہو چکی تھیں، اور شمال و جنوب دونوں علاقوں میں مسلمانوں میں بولی جانے والی زبانوں میں کسی شیخ سلیم نامی صاحب کی ”کتھا سلونی“ یعنی ع کہو یہ کون دھرم ہے، ترجمہ بند وانی نظم اور دکنی زبان میں صغیر تخلص رکھنے والے کسی گنام شاعر والی مسدس جس میں ٹیپ کا شعر ہے

یاد ہووے گر تمہیں ہم کویتا و برہمن

کا ہے کوچرہ تے ہو، نا حق پوچھتی پتھر تم

عام طور پر ملک کے طول و عرض میں پھیلائی جا چکی تھی، چاہئے تو کہہ سکتے ہیں، کہ کافی ہتھیار مسلمانوں میں گویا تقسیم ہو چکے تھے۔ ان حالات میں کیسے کہا جاسکتا ہے، ان بانٹے ہوئے ہتھیاروں کے استعمال کی نوبت خدا شناسی کے اس میلے میں نہ آتی۔ آخر مولاداد پادری مسلمانوں کو جب وہ سب کچھ سنا سکتا تھا، جو اس نے سنایا، تو ان مولویوں کو بھی کون روک سکتا تھا، اگر ہندوؤں کو وہی سب کچھ سنانے لگتے، جس کے سنانے کی توقع پادری کر سکتے تھے۔

اب یہ خدا کی طرف سے بات تھی، کہ روکنے کی تدبیروں کے باوجود سیدنا الامام الکبیر رک نہ سکے، اور ایک ہی میلے میں نہیں، بلکہ دوسرے سال کے میلے میں بھی عملاً آپ شریک ہوئے، شریک ہوئے کیا معنی؟ سچی بات تو یہ ہے، کہ اول سے آخر تک مسلمانوں کی طرف سے پہلا میلہ ہو، یا دوسرا، گویا بچھنا چاہئے، دونوں ہی میں آپ ہی آپ تھے، جو کچھ کہا، آپ ہی نے کہا، اور جو کچھ کیا، آپ ہی نے کیا، اس سلسلے میں اور تو جو کچھ آپ نے کہا سنا، وہ تو خبر بجائے خود ہے، خاص کر ہندوؤں کے دین، اور دینی پیشواؤں کے ذکر کے جو مواقع پیش آئے، ان میں خود سوچنا چاہئے، اپنے اس کلی عقیدے کو پیش کرتے ہوئے کہ ”ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اور ادیان و مذاہب اصل سے غلط ہیں، دین آسمانی نہیں ہیں“

جو یہ اعلان کر رہا ہو کہ

”دین ہندو اس کی نسبت اگرچہ ہم یقیناً نہیں کہہ سکتے، کہ اصل سے یہ دین بھی آسمانی ہے“

لیکن جیسے یقیناً نہیں کہہ سکتے، ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمایا کہ

”مگر یقیناً یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ دین اصل سے جعلی ہے۔ خدا کی طرف سے نہیں آیا۔“

اسی کے بعد ان قرآنی شواہد کو پیش کرتے ہوئے، جن میں اطلاع دی گئی ہے، کہ خدائی نمائندوں کے کسی قوم و ملت کو ان کے پیدا کرنے والے نے محروم نہیں رکھا، پھرے مجمع میں یہ کہہ رہا ہوں کہ

”پھر یہ کیوں کر کہہ دیجئے، کہ اس ولایت ہندوستان میں جو ایک عریض و طویل ولایت ہے، کوئی یادی نہ پہنچا۔“

اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ اضافہ

”کیا عجیب ہے کہ جس کو ہندو صاحب اوتار کہتے ہیں، اپنے زمانہ کے نبی یا دلی یا نائب نبی ہوں۔“

اور اسی کے ساتھ قرآنی آیت جس میں بیان کیا گیا ہے، کہ قرآن میں بعض رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے، اور ایسے بھی انبیاء و رسل ہیں جن کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، یعنی منہم من قصصنا علیہم و منہم من لم نقصص علیہم کو تلاوت کر کے اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ فرما رہا ہوں کہ

”کیا عجیب ہے، کہ انبیاء ہندوستان بھی ان ہی نبیوں میں سے ہوں، جن کا تذکرہ آپ سے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) نہیں کیا گیا۔“

پھر یہی نہیں، بلکہ جیسے عیسائیوں کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقدیس و تنزیہ کی ذمہ داری مسلمانوں کے سپرد کی گئی، غلط عیسائیت یا کشمچیانہ کی بددلت، یا غلط یہودیت کی راہ سے حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف ایسی باتیں جو منسوب ہو گئی ہیں جن کا اعتبار ان کی برگزیدہ ذات کی طرف کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا، ان آلودگیوں سے حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کو پاک کر کے دنیا میں پیش کرنا، یہ مسلمانوں کا دینی فرض ہے، تھیک اسی طرح ہندو مذہب کے جن پیشواؤں کی طرف ناسترا باتیں منسوب ہو گئی ہیں، ان سے تزکیہ و تطہیر کے فرض کو بھی خواہی اور استرازی جذبات کے ساتھ ان الفاظ میں ادا کر رہا ہوں کہ

”جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف دعویٰ خدائی نثارنے نے منسوب کر دیا ہے، اور دلائل عقلی و نقلی اسکے مخالف ہیں، ایسے ہی یہ عجیب ہے کہ سری کرشن اور سری رام چندر کی طرف بھی یہ دعویٰ

(خدائی وغیرہ کا) بدروغ منسوب کر دیا گیا ہو۔“

اور جیسے بنی اسرائیل کے بعض انبیاء حضرت داؤد و حضرت لوط علیہما السلام کی طرف یہود نے ناگفتہ بہ باتیں منسوب کی ہیں۔ لیکن ان سے ان بزرگوں کا تبریہ، و تنزیہ مسلمانوں کا دینی عقیدہ ہے، اسی طرح ہندو مذہب کے جن پیشواؤں کی طرف منسوب کرنے والوں نے کچھ ایسی قسم کی نکوہیرہ، ناگفتہ باتیں منسوب کر دی ہیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے، یوحنا سانی پادریوں کو یہ سنارہا ہو کہ

”کیا عجب ہے کہ سری کرشن دوسری رام چند بھی ان عیوب مذکورہ سے مبرا ہوں، اور دل نے

ان کے ذمے یہ تہمت (زنادسرت) لگا دی ہو؟“ ملا مباحثہ

آج سننے والے سیدنا امام الکبیر کی ان تقریروں کے نہیں ہیں، اور نہیں کہا جاسکتا کہ جو کچھ ان مواقع پر آپ نے فرمایا تھا، مجسہ اس کے ظلم بند کرنے میں رد واد کے مرتب کرنے والے کا مایاب بھی ہوئے ہیں لیکن جب ہم جانتے ہیں کہ اس باب میں جو کچھ بھی فرمایا جا رہا تھا، کسی وقتی مصلحت کے زیر اثر نہیں کہا جا رہا تھا کیونکہ واقعہ اور جو کچھ ان میلوں میں گذرا ان کو ایک خاص نقطہ نظر سے مرتب و مربوط کرنے کے بعد آج خواہ جس نتیجے تک ہم پہنچتے ہوں، لیکن عرض کر چکا ہوں کہ ایسی کوئی شہادت میرے پاس نہیں جس کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہو، کہ پورے طور پر نہ ہی، کسی نہ کسی حد تک سیدنا امام الکبیر کو بھی ضا شناسی کے ان میلوں کے عقبی محرکات کا جکا سراخ آج مل رہا ہے اندازہ ہو گیا تھا، بلکہ جہاں تک قرائن اور حالات کا اقتضا ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان سے آپ قطعاً خالی الذہن تھے، ماسوا اس کے کچھ اسی میلے کی تقریروں ہی کی حد تک آپ کے مذکورہ بالا خیالات محدود نہیں ہیں۔ آپ کی دوسری کتابوں میں بھی یہی باتیں مختلف تعبیروں میں ملتی ہیں۔ وہی کتاب جس کا نام جواب ترکی بہ ترکی ہے، مختلف حوالے اس کتاب کے گذرے بھی ہیں۔ اس کتاب کے مروجہ پرچھپا ہوا تو یہی ہے، کہ حضرت والا کے تلمیذ سعید مولنا عبد العلی صاحب کی تصنیف ہے، لیکن عموماً مشہور یہی ہر اور مصنف امام نے اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ

”مولنا سیدنا امام الکبیر نے کچھ بیان فرمایا، اور کچھ تحریر شروع کی، جس کو مولوی

عبدالعلی صاحب نے بطرز جواب لکھا، اور نام ”جواب ترکی بہ ترکی“ رکھا، ص ۲۷
مطلب جس کا یہی ہے، کہ ترتیباً نہ سہی، لیکن مضموناً یہ کتاب درحقیقت خود حضرت والا ہی کی ہے خود اسی کتاب
میں یہ عبارت جو پائی جاتی ہے، یعنی

”مزید تحقیق کو مکتوب دوم نمبر اول قاسم العلوم پر حوالہ کر کے یہ عرض کرتا ہوں“ ص ۲۹ جواب
ترکی بہ ترکی

جو جانتے ہیں کہ ”قاسم العلوم“ حضرت والا کے چند خاص مکاتیب اور مقالات کے مجموعہ کا نام ہے،
وہ اگر یہ سمجھیں کہ قاسم العلوم ہی کے مصنف کے ظم یا زبان سے یہ نکلا ہوا فقرہ ہے، تو ایسا باور کرانے کی
یہ کافی وجہ ہے، کچھ بھی ہو، اتنا بہر حال اب بھی کتاب کے مسروق پر چھپا ہوا ہے کہ
”بایما، حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین جناب مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند
لکھے گئے“

نظر بوجہ بالا اتنی بات مسلم ہے، کہ کتاب کسی نے لکھی ہو، لیکن اصل مضامین کی حد تک اس کتاب میں جو کچھ
ہے، وہ سب حضرت والا ہی کے براہ راست تصدیقہ افکار و مسلمات ہیں۔ اسی کی تعبیر ان الفاظ میں فرماتے
ہوئے کہ

”ہم نے اب تک نہ دیکھ کر کہا ہے، نہ پیشوا یاں دین ہنود کو برا کہا ہے، اور برا کہیں تو کیوں کہیں“
آئے جو یہ ارشاد ہوا ہے، کہ ہندو دھرم کے
”پیشواؤں کو برا کہنے تو ان کا کیا قصور“

یہ کتنی معقول اور انصاف کی بات ہے۔ فرض کیجئے کہ موجودہ نسلوں سے ان کی مسلمانوں کو تکلیف و اذیت
بھی پہنچے، لیکن اس میں ان کے گزشتہ پیشواؤں اور بزرگوں کا کیا قصور ہے، کہ موجودہ نسلوں کے اعمال
کا بدلہ گزرے ہوئے بے قصور لوگوں سے لیا جائے۔ کاش ادوسری قومیں بھی انصاف و عدل کے اس
نظریہ کی رعایت کریں، اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے ان کو کوئی شکایت پیدا ہو، تو وہ بھی اپنی ہی منہادی
کو محسوس کریں کہ مسلمانوں کے بزرگوں کو ان کی قبروں سے، ان کے مآثر سے انتقام لینے کا بھلا کیا مطلب

ہو سکتا ہے، چوٹ آپ کو پہاڑ سے اگر لگی ہے، تو گھر کی سل سی اس کا بدلہ لینا خود ہی سوچئے کہاں تک انصاف کا، عقل کا، انسانیت کا تقاضا ہو سکتا ہے۔ اسی مقام میں نہیں، بلکہ اسی کتاب کے ابتدائی ادراک میں بھی اسی مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے، منشی اندلال کو جنکے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، سمجھایا گیا ہے کہ ”تمہارے بڑوں کو سنائیں، تو ان بے چاروں کا کیا تصور“ مگر

اور ٹھیک جیسے میلہ کے جلسوں میں سری کرشن، اور سری رام چندر جی کے متعلق آپ نے فرمایا تھا، اسی کتاب میں بھی ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”پھر بھی خیال کہ شاید اپنے زمانہ کے بزرگ ہوں، اور جو حرکات ناشائستہ ان کی طرف منسوب ہیں، عجب نہیں غلطی تاریخ کی ہو“

صرف پیشواؤں ہی کی حد تک نہیں، بلکہ ہندو دھرم کی اساسی کتاب وید کا تذکرہ کر کے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

”ویدوں کو برا کہئے، تو کیا ضرورت، اور پھر یہ احتمال کہ شاید کوئی مضمون الہامی ہو، اور شرک وغیرہ امور باطلہ کی تعلیم جو اس میں درج ہے، کیا عجب ہے، از قلم تحریف ہو“ مگر

بہر حال ہندوؤں کے دینی پیشواؤں، اور ان کی دینی کتاب دید کے متعلق جس کے عام احساسات کی نوعیت یہ ہو، سوچا جاسکتا ہے کہ اسی نے جس وقت میلے میں اپنے ان احساسات کو جو کم از کم پادریوں کی توقعات کو بھی قطعاً خلاف تھے، آخر جس زمانہ میں یہ پھیلا یا جا رہا تھا کہ ہندو مذہب ہی نہیں، بلکہ جس زبان میں ہندوؤں کا مذہب ہے یعنی سنسکرت، مسلمانوں کو اس زبان سے ابدی نفرت رہی ہے، یہ اور اسی قسم کی غلط فہمیوں سے لب ریز و معمور ماحول میں اچانک مسلمانوں کے ایک مسلم الثبوت، عالم باعمل کی زبان مبارک سے مذکورہ فقرے نکل کر کاغذ سے جس دقت ٹکرا رہے ہوں گے، تو وقتی مصلحت کو تقاضوں کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا، بلکہ وہی واقعی آپ کے خیالات و احساسات تھے، قدر قابل دلچسپ کا جو رنگ، اور بیان میں زور قوت کی جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے،

ایسی صورت میں نہ پادریوں کے چہروں کی انفرادی خوشگلی ہی محل تعجب ہو سکتی ہے، بلکہ میلے میں علم ہندو

جو شریک تھے، ان میں اس کے برعکس آثار کا مشاہدہ اگر کیا گیا تھا تو بھی کیلئے کوئی اچھے کی بات ہو سکتی ہے؟ بلکہ اسی کے ساتھ انصاف کی بات یہی ہے کہ گو خدا شناسی کے ان دونوں نیلوں میں ہندوؤں یا ہندو مذہب کے نمائندے پنڈتوں کی طرف سے بعض اشتعال انگیز اقدامات ضرور ہوئے۔ پادریوں کے ساتھ بتدریج ان کا مل جانا، ملجانا کیا سنی؟ ان ہی میں مدغم ہو کر کھپ جانا، ہندوؤں کے متعدد فرقوں کا نام لے کر ہر فرقہ کی طرف سے نمائندگی کا مطالبہ پیش کر کے اکثریت حاصل کرنے کی کوشش، رائے دہی کے مواقع میں عموماً پادریوں ہی کے ساتھ ان کا ہاتھ اٹھانا، یہ اور اسی قسم کے کام تو ان کی طرف سے بھی ایسے کئے جا رہے تھے جس سے مقابل پارٹی کے نمائندے مشتعل ہو سکتے تھے۔ سیدنا الامام الکبیر نے منشی پیارے لال سے بطور شکایت کے کہا بھی تھا کہ پادریوں کی طرف آپ لوگ دھل جاتے ہیں، ہندوؤں کے نمائندے جو کچھ کر رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے آخر جلیبہ کے ہتم موتی میاں صاحب سے بھی نہ رہا گیا تھا اور ترش رو ہو کر بول اٹھے تھے کہ

”پادری صاحبوں کے کہنے پر بے سوچے سمجھے ہاتھ اٹھا کر تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ بات سازش اور

اتفاق باہمی پر دلالت کرتی ہے۔“ ص ۵

کوئی شبہ نہیں کہ تنگ ظرفی، اور تنگ نظری چاہتی تو اسی ترش روی کو بڑھاتے ہوئے، نفرت اور دشمنی و عداوت تک پہنچا سکتی تھی، لیکن پہلی بات تو یہی تھی کہ جو کچھ بھی ہو ہاتھ، ہندو مذہب کے نمائندوں کی طرف سے ہو رہا تھا، لیکن میلے میں عام ہندو جو شریک تھے، ان بے چاروں کو اس سے دور کا بھی تعلق نہ تھا، پھر ان پنڈتوں یعنی ہندو مذہب کے دکھار کی طرف سے کرنے کی حد تک جو کچھ کیا گیا ہو، لیکن انہوں نے جو کچھ کہا، تقریر کی، یا تحریر پڑھی، اس میں ایسی بات شاید نہیں کہی گئی، جس سے مسلمانوں کو شکایت پیدا ہوتی، اب غراہ اس کی وجہ یہ ہو کہ واقع میں ان کی تقریروں اور تحریروں میں ایسی کوئی چیز تھی ہی نہیں، یا سنسکرت آمیز بھاشا والی زبان جو وہ استعمال کر رہے تھے، وہ پردہ پوش بن گئی۔

مگر برخلاف اس کے عیسائیوں کی طرف سے ادل سے آخر تک وہی کیا گیا، اور وہی کہا گیا، جس سے نفرت و حقارت کی آگ قدرتا مسلمانوں میں بھڑکتی رہی، ان کی سینہ زوریاں ہر ہر قدم پر اپنی برتری کا

اٹھارہ اپنے قابوچی بننے پر اصرار، اپنی منہ زوریوں میں مسلمانوں کے پیغمبر ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم تک کے متعلق جب ان کی طرف سے گندگیاں اچھالی جا چکی تھیں، تو اس کے بعد بات ہی کیا باقی رہ گئی تھی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ سوچ و سمجھ کر یہ کیا گیا تھا، لیکن حالات کے قدرتی نتائج کا ظہور اگر اس شکل میں ہوا کہ گو مسلمانوں کے مقابل میں عیسائیوں کی طرح ہندو بھی اس میلے میں کھڑے ہوئے تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی طرف سے سب کچھ کرنے والے اور سب کچھ کہنے والے سیدنا الامام الکبیر ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ عیسائیوں ہی کو اپنا مد مقابل بتائے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مذہب کے اسامی کلیات کی تشریح کرتے ہوئے جہاں جہاں ضرورت ہوئی ہے، وہاں آپ نے ہندو مذہب کے بعض عقائد کا بھی تمثیل ذکر کیا ہے۔ لیکن اب اس ہمہ دونوں سالوں کے میلوں میں حقیقی نشاۃ، آپ کی تقریروں کا عیسائی ہی نظر آتے ہیں۔ یاد ہو گا کہ پہلے سال کے میلے کا پہلا دن جب ختم ہوا اور مولویوں کو آپ نے میلے میں گھوم گھوم کر تبلیغ کا حکم دیا، تو لکھا ہے، میں نے شاید پہلے بھی نقل کیا ہے کہ ”چنانچہ داعطین (اسلام) نے جا کر علی الاعلان منادی اسلام و ابطال عیسائیت کو مینا کرنا شروع کیا“ ص ۲۱

ابطال کے کام کو عیسائیت ہی کی حد تک کیوں محدود رکھا گیا۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، کہ ہندوؤں کی طرف رخ مولویوں کی تقریروں کا نہ تھا۔ نیز اس قسم کے واقعات جن کا تذکرہ ان رد وادوں میں کیا گیا ہے۔ مثلاً محی الدین پشادری نامی ایک کالے پادری نے کسی ریاض الدین نامی شخص کی کتاب کا حوالہ پیش کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ حضرت مسیحؑ میں الوہیت کی شان پائی جاتی تھی، یہی اسلامی عقیدہ ہے، ریاض الدین رومی نے یہی لکھا ہے، جو مسلمانوں کے معتبر پیشواؤں میں تھے، سیدنا الامام الکبیر نے اس کے جواب میں دوسری باتوں کے ساتھ اسی کالے پادری کو مخاطب کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ

”آپ بھی توحی الدین پشادری ہیں، آپ کی شکل و صورت مسلمانوں کی سی ہے، نیچی ڈاڑھی

کرتہ پہنے ہوئے ہیں، نام بھی مسلمانوں کا سا ہے“ ص ۲۱ مباحثہ

جس سے اس جھنجھلاہٹ کا اندازہ ہوتا ہے، جو سیدنا الامام الکبیر کے قلب مبارک میں پادریوں کے اقوال و اعمال سے طبعاً پیدا ہو گئی تھی اور جیسا کہ کہتے ہیں، چور کی داڑھی میں تینکے کی تلاش کرنا ہے، ہم ان عیسائی پادریوں ہی کو پاتے ہیں کہ سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کا نشانہ وہ بھی اپنے آپ ہی کو قرار دیئے ہوئے تھے، ایک موقع پر اس کا تذکرہ فرماتے ہوئے، کہ خالق تعالیٰ جل مجدہ کی ذات پاک کو مخلوقات سے کیا نسبت؟ جب دو مخلوقوں، بلکہ دو آدمیوں کا حال یہ ہے کہ پادری صاحب کو کوئی اگر چہا کہہ دے، تو آپے سے باہر ہو جائیں، حالانکہ پادری صاحب اور چار میں کیا فرق ہے۔ یہی مخلوق، وہ بھی مخلوق، وہ بھی انسان یہ بھی انسان، ان کے پاس بھی دو آنکھیں ایک ناک اور دو کان، تو اس کے پاس بھی یہی سب کچھ، حالانکہ یہ ایک بالکل برجستہ تمثیلی بات تھی، لیکن لکھا ہے کہ یہی کالے پادری صاحب محی الدین پشاوری کھڑے ہو کر سیدنا الامام الکبیر کو براہ راست مخاطب بناتے ہوئے چلانے لگے کہ

”آپ نے کل بھی بعض کلمات سخت کہے تھے اور آج بھی اب آپ نے بعض کلمات

سخت بیان کئے“ ملے مباحثہ

یعنی کل انجیل کے الحاقی فقرے کو نجاست سے تشبیہ دی، اور آج پادری کو چار سے تشبیہ دی گئی، لکھا ہے کہ چین پر چین ہو کر اس نے سیدنا الامام الکبیر کو خطاب کر کے یہ بھی کہا کہ ”ہم تمہارے سن و سال کا لحاظ کرتے ہیں“

بہر حال عیسائی جیسی کہتے تھے، ان رودادوں سے معلوم ہوتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ویسی نہیں، تو کچھ نہ کچھ اس جیسی بات کبھی کبھی ان کو سنائی دی جاتی تھی، لیکن اسی میدان مباحثہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں حالانکہ ہندو بھی صاف آراء تھے، اور آپ دیکھ چکے کہ کرنے کی حد تک کافی اشتعال انگیز اقدامات ان کی طرف سے بھی مسلسل ہوتے رہے، لیکن ان کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر کا رویہ اول سے آخر تک دونوں ہی میلوں میں، میلوں کے ہر اجلاس میں، اجلاسوں کا اندر بھی، اور ان سے باہر بھی کچھ ایسا رہا، کہ شاید صلح و عفو، درگزر کے سوا، ہم آپ کے اس رویہ اور خوش گو کو یا اور کچھ نہیں کہہ سکتے، کہنے والا جا ہے، تو کہہ سکتا ہے کہ ان دونوں درمقابل فرقوں میں سے ایک کے ساتھ یعنی عیسائیوں کے ساتھ

آپ کا جو طرز عمل تھا، جیسے وہ قرآنی حکم

جزاء سنۃ سنۃ مثلھا | برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے۔

کی تعمین علی شکل تھی، اسی طرح قرآن میں اسی کے بعد قانون کے دوسرے پہلو کی طرف

فمن عفا واصلح فلجراہ علی اللہ | اور جو عفو وصلاح کی بات کرے تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔

کے الفاظ سے جو اشارہ کیا گیا ہے اس کا عملی تجربہ گویا اس سلوک سے کرایا جا رہا تھا، جو ہندوؤں کے ساتھ

کر کے دکھایا جا رہا تھا، قرآنی قانون کے اسی دوسرے پہلو کا ثمرہ قرآن ہی میں جو یہ بتایا گیا ہے، یعنی

اسی پہلو کی تعبیر

ادفع بالتی ہی احسن | سب سے زیادہ بھلے طریقہ سے جواب دو

سے فرماتے ہوئے، اطلاع دی گئی ہے، کہ

فاذا الذی بینک و بینہ عد اودة | تو اچانک وہ کہ تم میں اور اس میں عداوت تھی، مخلص

کانہ ولی حمیم | دوست ہو جائے گا۔

گویا ذمہ داری لی گئی ہے کہ ”مدافعت بالحسن“ پر ہر حال یہی نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا، انسانی نفسیات کو

ڈھالنے والے نے اسی سانچہ میں ڈھالا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں سیدنا الامام الکبیر کے خطبات اور تقریروں کے تاثری نتائج ان

دونوں قوموں پر قطعاً متخالف رنگ میں اگر نمایاں ہو رہے تھے، تو آپ خود ہی سوچئے، کہ اس کے سوا،

دیکھنے والے اور دیکھتے کیا، دوسرے لفظوں میں چاہئے تو اس بنیاد پر کہہ سکتے ہیں، کہ خدا شتا سی

کے ان میلوں کو قائم کرنے والوں نے خواہ جس مقصد اور نیت سے قائم کیا ہو، لیکن سیدنا الامام الکبیر نے

جیسا کہ اسلام کے بنیادی حقائق کی تبلیغ کا ذریعہ بنالیا تھا۔ اسی طرح مذکورہ بالا قرآنی قانون کے ان دونوں

پہلوؤں کی عملی تجربہ گاہوں کا قالب بھی ان ہی میلوں نے آپ کی بدولت اختیار کر لیا تھا۔ اب خواہ اسباب

کچھ ہی ہوں، باطنی تصرفات کا نتیجہ سمجھا جائے، یا خلاف توقع ہندو دھرم اور ہندو دھرم کے پیشواؤں

کے متعلق سیدنا الامام الکبیر نے اپنے جن احساسات کا اظہار فرمایا، یا بجائے مجازاً بالمشمل کے

ہندوؤں کے ساتھ ”مدافعت بالحسنیٰ“ کے قرآنی حکم کے تجربہ کا یہ اثر تھا، یاد اللہ اعلم بالصواب ان کے سوا کوئی اور بات ہو، مگر آنکھوں نے جو دیکھا تھا اور کانوں نے جو کچھ سنا تھا، ان رومادوں میں آپ پر مہرِ جبرت ہوتی ہے کہ ایک طرف جیسا کہ گذر چکا عیسائیوں کے متعلق تو عموماً یہی لکھا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کے بعد ششدر و حیران، سراسیمہ و پریشان نظر آتے تھے، کالے پادری ہوں، یا گورے سب ہی پر افسردگی چھا جاتی تھی۔ عموماً غصہ میں بھرے ہوئے الفاظ ان کی زبانوں سے نکلتے تھے۔ چین بجیں ہو کر گفتگو کرتے، کہنا کچھ چاہتے تھے، اور منہ سے کچھ نکلتا تھا، بعض دفعہ تو ایسی صورتیں بھی پیش آئیں، جیسا کہ لکھا ہے کہ کالا پادری محی الدین پشادری جو کئی دفعہ اپنی بے محل گفتگو سے پادریوں کو رسوا کر چکا تھا، جب تقریر کرنے کیلئے اٹھا، تو

”اور پادری ان کی طرف گھورنے لگے۔“ مباحثہ

اسی سلسلہ میں یہ لطیفہ بھی پیش آیا، کہ امام فن مناظرہ مولوی ابوالمنصور نے باہم پادریوں کے اس رنگ کو دیکھ کر کہا کہ

”دیکھنا ان کو نہ کھڑا کرنا، نہیں تو پھر اسی طرح فضیحت کر ایسے گئے۔“ مباحثہ

مرعوبیت کا حال یہ تھا کہ کالے تو کالے ایک یورپین نژاد گورے پادری جن کا نام جان ٹامسن صاحب تھا، لکھا ہے کہ بولنے کے لئے کھڑے ہوئے، مگر

”ایک دو لفظ کہنے پائے تھے، کہ جورہ گئے۔“ مباحثہ

اور آگے کچھ بول نہ سکے، اپنی منوبیت کو محسوس کر کے شور اور ہنگامہ مچانے لگے، اور تو اس آخریں تو پادری نولس تک کے متعلق لکھا ہے، کہ ان کا آخری سرمایہ بھی پیہرہ گیا تھا کہ

”چلا چلا کر اپنے مذہب کے فضائل بے دلیل بیان کرتے رہے۔“ مباحثہ

بدحواسی میں اپنی کتابیں جلسہ میں چھوڑ کر بھاگے مسئلہ تقدیر یا ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کے گستاخانہ اشارے، اس قسم کی باتوں کو مذہبی حرکات کے سوا اور کیا سمجھا جائے، مگر آئیے، اور دیکھئے ہندوؤں کا حال کیا تھا؟

ہندو مذہب کے مائندے پنڈت دیانند یا منشی اندرمن کے ایسے اعترافات مثلاً رسالہ مباحثہ شاہ جہاں پور میں نقل کیا ہے کہ جلسہ برخواست ہونے کے بعد جب سیدنا الامام الکبیر اپنی فرودگاہ میں پہنچے، تو وہیں حاضر ہو کر

”موتی میاں، مولوی قاسم صاحب سے فرمانے لگے، کہ پنڈت دیانند سرستی اور منشی اندرمن آپ کی، اور مولوی منصور علی صاحب کی بہت تعریف کرتے تھے، اور دونوں صاحبان کی تقریر اور علم کے بہت مداح تھے“ ۵۵

اس کے متعلق تو کہا جاسکتا ہے، کہ اس قسم کی منہ دیکھی تعریف تو پادری نولس وغیرہ نے بھی کی تھی، مگر نولس صاحب کی تعریف تو واقعی سیدنا الامام الکبیر کے سامنے منہ پر کی گئی تھی، اور پنڈت جی، یا منشی جی کی تعریف منہ پر نہ تھی، بلکہ بیٹھ پیچھے موتی میاں کے آگے کی گئی تھی اسی طرح ایک موقع پر جب پنڈت جی کے سوال کا جو صحیح مطلب تھا، پادری اسکاٹ نہ سمجھ سکے اور پنڈت جی کے منشا کی وضاحت سیدنا الامام الکبیر نے فرمائی، تو منشی پیارے لال کے ہم دم دہم رازہ لالہ مکتا پر شاد کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکل پڑا کہ

”ہاں مولوی صاحب ہی مطلب ہے جو آپ نے بیان کیا“ ۵۶

اسی طرح مقصد تخلیق پر سیدنا الامام الکبیر نے جو تقریر فرمائی تھی، تو ختم تقریر پر لکھا ہے، کہ یہی لالہ مکتا پر شاد تھے، یا منشی پیارے لال بانی میلہ، بہر حال ان دونوں میں سے کوئی ایک بے اختیار ہو کر بول اٹھا تھا، کہ

”جواب اس کو کہتے ہیں“ ۵۷ مباحثہ

یا کہا کہ ”جو اب تو یہ ہوا“

کچھ پوچھئے، تو میرے تعجب کا تعلق اس قسم کی چیزوں سے نہیں ہے، جلسوں میں مقررین اور خطیبوں کے ساتھ عموماً ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، بلکہ حیرت میں مجھے جس چیز نے ڈالا ہے، وہ ان عام ہندوؤں کا حال ہے، جو دونوں سال کے میلوں میں شریک تھے، اور قرآن کا اقتضاء

یہی ہے کہ ہر سال کے میلے میں اکثریت ان ہی کی تھی۔

ایسی صورت میں سیدنا الامام الکبیر کی تقریروں کے متعلق جہاں جہاں ایسی خبریں دی گئی ہیں، مثلاً پہلے سال کی روداد کی وہی اطلاع جس کا شاید پہلے بھی کہیں ذکر گذرا ہے، یعنی لکھا ہے، کہ ”یہی تقریر ہو رہی تھی، اور لوگوں پر ایک کیفیت تھی، ہر کوئی ہمہ تن گوش ہو کر مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کی جانب تک رہا تھا، کسی کی آنکھوں میں سنتے ہیں آنسو، اور کسی کی آنکھوں میں حیرت“ ۱۷ میلہ

اسی طرح دوسرے سال کے میلے کی روداد میں بھی آپ کی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے، کہ

”ایسا زور و شور کا وعظ ہوا، کہ تمام جلسہ حیران رہ گیا ہے، اور ہر شخص پر سکتہ کا عالم تھا“

۱۸ واقعہ شاہ جہاں پور

اثر پذیر یوں کی تصویریں الفاظ میں کھینچی گئی ہے، ان کا اقتضا تو یہی ہے کہ حاضرین جلسہ کے کسی خاص طبقہ کے ساتھ ان کو مخصوص نہ سمجھا جائے، کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ”ہر کوئی“ یا ”تمام جلسہ“ جیسے عام الفاظ سے ہندوؤں کو مستثنیٰ کر کے جلسہ کے ان ہی مشرکوں تک ان کو محدود کر دیں جو مسلمان تھے۔ خصوصاً جب تسلیم کر لیا جائے، کہ اکثریت ان جلسوں میں ہندوؤں ہی پر مشتمل تھی، یوں بھی بیان خطابت کا جو تعلق عام انسانی احساسات کے ساتھ ہے، ان احساسات کو کسی خاص مذہب کے ماننے والوں ہی تک کیوں منحصر سمجھا جائے۔ مگر یہ حال تو اس وقت کا تھا، جب سیدنا الامام الکبیر کی تقریر ہوتی تھی لیکن تقریر سے فارغ ہونے کے بعد جو تماشے دیکھے گئے۔ اجنبی تو ان ہی پر ہوتا ہے، بیتان کرنے والوں نے بجائے اجمال و عمومیت کے صاف صاف واضح الفاظ میں ان کو بیان بھی کیا ہے، درحقیقت مقصود ان ہی کا تذکرہ ہے، ذرا ملاحظہ فرمائیے، لکھا ہے، کہ جلسہ جس وقت برحق ہوا، تو

”باہر آتے ہی، مولوی محمد قاسم صاحب کے گرد ایک بیچر تھا، ہندو مسلمان سب گھیر کر کھڑے تھے“

آگے اسی کے بعد ہے کہ

”مسلمانوں کی اس وقت جو کیفیت تھی، سو تھی، مگر ہندو بھی بہت خوش تھے، آپس میں کہتے

تھے کہ نیلی لنگی والے مولوی نے پادریوں کو خوب مات دی “ مثلاً مباحثہ

کیا عجیب بات ہے کہ پادریوں نے ہندو مذہب کے نمائندے پنڈتوں کو جلسہ کی حد تک تو ہم نوا بنایا تھا۔ لیکن جلسہ سے باہر ہونے کے بعد ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ الٹ جاتا تھا، میلہ کے عام ہندو مسلمانوں کے ساتھ مل کر پادریوں کی ہزیمت و شکست کا گویا شادیانہ بچا ہے تھے۔

یاد ہوگا، پہلے سال کے میلے میں یہ صورت جو پیش آئی تھی، یعنی جلسہ کے برخاست ہونے کے بعد گھوم گھوم کر سیدنا الامام الکبیر کے اشارہ سے مسلمانوں کے مولوی اسلام کی منادی اور عیسائیت کا ابطال کر رہے تھے، تو اس موقع پر بھی نقل کیا ہے، کہ پادری جب سامنے آجاتے، تو ان کو دیکھ کر

”عوام بھی کہتے تھے کہ پادری صاحب ہم کو ہی دھمکاتے تھے، اب تو کچھ بولے “

اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ کہنے والے عوام میں مسلمان ہی نہیں، بلکہ ہندو بھی تھے، اسی کے بعد رودادیں تصریح بھی کر دی گئی ہے کہ

”اور جملہ ہندو بھی خوش تھے “ مثلاً میلہ

اور اپنی خوشی کا اظہار پادریوں پر فقرے کس کس کر کرتے تھے۔

صرف یہی نہیں کہ جلسہ سے باہر نکلنے کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کا جمع سیدنا الامام الکبیر کو گھیر لیتا تھا۔ بلکہ دوسرے سال کی روداد کے مرتب کرنے والے مولانا خزانہ الحسن گنگوہی جو اس سال کے میلے میں خود بھی شریک تھے۔ اپنی یہ چشم دید شہادت بھی مولانا نے درج کی ہے کہ

”راقم الحروف نے دیکھا کہ اس وقت بعض ہندوؤں نے کہا کہ ”واہ مولوی صاحب“ او

بعض ہندو آتے تھے، اور مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کو سلام کرتے

تھے “ مثلاً مباحثہ

الغرض جلسہ کے اختتام کے بعد اسی قسم کے حیرت انگیز نظائے تھر، جو میلے میں دیکھے جا رہے تھے، غریب پادریوں کے لئے یہ سمان عجیب ہو گا۔ سوچا کیا گیا تھا، اور ہو کیا رہا ہے، لکھا ہے، کہ میلہ اور میلہ کے میدان ہی تک نہیں، بلکہ لوگ میلہ کے منتشر ہونے کے بعد بھی اپنے اپنے گھروں کی طرف جس وقت لوٹ رہے تھے، تو جس راستہ سے سیدنا الامام الکبیر گذرتے،

”میلہ کے ہندو وغیرہ مناظر ان اسلام کی طرف اشارہ کر کے اوروں کو بتاتے کہ ”یہ ہیں“ “ملا میلہ

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر میلہ سے رخصت ہونے والوں کے کلام کا موضوع خاص سیدنا الامام الکبیر کی ذات مبارک اور آپ کی تقریریں بنی ہوئی تھیں۔ اسی کا نتیجہ تھا، کہ جب کسی ٹولی کے سامنے سے گذرتے، تو لوگ بتاتے کہ جس شخص کا ہم ذکر کر رہے تھے، وہ یہی ہیں۔

اور چاندپور کے صحرائی مبدان سے لوٹ کر شہر یعنی شاہ جہاں پور پہنچنے کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے، کہ میلہ میں شریک ہونے والوں میں یہی چرچا ہوتا رہتا تھا، لکھا ہے کہ شاہ جہاں پور کے ”بازاروں میں مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) اور ان کے رفقاء کو نکلنے کا اتفاق ہوا، تو ہندو وکانداروں کی بھی انگلیاں اٹھتی تھیں“ “ملا مباحثہ

الغرض آپ کی تقریروں کی تاثیر کی کیفیات، جلسوں ہی تک محدود نہ تھیں، بلکہ جلسوں کے بعد بھی، میلہ کے اندر میلے سے روانہ ہونے کے بعد راستوں میں اور شہر پہنچنے کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ عام ہندوؤں میں تو روزانہ تھیں، اور پادریوں کے مقابلہ میں جو کامیابیاں ہوئی تھیں، وہ مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ ہندوان کو اپنی کامیابی بھی یقین کرتے تھے، اور فخر و مباہات کے ساتھ اپنی ان کامیابیوں کا ذکر کرتے رہتے تھے۔

لطف تو یہ ہے کہ شہر یعنی شاہ جہاں پور کے سوا جو لوگ دوسرے شہروں تک پہنچے، ان میں مسلمان ہی نہیں، بلکہ ہندو بھی، ملنے جلنے والوں سے اپنے تاثرات کا اظہار جن الفاظ میں کرتے تھے، وہ بھی سننے کے قابل ہیں، بریلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چند کھتری جو اس میلہ میں شریک ہونے

کے بعد یہاں پہنچے، وہ باہم ہندوؤں سے سنایا کہ کہہ رہے تھے کہ

”مسلمانوں کی طرف سے ایک پتلا سا آدمی، میلے کپڑے، نیلی لنگی بغل میں دبی ہوئی، بیان

کرنے کھڑا ہوا، ایسی تقریر بیان کی کہ پادریوں کو کچھ جواب نہ آیا۔“

صرف یہی نہیں، بلکہ یہی صاحب جہنوں نے کھتریوں کی یہ گفتگو سنی تھی، وہی کہتے تھے کہ آخر میں ان ہی کھتریوں میں سنا کہ کوئی اپنے قلبی تاثر کا اظہار ان الفاظ میں کر رہا ہے، یعنی سیدنا الامام الکبیر کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا کہ

”کوئی اوتار ہوں، تو ہوں“ ۹۱

تقریباً یہی اسی قسم کی بات ہے، جو یورپین نژاد پادری اسکاٹ نے بھی تھی یعنی

”یہ مولوی نہیں، صوفی مولوی ہیں“

اسی طرح سہارنپور میں بھی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ڈپٹی انسپکٹر تعلیمات تھے، ان سے ایک اچھے صاحب ذوق ہندو لیکھ راج نامی کی ملاقات ہوئی، جو میلے کے بانی فشی پیارے لال کے خاص آشناؤں میں تھے۔ میلے میں وہ بھی شریک تھے، بہر حال لیکھ راج نے مولانا ذوالفقار علی صاحب سے کہا تھا کہ

”ایک مولوی صاحب قاسم علی نام اسی طرف کے تھے، ان کا حال کیا بیان کیجئے“

پھر جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، اس کی تعبیر اپنی خاص اصطلاح میں کرتے ہوئے کہا تھا کہ

”ان کے (سیدنا الامام الکبیر کے) دل پر تو علم کی سرستی بول رہی تھی“ ۹۲

یہی سوچنے کی بات ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں پہلی دفعہ ہندوؤں کو اس میلے میں لا کر کھڑا کیا گیا تھا،

مولانا اشتیاق احمد صاحب نے بیان فرمایا کہ مجھے سوسائے والد صاحب (شیخ ظفر احمد صاحب) یونہی نے بیان فرمایا کہ اسی زمانہ میں جب مبارک شاہ جہانپور ہوا، شاہ جہانپور کے کسی ہندو کا خط مولوی محمد منعم صاحب منظر نگری وکیل کے پاس آیا۔ اس میں اس مبارک کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ایک مولوی جن کا حلیہ یہ تھا، دوپٹی ٹوپی، اک پٹا یا جامہ، ملے گز کی چال و دھانت کی رفتار، اس نے پادریوں کو تاثر گید کہ یہاں کی (ہندوستان کی) ساری قوموں کی لالچ رکھ لی۔ یہ خط مولوی محمد منعم صاحب کے پاس سے لایا گیا، اور پڑھا گیا۔ ۱۲ محمد طیب غفر

کھڑا کرنے والوں کا جو مطلب بھی ہو، قرآن و قیاسات سے اس سلسلہ میں جن باتوں کا پتہ چل سکتا تھا -
تفصیلاً انہیں پیش کر چکا ہوں، لیکن کچھ بھی ہو، اس کی بھلا کون توقع کر سکتا تھا، کہ مسلمانوں کے نمائندے
مولوی کو اذتار تک کے درجہ تک پہنچانے والے اسی سلسلہ میں پیدا ہو جائیں گے، اور سستی یعنی
علم کی دیوی، یا کہنے تو کہہ سکتے ہیں کہ روح القدس کا تائید یافتہ وہی ہندوؤں کو نظر آنے لگے گا،
اسی سلسلہ میں ایک ہندو جوگی کی داستان کتنی دلچسپ ہے، پہلے سال کے میلہ کا قصہ ہے
میلہ جب اکھڑنے لگا، اور دالسی کے وقت مسلمانوں کے اصرار سے بجائے پیادہ پا چلنے کے بہلیاں
جن پر شاہ جہاں پور سے لوگ آئے تھے، ان ہی میں سے ایک بہلی پر سیدنا الامام الکبیر کو بھی سوار ہونے
پر مجبور کیا گیا، اور قطار باندھ کر بہلیاں شہر کی طرف جارہی تھیں۔ لکھا ہے، کہ میلے سے تھوڑی دور بہلیوں
کی یہ قطار پہنچی تھی، دیکھا گیا جیسا کہ لکھا ہے

”گاڑیوں کی قطار سے بیس قدم پر ایک جوگی جا رہا تھا، پاؤں میں کھڑا دیں، سر پر لمبے لمبے

بال، برہمنہ سر، ہاتھ میں دست پنہ، دوچار معتقد اس کے ساتھ“

اسی شان سے جوگی جا رہا تھا، کہ اچانک اس بہلی پر اس کی نظر پڑی، جس پر سیدنا الامام الکبیر سوار تھے، بیان کیا
ہے کہ نظر پڑتے ہی

”مولوی محمد قاسم ضحاکی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا“

صاحب روداد نے اس کے بعد جوگی کے تلفظ خاص میں اس کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں، یعنی اشارہ
کر کے کہہ رہا تھا کہ

”جی مونی ہے“

یعنی ”یہ مولوی ہے“ جوگی کی زبان سے یہ الفاظ نکل ہی رہے تھے، لکھا ہے، کہ

”اتفاقاً مولوی محمد قاسم صاحب کی نظر ادھر کو پلٹی“

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، سامنا ہوتے ہی جوگی ہی نے پیش قدمی کی، اور سیدنا الامام الکبیر کو سلام
کیا، جوگی کے اس سلام کی نوعیت کیا تھی، اس کو تو صاحب روداد نے نہیں بیان کیا ہے، لیکن ہندو جوگی

کے سلام کا جواب دانا العلوم دیوبند کے بانی سیدنا امام البکیر کی طرف سے جس طریقہ سے دیا گیا تھا، وہ سننے کے قابل ہے، لکھا ہے کہ

”مولوی محمد قاسم صاحب نے التفات کے ساتھ، ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔“

اس سے پہلے میلے میں جو کچھ کہا اور کیا جا رہا تھا، اگر سمجھا جانے کے مقابلے میں ”مداغت بالحسن“ والے قرآنی قانون کی تعمیل کی وہ اجتماعی شکل تھی، یعنی اس کا رخ ان عام ہندوؤں کی طرف تھا، جو اس میلے میں شریک تھے، تو قرآن کے اسی حکم کا ایک شخصی اور جزئی تجربہ حضرت دانا کے اس طریقہ کار کو ہم شاید قرار دے سکتے ہیں جو اسی ہندو جوگی کے ساتھ اس وقت اختیار کیا گیا، نتیجہ بھی اسی وقت اس شکل میں سامنے آگیا، لکھا ہے کہ

”اس نے (جوگی نے) جو دیکھا کہ مولوی صاحب التفات سے جواب دیتا ہے، تو وہاں

سے (یعنی جہاں پر وہ کھڑا ہوا تھا) دوڑا اور گاڑی کا ڈنڈا پکڑ کر گاڑیاں سے کہا، تمام بڑے

کانہ ولی حمید (گو یا وہ ایک گرم جوش دوست ہے) نتیجہ کے ان قرآنی احاطہ کی کتنی واضح اور کھلی ہوئی تصویر ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہب کے معاملہ میں مقابلہ ہوگا، اسی خبر کو سن کر ظاہر ہے، کہ اپنی قوم کی طرف سے گود مقابل بن کر اس میلے میں یہ جوگی پہنچا تھا، معلوم ہوتا ہے، کہ مسئلہ سے خاص دل چسپی بھی رکھتا تھا، آگے معلوم ہو گا کہ بجائے عام لوگوں کے اسی لئے نیمہ کے اندر اس جوگی کو یکہ دی گئی تھی،

بہر حال دوڑ کر جوگی نے گاڑی کے ڈنڈے کو پکڑا، اور تمام دے، کی اصطلاحی آواز دے کر

بہیلیوں کی ساری قطار کو رکھ دیا۔ تاعدہ ہے، کہ قطاریں چلنے والی گاڑیوں کے مقدمہ الحیش کو جب دیہتا والے کہتے ہیں کہ ”تمام دے“ تو وہ خود بھی تم جانتا ہے، اور سچھے لگی ہوئی گاڑیوں کو بھی تم جانے کا

حکم دیتا ہے، یہی صورت یہاں پیش آئی۔ اب آگے کیا ہوا، یہ لکھ کر

”القصدہ گاڑیاں تم گئیں۔“

صاحب روداد نے بیان کیا ہے، کہ اس کے بعد سیدنا امام البکیر کو مخاطب بنا کر جوگی نے کہا کہ

مصنف امام نے کہا تھا کہ

”وہ یہ تھا کہ تمام مذاہب کے جتنے میں اسلام کی ایک منادی ہو جائے اور خدا کی حجت بندوں

پر پوری ہو جائے، سو وہ اس میلہ خدا شناسی میں ہو چکی، خدا

اسی روایت کے آخر میں یہ بھی ہے کہ

”چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وفات ہو گئی۔“

مطلب مصنف امام کے اس بیان کا اگر یہ سمجھا جائے کہ اسی تبلیغی نمونہ کا قائم کرنا بھی سیدنا الامام الکبیر کے وجود باوجود کا آخری نصب العین ان کے نزدیک تھا تو جو کچھ انہوں نے فرمایا ہے، خود ہی سوچو کہ اس سے اور کیا سمجھا جائے اور مجھ سے اگر پوچھتے ہیں، تو چاند اپور میں جو کچھ سیدنا الامام الکبیر نے کہا اور کیا، اگر ایک طرف دین حق کی تبلیغی ذمہ داریوں میں اس سے جاگ پیدا ہوتی ہے تو دوسری طرف اگر ہم فکر معقول سے کام لیتے ہوئے آپ کے طریقہ سے چاہیں تو یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ بغیر کسی تلخی اور ناگواری کے غیر قوموں کے درمیان بود و باش اختیار کر کے تبلیغ حق کے اس فرض سے سبکدوشی حاصل کرنے کا حکیمانہ طریقہ کیا ہو سکتا ہے، آپ کے اس حکیمانہ طریقہ کار کی تفصیل واقعات و شواہد کی روشنی میں پیش ہو چکی ہے، اس کو بار بار پڑھئے اور نتیجے اس سے حاصل ہو سکتے ہیں ان کو حاصل کیجئے، حق تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی بادشاہی کے زمانے میں

”ہندوئی مذہب شمسیر اسلام“

کا تماشا اگر دیکھا گیا تھا، تو شاید یہ اتنا تعجب انگیز نہ تھا، لیکن خدا شناسی کے اسی میلہ میں جب مسلمانوں کے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شان گرامی میں کالے پادری مولیٰ داد کی طرف سے گندگی اچھائی جا رہی تھی اور سیدنا الامام الکبیر اسی کے مقابلہ میں مسلمانوں کی طرف سے عیسائیوں کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ اعلان کر رہے تھے۔

”حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین بھی ہمارے نزدیک مثل توہین حضرت خاتم النبیین صلی اللہ

علیہ وسلم موجب کفر و اتنا داس ہے۔“ خدا

اسی لئے آگے مکالمہ یوں ختم ہوا۔

”مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) نے فرمایا، آپ نے بڑی مہربانی کی جو آپ آئے“

جواب میں جانکی داس جوگی نے یہ عجیب و غریب الفاظ کہے۔

”ہم تو تمہارے بیٹا بیٹی ہیں“

یہ کہا اور

”سلام کر کے چل دیا“

سچ پوچھئے تو ”انی لاٹ ولی حمید“ ہی کا اپنے الفاظ میں جوگی نے گویا ترجمہ کر دیا تھا، سیدنا الامام الکبیر کے برتاؤ اور حسن سلوک نے جو اثر غور و فکر کے دل پر ڈالا تھا، اور کہا جائے تو کہا جاسکتا ہے، کہ اپنی قوم یا کم از کم اس میلے میں اس جوگی کے ہم مذہب لوگ جو شریک تھے، سب ہی کو ”بیٹا بیٹی“ ٹھہراتے ہوئے، اسی اثر کی عمومییت کا گویا جوگی اعتراف و اقرار کر رہا تھا، کیسا عجیب اور طراوت بخش نظارہ ہے کہ دشمن بنانے کے لئے جولائے گئے تھے، دوست یا جوگی کے الفاظ میں ”بیٹا بیٹی“ بن کر وہی دایس ہو رہے تھے، اور جوگی بے چارہ تو خیر جوگی تھا، اسی روداد میں ایک واقعہ یہ بھی نقل کیا ہے، کہ جن پنڈتوں کو مقابلہ ہی کے لئے خاص طور پر بلا گیا تھا، ان میں ایک پنڈت صاحب جنہوں نے جلسہ میں عملی حصہ بھی لیا تھا، اور منسکرت آمیز بھاشا والی تقریر کی وجہ سے ان کی تقریر جلسہ کے عام حاضرین نہ سمجھ سکے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ دیا نندی تحریک سے وہ بھی کافی متاثر تھے۔ تاہم تقریر کے وقت بھی ان کو دیکھا گیا تھا کہ کسی خاص مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر کی طرف خاص اشارہ کر رہے ہیں اور اشارہ کر کے کہہ رہے ہیں

”خاص ان مولوی صاحب سے پوچھتا ہوں“

اسی سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت والا کے عالم و عمل سے وہ یوں ہی متاثر تھے، لیکن جلسہ جب برخاست ہو گیا تو میان کیا ہے، کہ

”وہ پنڈت صاحب بھی اس وقت مولوی صاحب (سیدنا الامام الکبیر) کے پاس آ بیٹھے“

جنہوں نے جلسہ میں یہ کہا تھا، میں سب سے پوچھتا ہوں اور مولوی محمد قاسم صاحب کی طرف

اشارہ کر کے کہا تھا، قاسم کران سے، صلا

بہر کیف کہنا یہ ہے، کہ یہی پنڈت جی جیسا کہ لکھا ہے، حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہو کر کہہ رہے تھے، کہ

”میں سچے جی سے مذہب کے مقدمہ میں پوچھنا چاہتا ہوں“

اور جلسہ میں حضرت والا کی تقریروں نے جو اثر ان کے اندر قائم کیا تھا، اس کا اظہار ان الفاظ میں کرنے لگے کہ

”پر آدمی اس سے پوچھے جو دوسرے کو سمجھا سکے“

جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ سمجھا سکنے کے اس جن سلیقہ کا تجربہ چونکہ سیدنا الامام الکبیر میں پنڈت جی کو محسوس ہوا تھا، اسی لئے آپ کے پاس وہ حاضر ہوئے تھے۔ پنڈت جی کے اس معروضے پر حضرت والا نے جو کچھ فرمایا تھا، اس سے آپ کی تقریروں کی خصوصیت کا اندازہ ہوتا ہے، کہا گیا تھا کہ

”جو کچھ ہم کہیں گے، آپ بھی اس کو صداقت ہی صداقت پر محمول کریں گے، تعصب

اور سخن پروری نہ سمجھیں گے“

یہی تعصب اور سخن پروری سچ پوچھنے تو مذہبی واعظوں کی تقریروں کو عموماً بے جان بنادیتی ہے، اثر انداز کا سب سے بڑا گڑبہ ہے، لیکن ظاہر ہے کہ دین کا معاملہ اتنا ہلکا اور آسان تو نہیں ہے، کہ کسی جلسہ کی چند تقریروں اور زبانی باتوں سے کام چل جائے، اسی لئے پنڈت جی کو آپ نے مشورہ دیا تھا، کہ ”تہنیت کے باب میں اطمینان ہے اس کے تصور نہیں کہ مہینہ پندرہ روز آپ اور ہم ساتھ

رہیں اور باہم مذہب کی باتیں کرتے رہیں“ صلا

تاکہ گفتار کے ساتھ رفتار کو، قول کے ساتھ کردار کے تجربہ کا بھی موقع ملے۔ لکھا ہے، کہ بے چارے پنڈت جی نے ساتھ رہنے کا اقرار بھی کر لیا تھا، پھر نہ معلوم کیا عوائق پیش آئے، کہ انفرادہ

نہ کر کے

بہر حال ہندوؤں پر عیسائیوں کے برعکس سیدنا امام الکبیرؒ کی تقریروں کا اثر بڑھاتا تھا، گویا وہی مثال صادق آرہی تھی، کہ کپڑے کو سکھانے کے لئے دھوپ میں دھوبی کھڑا ہوتا ہے، ایک ہی آفتاب ہوتا ہے، جس کی شعاعوں سے دھوبی غریب کا چہرہ تو کالا پڑتا جاتا ہے، اور ٹھیک اسی وقت یہ بھی دیکھا جاتا ہے، کہ کپڑا جسے دھوبی سکھا رہا تھا، سفید سے سفید تر بنتا چلا جاتا ہے۔ آثار کے اس اختلاف کا جو دعویٰ میں نے کیا تھا، کیا اب بھی اس میں شک کی گنجائش باقی ہے؟ حد تو یہ ہے کہ چاند پور، اور سارنگپور نیز ان کے گرد و نواح کے دیہاتوں کی طرف سے میلے کے بن بعض لوگ گزرے، وہی بیان کرتے تھے۔ کہ

”راہ میں جو ہندو گنوار ملے، ان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ پٹھان جیتے“

پٹھان شاہ جہاں پور کے علاقہ میں مسلمانوں کی تعبیر ہے۔ جیسے عام طور پر ترک بھی مسلمانوں کو ہندوستان میں کہتے ہیں۔ مطلب یہی ہے، کہ مسلمانوں کے ساتھ اس علاقہ کے ہندو گنوار بھی مسلمانوں کی کامیابی، اور عیسائیوں کے مقابلہ میں ان کی حیت کا ذکر کر کے خوشیاں منا رہے تھے، گویا صحرائی علاقہ کا انتخاب اگر واقعی فاسد اغراض کے تحت کیا گیا تھا، جن کی غمخیزی قرآن و قیاسات کر رہے ہیں تو سمجھنا چاہئے، کہ معاملہ الٹ گیا عسی ان تکوہوا شیدئا وھو خیر لکم کے قرآنی اصول کی تفسیر پہلے بھی ان ہی شکلوں میں ہوتی رہی ہے، اور آئندہ بھی ہوگی۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ حکمرانی، اور پادشاہی کو اپنا موردی حتیٰ یا پیشہ قرار دینے والے مسلمانوں نے ہندوستان پہنچ کر تبلیغ اسلام کے دینی قرض کے ساتھ جو رویہ بھی اختیار کیا ہو، لیکن ہندوستان ہی کیا، شاید بادشاہی اور ملوکیت کے اس ذوق کی تسکین کی گنجائش دنیا کے کسی گوشہ میں باقی نہیں رہی ہے، مصر تو تقریباً خالص اسلامی ملک ہے، وہاں کے معزول شاہ فاروق نے خواہ مخواہی کہا ہو کہ انگلستان کے سوا شاید کسی ملک میں بادشاہت اب باقی نہ رہے گی۔

چا جا جائے یا نہ چا جا جائے، مگر حالات کا بظاہر قدرتی اقتضار یہی ہو چکا ہے، ایسی صورت میں

مسلم و غیر مسلم باشندوں کی ملی جلی آبادیوں کو دہسنے والے مسلمانوں کیلئے پہلے نہیں تو اب جب بادشاہی کا خواب صرف خواب بن چکا ہے، کیا یہ سوچنے کا وقت نہیں آگیا ہے، کہ جس دینی فرض و حکومت کے جھگڑوں میں مبتلا ہو کر ان کے آگاہوں نے لاپرواہی برتی تھی، اس فرض کی ذمہ داری کو وہ محسوس کریں، اور سوچیں۔ اس بات کو کہ غیر اسلامی آبادیوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا ایسا صحیح راستہ کیا ہو سکتا ہے جس پر عمل کر دین کا فرض بھی ادا ہو نہ رہے، اور دنیا میں دوسری قوموں سے ان کے توانمات خوش گوار رہیں۔

ظاہر ہے، کہ یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ بہر حال اس باب میں مسلمانوں کو فیصلہ تک پہنچنا ہی پڑے گا، میں یہی کہنا چاہتا ہوں، کہ دوسری باتوں کے ساتھ چاہا جائے تو روشنی کا مینار سیدنا امام الکبیر کے ان نمونوں کو بھی بنایا جاسکتا ہے، جنہیں خدا شناسی کے ان میلوں میں آپ کی رفتار و گفتار سیرت و کردار نے پچھلی نسلیوں کے لئے چھوڑا ہے۔

آپ دیکھ چکے کہ وہی میلہ جس میں اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ اسلام اور مسلمانوں کی دینی تحقیر و توہین کا لالہ کر کے عیسائی مذہب اور ہندو دھرم کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ لیکن میلے میں پہنچنے کے بعد سیدنا امام الکبیر نے اسلام کے بنیادی حقائق کی تبلیغ کا ذریعہ ان ہی میلوں کو جو بنالیا تھا، اس باب میں آپ کی سعی و کوشش جن حدود تک پہنچی تھی، اس کی داستان سنا چکا ہوں۔

بلکہ ارواحِ ثلاثہ میں مولانا طیب صاحب کے خوالہ سے یہ روایت جو درج کی گئی ہے کہ ان کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ

”جب مباحثہ شاہ جہاں پر ہو چکا، اور حضرت مولانا نو قوی مظفر و منصور ہو کر واپس شریف

لائے تو مولانا محمد یعقوب صاحب نے فرمایا کہ اب مجھے مولانا کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے۔

کیونکہ حق تعالیٰ کو ان سے جو کام لینا تھا، وہ پورا ہو چکا۔“

”کام جو لینا تھا“ اپنے ان الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا محمد یعقوب یعنی ہمارے

”تم نے بڑا کام کیا“

اس سے یہ سن کر لکھا ہے کہ

”مولوی محمد قاسم صاحب نے کہا میں نے کیا کیا؟“

مخاطب چونکہ ایک ہندو جوگی تھا، اس لئے آگے فرمایا گیا: کیا فرمایا گیا؟ معلم العلماء کی زبان مبارک کے اس فقرے کو سنئے ”میں نے کیا کیا“ یہ کہنے کے بعد ارشاد ہوا تھا کہ

”پریش کرنے کیا“

”سچ کہتے ہو“ ان تصدیقی الفاظ کے بعد بیان کیا ہے کہ

”پھر جوگی مذکور نے ہاتھ اٹھا کر چار انگشت سے اشارہ کر کے کہا کہ جب تم نے ”بولی

ماری“ (یعنی تقریر کی) تو ہم نے دیکھا کہ اس کا یعنی پادری کا اتنا سر بر سوکھ گیا تھا، یا یوں کہا

کہ گھٹ گیا تھا“

دیکھ رہے ہیں۔ آپ ایک ہی تقریر کے ان دو مختلف اعتراضی آثار کو، پادری کا سر بر جسم، سوکھ یا

گھٹ رہا تھا، اور جوگی جس کی حیثیت ہندوؤں میں گویا وہی تھی، جو پادریوں کی عیسائیوں میں ہوتی ہے، اس

کے دل کی مسرت ان الفاظ کی شکل میں جھلک رہی تھی،

اس کے بعد کسی ”ولی حمیم“ سے میل ملاپ جیسی گفتگو ہوتی ہے، یہی گفتگو دونوں میں جس طریقہ سے

ہوئی، دوداد میں وہ بھی نقار کر دی گئی ہے، لکھا ہے کہ جوگی سے

”مولوی محمد قاسم صاحب نے فرمایا کہ تم کہاں تھے خیمہ کے باہر تھے“

جواب میں جوگی نے کہا کہ

”ہم بھی خیمہ کے اندر تھے“

حضرت والا نے دریافت کیا کہ

”آپ کا نام کیا ہے؟“

جوگی نے کہا، جانکی داس، شاید یہ گفتگو دیر تک ہوتی، لیکن ردا، وہی میں تھے، پہلیوں کی قطار رکی ہوئی تھی۔

جانتے ہیں، اس کا نتیجہ کیا ہوا، مسلمان تو مسلمان لکھا ہے، مگر مولانا اب دیکھتے کہ

”ہندو بھی برا بھلا کہہ رہے تھے“

صرف یہی نہیں، بلکہ جوش میں دیکھا گیا، اسی رد واد میں لکھا ہے کہ

”ایک ڈپٹی صاحب ہندو مذہب، جن کا نام غالباً ابو دھیپا پرشاد ہے، کھڑے ہوئے“

اور اس مضمون کو دیر تک بیان کرتے رہے کہ کسی کے پیشواؤں کو برا نہ کہنا چاہئے، ۲ میلہ

جس کا مطلب یہی تو ہوا، کہ مسلمانوں کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت و عزت کی حفاظت کے لئے ایک

ہندو ڈپٹی کلکٹر کھڑا ہو گیا، اور یوں ہندو می مذہب شریعہ اسلام کا جاں پرور روح افزا و نظارہ مسلمانوں کے عہد

محکو میدت میں اس وقت سامنے آگیا تھا، جب چانڈاپور کے اس میلے میں عیسائیوں اور ہندوؤں کے

نمائندوں کو اسلامی دین پر اعتراض و تنقید کے لئے اکٹھا کیا گیا تھا اس تمام رد واد میں اذعیا للہی

یعنی مافقت بالحق کے قرآنی حکم کے قرآنی نتیجہ کو مشاہدہ بنا کر اس میلے میں جس طریقہ سے

دکھایا گیا تھا، چاہئے کہ کافی توجہ سے اس کو پڑھا جائے، اور آج جن مشکلات سے نکلنے کی راہیں

مسلمان اس ملک میں اپنے اوپر بندھا رہے ہیں، میسر یا خیال تو یہی ہے کہ ان مشکلات کے حل کی

ایک واضح راہ انشاء اللہ تعالیٰ ان کے سامنے آجائے گی، پیدا کرنے والے نے بنی آدم کو جن نفسیاتی

قوانین کا پابند بنا کر پیدا کیا ہے۔ ان سے اور ان کے اقتدار سے کوئی جدا ہونا بھی چاہے تو جدا نہیں

ہو سکتا۔ ایرانی کا یہ لہ بھلائی کے ساتھ جب دیا جاتا ہے، تو دشمن خواہ کامل و درست نہ بن جائے لیکن

گویا کہ وہ ایک گرم جوش دوست یعنی کاغذ و لی صحیفہ بنا ہوا ہے۔ قرآن کی یہ اطلاع بظاہر

غیر منطقی ہی کیوں نہ نظر آتی ہو، لیکن کیا کہئے، کہ تجربہ سے ہمیشہ اس کی تصدیق ہوتی ہے، بنی آدم

تو بنی آدم تجربہ کرنے والوں نے تو حیوانی نفسیات تک کے اور پر اسی قانون کو محیط پایا ہے۔

لیکن ہر تجربہ اپنے ساتھ کچھ مشہدہ نظر رکھتا ہے۔ اس قانون کا ذکر کرتے ہوئے آخریں جو یہ

فرمایا گیا ہے یعنی۔

اور یہ بات ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل

وَمَا يُلْقَاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا

وما یلقاھا الا ذو حظ
عظیم

مزاج ہیں، اور یہ بات ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا
صاحب نصیب ہے۔

میرے نزدیک تو اس تجربہ کے عملی نتائج کے شرائط ہی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کافی صبر
بڑے ظرف اور وسیع حوصلہ کی ضرورت اسی لئے ہے کہ برائی کرنے والوں کے مقابلہ میں بھلائی پر
اپنے دل کو آمادہ کرنا ہر کس و تا کس کے لئے آسان نہیں ہے، اور اس راہ میں دل ہی کی آمادگی دراصل
آمادگی ہے۔ دل میں نفرت و عداوت کی آگ بھری ہو، اور زبان یا قلم سے خوبصورت، خوش کن الفاظ
نکل بھی رہے ہوں، تو جس نتیجہ کا قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کے ظہور کا انتظار بڑی خطرناک
غلطی ہوگی۔ اس طریقہ سے، تو کہ دینے والے مکان ہے کہ خود دھوکہ کھانے لگے، اس میں شک
نہیں کہ بجائے غیر کے اپنے دل پر قابو، بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ اکثر لوگ
کے لئے یہی آسان بات عموماً دشوار ہو گئی، عملاً اسی لئے نفرت کا جواب نفرت ہی سے لوگ دیتے
رہتے ہیں، شیطان کا یہی وہ چرچہ ہے، جس کا چکر کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ شاید ”مدافعت بالحسنى“ والی
آیتوں کے بعد

واما ینزعلنک من الشیطان
نزوعاً فاستعذ بالله انه
هو السميع العليم

اور اگر ایسے وقت میں، آپ کو شیطان کی طرف سے کچھ
وسوسہ آنے لگے تو فوراً اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے،
بلاشبہ وہ خوب سننے والا ہے خوب جاننے والا ہے۔

پر کلام کو جو ختم کیا گیا ہے، اس سے یہی سمجھنا مقصود ہے کہ ”شیطان“ ”مدافعت بالحسنى“ والی راہ
یعنی برائی کا مقابلہ بھلائی سے کرنا، برآدم کی اولاد کو چلنے نہیں دیتا، برائی کے مقابلہ
میں برائی ہی کے جذبات کو ابھارتا ہے۔ علاج اس کا یہی بتایا گیا ہے کہ سارے شیطانی خطرات
جو بظاہر عقلی مشوروں کے رنگ میں سامنے آتے ہیں، ان سے خدا کی پناہ ڈھونڈھی جائے، برائی
کے مقابلہ میں واقعی دل سے ہم اگر بھلائی کریں گے، تو خدا جو ہمارے دلوں کے حال سے آگاہ ہے
وہ اپنے بنائے ہوئے قانون کے مطابق نتیجہ کو ہر حال سامنے لائے گا۔

میں اپنے موضوع بحث سے اس مسئلہ میں شاید ذرا زیادہ دور بہٹ گیا، زندگی کے ایک اہم قرآنی دستور کا ذکر جو مکہ چھڑ گیا، سب کچھ کہنا تو دشوار تھا، لیکن کچھ نہ کہا جائے یہ بھی مناسب نہ معلوم ہوا، اور گفتگو تو سیدنا الامام الکبیر کے ان قوی و عملی نمونوں کے متعلق ہو رہی تھی، جو خدا شناسی کے ان میلوں میں آپ کی طرف سے پیش ہوئے، جن کے متعلق اپنا ذاتی احساس پیش کر چکا ہوں، ان نمونوں کو آپ کے احسانی حکم و علم کے آثار میں شمار کرتا ہوں۔

تاریخ کے جس عہد میں یہ نمونے مسلمانان ہند کے درمیان پیش ہو رہے تھے، یہ وہی زمانہ تھا، جب مسلمانوں کی حالت زار سے متاثر ہو کر ملک کے مختلف گوشوں میں مصلحین اس لئے کھڑے ہو رہے تھے کہ جو کچھ ہوتا تھا، وہ تو خیر ہو چکا، لیکن ان ہی حالات میں اس ستم رسیدہ قوم کے جینے کا جو سامان بھی ممکن ہو، اسے فراہم کرنا چاہئے۔

ان کی کوششیں بھی جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے، اخلاص اور سچی بہی خواہیوں، دلی ہمدردیوں ہی پر مبنی تھیں، لیکن وہ جو کچھ سوچتے تھے، عقل سے سوچتے تھے، عقل جن مشوروں کو پیش کرتی تھی ان پر عمل پیرا تھے، اور اس کے سوا وہ بے چارے آخر کرتے کیا، احسانی حکم کی دولت ہر ایک کو از انانی نہیں ہوتی،

سچ پوچھئے، تو سیدنا الامام الکبیر کی خدمات کی سیج قدر و قیمت سے اسی لئے مسلمانوں کی عزت جیسا کہ چاہئے واقف نہ ہو سکی، اس کے مقابلہ میں عقلی علم و حکم والوں ہی کی باتیں زیادہ مشہور اور زیادہ پسند کی گئیں، ان ہی کے مشوروں کے مطابق پروگرام بنتے رہے، اور جو نتیجے ان پر مرتب ہو سکتے تھے، وہ مرتب ہوتے رہے اور آج تک ہو رہے ہیں۔

خصوصاً خدا شناسی کے یہ میلے جو بقول مصنف امام سیدنا الامام الکبیر کی پیدائش کے منصب الہین کی تکمیل و ظہور کے آخری جلوہ گاہ تھے، وفات کی پیش گوئی تک اپنے اسی باطنی مکاشفہ کی روشنی میں انہوں نے کر دی تھی، لیکن اب اسے کیا کہئے، پتہ ہی چلتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی جس میں یہ میلے منعقد ہوئے، اور اس کے بعد بھی یہ میلے اور ان میلوں میں جو کچھ ہوا، سب ہی کے متعلق زیادہ زیادہ

عمومی ناثر یہی رہا کہ ان میلوں میں مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں سے باہم مذہبی مسائل پر کچھ بحث بھی ہوئی، اور ان کا حال تو معلوم نہ ہو سکا، لیکن مسلمانوں میں یہی مشہور ہوا کہ مولانا محمد قاسم کی بدولت ان ہی کی جیت ہوئی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ چند خاص لطیفوں کا پیرچہ بھی سیدنا الامام الکبیر کے متعلق مسلمانوں کی مجلسوں میں ہوتا رہا، جن کی یاداب بھی کبھی کبھی بطور گرمی نرم تازہ کر لی جاتی ہے۔

باقی مسلمانوں کے سوا عیسائیوں اور ہندوؤں میں چاند اپور کے ان میلوں اور ان کے نتائج کو کن نظروں سے دیکھا گیا، اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پہلے سال کے میلہ کی روداد مطبع ہاشمی کے ہتم مولوی محمد ہاشم، اور مطبع ضیائی کے ہتم مولوی محمد حیات صاحبان، دونوں نے مل کر، اور دوسرے سال کی مولانا فخر الحسن گنگوہی مرحوم نے مرتب کی تھی۔ کتاب جواب ترکی بہ ترکی میں اس کا ذکر کرتے ہوئے، کہ مسلمانوں کی طرف سے جو روداد چاند اپور کے میلوں کی مرتب ہوئی ہے، اسی کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ

”کینیت میلہ چاند اپور بھی جس میں پنڈت جی (دبانہ سہوتی) بھی رونق افروز تھے، نہ چھپنے پائی“

آگے بیان کیا ہے کہ

”اور پنڈت جی نے کیفیت مذکورہ چھوڑ، رڑکی دمیڑھ وغیرہ مقامات کے تمام واقعات بہ دل خواہ گھر گھر چھپوا دیں“ ص ۲

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کی طرف سے بھی چاند اپور کی سرگزشت مرتب ہو کر شائع ہوئی تھی، مگر مجھے یہ تحریر نہیں مل سکی، اور اس کا تو پتہ بھی نہ چلا کہ عیسائیوں کی طرف سے بھی کوئی رپورٹ چھاپی گئی تھی یا نہیں چھاپی گئی تھی۔

قرینہ کا افتضاء تو یہی ہے کہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے اس زمانہ میں جو اخبار اور رسالے نکلتے تھے کم از کم ان میں ان میلوں کی کارروائیوں کا تذکرہ ضرور ہوتا ہو گا، لیکن کیا کیجئے کہ اس قسم کی کوئی چیز مجھے نہ مل سکی۔ ”توڑی مروڑی یہی“ لیکن اس کا تو اندازہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کے سوا دوسرے

فرقوں میں خدا شناسی کے ان میلوں اور ان کی کارروائیوں کو کنکٹ کیا تھا۔

زمانہ بھی کافی گزر چکا ہے، صدی نہیں تو پون صدی میں تو کوئی شبہ ہی نہیں، اس زمانہ میں ہندوستان کا اسلامی پریس ہو، یا غیر اسلامی، دونوں بالکل ابتدائی منزلوں میں تھے، گنتی کے چند ہفتہ دار اخبار بعض مقامات سے نکلتے تھے، ممکن ہے کہ ڈھونڈھنے والوں کو میرے بعد شاید کوئی جدید مواد مل جائے، لیکن عام حال عیاں میں نے عرض کیا، بظاہر ایک وقتی بحث و مباحثہ کی زیادہ اہمیت شاید کسی فرقہ میں ان میلوں اور ان کی کارروائیوں کو نہیں دی گئی، یہ بات کہ آئندہ نسلیں کی راہ نمائی کا کام بھی ان عملی نمونوں سے لیا جاسکتا ہے جو سیدنا الامام الکبیر کی طرف سے ان میلوں میں پیش ہوئے، شاید فرط عقیدت یا میری خیال آمانی، بلکہ ممکن ہے اس پرتک بندی تک کا شبہ، شبہ کرنے والوں کو ہو، لیکن یہ اپنا اپنا خیال ہے، میں دوسروں کو ان نتیجوں تک پہنچنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا، ایک بات میری سمجھ میں آئی، وہ پیش کردی گئی۔ اور دنیا خواہ اس روشنی کو قبول کرے یا نہ کرے، مگر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جن نفوس قدسیہ نے زندگی کی دوسری شاخوں میں سیدنا الامام الکبیر کی خدمات کو آگے بڑھایا، آپ کے نصب کئے ہوئے پودوں کو پروان چڑھایا، ان بزرگوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے اول سے آخر تک اس باب میں بھی جو عملی مثالیں پیش کیں، اور آج تک جس راہ پر وہ چل رہے ہیں، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے، تو یہی کہا جاسکتا ہے، کہ چاند پور کے نمونوں سے جو عملی درس مل سکتا تھا، اس پر وہ عمل پیرا ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے، کہ پادریوں کا طبقہ جسے ان میلوں میں اس غیر ملکی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی، جو ہندوستان پر مسلط ہو گئی تھی اور براہ راست نہ تھی، لیکن بالواسطہ، حقیقت اسی حکومت مسلطہ کی ان میلوں میں نمائندگی کر رہے تھے، اور سچ پوچھئے تو اسی حکومت کے پیچوں کو مضبوط کرنے کی دوسری تدبیروں میں تو ایک تدبیر وہ بھی تھی، جسے پادری انجام دیتے تھے، الغرض اس طبقہ کے ساتھ سیدنا الامام الکبیر نے جو تعلق قائم کیا تھا، یا آپ کے طرز عمل سے

جو تعلق حکومت کے ان نمائندوں سے چاندپور میں قائم ہو گیا تھا، بجنسہ اسی تعلق کو سیدنا الامام الکبیر کے ان جانشینوں نے اس غیر ملکی اقتدار کے ساتھ مسلسل قائم رکھا، اور گوبنددوں کو بھی ان سیلوں میں پہلی دفعہ مسلمانوں کے مقابلہ میں لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا، لیکن آپ دیکھ چکے کہ بجائے دور ہونے کے ان سیلوں میں ہندوؤں کی عہدیت سیدنا الامام الکبیر سے جیسے قریب ہی ہوتی چلی گئی، کچھ نئی رنگ آپ کے جانشینوں کا بھی اس ملک کی غیر مسلم آبادی خصوصاً ہندوؤں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ چاندپور کے ان سیلوں کے بعد تاریخ کا ایک طویل سلسلہ ہے جس سے ملک گذرتا ہوا موجودہ حالات تک پہنچا ہے اس طویل عرصہ میں ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات نشیب و فراز کی گھاٹیوں سے گذرتے رہے، سلجھاؤ کے ساتھ الجھاؤ، سیدھ کے ساتھ شیرازہ کی بیسیوں شکلیں سامنے آئیں، لیکن سیدنا الامام الکبیر کے جانشینوں نے ان تمام حالات میں اپنی حد تک کوئی ایسی صورت اختیار نہیں کی، جس کی بنیاد پر یہ سمجھا جائے کہ ان کے کسی خاص طریقہ کار سے ملک کے ان دونوں طبقوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی، یا منافرت پیدا ہوئی۔

بلکہ پہلے سال کے میلے میں یاد ہو گا، مباحثہ و تقریر وغیرہ کی مجلسوں کے اختتام کے بعد ایک پنڈت جی سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں تحقیق حق کے لئے یہ کہتے ہوئے حاضر ہوئے کہ

”میں سچے جی سے مذہب کے مقدمہ میں پوچھنا چاہتا ہوں“

پنڈت جی کی دل دہی کرتے ہوئے منجملہ دوسری باتوں کے سیدنا الامام الکبیر نے آفریں ان سے فرمایا تھا کہ

”مذہب کے باب میں اطمینان ہے اس کے متصور نہیں کہ مہینہ پندرہ روز آپ اہم ساتھ

میں اور مذہب کی باتیں کرتے رہیں“

ایک جزئی واقعہ یا شخصی مکالمہ سے زیادہ بظاہر اس فقرے کا وزن محسوس نہ کیا جائے، مگر میں پوچھتا ہوں کہ ایک انفرادی شخصیت تک دین حق کی تبلیغ کا جو فرض مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے، جب اس فرض سے سبکدوشی کے لئے سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک مہینہ پندرہ روز کی رفاقت کی ضرورت تھی، تو

سیدنا الامام الکبیر کے جانشینوں کا یہ فیصلہ کہ کروڑ ہا کروڑ انسانوں تک حق کی تبلیغ کا موقعہ قدرت کی طرف سے مسلمانان ہند کے لئے جو آسان کر دیا گیا ہے، اس میں دشواری نہ پیدا کی جائے، بتایا جائے کہ اس فیصلہ کو بے جا فیصلہ ٹھہرانے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے، سیدنا الامام الکبیر کے جواب کا یہ جزو یعنی

”ہم مذہب کی باتیں کرتے رہیں“

یقیناً ملے جلے رہنے ہی کی صورت میں یہ زیادہ آسان ہے۔

بہر حال ختم نبوت کے بنی جیسا کہ معلوم ہے، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا بھی ہے کہ ”خود امت مسلمہ مبعوث کی گئی ہے،“

کنفوخیرامۃ اخر حجت
للساس
تم میرے بڑے امت ہو جو لوگوں (کے نفع و ہدایت) کیلئے
بھیجے گئے ہو۔

کا مطلب شاہ صاحب کے نزدیک یہی ہے، ایسی صورت میں اگر یہ سمجھا جائے کہ دنیا کے جس حصہ میں مسلمانوں کو خدا نے پہنچایا اور پہنچا کر آباد کر دیا ہے، وہاں کے غیر مسلم باشندوں کی طرف آباد کاروں کا اسلامی طبقہ مبعوث ہے، اور اسی بنیاد پر مسلمانان ہند میں جو لوگ اپنے تبلیغی فرض کو محسوس کر کے سیدنا الامام الکبیر کے جانشینوں کے مشورے کے مطابق وطنی تبدیلیوں پر راضی نہ ہوئے، بلکہ جہاں تھے وہیں پڑے ہوئے ہیں، تو بتایا جائے کہ تبلیغ کے کفائی فرض سے سبکدوشی کی آخر دوسری شکل مسلمانان ہند کے لئے اور کیا ہو سکتی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ اس تبلیغی فرض کا ”نڈر“ تو کبھی نہیں پٹا گیا، لیکن سیدنا الامام الکبیر کے جانشینوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ عملاً اس سے وہ کبھی غافل نہیں رہے ہیں، وقتاً فوقتاً ان بزرگوں کے ذریعہ مشرف یا سلام ہونے کی سعادت جن خوش نصیبوں کو حاصل ہوتی رہی ہے، یوں بھی مختلف اسباب و وجوہ کو تحت اس ملک کے غیر اسلامی طبقات کے لیڈروں اور زعمیوں سے ان کے ایسے خوش گوار تعلقات قائم رہے، جس سے وہ دوسروں کیلئے اسلامی تعلیمات سے مانوس ہونے کی زمین قدرتنا ہموار ہوتی رہی،

گو یا مذہب کی باتیں کرنے کی ایک صورت یہ بھی تھی۔ اور گو عام طور پر لوگوں کو اس کا شاید علم نہ ہو، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ”دارالعلوم دیوبند“ میں جب کبھی موقع ہمدست ہوا، ہندو دھرم کی علمی زبان سنسکرت اور بھاشا کے سکھانے کا نظم بھی مدرسہ میں کیا گیا، یا وظیفہ دے کر طلبہ کو ان زبانوں کے سکھانے کے لئے بھیجا گیا۔

لیکن یا اس ہمہ کیسی عجیب بات ہے کہ خود مسلمانوں کے مختلف احزاب اور جماعتوں کی طرف سے دارالعلوم دیوبند اور دیوبندیت پر جتنی بھی نکتہ چینیاں کی گئیں ہوں، بسا اوقات خود قصبہ دیوبند میں بھی دارالعلوم کے متعلق مسلمان باشندوں کے اندر کش مکش کی صورتیں پیدا ہوئیں۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، قیام دارالعلوم سے اس وقت تک جو زمانہ گزرا ہے، قریب قریب صدی ہی پوری ہو رہی ہے۔ اس طویل مدت میں ہندوستان کی غیر اسلامی آبادی کو مسلمانوں کے اس خالص دینی مرکز سے

۱۵ مدرسہ کی رودادوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بھاشا اور سنسکرت زبانوں کے سکھانے کے لئے وقتاً فوقتاً مولانا ابوجرت حسن میرٹھی اور مولانا غلام محمد سیٹیا پوری، ڈاکٹر غلام محمد وغیرہ کی تدریسی خدمات دارالعلوم نے حاصل کیں، اسی طرح مولانا شہید اللہ صاحب (مشرقی بنگال کے) مشہور فاضل سنسکرت کی خدمت میں تعلیمی وظائف دے کر طلبہ دارالعلوم سنسکرت زبان کے سکھنے کے لئے بھیجے گئے، دیکھئے روداد ۱۳۴۳ھ یا کتاب فرنگیوں کا جہاں ۱۸۵۱۔ اور آج بھی ضرورت ہے کہ کچھ نہیں تو کم از کم ہندوستان کے موجود مذاہب و ادیان کے متعلق صحیح معلومات سے دارالعلوم کے طلبہ کو روشناس کرنے کی ممکنہ صورتیں اختیار کی جائیں، بلکہ ہندی زبان ناگری خط کے ساتھ جب اس ملک کی دستری زبان مانی جا چکی ہے تو قدرتا اس کی وجہ سے اس زبان کی تسلیم کا انتظام زیادہ آسان ہو چکا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اسلامیات کا جو ذخیرہ اردو زبان میں پایا جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ سرمایہ اسلامی تعلیمات کا ہندی زبان میں منتقل کر دیا جائے، ہمارا یہ ایک تبلیغی فرض ہے، اور انشاء اللہ تعالیٰ یہ خواب پورا ہو کر رہے گا۔

از بندہ محمد طیب غفرلہ عرض ہے کہ انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد اسی سال احقر کی طرف سے دارالعلوم کے درجہ فارسی میں ہندی اور روسی ناگری جاری کر دیے جانے کی ہدایت بھیج دی گئی، اور ایک مستقل مدرس ہندی کے لئے مامور کیا گیا، جو آج تک جاری ہے، بعد میں اسے تمام بزرگان دارالعلوم نے پسندیدہ ٹھکاہوں سے دیکھا اور اب یہ ہندی کی تعلیم ضابطہ سے جزو و نصاب درجہ فارسی بنادی گئی ہے۔ محمد طیب غفرلہ

تصادف و تراجم تو خیر دور کی بات ہے، شاید کسی قسم کی کوئی قابل ذکر شکایت بھی نہیں پیدا ہوئی، مگر بائبلوں کی طرف سے کبھی ایسی کوئی آواز بلند ہوئی اور نہ خود قصبہ میں باوجود یکہ ہندوؤں کی کافی آبادی ہے، ان ہی کو شکایت کا موقعہ میری دانست میں کبھی ملا ہے۔

بہر حال یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ چاندپور کے میلوں میں جو کچھ دیکھا گیا تھا، اگر سوچا جائے تو یہ نظارہ ان ہی میلوں کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا، بلکہ ”دارالعلوم دیوبند“ کی پوری تاریخ میں اس باغ کی باغبان کی وہ روش اب تک نظر آتی ہے، جسے دیکھنے والوں نے ضلع شاہ جہاں پور کی مقامی ندی گمرانامی کے ساحل پر دیکھا تھا، جہاں تک میرا خیال ہے اسلامی ہند کی موجودہ مشکلات کے حل میں چاہا جائے تو اس روش سے آج بھی استفادہ کا امکان باقی ہے، واللہ یدہی من یشاء الی صراط مستقیم

اور عمل کے لئے خدا شناسی کے ان میلوں سے جہاں یہ روشنی ملتی ہے، وہیں یہ عجیب بات ہے، کہ علم کے دائرہ میں ہم جن ”نظریات فائقہ“ کی تعبیر ”حکمت قاسمی“ سے کر سکتے ہیں، یا چاہئے، کہ کریں، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی میلوں کی بدولت پہلی دفعہ وہ قلم بند ہوئے، میرا اشارہ سیدنا امام الکبیر کی مشہور کتاب ”حجۃ الاسلام“ کی طرف ہے، اس کتاب میں کیا ہے، ظاہر ہے اس پر بحث کا مورد ترین مقام تو سیرت طیبہ کی بعد کی جلد ہی ہو سکتی ہے، بس میں آپ کے خصوصی نظریات کی ترتیب و تزیین کا کام کیا جائے گا، مختصر فقراتوں میں سر درست اس سلسلہ میں بس اتنی بات کافی ہے کہ اس کتاب کا خاص اڈیشن جب شائع ہوا تھا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے ارقام فرمایا تھا کہ

لے ہاں افراتفری کے ان مہیبلہ و مایکہ نوروں میں جب ۱۹۱۲ء میں غیر ملکی حکومت اچانک اپنے سیاسی اقتدار سے دست بردار ہو کر اس ملک سے رخصت ہو رہی تھی، جہاں رست و خیز کے اس ہنگامہ میں سب کچھ دیکھا گیا، دارالعلوم کو بھی بعض ناگوار حالات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن تحقیق نے اس وقت بھی یہی ثابت کیا، کہ شکایت کا سختی دارالعلوم نہیں، بلکہ وہی لوگ تھے، جنہوں نے گھن کے ساتھ گہوں کے پیسے دینے کا غلط اقدام کیا تھا ۱۲

”اس تحریر کی نسبت حضرت مولانا سیدنا الامام الکبیرؒ کی زبان مبارک سے یہ بھی شاہد کہ جو مضامین تقریر و دل پذیر میں یہاں کرتے کارادہ ہے، وہ سب اس تحریر میں آگئے، اس قدر تفصیل سے نہ سہی، بالا جلال ہی سہی“ ص ۱۷

جیسا کہ معلوم ہے ”تقریر و دل پذیر“ نامی کتاب میں اسلام کے علمی و عملی نظام کو تعمیر و استدلال کے نئے پہلو میں ڈھالنے کا ارادہ سیدنا الامام الکبیرؒ نے فرمایا تھا، لیکن چند ابتدائی ابواب سے زیادہ یہ کتاب لکھی نہ جاسکی، شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، آگے لکھا تھا کہ ”تقریر و دل پذیر کے تمام نہ ہونے کا قاطع شائقان اسرار علیہ کو ہے، اس کی مکافات کی صورت بھی اس رسالہ (حجۃ الاسلام) سے بہتر دوسری نہیں ہو سکتی“

پھر اسی کتاب حجۃ الاسلام کے متعلق اپنے ذاتی احساس کو ظاہر کرتے ہوئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ارتقام فرمایا تھا کہ

”تا سید احکام اسلام، اور مباحث فلسفہ قدیمہ و جدیدہ کے لئے جو تدبیریں کی جاتی ہیں، ان کو بجائے خود رکھ کر حضرت خاتم العلماء (سیدنا الامام الکبیرؒ) کے رسائل کے مطالعہ میں کچھ وقت ضرور صرف فرمائیں، اور پورے غور سے کام لیں، اور انصاف سے دیکھیں، کہ ضروریات موجودہ زمانہ، حال کے لئے وہ سب تدابیر سے فائق اور مختصر اور بہتر و مفید تر ہیں، یا نہیں“ ص ۱۷

بظاہر ان الفاظ کا تعلق اگرچہ عام رسائل سے معلوم ہوتا ہے، لیکن زیادہ تر ”حجۃ الاسلام“ ہی کے افادی پہلوؤں کی طرف حضرت شیخ الہندؒ نے ان جامع و مانع الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے، آپ کے اس دعوے کی توثیق تجربہ سے ہوتی ہے،

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ چاندپور کے یہ میلے خواہ کسی نیت اور ارادے سے جمائے گئے ہوں، لیکن مبتلہ دوسرے فوائد کے ایک بڑا علمی و دینی فائدہ ان میلوں کا یہ بھی ہوا، جیسا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اسی دیباچہ میں لکھا ہے کہ

”بندہ محمود، حمد و صلوة کے بعد طالبان معارف الہیہ اور دل دادگان اسرار ملت حنیفیہ کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ ۱۸۷۶ء میں پادری نرلس صاحب اور نئی پیاسے لال صاحب ساکن موضع چاندا پور متعلقہ شاہ جہاں پور نے جب ایک میلہ بنام ”میلہ خدا شناسی“ موضع چاندا پور میں مقرر کیا، اور اطراف و جوانب میں اس مضمون کے اشتہار بھجوائے کہ ہر مذہب کے علماء آئیں اور اپنے اپنے مذہب کے دلائل سنائیں، تو اس وقت معدن الحقائق، مخزن الدقائق، مجمع المعارف، منظر الاطائف، جامع الفيوض والبرکات، قاسم العلوم والنجرات میدی مولائی حضرت مولانا محمد قاسم متعا اللہ علومہ و معارفہ نے اہل اسلام کی طلب پر میلہ مذکور کی شرکت کا ارادہ ایسے وقت میں مصمم فرمایا کہ تاریخ مباحثہ ۷ مئی سرپر آگئی، چونکہ یہ امر بالکل معلوم نہ تھا کہ مذاہب اور بیان دلائل کی کیا صورت تجویز کی گئی، اعتراضات و جوابات کی نوبت آئے گی، یا زبانی اپنے اپنے مذہب کی حقانیت بیان، یا بیانات تحریری ہر کسی کو پیش کرنے پڑیں گے، تو اس لئے یہ نظرا احتیاط حضرت مولانا قدس اللہ سرہ کے خیال مبارک میں یہ آیا کہ ہر ایک تحریر جو اصول اسلام اور فروع ضروریہ بالخصوص جو اس مقام کے مناسب ہوں، سب کو شامل ہو، حسب قواعد عقلیہ منضبط ہوتی چاہئے، جس کے تسلیم میں ماقبل منصف کو کوئی دشواری نہ ہو اور کسی قسم کے انکار کی گنجائش نہ ملے۔“

اسی کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے یہ اطلاع دی ہے کہ

”چونکہ وقت بہت تنگ تھا، اس لئے نہایت عجلت کے ساتھ غالباً ایک دفعہ کامل اور کسی قدر شب میں بیٹھ کر ایک تحریر جامع تحریر فرمائی۔“

لیکن جیسا کہ گذر چکا تحریری مقالے کے سنائے کا موقعہ مسیدنا الامام الکبیر کو نہ ملا، بلکہ بقول شیخ الہندؒ

”جلسہ مذکور میں تو مضامین مندرجہ تحریر مذکور کو زبانی ہی بیان فرمایا، اور دوبارہ حقانیت اسلام

جو کچھ بھی فرمایا، زبانی ہی بیان فرمایا۔“

مکھیلے کے بہانے سے ”قاسمی معارف“ کا ایک قیمتی حصہ، اور صدیوں کام آنے والا سرمایہ جو تیار ہو گیا تھا، اس نے تو تحریک کا قالب اختیار کر لیا، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اسی سلسلے میں یہ خبر بھی دی ہے کہ

”مولانا مولوی فخر الحسن رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس کے (یعنی نظم بند شدہ تحریر کے) مضامین کے لحاظ سے اس کا نام ”حجۃ الاسلام“ تجویز فرما کر اول بار شائع فرمایا تھا۔“

”خدا شناسی کے میلہ“ کی سرگزشت کو ختم کرتے ہوئے، سیدنا الامام الکبیر کی کتاب ”حجۃ الاسلام“ کے ذکر کی تقریب سے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کے اکثر حصہ کو میں نے اس لئے بھی نقل کر دیا ہے، کہ براہ راست اس میلہ میں اپنے حضرت الاستاذ سیدنا الامام الکبیر کی ہر کتابی میں شیخ الہندؒ بھی شریک تھے، اسی لئے جو کچھ آپ نے لکھا ہے شنیدہ نہیں دیدہ ہے، آپ کے کلم مبارک کی لکھی ہوئی اجمالی روداد کو مناسب معلوم ہو کہ اس کتاب میں بھی تبرکاً درج کیا جائے۔ اور ضمیمہ اشارہ

لے تعارف کے اسی مضمون میں یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ

”صاحبان مطالع اس عجاوب مقبولہ (حجۃ الاسلام) اور نیز دیگر تصانیف حضرت مولانا سیدنا الامام الکبیر، رحمۃ اللہ علیہ کی اشاعت دیکھ کر، صرف بغرض تجارت معنوی طور پر ان کو چھاپتے رہے کسی زائد اہتمام کی حاجت ان کو محسوس نہ ہوئی، اس لئے فقط کاغذ اور لکھائی چھپائی ہی میں کوتاہی نہیں ہوئی، بلکہ تصحیح عبارت میں نمایاں غلط پیدا ہو گئے۔“

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ”حکمت قاسمیہ“ کی نشر و اشاعت کی تجویز کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

”اس حالت کو دیکھ کر کفش برداران قاسمی و دل دادگان اسرار علمی کو بے اختیار اس امر پر کمر بستہ ہونا پڑا، کہ صحت و خوش خطی و غیرہ تمام امور کا اہتمام کر کے اس عجاوب مقدمہ کو چھاپا جائے اور بغرض توضیح حاشیہ پر ایسے نشانات کر دیئے جائیں جن سے تفصیل مطالب ہر کسی کو بے تکلف معلوم ہو جائے، اور

جلہ تصانیف حضرت مولانا فتح اللہ المسلمین فیوضہ

کو اسی کوشش اور اہتمام کے ساتھ چھاپ کر ان کی اشاعت میں کوشش کی جائے، واللہ و لی التوفیق“

لیکن شاید حجۃ الاسلام کے سوا سیدنا الامام الکبیر کی دوسری کتابوں کے متعلق اس تجویز کے مطابق عمل کاربائی نہ ہو

بھی کرنا چاہتا ہوں کہ بہت سے واقعات تاریخ میں ایسے گزرے ہیں، جن کے دور رس نتائج کا اندازہ ان کے وقوع کے زمانہ میں نہیں کیا جاسکتا تھا، جو بعد کو لوگوں کے سامنے آئے، یہی حجت الاسلام کتاب ہے، لکھی تو گئی ہے کل ایک دن اور رات کے کچھ حصہ میں، لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ اس کے مضامین سے دنیا کب تک کن کن حالات میں کس حد تک مستفید ہوتی رہے گی، اور کتنوں کی دینی راتیں اس کتاب کی روشنی سے دن بنی چلی جائیں گی، مجھے تو یہی رنگ ان عملی نمونوں کا بھی معلوم ہوتا ہے، جو ان میلوں میں سیدنا امام الکبیر کی طرف سے خواہ جتنے مختصر زمانہ میں بھی پیش ہوئے ہوں، مگر فائدہ اٹھائے کا ارادہ کیا جائے، تو ہندوستان کی اسلامی آبادی اپنے بود و باش کے الجھے ہوئے مسائل کو چاہے تو ان نمونوں کی مدد سے آج بھی سلجھا سکتی ہے۔ وما یلقاها الا الذین صبروا وما یلقاها الا ذو حظا عظیم۔

بہر حال خدا شناسی کا یہ سببہ تو ختم ہو گیا، معلوم نہیں کہ اس کا سلسلہ آئندہ سالوں میں جاری رہا یا ان ہی دو میلوں تک قصہ ختم ہو گیا، جو بقول ہمارے مصنف امام دہلیت قائم ہی اس لئے ہوا تھا، اور خود کی غرض ہی یہ تھی کہ

(گزشتہ صفحہ سے) موقوفہ نزل مسکا میں نے اس تجویز کے الفاظ کو بخندہ اس لئے نقل کر دیا ہے، کہ دارالعلوم دیوبند، اور اس کے ادب و سنت و کثافت و بلکہ شاید تمام وابستہوں پر ایک قرض ہے، جو چڑھا چلا آ رہا ہے، خدا ہی جانتا ہے کہ یہ قرض کب ادا ہوگا، دل چپ لطیفہ یہ ہے کہ دیوبند کے اس معنوی سرمایہ کو جب اس کے شایان شان لباس پہنا لے گا اور ادا کیا گیا، تو یہ عجیب اتفاق ہے، مگر نظر انتخاب علی گڑھ پر پڑی، اور حجت الاسلام کا یہ خصوصی ادیشن مطبع احمدی علی گڑھ میں چھاپا گیا، اسلام کی معنوی و صوری یا قلب و دقالب کی خدمت کے سلسلہ میں تقسیم عمل کا یہ حسن اتفاق، باہمی وفاق کا کتنا اچھا اشارہ ہے۔ ۱۲

۱۵ اس قرضہ کی ادائیگی الحمد للہ شروع کر دی گئی ہے، حضرات کارکنان دارالعلوم نے یہ بار دلی طور پر اپنے سر لے لیا ہے، ایک مستقل ادارہ بنام ادارہ نشر و اشاعت قائم کر کے اس میں ایک مستقل خندہ سی لئے کھول دیا گیا ہے کہ اس میں اسلاف دارالعلوم بالخصوص حضرت بانی دارالعلوم کے علوم اور تصانیف کو اچھے لباس کے ساتھ منظر عام پر لایا جائے، کام شروع کر دیا گیا ہے، اور امید ہے کہ عنقریب بدیہیات قاسمہ اور حکمت قاسمہ کے منظر (تصانیف قاسمہ) سامنے آتی شروع ہو جائیں گی۔ دائرہ دلی التوفیق ۱۲ محمد طیب غفرلہ

”ان دو سال کے جلسوں میں عام مخلوق نے جان لیا کہ یہ شخص (یعنی سیدنا الامام الکبیر) کس پایہ کا ہے، اور فضل الہی کی کیا صورت ہو ا کرتی ہے۔“ ”جز بہ تائید آسانی نیست“ کا نقشہ ظاہر ہو گیا، ملا سوانح قدیم

اور گو عام طور پر علمی حلقوں میں سیدنا الامام الکبیر کی علمی و عملی عظمت کا اس کے پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا، لیکن ہندوستان کے طول و عرض میں آپ کی شہرت کا ذریعہ بظاہر ان ہی سیلوں کی غیر معمولی کامیابیاں گئیں ان سیلوں سے فارغ ہو کر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں جب

”محمد اللہ نصرت اسلام کا پھر برا اڑاتے ہوئے حضرت مولانا المعظم واپس تشریف لائے“ ملا (تعارف حجۃ الاسلام)

عرض کر چکا ہوں کہ دوسرے سال کے میلے کے بعد چند دن آپ کا قیام شہر شاہ جہاں پور رہا، مہمان نوازی کا فرض مولوی طاہر صاحب آنریری مجسٹریٹ یعنی ملا دن والے موتی میاں نے ادا کیا، اسی زمانہ میں جب موتی میاں کے یہاں دوسرے علماء جو میلے میں شریک ہوئے تھے، ان کے ساتھ مقیم تھے، یہ تحریک کی گئی تھی کہ منشی اندر سن اور پنڈت دیانند سرسوتی دونوں صاحبوں کو چاند پور سے جہاں منشی پیارے لال بانی جلسہ کے یہاں یہ دونوں مہمان تھے، شاہ جہاں پور بلایا جائے خط لیکر آدمی چاند پور گیا، بتا چکا ہوں کہ جواب میں دونوں صاحبوں نے آنے سے معذرت کی، اور لکھا کہ آپ ہی لوگ چاند پور آئیں، رد و اد میں ہے کہ اس کے بعد

”مولوی محمد طاہر صاحب (موتی میاں) نے بامشارہ مولوی محمد قاسم و حسب صلاح مولوی محمد علی صاحب (مصنف سوط اللہ الحبار) پھر مکر لکھا کہ جیل میں مورنا پنا کس نے دیکھا، وہاں کا (یعنی چاند پور کا) مجمع برقا ست ہو گیا، اب وہاں کون ہے جو مباحثہ کا لطف اٹھائیگا۔“

مشہ مباحثہ شاہ جہاں پور

لیکن باوجود دوبارہ تقاضے کے نہ منشی اندر سن ہی شاہ جہاں پور آنے پر راضی ہوئے، اور نہ پنڈت جی ہی آئے۔ لکھ بھیجا تھا کہ

”آپ کے (یعنی سوتی میاں کے) مکان پر نہیں آتا، ہاں! اگر منشی گنگا پرشاد ہوتے، جن کی تبدیلی عہدہ ڈپٹی کلکٹری پر مقام شاہ جہاں پور ہو گئی ہے، تو ان کے مکان پر میں آسکتا تھا،“ مشہور مباحثہ شاہ جہاں پور

اور اسی سے اندازہ ہوتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر کی یہ کوشش تھی کہ منشی اندرسن، یا پنڈت نیا نند سوتی جیسے لوگوں سے جو اس زمانہ میں اچانک مسلمانوں اور مسلمانوں کے دین پر اعتراض و تنقید کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، براہ راست ملیں۔ لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ براہ راست ملاقات اور مکالمہ سے گریز کی راہ وہ کیوں اختیار کرتے رہے۔

شاہ جہاں پور کا یہ قصہ تو خیر شاہ جہاں پور ہی پر ختم ہو گیا، اس کے بعد سیدنا الامام الکبیر گھر واپس ہوئے، چند ہی مہینے گزرے تھے کہ اچانک تیسرے حج کے سفر کا ارادہ کر کے آپ حجاز روانہ ہو گئے آپ کے اس حج کا جو آپ کی زندگی کا آخری حج تھا، اس کی تفصیل تو آگے آرہی ہے، آمد و رفت میں تقریباً چھ مہینے صرف ہوئے، یعنی دوسرا میلہ تو شہداء کے ماہ مارچ میں منعقد ہوا تھا، اسی سال کے ماہ اکتوبر میں آپ راہی حجاز ہوئے، اور جیسا کہ مصنف امام نے خیر دی ہے، اس حساب سے دوسرے سال شہداء ماہ مارچ میں ہندوستان واپس تشریف لائے۔ گویا حج و زیارت کا یہ سفر چھ مہینے میں پورا ہوا تھا۔

مارچ کے بعد صرف اپریل و مئی و جون کے تین ہی مہینے گزرے تھے، واپسی بھی اتنے طول و طویل سفر سے ہوئی تھی، اور جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، مکہ معظمہ سے واپس ہوتے ہوئے، مکہ اور جدہ کی مہیاں آپ پر اس مرض کا حملہ ہوا، جو آپ کی ناسوتی زندگی کی گویا آخری علامت تھی۔ کسی نہ کسی طرح ہندوستان آنے والے جہاز پر آپ کو سوار تو کر دیا گیا تھا، لیکن جہاز ہی میں مصنف امام نے لکھا ہے کہ ”ایک دن یہ نوبت ہوئی، کہ ہم سب مایوس ہو گئے“ ص ۲۲

گویہ مایوسی واقعی مایوسی اس وقت ثابت نہ ہوئی، لیکن مرض کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ وطن پہنچنے کے بعد بھی زیر علاج رہے، کلی صحت تو بحیر بھی حاصل نہ ہو پائی تھی، لیکن بقول مصنف امام

”مرض دفع ہوا، گو نہ طاقت آئی، مگر کھانسی ٹھیر گئی، اور کبھی کبھی دورہ سانس کا ہوتا۔

زیادہ بولنا، دیر تک کچھ فرمانا مشکل ہو گیا، پھر اس میں بھی کچھ تخفیف ہوئی، ص ۱۳۰

”کچھ تخفیف ہوئی“ کے الفاظ ہی بتا رہے ہیں کہ تکلیف کا کلی ازالہ نہیں ہوا تھا، آپ ان ہی حالات میں تھے، کہ وہی پنڈت دیانند سرسوتی جی نے ہندوستان کے طویل و عریض رقبہ میں غذا ہی جانتا ہے کہ کن مصلحتوں کے زیر اثر اپنی کد و کاوش کامرکز خلع سہانپور کے قصبہ رڈکی کو بنالیا، سیدنا امام الکبیر نے اپنی کتاب قبلہ نما کو دیباچہ میں خود ہی ارقام فرمایا ہے کہ

”بعد حمد و صلوة بندہ میچران، سرایا گناہ محمد قاسم ناظر بھی اوراق کی خدمت میں عرض پرداز

ہے کہ سن بارہ سو پچانوے، بھری رجب (مطابق ۱۲۹۵ھ ۱۸۷۸ء جولائی) میں پنڈت دیانند

صاحب نے رڈکی میں آکر سرایا راجمجمع عام میں مذہب اسلام پر چند اعتراض کئے، ص ۲

نہیں کہا جاسکتا کہ رجب کے جس مہینہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس مہینہ کی کس تاریخ سے پنڈت جی کی گل افشائیاں کہئے، یا شرربادیوں کا یہ قصہ رڈکی میں شروع ہوا تھا، بظاہر قیاس کا اقتضا ہے کہ آخری رجب میں پنڈت جی نے رڈکی پہنچ کر پادریوں کے طریقہ سے برسر بازار اسلام کو اپنے تیروں کا نشانہ بنالیا، رڈکی کے مسلمان بے چین ہو گئے، شاہ جہاں پور کے میلوں کی سرگذشت عام طور پر مشہور بھی ہو چکی تھی، نیز قرب مکانی کی وجہ سے قد تارڈکی کے مسلمانوں کی نظر سیدنا امام الکبیر ہی پر پڑ سکتی تھی، واللہ اعلم آدمی رڈکی سے آئے، یا ڈاک سے اطلاع دی گئی، مصنف امام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ اختتام رجب کے بعد شعبان میں یہ خبر سیدنا امام الکبیر تک پہنچی، انہوں نے لکھا ہے کہ

”اسی سال (۱۲۹۵ھ) میں حجاز سے واپسی ہوئی تھی، شعبان میں رڈکی سے خبر ملی کہ

پنڈت دیانند تشریف لائے ہوئے ہیں، اور مسلمانوں کے مذہب پر کچھ اعتراض مشہور کئے

ہیں، اہل رڈکی بکھر ہوئے، کہ آپ تشریف لائیں“

مشہور کرنے کا مطلب وہی ہے کہ پادریوں کی ریس میں پنڈت جی نے بھی برسر بازار اپنی گل افشائیاں کی

یاشہر رہا ریوں کا سلسلہ شروع کیا تھا، پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، پنڈت جی اپنی ذہانت کے زور سے اس دعوے کا اعلان کرتے پھرتے تھے کہ دنیا کی تمام بت پرست قوموں میں سب سے بڑی بت پرست قوم مسلمانوں کی ہے۔ بنظاہر رڑکی میں بھی اپنی اسی اچھوتی اور انوکھی اچھ سے مسلمانوں کے دل دماغ کو مجروح کر رہے تھے۔ پنڈت جی کے اعتراضوں میں گل سرسبد کی حیثیت اسی اعتراض کو حاصل تھی، اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے، کہ رڑکی کے اسی قصبے کے سلسلے میں سیدنا الامام الکبیرؒ نے قبلہ نما نامی اپنی کتاب ہی اعتراض کے جواب میں لکھی ہے، بہر حال شعبان میں پنڈت جی کی آمد کی خبر ملی، رڑکی کے مسلمانوں نے تو خیر طلب ہی کیا تھا، لیکن اس بیرونی کشش کے سوا سچ پوچھے تو خود سیدنا الامام الکبیرؒ بھی رڑکی کی آئی ہوئی خبروں سے تمللا اٹھے تھے، اسی کتاب قبلہ نما کے نیاپہ میں ارقام فرماتے ہیں کہ

”حسب الطلب بعض احباب (رڑکی) اور بقا ضائے غیرت اسلام یہ سنگ اسلام بھی

شروع شعبان میں دیاں (رڑکی) پہنچا“ ص ۷

اس میں شک نہیں کہ رڑکی کا فاصلہ زیادہ نہ تھا، لیکن ذرا سوچئے تو یہی ان باتوں کو کہ حجاز کے طول و طویل سفر سے ابھی آپ واپس ہوئے ہیں، اور واپسی بھی ایسی شدید علالت کے ساتھ ہوئی ہے، گو مرض میں وقتی طو پر گونا گونا فائدہ کی صورت ظاہر ہو چکی تھی، لیکن ضعف ہی نہیں، بلکہ مصنف امام نے جو یہ اطلاع دی ہے، کہ

”مولانا (سیدنا الامام الکبیرؒ) باوجود ضعف اور مرض کے تشریف لے گئے“

اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ مرض کا لگاؤ بھی باقی تھا۔ مولنا حکیم منصور علی خاں صاحب نے اپنی کتاب مذہب منصور میں رڑکی کے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے جس کا آگے ذکر آ رہا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ رڑکی کا یہ سفر پہلی میں کیا گیا تھا۔ میل کی اس گاڑی کے ہچکوں کو اچھے اچھے متعدد ستوں کے بھی انجنر بنجر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، پھر مرض اور مرض کی نقابہت کے ساتھ یہ سفر جس حد تک تکلیف دہ ہو سکتا ہے، خصوصاً راستہ بھی جب ہموار نہ ہو، قبلہ نما کے

دیباچہ میں ”راہ کی خرابی“ کا ذکر بھی کیا گیا ہے، مگر آپ دیکھ رہے ہیں، کہ ”غیر اسلام“ کے تقاضے نے ہر تقاضے کو سامنے سے ہٹا دیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی توہین کا خیال، ہر خیال پر غالب ہے، جس حال میں تھے، کھینچے ہوئے رڑ کی پہنچ گئے، اور عجیب شان کے ساتھ پہنچے، مصنف امام نے لکھا ہے کہ رڑ کی کے اس سفر میں یہی نہیں کہ

”بہت سے خادم ساتھ ہوئے“ ص ۱۱۷

بلکہ شاہ جہاں پور کے قلعے مسلمانوں میں جو پھیلے ہوئے تھے، بظاہر ان ہی کا اثر تھا، کہ لوگوں کو جب خبر ہوئی، کہ سیدنا الامام الکبیر اور پنڈت دیانند جی میں مباحثہ و مناظرہ بہ مقام رڑ کی ہونے والا ہے، تو

”اطراف و جوانب سے بہت سی مخلوق مولنا کی تقریر کے اشتیاق میں جمع ہو گئی“ ص ۱۱۸

خلاف دستور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ رڑ کی کے اس معرکہ میں قصداً اپنے خاص خاص شاگردوں کو جو دوسرے مقامات میں تھے، آپ نے طلب کر لیا تھا، مولنا حکیم منصور علی صاحب جو اس زمانہ میں منگلور نامی قصبہ میں کسی مدرسہ میں مدرس تھے جو دیونندا و رڑ کی کے درمیان راستہ میں ملتا تھا، حکیم صاحب نے لکھا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر نے

”ایک تلمیذ رشید (مولنا فخر الحسن گنگوہی) کو منگلور بھیجا، کہ اس کو (یعنی حکیم صاحب کو)

ملنے کے لئے بلا لاؤ۔ میں یہ مشرودہ سنتے ہی مولوی فخر الحسن گنگوہی کے ہمراہ چلا گیا،

شرک پر پہلی کو ٹھیکر کر فرمایا، تم بھی ضرور رڑ کی آ جانا۔ حسب الارشاد دین روز بعد میں

بھی رڑ کی پہنچا“ ص ۱۱۹ مذہب منصور

بہر حال خدام خاص (تلامذہ وغیرہ) کے سوا عام مسلمانوں کا بھی کافی مجمع معلوم ہوتا ہے، کہ رڑ کی میں اکٹھا ہو گیا تھا، گویا ایک برات ہی اتر پڑی تھی۔ اسی کے ساتھ جب ہم حضرت والا ہی کی براہ راست دی ہوئی اس اطلاع کو پڑھتے ہیں یعنی رڑ کی پہنچنے کے بعد اقام فرمایا گیا ہے، کہ

”آزاد نے مناظرہ میں سولہ سترہ دن وہاں (رڑ کی) ٹھیکر کیا“ قبلہ نم ۱۷

تو یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے، نصف ماہ سے زیادہ دن تک باہر سے آئے ہوئے اتنے بڑے مجمع کے رہنے پہنے، کھانے پینے کا نظم، اور وہ بھی اس طریقہ سے کہ ہر شخص اپنے کھانے پینے کا خرچ خود برداشت کرے، یہی حکم سیدنا امام الکبیر کا تھا، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، اور مہینہ بھی جولائی آغازِ موسمِ بزرگسال کا۔

”علامہ برین برسات کا موسم“

ان الفاظ سے قبلہ نما کے اسی دیباچہ میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔

لیکن اپنے ذاتی ضعفِ مرض، اور اتنے بڑے مجمع کے قیام و طعام کی دشواریوں سے بی پروا ہو کر تین چار دن نہیں بلکہ سولہ سترہ دن تک آپ رڑکی میں کیوں مقیم رہے؟

بظاہر جیسا کہ خود آپ کے ذاتی بیان سے بھی معلوم ہوتا ہے، اور دوسروں نے بھی لکھا ہے کہ پنڈت جی سے آپ براہِ راست دو بدو ہو کر گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ قبلہ نما کے دیباچہ میں آپ کے الفاظ ہیں کہ

”ہر چند چاہا کہ مجمعِ عام میں پنڈت جی سے اعتراض سنوں اور بالمشافہہ بجا نیت خداوندی

اسی وقت ان کے جواب عرض کروں“

لیکن جیسا کہ مصنفِ امام نے اجمالاً یہ خبر دی ہے، کہ

”وہ اللہ کا بندہ (پنڈت دیانند سرسوتی) گھٹگو پر پکانہ ہوا۔ اینڈی بینڈی مشہطیں

کرتا تھا۔“

ان اینڈی بینڈی شرطوں کی تفصیل تو آپ خود سیدنا امام الکبیرؒ کے حوالہ سے آگے سنیں گے

لیکن ان سے زیادہ دل چسپ حصہ مصنفِ امام کی خبر کا یہ ہے، کہ

”وہ اللہ کا بندہ گھٹگو پر پکانہ ہوا“

آپ مجھ ہی سے سن چکے ہیں کہ گھٹگو یعنی بحث و مباحثہ، مناظرہ و مجادلہ کے میدان کے پنڈت جی اپنے وقت میں دھنی تھے، جے پور پہنچ کر راجہ رام سنگھ والی جے پور کے دربار کے فاضل پنڈت

رنگا چاریہ کو چیلنج پر چیلنج، بے رہے تھے، اگرہ، 'اجمیر' پشکر جہاں پہنچے، شیومت کا جس کی پنڈت جی شروع میں پابند تھے۔ منڈن یعنی تائید اور دشمنومت کا کھنڈن یعنی تردید اسی کو اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ پنڈتوں کے قدیم دائرے سے باہر نکلنے کے بعد جب عیسائیوں، مسلمانوں وغیرہ ہندوستان کے مختلف مذہبی گروہ کے دین پران کے اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوا تھا، سہا زپور سے دانا پور تک پنڈت جی نے اہم مچار کھی تھی، اپنی تقریروں اور مباحثوں میں پنڈت جی جن جھگڑوں سے کام لیتے تھے، مدراس کے ڈاکٹر مرڈک ایم۔ اے ایل ایل ڈی کی شہادت ان کے متعلق گزری تھی کہ پنڈت جی کے ساتھ ان کی تعریف کرنے والوں کی ایک منڈلی رہتی تھی، اور جب پنڈت جی مباحثہ میں اپنے مخالف فریق کی

”ہنسی اڑاتے، قہقہہ لگاتے، تو یہ لوگ (منڈلی والے) اس کام میں ان کا ساتھ دیتے تھے“

اور یہی گواہی ڈاکٹر فارکوہار کی بھی نقل کر چکا ہوں جس میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ پنڈت جی ”مباحثہ میں تند و ترش، بہت چیننے والے اور مخالف پر ناجائز دباؤ ڈالنے والے تھے“

”سوامی دیانند اور ان کی تعلیم“ نامی کتاب سے ان شہادتوں کو پہلے اپنے موقع پر پیش کر چکا ہوں، لیکن یہ عجیب بات ہے، کہ سیدنا الامام الگیر کے مقابلہ میں آنے کے بعد خدا ہی جانتا ہے کہ پنڈت جی پر کیا حال طاری ہوا، کہ خدا شناسی کے میلے میں سنسکرت آمیز بھاشا یعنی اسی زبان میں تقریر کی جس کے سمجھنے والے میلے میں دس پانچ آدمی بھی نہ تھے، نہیں کہا جاسکتا کہ پنڈت جی کے دل کا جو ارمان پڑیس تھا دل ہی کے اندر رہ گیا تھا، اسی ارمان کو نکالنے کے لئے رٹ کی پہنچے تھے اور رٹ کی کے انتخاب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ سیدنا الامام الگیر کا وطن ان کو معلوم ہو گیا تھا، کہ اسی علاقے میں ہے، مگر اب اسے کیا کہنے، جب حضرت والا باوجود ضعف اور مرض کے رٹ کی پہنچ گئے تو وہی پنڈت جی جنہوں نے رٹ کی کے مسلمانوں کو بیٹھے بٹھائے بے چین کر دیا تھا، اور تنہا پیش قاضی ردی راضی آئی، والی مثال کے مطابق حضرت کی تشریف آوری سے پہلے سب کچھ

کہہ رہے تھے، وہی بجائے آگے بڑھنے کے گریز اور فرار کی راہ ڈھونڈنے لگے، اور ان کے سارے سینٹرے، داویج جو مباحثوں میں خرچ ہوتے تھے، رڑکی میں بالکل اس کے برعکس مباحثہ اور گفتگو کے روکنے میں استعمال ہوتے رہے، کوئی دوسرا لگتا تو شاید شک و شبہ کی کچھ گنجائش بھی ہو سکتی تھی، لیکن اس سے زیادہ معتبر ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی براہ راست یشہادت ہے، قبلہ نما کے دیباچہ میں فرماتے ہیں

”مگر پنڈت جی ایسے کا ہے کہ تو تھے کہ میدان مناظرہ میں آتے، جان چرانے کے لئے وہ وہ داؤ کھیلے کہ کا ہے کو کسی کو سو جھٹے میں“

”داؤ کھیلنا“ تو پنڈت جی کا عام دستور تھا، فرق یہی تھا کہ پہلے ہی کھیل وہ مباحثہ اور گفتگو کرنے میں کیلتو تھے اور اب اسی داؤ کو وہ مباحثہ اور گفتگو کو ملتبی کرنے کے لئے کھیل رہے تھے۔ اس طرف پنڈت جی تو اپنے سارے کرتب اسی کوشش میں صرف فرما رہے تھے کہ کسی طرح سیدنا الامام الکبیر کا سامنا نہ ہو، اور دوسری طرف ٹھیک اس کے توڑ پر سیدنا الامام الکبیر کو دیکھا جا رہا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، پنڈت جی کو میدان میں اترنے پر مجبور کر رہے ہیں، خود ہی ارقام فرماتے ہیں، کہ برسر عام مباحثہ پر آمادہ کرنے کے لئے

”منتیں کیں، غیرتیں دلائیں، جھتیں کیں، سعین کرائیں، مگر وہاں (یعنی پنڈت جی کے یہاں)، وہی نہیں کی نہیں رہی“

افسوس ہے کہ ان منتوں، غیرتوں، جھتوں، سعینوں کی پوری تفصیل کا علم نہ ہو سکا۔ مصنف امام نے یہی حد سے زیادہ اجمال سے کام لیا ہے۔ ”اینڈی مینڈی شیطیں“ بس ان ہی الفاظ میں سب کو لپیٹ کر انہوں نے رکھ دیا، اور دوسرے ذرائع سے بھی ان تفصیلات کا جیسا کہ چاہئے پورا پتہ نہ چل سکا۔ چونکہ سولہ سترہ دن تک رد و بدل سوال و جواب کا یہ سلسلہ جاری رہا ہے، اس لئے بظاہر یہی خیال گذرتا ہے کہ باتیں کافی دل چسپ ہوں گی۔ حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے حوالہ سے قصص الاکابر میں ایک لطیفہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ پنڈت جی نے ایک دفعہ یہ غزلیہ پیش کیا کہ۔

”میں اس ارادہ (یعنی مناظرہ و مباحثہ کے ارادہ) سے نہیں آیا ہوں“

تو مسیدنا الامام الکبیر کی طرف سے جواب میں کہا گیا کہ

”ارادہ تو فعل اختیاری ہے، اب کر لیجئے“

”جتنیں کہیں“ کے اجمال کی یہ ایک مثالی تفصیل ہے، اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً نصف ماہ کے اس طویل عرصے میں کتنے نشاط انگیز، روج پرور لطائف پیش آئے ہوں گے، لیکن افسوس کہ ذکر کرنے والوں نے عموماً خاموشی سے کام لیا، تاہم ادھر ادھر سے جن معلومات تک رسائی ہو سکی ہے، انہیں پیش کر دیتا ہوں زیادہ تر یہ معلومات خود حضرت کی کتاب قبلہ نما کے دیباچہ ہی سے فراہم کی گئی ہیں۔ اسی کتاب میں ہے کہ رڑکی کی عام آبادی سے جہاں آپ مقیم تھے، ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر وہ جگہ تھی، جہاں پنڈت جی فروش تھے۔ غالباً پنڈت جی کے کسی معتقد کا باغ تھا، مسیدنا الامام الکبیر نے اطلاع دی ہے کہ

”ہماری فردگاہ سے بلکہ شہر سے ان کا (پنڈت جی کا) مکان ڈیڑھ میل پر تھا،“ قبلہ نما ص ۱

پنڈت جی کی یہی وہ قیام گاہ تھی، جہاں ان کے کھانے کا وہ تماشا دیکھا گیا تھا جس کا ذکر غالباً پہلے بھی کہیں گذرا ہے، امیر شاہ خان صاحب کے حوالہ سے ارداخ ثلاثہ میں یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ مسیدنا الامام الکبیر اد پنڈت جی کے درمیان نامہ و پیام کے لانے اور لے جانے کا فرض اس زمانہ میں منشی نہال مرحوم انجام دیتے تھے، خاں صاحب روایت کرتے تھے کہ

”منشی نہال احمد کو جو نہایت ذکی تھے، دیانند کے پاس مشرط المناظرہ طے کرنے کے

لئے بھیجا گیا،“ مشرط ارداخ

ایک دفعہ جب منشی نہال احمد صاحب پنڈت جی کے پاس موجود تھے۔ پنڈت جی کی رسوائی کا وقت آگیا، بقول خاں صاحب مرحوم انہوں نے دیکھا کہ

”کئی بڑی بڑی تھالیں پوریوں کی تھیں، اور سیروں مٹھائی تھی جس کو یہ منشی نہال احمد

کئی آدمیوں کا کھانا سمجھے، مگر وہ اکیلے کے لئے آیا تھا، اور اسی نہال نے وہ سب تھالیں

صاف کر دیں“

اسی سلسلہ میں وہ لطیفہ پیش آیا تھا، حبيب سيدنا الامام الکبير تک اس کی خیر پہنچ کر منشی نہال احمد پنڈت جی کے کھانے کی یہ رپورٹ لائے ہیں، اور کہتے ہیں کہ کھانے میں مقابلہ کی پنڈت جی سے مولانا کی اگر ٹھن گئی، تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوگا؟ منشی نہال احمد مرحوم جو خود بھی پھر خوری میں کافی نیک نام تھے ان کو بلا کر حضرت والا نے فرمایا تھا کہ اس کے لئے آپ تو ہمارے ساتھ ہیں، تم ہی کو پنڈت جی سے بھڑا دوں گا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ مقابلہ کمال میں ہوتا ہے، اور زیادہ کھانا زیادہ احتیاج کی دلیل ہے اور احتیاج کمال نہیں نقص ہے، نقص میں بھلا کیا مقابلہ کیا جائے گا؟ خاں صاحب کے بیان میں یہ بھی ہے، کہ آخر میں فرمایا گیا تھا کہ کھانے میں مقابلہ کی ٹھہر جائے تو ”کسی بھینسے یا ہاتھی کو لا کر کھڑا کر دینا“

لے پنڈت جی کے کھانے پینے کے قصہ جیسا کہ ان کی سوانح عمریوں سے معلوم ہوتا ہے، کافی دلچسپ ہیں، انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح غری میں لکھا ہے کہ برم جباری ہونگی وجہ سے اچانک انا خود کچا ناڑا تھا جس کی وجہ سے میری خواندگی میں ٹراچھ واقع ہوتا تھا، بنا بریں اس بکھر چڑھ چوٹنے کیلئے میں نے ارادہ کیا کہ حتی الامکان کوشش کر کے سیاسی آشرم کے چوتھے حصہ میں داخل ہو جاؤں (سوامی دیانند اور ان کی تعلیم ۲۹) جو خود نوشت سوانح عمری، یوں گویا بے چارے پریش کی مجبوری سے سنایا ہے۔ لہذا مذکور کا خاص شوق تھا، جس کے لئے رسوئیا، کہاں روغرو رکھنے کی ضرورت ہوئی۔ اپنی حسب مشاء کھانا تیار کرانے کیلئے لکھا ہے کہ میرا نوں سے عموماً نقد و پیر سوامی جی لے لیا کرتے تھے۔ لاہور پہلی دفعہ جب پہنچے تو رازدانی کے اس زمانہ میں بارہ روپیہ فی مہنت میرا نوں سے وصول کیا کرتے تھے۔ آخر میں ایک رسوئیا (بادرچی) نے جیسا کہ ان کی سوانح عمریوں میں لکھا ہے زہر کھلا دیا۔ اور اسی زہر لے کھانے سے وفات ہوئی۔ تفصیل کے لئے پنڈت جی کی سوانح عمریوں کو پڑھئے۔ نیز کتاب ”سوامی دیانند اور ان کی تعلیم“ کا مطالعہ بھی کافی ہو سکتا ہے، خوش خدا کہ ہونے کو ساتھ پنڈت جی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کافی خوش پوشاک بھی ہو گئے تھے۔ مرنے کے بعد جیسا کہ میرٹھ کے اخبار آریہ سماج میں چھپا تھا۔ متعدد سرخ زرد کا مداد دوشلے، پٹھنہ کی چادریں، پٹھنہ کے چنے، ریشمی دو شالے، دھوپ چھاؤں کے ریشمی دوپٹے، ریشمی چنے، ریشمی کوٹ، سرخ پٹا، ریشمی کٹائے کی دھوئیاں، کلاہوں کا دوپٹہ وغیرہ دیکھئے تھے۔ پنڈت جی کو تبا کو ہی نہیں بلکہ بھنگ وغیرہ چیزوں کے استعمال کی بھی عام عادت تھی ۱۲

۱۳ اس واقعہ میں یہ جزو بھی میں نے اکابر سے سنا ہے کہ حضرت والا نے فرمایا کہ مقابلہ کمال میں ہوتا ہے نہ کہ نقص میں اور جیسے ہمیں ہو کہ منشی نہال احمد سے فرمایا کہ تم اتنے دنوں صحبت میں رہے تہا بے ذہن میں (باقی اگلے صفحہ پر)

بہر حال پنڈت جی شہر سے ڈیڑھ میل دور والے اسی مکان میں بیٹھے بیٹھے، سوال و جواب کا سلسلہ جاری کئے ہوئے تھے حضرت دلا کی طرف سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ جیسے برسر بازار آپ نے اعتراضات کئے ہیں، ان کے جواب سننے کیلئے چاہئے کہ آپ برسر بازار آئیں، اپنے اعتراضات کی بیان کریں، اور سب کے سامنے مجھ سے ان کے جوابات سنیں۔ لیکن بجائے شہر آؤں گے پنڈت جی کا اصرار تھا کہ گفتگو کے لئے آپ ہی میری قیام گاہ پر آئیے۔

صرف یہی نہیں، بلکہ دوسری شرط پنڈت جی کی طرف سے یہ پیش ہوئی، کہ آنا ہو، تو مجمع عام کے ساتھ نہ آئیے۔ زیادہ سے زیادہ پچاس آدمیوں کے سامنے گفتگو کا موقع دیا جاسکتا ہے، وائس اعلیٰ ان پچاس آدمیوں میں پنڈت جی کے طرفداروں کا طبقہ بھی شریک تھا، یا حضرت دلا کو پچاس آدمی کی حد تک اپنے ساتھ لانے کی اجازت دی گئی تھی۔ ان ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے قبلہ نما میں ارقام فرمایا ہے کہ

”اعتراض تو مجمع عام میں کئے۔ پر مناظرہ میں اپنی قطعی کھلے کا وقت آیا تو پچاس

آدمیوں سے زیادہ پر راضی نہ ہوئے۔“

لکھا ہے کہ وجہ آدمیوں کی تحدید کی جب پوچھی گئی، تو

”اندیشہ فساد زب زبان تھا۔“

”اندیشہ فساد“ کی جو آڑ پنڈت جی نے لی تھی۔ غالباً اسی سلسلہ میں حجت کو تمام کرنے کیلئے اپنی فطرت

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

یہ سوال پیدا کیوں ہوا کہ اگر کھانے میں مقابلہ ہو گیا تو کیا ہو گا؟ یہ سوال کیوں نہ پیدا ہوا کہ اگر نہ کھانے میں مقابلہ ہو گیا تو کون جیتو گا؟ یہ کہہ کر فرمایا کہ میں بھی اندیشہ تھا کہ کسی بند کو ٹھٹھری میں بند کر دیا جائے اچھے پہینے تک بلا خود نوش بند کھا جائے، اور چھ ماہ بعد کھولا جائے تو جو تروتازہ نکلے اس سے حق و باطل کا فیصلہ کیا جائے۔ محطیب غفرلہ

۱۵ ”جواب تم کی بہ ترکی“ میں یہ لکھ کر کہ ”چاند اپور سے پہلے کبھی مولوی محمد قاسم صاحب سے ان کو پنڈت جی کو، پالانہ پڑا تھا۔ اس لئے وہاں نہ دس آدمیوں کی قید تھی نہ مجمع عام ہو سکا۔ فساد کا اندیشہ نہ غل کا کھٹکا، نہ تحریک کی ضرورت تھی نہ گوشہ تنہائی کی حاجت۔“ ۱۶ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں پنڈت جی نے کل دس آدمیوں کو ساتھ لانے کی اجازت دی تھی، پچاس تک رد و رک کے بعد ماضی ہوئے تھے ۱۷

عام روش کے برخلاف حضرت دالاس اقدام پر مجبور ہوئے جس کا ذکر قصص الاکار میں حکیم الامت
تھانویؒ کے حوالہ سے بایں الفاظ کیا گیا ہے

”مولنا محمد قاسم صاحب رٹ کی دینا سند سے مناظرہ کرنے کے لئے گئے اور بھی چند آدمی
ساتھ ہو گئے۔ سنا ہے کہ مولنا ایک جگہ ٹھہرے اور ساتھ والوں سے کہہ دیا تھا کہ کھانا
بازار میں کھائیں، مجسٹریٹ کو خبر پہنچی، تو اہل وہ سمجھا کہ دعوت خورے آئے ہوں گے،
مگر جب واقعی بات کی خبر ہوئی، کہ وہ اس طرح کے لوگ ہیں، تو اس کے (مجسٹریٹ
کے محل میں بڑی قدر ہوئی، اور اس نے مولنا کو بلایا، اور اشتیاق ظاہر کیا“

حضرت حکیم الامت نے اس کے بعد بطور جملہ معترفہ کے یہ بیان کیے تھے ہوئے کہ
”مولنا کی عادت تھی کہ کبھی کسی بڑے آدمی سے نہ ملتے تھے۔ ایک دفعہ رامپور (ریاست) گئے
نواب صاحب کو خبر ہوئی، تو مولنا کو بلایا۔ مگر مولنا نہیں گئے، اور یہ جلد گیا کہ ہم دیہاتی
لوگ آداب شاہی سے واقف نہیں ہیں۔ خدا جانے کیا بے ادبی ہو جاوے۔ نواب
صاحب نے کہا کہ آپ کو آداب وغیرہ سب معاف ہیں۔ آپ تشریف لائیں۔ ہمیں
آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ مولنا نے جواب دیا کہ کیا تعجب کی بات ہے کہ اشتیاق
تو آپ کو ہو ملنے کا، اور آؤں میں۔ غرض نہ گئے“

مگر پنڈت جی کو جس طرح جہی ہو، راہ پر لایا جائے۔ محض اس نصب العین کے تحت مجسٹریٹ کے
بلانے پر حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ

”ملنے سے انکار نہ کیسا۔ کیونکہ اس سے ملنے میں دینی مصلحت تھی“

مجسٹریٹ سے ملاقات ہوئی، اور اسی سلسلہ میں پنڈت جی کے طرز عمل کی شکایت کی کہ اعتراض
تو انہوں نے برسرِ اذار کیا، اور اب جواب سننے کے لئے مجمع عام میں اس لئے آنا نہیں چاہتے، کہ
ان کو فساد کا اندیشہ ہے۔ مجسٹریٹ سے بڑھ کر فساد کے اس بے بنیاد اندیشہ کے متعلق اور کون اطمینان
دلا سکتا تھا۔ حضرت تھانوی کا بیان ہے کہ

”مجسٹریٹ نے کہا کہ فساد کے ہم ذمہ دار ہیں“

اسی پر کہتے ہیں کہ پنڈت جی نے فرمایا تھا کہ میں نے مناظرہ کا ارادہ نہیں کیا۔ حضرت والا نے جس کے جواب میں کہا تھا کہ اب ارادہ کر لیجئے مگر اس اختیاری فعل پر بھی وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔

جیسا کہ قبلہ نما کے والد سے براہ راست حضرت والا کے الفاظ نقل کر چکا ہوں کہ ”پنڈت جی نے رڈ کی میں سر بازار مجمع عام میں نہ عجب اسلام پر چند اعتراضات کئے“ اسی لئے آپ نے چاہا کہ مجمع عام میں

پنڈت جی سے اعتراض سنوں اور بالمشافہ بیعت خاوندی اسی وقت ان کے جواب عرض کروں“

الغرض مجمع عام میں جو اعتراضات اسلام پر کئے گئے تھے، آپ کا مقصد تھا کہ جواب بھی ان کا مجمع عام ہی میں دیا جائے، اسی بنیاد پر سوال ہوتا ہے کہ مجمع عام میں جب جواب سننے سے پنڈت جی گریز کرتے

رہے، اور اس حد تک اپنے گریز پر ان کا اصرار قائم رہا، علاوہ کے مجسٹریٹ کی ضمانت دہانی بھی اس اصرار

سے ان کو ہٹا نہ سکی۔ ایسی صورت میں چاہئے تو یہی تھا کہ قصہ کو ختم کر دیا جاتا کہ اصل مقصد یعنی مجمع عام میں

جواب سنانے کا موقع باقی نہ رہا تھا۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر نے پنڈت جی کا تقابلی

رکھا اور کس حد تک جاری رکھا، قبلہ نما کے دیباچہ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ مجمع عام میں جواب سننے کے

لئے پنڈت جی جب آمادہ نہ ہوئے، بلکہ حضرت والا نے ارقام فرمایا ہے،

”مجمع عام کی جابد شواری دوسو تک آئے“

یعنی بجائے مجمع عام کے پنڈت جی نے کہلا بھیجا کہ زیادہ سے زیادہ دوسو آدمیوں کے درمیان آپ کے

جوابوں کو سننے کے لئے میں تیار ہو سکتا ہوں۔ بظاہر جس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ مناظرہ و مباحثہ

کے دونوں فریقوں کے آدمیوں کی تعداد دوسو سے متجاوز نہیں ہو سکتی، اور پنڈت جی کی ضد کہئے، یا ہٹ دھرمی

اسی نقطہ پر ختم نہیں ہو گئی، بلکہ اسی کے ساتھ یہ فرمائش بھی پیش ہوئی کہ جس جگہ میں ٹھہرا ہوا ہوں وہیں آپ

آئیں، میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ آگے حضرت والا نے قبلہ نما میں جو یہ اطلاع دی ہے کہ

”مگر اپنے مکان تنگ کے سوا اور کہیں راضی نہ ہوئے“

اس کا یہی مطلب ہے کہ اپنی فرد گاہ ہی پر سیدنا الامام الکبیر کو آنے پر پنڈت جی نے مجبور کیا، جیسا کہ عرض

کر چکا ہوں کہ پنڈت جی کی یہ قیام گاہ اس جگہ سے جہاں حضرت دالائے کرام تھے، ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر تھی، یہی نہیں بلکہ شہر جہاں عام مسلمانوں کی آبادی تھی۔ اس سے بھی یہی فاصلہ تھا۔ فساد کا اندیشہ جیسے پنڈت جی کو تھا، یہی اندیشہ دوسری طرف سے بھی کیا جاسکتا تھا۔ لیکن پنڈت جی کی یرشہ طبعی مان لی جاتی ہے، فاصلہ کی درازی کی وجہ سے وقت بجائے شام کے چاہا گیا کہ صبح کو رکھا جائے۔ تاکہ آمد و رفت میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو، لیکن پنڈت جی نے اس تجویز کو بھی مسترد کر دیا، اور بجائے اس کے اپنی طرف سے شام کا وقت پیش کیا اور شام کو بھی چھ بجے کا وقت دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ چھ بجے کے بعد دن ہی کتنا باقی رہتا ہے۔ وقت کی تنگی کی شکایت کی گئی تو کہلا بھیجا کہ چھ بجے سے نو بجے تک میں وقت دے سکتا ہوں۔ ان ہی باتوں کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہوئے کہ

”وقت صبح کے بدلے چھ بجے شام کے ٹھہرائی۔ کسی وقت کی شکایت کی نو بجے تک اجازت آئی“

قید و بند کے ان سارے قصوں سے مطلب کیا تھا، حضرت دالائے کرام نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

”نوبے فارغ ہو کر (تو ڈیڑھ میل کی مسافت کو طے کر کے، دس بجے شہر پہنچے، ایک گھنٹہ میں نماز سے فارغ ہوئے۔ اس وقت نہ بازار کھلا ہوا جو کھانا مول لیجئے، نہ خود پکانے کی ہمت جو یوں انتظام کیجئے۔ علاوہ بریں برسات کا موسم، بیٹھ برس گیا، تو اور بھی اللہ کی رحمت ہو گئی“

تہ کی بات یہ بھی جیسا کہ حضرت ہی نے لکھا ہے کہ

”ان کی (پنڈت جی کی، یہ غرض تھی کہ یہ لوگ) یعنی سیدنا الامام اکیبر اور ان کے رفقاء، تنگ ہو کر چلے جائیں اور ہم بخلیں بجائیں“

کچھ تحریری و تقریری مناظرے کی بحث بھی معلوم ہوتا ہے پنڈت جی کی طرف سے چھیڑ گئی حضرت کے الفاظ ”پھر اس پر تحریر و تقریر کی شاخ اوپر لگی ہوئی“

سے یہی سمجھ میں آتا ہے۔

بہر حال جہاں تک واقعات کا اقتضاء ہے۔ ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی سیدنا الامام الکبیر سے سامنا کرنے کے لئے وحیقت کسی شرط پر آمادہ نہ تھے۔ لیکن ٹھیک اس کے مقابلہ میں سیدنا الامام الکبیر کے طرز عمل سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو، آپ چاہتے تھے کہ دوبرہ گفتگو کرنے کا موقعہ پنڈت جی سے مل جائے۔ اسی لئے جو شرط اور قید و بند کی جو صورتیں بھی ان کی طرف سے پیش ہوتی رہیں، سیدنا الامام الکبیر ہر ایک کو تسلیم کرتے چلے جاتے تھے، خود ہی لکھا ہے کہ

بنام خدا ہم نے سب باتوں کو سر رکھا۔

گویا مان لیا گیا کہ آپ نہیں آتے، ہم ہی آتے ہیں۔ صبح کو نہیں شام ہی کو آئیں گے۔ کھانے پینے کا نظم ہو یا نہ ہو بہر حال برسات کی کالی سیلی راتوں میں دس بجے ہی ہمیں واپس ہوں گے لیکن پنڈت جی نے اپنی فرد گاہ والی شرط جو پیش کی تھی، اسی میں ایک قانونی راز مضمر تھا۔ رڑکی میں فوجی چھاؤنی اس وقت تک قائم ہو چکی تھی۔ اور باغ جس میں پنڈت جی ٹھہرے ہوئے تھے، کنٹونمنٹ ہی کی حدود کے اندر واقع تھا۔ فوجی قانون کی رو سے کنٹونمنٹ کی حدود میں مذہبی بحث و مباحثہ کے جلسوں کی قانوناً اجازت نہیں ہوتی، پنڈت جی اس فوجی دستور سے غالباً واقف تھے۔ کنٹونمنٹ والوں کو جب اس کا علم ہوا کہ چھاؤنی کی حدود میں اس قسم کا قصہ پیش آنے والا ہے، تو جیسا کہ حضرت والا نے لکھا ہے

”حکام وقت نے قطعاً ممانعت کر دی کہ سرحد چھاؤنی رڑکی میں مناظرہ نہ ہونے پائے، اور

اس سے خارج ہو، تو کچھ ممانعت نہیں۔“

یوں پنڈت جی کی قیام گاہ کا قصہ ختم ہو گیا، اور یہی پنڈت جی کی غرض بھی تھی مگر اس کے بعد بھی سیدنا الامام الکبیر نے چاہا کہ قصہ ختم نہ ہو، کنٹونمنٹ کی حدود کے باہر بعض محفوظ مقامات تھے۔ انتہا یہ ہے کہ عید گاہ جس کی حیثیت گو نہ مسجد جیسی تھی اس کے میدان تک میں حضرت والا راضی ہو گئے کہ پنڈت جی

آنا چاہیں، تو ہم ان کا استقبال کریں گے، خود ان کے الفاظ ہیں کہ

”ہم نے میدانِ عید گاہ وغیرہ میں پنڈت جی سے التماس قدم رنجہ فرمائی کیا“

مگر خدا ہی جانتا ہے کہ وہی پنڈت دیا نند سرسوتی جو دنیا بھر کو مناظرہ اور مباحثہ کا چیلنج دیتے پھرتے تھے ان پر کیا حائل طاری تھا، کہ کسی طرح وہ رو رو رہوئے پر آمادہ نہ ہوئے، اور اس سے بھی حیرت انگیز سبب نا الامام الکبیر کا طرز عمل ہے، کہ روز دروز نہیں، نصف ماہ سے زیادہ مدت تک تمام مشاغل سے الگ ہو کر رکھی ہی میں صرف اس لئے خیمہ زن ہو گئے، کہ جس طرح بھی ممکن ہو پنڈت جی سے براہ راست مکالمہ اور گفتگو کا موقعہ پیدا کیا جائے۔ پنڈت جی کی طرف سے شدید پرشر و ط کے اضافے ہوتے چلے جاتے تھے، اور آپ ہیں کہ ان کی ایک ایک شرط کے سامنے تسلیم خم کئے چلے جاتے ہیں گویا طے کئے ہوئے ہیں کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن ایک دفعہ تو اپنی بات ان کے کانوں تک پہنچا کر رہوں، آخر میں تو حد ہو گئی، یعنی جب آپ کو معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے زبانی مکالمہ پر پنڈت جی تیار نہ ہوں گے، تو آپ کی طرف سے پنڈت جی کے پاس یہ پیغام پہنچا کہ

”مرضی ہو، تو آؤ، مناظرہ تحریری یہی“

حضرت والا نے اپنے اس پیغام کو نقل کرنے کے بعد یہ اطلاع دی ہے کہ

”مگر جواب تو درکنار، پنڈت جی نے اپنی راہ لی۔ شکر میں بیٹھ، یہ جاوہ جا“ ص ۷۷

حقیقت تو یہ ہے، کہ پنڈت جی کا ناقابل فہم گریز، اور سیدنا الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ کا اس کے مقابلہ میں تعاقب حیرت انگیز، دونوں ہی کی حقیقت ایک نعمہ کی سی معلوم ہوتی ہے۔ پنڈت جی کو سیدنا الامام الکبیر کی ملاقات خدا شناسی کے میلے میں ہو چکی تھی، بیان کر چکا ہوں کہ دونوں میں انفرادی طور پر گفتگو بھی ہوئی تھی، آپ نے پنڈت جی کو روک کر کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن پنڈت جی یہ کہتے ہوئے کہ ”اب بھوجن کا وقت آگیا ہے اب ہم سے کچھ نہیں ہو سکتا“ ص ۷۸ مباحثہ شاہ جہاں پور

کچھ بھی ہو، دونوں میں گو نہ شبناسائی بھی پیدا ہو چکی تھی، پھر میلے کے جلسوں میں حضرت دلا کی تقریر کے سننے کا کافی موقعہ بھی پنڈت جی کو مل چکا تھا، آپ کی علمی قابلیت کا اعتراف بھی جیسا کہ نقل

کر چکا ہوں۔ پنڈت جی کہ چکے تھے، آپ کی افتاد طبع، فطری نرم مزاجی صلح پسندی وغیرہ کے اندازہ کرنے کے لئے جن باتوں کی ضرورت تھی، جہاں تک میرا خیال ہے، ان کا مشاہدہ کئے، یا تجربہ بھی پنڈت جی کر چکے تھے، بایں ہمہ رڑکی میں سامنے آنے سے پنڈت جی کیوں گریز کرتے رہے، جیسے مرے لئے یہ سوال کچھ ناقابل حل سا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت دالا کے طرز عمل کی صحیح توجیہ سے اپنی آپ کو عاجز پاتا ہوں۔ صرف اعتراضوں کا جواب ہی دینا تھا تو اس میں شک نہیں، بہتر صورت تو یضرتھی کہ جیسے مجمع عام میں پنڈت جی نے اعتراضات کئے تھے، جوابات بھی اسی مجمع عام میں ان کو اور مجمع دالوں کو سنا دیے جاتے، لیکن جب اندازہ ہو گیا تھا کہ پنڈت جی اس پر راضی نہیں ہو رہے ہیں، تو اعتراض کے سننے والے مجمع کے سامنے جوابوں کی تقریر کافی ہو سکتی تھی، جیسا کہ بعد کو یہی کیا بھی گیا، خود ہی ارقام فرماتے ہیں کہ

”مجبور ہو کر یہ ٹھہرائی، کہ جو ان کے اعتراض سننے والوں سے سنے ہیں، ان کے جواب مجمع عام میں سنا دیں، مگر چونکہ یہ بات ایک جلسہ میں ممکن نہ تھی، اور ہم کو دربارہ توحید رسالت وغیرہ ضروریات دین (اسلام) بھی کچھ عرض کرنا تھا، اور بوجہ هجوم بارش و خرابی راہ و قرب رمضان شریف زیادہ ٹھہرنے کی گنجائش نہ تھی (اس لئے) ایک جلسہ میں تو ان تین اعتراضوں کے جواب سنا لئے جو سب میں شکل تھے اور دو جلسوں میں توحید و رسالت کا ذکر کر کے شب بے خوابی و سوم ماہ شعبان کو رڑکی سے روانہ ہوا، اور ایک دن منجھو اور تین دن دیوبند ٹھہر کر تائیسویں کو اسی قصیر رانہ میں جس کو نانوہ کہتے ہیں، اور اس خاکسار کا دطن بھی یہی ہے پہنچا“

حاصل جس کا یہی ہے کہ ”یہ جاوہ جا“ کا نابوس کن نظارہ پنڈت جی کی طرف سے جب پیش ہوا، اور یقین ہو گیا کہ مشافہہ ان سے مکالمہ کی کوئی صورت باقی نہ رہی، تو تین جلسوں میں رڑکی دالوں کو مخاطب بنا کر تقریریں کیں جن میں پنڈت جی کے اعتراضوں کے جوابات بھی دیئے گئے، جو دوسروں نے حضرت دالا سمک پہنچائے تھے۔ چونکہ پنڈت جی کے ان اعتراضوں کا چرچا رڑکی کے سوا دوسری جگہوں میں بھی

پھیلا ہوا تھا۔ خصوصاً جہاں جہاں پنڈت جی نے تقریریں کی تھیں۔ ان لوگوں تک جو ابوں کو بچانے کے لئے، اور شاید اس لئے بھی کہ کتابی صورت میں ممکن ہے کسی نہ کسی شکل میں پنڈت جی تک بھی ان کے اعتراضوں کے جوابات پہنچ جائیں۔ آپ نے اپنی کتاب قبلہ نما مرتب فرمائی جیسا کہ دیباچہ کے آخر میں فرماتے ہیں۔

”یہاں (ناغوتہ) اگر یہ چاہا کہ بنام خدا دوبارہ اعتراض پنڈت جی صاحب اپنے ارادہ ملکوں کو پورا کر دے، یعنی ان کے جوابوں کو لکھ کر نذر احباب کر دے، تاکہ اس نامہ میاہ کے حق میں دلائل کا ایک بہانہ ہاتھ آئے، اور خدا تعالیٰ کی عنایت اور رحمت و مغفرت کو اپنی کارگزاری کا موقع ملے، الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ نے میرا ارادہ پورا کیا، اور میری فہم نارسا کے اندازے کے موافق اعتراضات مذکورہ کے جوابات مجھ کو کھجائے۔“

اسی کے بعد پنڈت جی کے اعتراضات میں سے پہلے اعتراض کو بایں الفاظ نقل فرما کر یعنی، ”مسلمان ہندوؤں کو بت پرست کہتے ہیں، اور خود ایک مکان کو سجدہ کرتے ہیں جس میں بہت سے پتھر ہیں، جو مسلمان جواب دیتے ہیں، بعینہ بت پرست کہہ سکتے ہیں، اس لئے مسلمان بھی بت پرستوں سے کم نہیں۔“

مسجدِ نالام الکبیر نور اللہ علیہ تالیف انوار علومہ و معارفہ نے جواب میں حقائق و اسرار کے سرمہر گنجینوں کو وقف عام فرما دیا ہے، صرف اسی اعتراض کا جواب ”قبلہ نما“ کے نام سے شائع ہوا، جس کے مضامین پر بحث کرنے کا موقع یہاں نہیں ہے کتاب اردو زبان میں ہے پڑھنے والے چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں۔ پنڈت جی کے باقی اعتراضات کیا تھے، ان اعتراضوں کے جوابوں کو قلم بند کرنے کا موقع حضرت دالاکو ملایا نہ ملا اس کا پتہ نہ چل سکا۔ قبلہ نما کے دیباچہ کی مذکورہ بالا عبارت خصوصاً یہ ارقام فرما کر ”ان کے جوابوں کو لکھ کر نذر احباب کر دے“ آگے یہ اطلاع جو دی گئی ہے، کہ

”الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ نے میرے ارادہ کو پورا کیا“

نظاہر اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس اعتراض کے سوا پنڈت جی کے دوسرے اعتراضوں کا

جواب بھی زیرِ تحریر آچکا تھا، لیکن کسی وجہ سے وہ شائع نہ ہو سکا۔

مگر سچ یہ ہے کہ اسی ایک اعتراض کے جواب میں جو کچھ ارتقا م فرمایا گیا ہے۔ وہی بیسیوں اعتراضوں کے جواب کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، اسی سے اندازہ کیجئے کہ اعتراض جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، کل تین سطروں میں ختم ہو گیا، لیکن متوسط تقطیع کے ایک سو سولہ صفحات صرف اسی ایک اعتراض کے جواب میں اس لئے کافی ہوئے ہیں، کہ مطر میں حد سے زیادہ گنجان اور گھنی ہیں، ورنہ عام کتابت کے لحاظ سے جہاں تک میرا تخمینہ ہے کم از کم تین سو صفحات سے کم میں یہ کتاب ختم نہیں ہو سکتی تھی۔

بہر حال پنڈت جی کا مسلمانوں پر کعبہ پرستی، اور کعبہ کی دیواروں کے پتھروں کی پرستش و عبادت کا الزام بجائے خود اس کی نوعیت جو کچھ بھی ہو، ان کے علم و فضل، فکر و نظر کے متعلق جو رائے بھی اس اعتراض کے سننے والے قائم کریں، لیکن ہم تو پھر بھی سپاس گزار ہی ہیں، کہ ان ہی کے بھڑکائے ہوئے شر سے خیر کا دروازہ ہم پر کھل گیا۔ سیدنا الامام اکبر نے ان کی اسی مضحکہ خیز اناج کے جواب میں حقائق و معارف کے مخفی خزانوں کو قبلہ نما میں وقف عام فرما دیا، پس محرک اور باعث تو اس خیر کے پنڈت جی ہی ہوئے، ورنہ سچ یہ ہے کہ الکعبہ (یا اول المساجد) کی طرف رخ کر کے خانی کائنات کی عبادت

یہ جیسا کہ معلوم ہے، کہ مخلوقات نہیں، بلکہ خانی کائنات کی عبادت و پرستش کے لئے قرآن نے اطلاع دی ہے، کہ سب سے پہلا گھر وہی ہے جو کہ یعنی دادی کہ میں تعمیر ہوا، اسی لئے الکعبہ کو ہم اپنی سب سے پرانی مسجد سمجھتے ہیں، اس کی قدامت ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن میں البیت العتیق (پیرانا گھر) کے نام سے بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ الغرض اپنی سب سے پہلی تاریخی مسجد کو مرکز بنا کر دنیا کے جس حصہ میں مسلمان پائے جاتے ہیں، اسی کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھا کرتے ہیں۔ اسی لئے حدیثوں میں آیا ہے کہ جعلت لی الارض مساجد (زمین کا سارا کرہ ہی میری مسجد ہوا ہے)، یعنی الکعبہ کی مرکزی مسجد کا صحیح بیس طراض کو قرار دے کر نماز کا جہاں وقت آجاتا ہے ہم اپنی اس پرانی مسجد کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیتے ہیں، یا زمین کے کبے پر جہاں کہیں مقامی مسجد بنائے ہیں اس کو مرکز سے مربوط کرنے کے لئے رخ اس مسجد کا الکعبہ ہی کی طرف کرتے ہیں، اپنی عبادت میں مسلمان اسی لئے مشرق و مغرب و شمال و جنوب وغیرہ سمت کے پابند نہیں ہیں۔ ہندوستان والے مغرب کی طرف رخ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے حساب سے یہ پرانی مسجد مغربی سمت میں واقع ہوئی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جہاں کے مسلمانوں کے لحاظ سے جس سمت پر بھی یہ پرانی مسجد واقع ہوئی ہے اسی طرف نمازیں ان کا رخ ہوتا ہے خود الکعبہ کی باقی ماندگی صفحہ ۱

جو مسلمان کرتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر اگر واقعی پنڈت جی اس مغالطہ میں مبتلا ہو گئے، کہ مسلمان کعبہ اور کعبہ کی دیواروں کو پوجتے ہیں، تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، کہ اسلامی تعلیمات کی ابتدائی اور عام بنیادی معلومات سے واقفیت حاصل کئے بغیر اسلام پر تنقید کرنے کے لئے وہ آمادہ ہو گئے تھے، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ مسجدوں میں مسلمانوں کو نمازیں پڑھتے ہوئے دیکھ کر آج تک کسی عامی سر عامی ناخواندہ ہندو کو بھی اس کا شبہ نہیں ہوتا کہ مسجد کی دیوار یا دیوار کی اینٹوں کو مسلمان پوجتے ہیں، یا کھیتوں، میدانوں میں ان کی نمازدن کو دیکھ کر آج تک کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہوتی کہ سامنے کی ہوا، یا درخت پہاڑ وغیرہ جو نظر آتے ہیں، ان کی مسلمان عبادت کرتے ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ پنڈت جی جیسی آدمی کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آئی۔ سیدنا الامام الکبیر نے صحیح ارشاد فرمایا ہے کہ

”اگر خود پنڈت جی کو ایسی باتوں میں فرق کرنا نہیں آتا، تو یہ شہرہ کمال کس خیال پر مبنی ہے؟“

حق تو یہ ہے، کہ اسلامی دین سے اتنی نادانیت کا اقتاب بھی پنڈت جی کی طرف مشکل ہے، اور نہ اتنی سبک مغزی، خوابیدہ دماغی، کی ان سے توقع ہو سکتی ہے، جسے ایک جاہل اور ناخواندہ آدمی کی طرف منسوب کرنے کی بھی ہم جرات نہیں کر سکتے۔

بلکہ پنڈت جی کی ذہانت مشابہشی اور داد کی مستحق ہے کہ جاہلیت و شرک، دبت پرستی کے تاریک ایام میں بھی سب کچھ پوج ڈالنے کے باوجود عرب کے جاہلوں کے دلوں میں بھی کعبہ اور ان پتھروں کی عبادت کا خطرہ نہ پیدا ہوا، جن سے اس عمارت کی تعمیر ہوئی تھی۔ ان اصنام اور بتوں یا مورتیوں کو تو وہ ضرور پوجتے تھے، جنہیں چہالت کے ان ایام میں کعبہ کے اندر انہوں نے داخل کر دیا تھا، لیکن جس عمارت میں ان کے یہ بت رکھے ہوئے تھے، اس کو قطعاً انہوں نے نہ کبھی پوجا اور نہ اپنا معبود سمجھا، اور وہی کیا دنیا کی بت پرست قوموں نے شاید ان مسندوں اور شوالوں یا بتخانوں کی

رہسہ صفحہ گذشتہ عمارت کا براہ راست سامنے ہونا بھی ضروری نہیں ہے، بلکہ تعمیری ضرورت یا کسی اور وجہ سے کعبہ کی یہ پرانی مسجد شہید بھی ہو جائے جب بھی نمازوں میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔ تفصیل کے لئے قبلہ نما مطالعہ کرنا چاہئے۔ ۱۲

عمارتوں کو کبھی نہیں پوجا، اور نہ معبود بنایا، جن میں اپنے بتوں کو وہ بٹھاتے تھے، یا آج تک بٹھا
 ہیں۔ گویا انسانی تاریخ میں پنڈت جی پہلے آدمی ہیں، جن کے سینے میں کسی معبد کی عمارت کی معبودیت
 کا انوکھا خیال جلوہ گر ہوا، اور اپنے دل کے اسی خود آفریدہ خیال کو غریب مسلمانوں کے سرانہوں نے
 منڈھ دیا، جیسے ان کا یہ ذہنی اشتغال بے نظیر ہے، اسی طرح بلکہ شاید اس تو بھی کچھ زائد ہی ان کی یہ دیدہ
 دلیری اپنی آپ مثال ہے کہ منڈھنے کے لئے کسی اور قوم کا نہیں، بلکہ مسلمانوں ہی کا سران کو موزوں نظر
 آیا، کچھ بھی ہو، پنڈت جی کو اتنا بھولا بھالا، سیدھا سادھا انجان یا طفل نادان کیسے مان لیا جائے کہ
 واقع میں کعبہ کو وہ مسلمانوں کا معبود سمجھتے تھے، پس صحیح بات وہی معلوم ہوتی ہے جس کی طرف اشارہ
 کرتے ہوئے سیدنا الامام الکبیر نے اقام فرمایا ہے کہ

”اگر دیدہ و دانستہ یہ حال ہے، تو پھر کچھ اور احتمال ہے، میں کیا عرض کروں، عاقلان
 خودی دانستہ“

میں تو حضرت والا کے ان الفاظ میں حد سے زیادہ اجمال دیکھتا تھا کہ وہ ان محل الفاظ میں کچھ کہنا چاہتے تھے،
 مگر مصلحتاً قلم روک لیا گیا، تاہم آخر میں

”عاقلان خودی دانستہ“

کا جو فقرہ بے ساختہ قلم مبارک سے نکل گیا ہے، مجھے تو اس میں کچھ الہام کا رنگ نظر آتا ہے، جس
 احتمال کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، قطعاً اپنے اصلی رنگ روپ میں اس وقت تک سامنے نہیں
 آسکتا، جب تک عقل انسانی ابھارے ہوئے جذبات کے بھیاروں کے نیچے دبی رہے گی۔

ہاں چھوڑے جذبات کے بھیاروں کی گندگی سے ملک کے باشندوں کی عقلیت جب
 پاک ہو کر آزاد ہوگی، اور کبھی نہ کبھی تو بہر حال یہ ہو کر رہے گا، آج ہو، یا کل، تب صحیح قیامت
 حضرت والا کے الفاظ

”عاقلان خودی دانستہ“

کی پہچانی جائے گی، ورنہ اس وقت ہم جس حال میں ہیں، ملک کے اچھے اچھوں کو سعدی کے اس

مشہور شاعر

چراغے کہ بیوہ زلے نے بر فروخت

بسے دیدہ باشی کہ عالم بسوخت

کا مطلب سمجھنا آسان نہیں ہے، مگر تاریخ گواہ ہے، کہ کسی بڑھی بیوہ عورت کے چلائے ہوئے

لے ہائے بے چارے برج لال عت کا وہ فوج کہئے یا بین، جس میں رونے والے نے یہ کہہ کہہ کر خود دیا اور

دوسروں کو دلا یا ہے۔

ہوئے پنجاب کے ٹکڑے ہوئے بنگال کے ٹکڑے
گرے کٹ کر کہیں ماں کے کہیں اطفال کے ٹکڑے
سحر آئی وطن میں ظلمتیں لے کر سگر آئی

یہی وہی ہے، ہوئے بنگال کے ٹکڑے
اڑے تہذیب آدم کے نہرے جال کے ٹکڑے
یہی وہی دن ہے جب اغیار کی امید برآئی

اور اسی کے بعد بے چارے کی یہ کراہ

دلوں میں جاگ اٹھی نفرت بھی دیرینہ عداوت بھی
وہ حشر اٹھا کہ اب تک رعبی، آدمیت بھی
جو اپنے وقت کے قاروں تھے بے زہر گڑے

یہی وہی دن ہے جس کے ساتھ ہی آئی قیامت بھی
نہ کام آئی ہزاروں سال کی آپس میں الفت بھی
جو اوانوں میں رہتے تھے وہ گھر پر گئے سارے

ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ جب خالص عقلی تنقید کی روشنی میں کیا جائے گا تب عقل والے جانیں گے ان
باتوں کو جنہیں آج ہم شاید سن بھی نہیں سکتے، یہ مسئلہ کافی طویل و تفصیل طلب ہے۔ ہندوستان کی سیاسی
تاریخ سے پنڈت جی کا بھی کچھ تعلق ہے، پہلے تو اسی کا سراغ لگانا پڑے گا۔ پھر پنڈت جی کی خود نوشتہ
اور دوسروں کی لکھی ہوئی انگریزی ہندی اردو زبانوں کی سوانح عمریوں سے پنڈت جی کے فطری رجحانات
کا پتہ چلانا، جب مشیومت اور مشنومت کے چکر میں تھے، اس وقت جے پور، ہینچکرادھم، چاننا، وشنومت
کی توہین و تحقیر میں اتنا غلو کہ راجہ صاحب جے پور کے اعلیٰ کے گھوڑوں کے گلے میں بھی شیبہ مت کی
نشانی پر دکھائی کی مالائیں ڈلو اتے پھرتے تھے۔ اس سلسلہ میں پنڈت جی کا انگریزوں کے بڑے بڑے
عہدہ داروں مثلاً گورنر، ڈپٹی کمشنر وغیرہ سے ملاقات کر کے اس خیال میں امداد طلب کرنا کہ جھوٹے متوں
(یعنی وشنومت کے سوا سارے متوں اور پنچھوں) کو مٹانا چاہئے، یہ حال تو ابتداء میں تھا، پھر جب
ہندو مذہب کے مختلف فرقوں کے دائرے سے باہر نکل کر میدان میں آئے اداس کے بعد انہوں نے جو کچھ لکھا جو کچھ
بولے اس کا حاصل یہی تھا کہ جس مت کو پنڈت جی نے آریہ سماج کے نام سے قائم کیا ہے، اس کے سوا کسی مت یا
مذہب کے ماننے والے کو جینے کا حق نہیں ہے، خواہ وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، عیسائی ہو، سکھ ہو، یہ ایسی عام باتیں ہیں
جو پنڈت جی کی سوانح عمریوں بلکہ خود نوشتہ تصنیفوں میں بھری ہوئی ہیں ۱۲

مٹی کے دیا سے شہر کا شہر خاک سیاہ ہو کر رہ گیا۔

بہر حال جس "احتال" کے سمجھنے کے لئے عاقلوں کی ضرورت سیدنا الامام الٰہکبیر نے محسوس کی ہے، یہ ایسی ضرورت ہے کہ جب تک صحیح معنوں میں عقل اپنی جگہ واپس نہیں ہوتی، لاکھ سمجھانے کی کوشش کی جائے لوگ اسے سمجھ نہیں سکتے، اور تو اور ایسے سنجیدہ دل و دماغ والے لوگ جیسے لالہ لاجپت رائے تھے، ان تک کا خیال یہ ہو کر

"سودیشی اور نان کو آپریشن کے اصول مہاتما گاندھی کے میدان عمل میں آنے سے بہت پہلے سوامی دیانند سے سیکھے تھے" دیانند اور ان کی تعلیم ۱۳۱۱ بھو راخبار بندے ماترم مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۲۱ء

گویا گاندھی جی کی تحریک کا رشتہ الٰہ جی کے نزدیک پنڈت جی کے دل و دماغ سے ملا ہوا تھا اسی طرح گردل کانگریسی کے سابق پرنسپل پروفیسر رام دیو بی۔ اے جن سے ملاقات کا موقع فقیر کو بھی ملا تھا وہ بھی صاف صاف لفظوں میں لکھتے ہوں کہ

"مہاتما گاندھی تو سوامی جی کی پولیٹیکل فلاسفی کو صرف عملی صورت دے رہے ہیں" (اخبار جیون تو مورخہ ۷ فروری ۱۹۲۲ء)

در حالیکہ گاندھی جی اپنے بعض مضامین میں یہ لکھ کر چھاپ چکے ہیں کہ ستیا رتھ پرکاش میں گندگی اچھالنے کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ یہ وہی مثل ہوئی کہ مدعی سست گواہ چست۔ محمد طیب غفرلہ، جہاں یہ اور اسی قسم کی باتیں سمجھی اور سمجھائی جاتی ہوں، وہاں غریب عقل کے لئے راہ پانے کی امید ہی کیا کی جاسکتی ہے۔

پس مناسب یہی ہے کہ آئے والے عاقلوں کا انتظار کرتے ہوئے ہم بھی اس داستان کو سر بہر چھوڑ کر دوسرے مسئلہ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پنڈت جی سے براہ راست مکالمہ اور مخاطبہ کے مواقع کی تلاش میں سیدنا الامام الٰہکبیر کے حد سے گزرے ہوئے اصرار کی یہ توجیہ کہ مسلمان کعبہ کے معبد اور مسجد کو

نہیں پوچھتے، پنڈت جی کے ذہن نشین ادھماٹل کے ساتھ خصوصیت سے اسی مسئلہ کو کرنا چاہتے تھے، اور صرف اتنی سی بات سمجھانے کے لئے مرض وضعف کی حالت میں پندرہ سولہ دن تک رڑکی میں آپ ٹھہرے رہے، اس راہ میں پنڈت جی کی اینڈی بینڈی شرطوں کو مسلسل تسلیم کرتے چلے گئے تا آنکہ آپ کی فطرت کے لحاظ سے آج بھی ہم جس کا تصور نہیں کر سکتے۔ یعنی اسی سلسلہ میں انگریز حاکم کی کوٹھی تک پہنچے، اور قیام اس کے سلسلہ میں امداد کے طالب ہوئے، خود سوچنا چاہئے کہ کس حد تک قرین عقل و قیاس توجیہ ہو سکتی ہے، یہی نہیں بلکہ پنڈت جی کی طرف سے ”یہ جاہ جا“ کا تماشا جب پیش آیا، یعنی شکرم میں بیٹھ کر رڑکی سے روانہ ہو گئے۔ اور اس کے بعد آپ کو بھی مجبوراً رڑکی چھوڑنی پڑی۔ اسی کا ذکر فرماتے ہوئے یہ جو ارقام فرمایا گیا ہے۔

”بوجہ ہجوم بارش، و خرابی راہ و قرب رمضان شریف زیادہ ٹھہرنے کی گنجائش نہ تھی۔“ ۳

بظاہر ان الفاظ سے بھی سمجھ میں آتا ہے، کہ یہ وقتی رکاوٹیں اگر پیش نہ آجاتیں، تو آپ کے قیام کی مدت شاید اور بھی زیادہ دراز ہو جاتی۔ قبلہ نماہی کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ ابتداء ماہ شعبان میں آپ رڑکی پہنچے تھے، اسی کتاب میں یہ اطلاع آپ نے دی ہے کہ

”بست دسوم ماہ شعبان کو رڑکی سے روانہ ہوا۔“

گویا کم و بیش یہی سمجھنا چاہئے کہ ماہ شعبان کا اکثر و بیشتر حصہ رڑکی ہی میں گزرا، اور موانع نہ پیش آجاتے خصوصاً قیام و سیام کا مہینہ رمضان سر پر نہ ہوتا، تو کون کہہ سکتا ہے، کہ پنڈت جی کے تعاقب کا یہ سلسلہ کہاں تک پہنچتا، اور پہنچا کیا معنی؟ ”جواب ترکی بہ ترکی“ میں جن واقعات کی طرف اجمالی اشارے کئے گئے ہیں، افسوس ہے کہ تفصیلات کا تو ان کے علم نہ ہو سکا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد مقامات میں اس قسم کے فترتوں کے ساتھ مثلاً

”پنڈت جی بھاگتے پھرتے ہیں، اور مولوی صاحب (سیدنا الامام البکیر) ان کے

پچھے پچھے ہیں۔“ ۵۹

یاد دسرے موقع پر اس مشہور شعر کو درج کرتے ہوئے، یعنی

ہم وہ نہیں کرتے جو کہیں اُردہ کہیں ہوں میں

میں ہوں تمہارا سایہ جہاں تم وہیں ہوں میں

حضرت والا کی طرف سے پنڈت جی کو خطاب کر کے لکھا ہے کہ

”غرض جس چال آپ چلتے ہیں، ہم بھی ساتھ ہی پیچھے چلے آتے ہیں۔“ ۳۵

اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ عام پتھکنڈاز زیادہ تر مسلسل تعاقب کے ان مواقع میں پنڈت جی کی طرف سے جو استعمال ہوتا تھا، وہ وہی فساد اور ہنگامہ کے اندیشہ کا تھا، اسی کتاب جو اب ترکیہ ترکی میں جس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”فساد کا وقت تو وہ تھا کہ پنڈت جی مجمع عام میں جی کھول کر مسلمانوں پر اعتراض کرتے تھے۔“ ۳۶

اور زیادہ تر یہی صورت پنڈت جی نے اختیار کر رکھی تھی، لیکن سیدنا الامام اَلْکبیر جب ان سے براہِ راست گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے تھے، رڈکی میں آپ سن چکے کہ علاقہ کا انگریز مجسٹریٹ امن و امان کی ضمانت دے رہا تھا، پھر رڈکی میں بھی انگریزوں کی فوجی چھاؤنی تھی، یہی حال میرٹھ کا بھی تھا، ان ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی کتاب میں لکھا ہے کہ

”تو کو الیاں کنسٹبل بکثرت سالہ بلٹن، پیجمنٹ لال کرتی موجود، اس پر بھی پنڈت جی کو خوف ہو۔“

انگریزوں کے جلال و جبروت کی قوتوں سے اس زمانہ میں سارا ہندوستانی کانپ رہا تھا بقول مصنف کتاب کے

”فرماں روا اُے لاہور، اور بادشاہ لکھنؤ، راہا اُے بڑودہ، اور کابل تو سرکار (انگریزی) سے منہ ملا ہی نہ سکیں۔“

آگے اسی کے بعد ان ہی کے الفاظ میں

”فساد کرینگے تو کوئی؟ مولوی محمد قاسم صاحب جو مطبوعوں کی مزدوریاں کر کر اپنا پیٹ پالیں۔“ ۳۶

اسی کے ساتھ ان ہی کی یہ بات کتنی صحیح ہے، کہ

”علامہ بریں اگر فساد ہوتا تو اول مولوی محمد قاسم اور ان کے ہوا خواہ گرفتار ہوتے، پنڈت جی کو

اتنا ہی کافی تھا کہ ہم تو پہلے کہیں تھے،“

حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں کو جب ہم سہ جتے ہیں، تو قسمت کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ پنڈت جی سیدنا الامام الکبیر سے مل کر گفتگو اور بات چیت کرنے سے کیوں کتراتے رہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ملنے کے بعد دونوں کے درمیان کن کن مسائل کا ذکر آسکتا تھا۔ آخر ڈکی ہی میں دیکھنے والوں نے اسی زمانہ میں جب دیکھا تھا، حکیم الامت تھانوی قدس اللہ سرہ اس ردایت کے راوی ہیں کہ رڈکی کا وہی انگریز مجسٹریٹ جس نے حضرت دالاکو بلا کر ملاقات کی تھی، اور امن وامان کی ضمانت لی تھی، انیسویں صدی کا اسی انگریز نے اس وقت جو انگریزی قوم کے الحاد اور بے دینی کا گویا عہد شباب تھا، اسی نے باتوں باتوں میں سیدنا الامام الکبیر سے

”بارش کی کمی کی وجہ پوچھی“

حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ جواب میں

”مولانا نے دلائل عقلیہ سے ثابت کر دیا، کہ گناہ سبب ہیں کمی بارش کے“

یہاں تک تو خیر کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر تعجب ہو، لیکن آگے حضرت تھانوی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

”وہ (یعنی انگریز مجسٹریٹ) بہت ہی مخلوط ہوا، اور مولانا کے علم کا قائل ہو گیا، اور بہت

اچھی طرح پیش آیا“ قصص الاکابر الہادی ص ۵۸ ماہ جادی الاولیٰ

ہم جب اس خبر کو پڑھتے ہیں، تو خیال گذرتا ہے، کہ انیسویں صدی میں جب ایک انگریز کو سیدنا الامام الکبیر سے سمجھا سکتے تھے کہ بارش کی قلت اور قحط خدا کی نافرمانیوں کا نتیجہ ہے۔ آپ کے علمی احترام کی وجہ آپ کی یہی تقریر سن سکتی تھی، تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ پنڈت جی سے براہ راست گفتگو کرنے کی کوشش میں سیدنا الامام الکبیر اگر کامیاب ہو جاتے تو آپ کے خیالات و احساسات سے پنڈت جی

بھی متاثر نہ ہوتے، اور جو رنگ ان پر چڑھا ہوا تھا، یا چڑھایا گیا تھا، ازالہ نہ بھی، شدت اور تیزی میں اس کے کچھ کمی نہ ہو جاتی،

لیکن جو واقعہ پیش ہی نہ آیا، اب اس کے ثمرات و نتائج کے متعلق کیا سوچا جائے۔ بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ آئندہ ہندوستانی تاریخ میں ثریا تک جو دیوار اس لئے کج ہوتی چلی گئی، کہ پہلے ہی اینٹ ہی اینٹ کی کج رکھی گئی، شاید اس کی کجی اس حد تک نہ پہنچتی، کہ بالآخر اپنے اوپر وہ خود گر پڑی گھر کے چراغ ہی سے گھر میں آگ لگ گئی، پرانا قدیم تجربہ ہے کہ سلائی سے جس جھرنے کے منہ کو بند کرنا ممکن تھا، جب جاری ہونے کیلئے وہی کھلا چھوڑ دیا گیا تو

”جو پرشد نشاء گد مشتن بہ پیل“

ہاتھیوں سے بھی دیکھا گیا ہے کہ اس کی رو کو روکنا نامکن نظر آ رہا ہے۔

آخر یہی انگریز مجسٹریٹ تو تھا، عرض کر چکا ہوں، کہ حضرت والا اور آپ کے رفقاء کی طرف سے ابتدائی احساس اسی کے دل میں بقول حضرت تھانویؒ یہ پیدا ہوا تھا کہ

۱۔ پہلے بھی کچھ اشارے کر چکا ہوں کہ ایک بڑے طبقہ کا جس میں ہندوستان کے اچھے لکھے پڑھے تعلیم یافتہ لوگ شریک ہیں۔ خیال تھا کہ ہندوستان میں سیاسی جدوجہد کی ابتداء پنڈت دیانند سرسوتی جی نے کی۔ پروفیسر رام دیو بی۔ اے تو ہندوستان کی پولیٹیکل سیداری کا جنم داتا، اور بانی مابانی پنڈت جی کو کہا کرتے تھے، (دیکھو اخبار جیون تنو مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۲۲ء) ڈاکٹر ستیہ پال کی تقریر لاہور کے انگریزی اخبار ٹریبون میں چھپی تھی۔ اس میں انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ جو محبان وطن اس سرزمین (ہند) میں کبھی پیدا ہوئے ان میں سب سے بڑے محب وطن رشی دیانند تھے (اخبار مذکور مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۲۵ء) ایسے کلنڈر بھی شائع ہوتے رہے جن میں ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کے بانی اول کی حیثیت سے پنڈت جی ہی کی تصویر کو سب سے اونچی جگہ دی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں کچھ فرط عقیدت کو بھی دخل ہو۔ لیکن بعض وجوہ سے کلیتہً اس قسم کے دعوؤں کو بے بنیاد ٹھیکرانا بھی شاید درست ہو گا۔ جس کی تفصیل کا موقع میری اس کتاب میں نہیں ہے۔ مناسب ہو گا کہ اس کے لئے وہی کتاب سوامی دیانند اور ان کی تعلیم کا مطالعہ کیا جائے۔ مندرجہ بالا اقتباسات اسی کتاب سے نقل کئے گئے ہیں۔ ۱۲

۵ خشت اول چوں ہند معمار کج

تاثریامی رود دیوار کج

”دعوت خورے آئے ہوں گے“

لیکن ملنے اور باہم بات چیت کرنے کے بعد ان ہی سے آپ سن چکے کہ

”مولنا کے علم کا قائل ہوا، اور بہت اچھی طرح پیش آیا“

جب ایک انگریز جو غیر ملک، غیر قوم کا رہنے والا تھا، ہندوستان کی زبان بھی پوری طرح سمجھ نہیں سکتا

جب اس میں اس انقلاب کا مشاہدہ کیا گیا تھا تو پنڈت جی بہر حال اپنے گھر کے آدمی تھے۔ سیدنا

الامام الکبیر سے ملاقات اور گفتگو کے بعد ان کے احساسات میں کسی تبدیلی کی توقع بے معنی توقع

کیوں قرار دی جاسکتی ہے، لیکن ماقدالہ فسوف یکون

سچ تو یہ ہے، کہ اپنی حد تک سیدنا الامام الکبیر جو کچھ کر سکتے تھے، کوشش کا کوئی دقیقہ آپ

نے اٹھا نہیں رکھا، بلکہ کہنے والا چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ کی زندگی کا آخری حصہ شاید اسی کوشش

میں صرف ہوا

ذرا سوچئے تو سہی، رڑکی کا واقعہ تو خیر وفات سے تقریباً دو سال پہلے کا ہے، لیکن رڑکی کے

بعد پنڈت جی کے تعاقب کے سلسلہ میں میرٹھ کی جس سرگذشت کی طرف کتاب جواب نرکی بہ ترکی

میں بایں الفاظ اشارہ کیا گیا ہے کہ

”مولوی محمد قاسم صاحب نے پنڈت جی کو میرٹھ سے بھگا کر کہیں کا کہیں

پہنچایا“ ۳

اسی کی اطلاع ان الفاظ میں دیتے ہوئے کہ

”پھر پنڈت دیانند کہیں پھر پھر اگر میرٹھ پہنچے، اور وہاں بھی ان کے وہی

دعوے تھے“

مصنف امام نے آگے یہ خبر دی ہے کہ

”ہر چند مرض کے بقیہ، اور ضعف کے سبب قوت نہ تھی، مگر ہمت کر کے

(میرٹھ) پہنچے“

اور حسب دستور براہ راست مکالمہ اور گفتگو کے لئے آپ جو کچھ کر سکتے تھے کرتے رہے
لیکن بقول مصنف امام

”وہ (پنڈت جی) بہانہ جھیل کر کے وہاں سے کافور ہو گیا۔“

اگرچہ صحیح طور پر میسر ٹھ کے اس واقعہ کی تاریخ کا علم نہ ہو سکا، لیکن مصنف امام نے
اسی کے بعد بیان کیا ہے کہ اسی زمانہ میں کتاب ”جواب ترکی بہ ترکی“ خاص لب و لہجہ میں اس
لئے لکھی گئی، کہ

”پنڈت کے بعض معتقدوں نے کچھ تحریریں جواب مولانا

(نانوتوی) بے سرو پا لکھی تھی، اور کچھ ادت پٹانگ مسلمانوں

کے مذہب پر اعتراض کئے تھے، یہ رسالہ اسی کے

جواب میں ہے۔“

پہلے بھی نقل کر چکا ہوں، کہ سیدنا الامام الکبیر کے تلمیذ سعید مولانا عبد العلی
صاحب مرحوم کی طرف کتاب کی تالیف منسوب ہے۔ اگرچہ علمی افادات اس کے خود
حضرت والا کے ہیں۔

بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب ”جواب ترکی بہ ترکی“ تقریباً اسی زمانہ میں
لکھی گئی کہ جب میسر ٹھ میں پنڈت جی سے گفتگو کرنے کی کوشش سیدنا الامام الکبیر
کی طرف سے جاری تھی، اب ہم دیکھتے ہیں جیسا کہ اسی کتاب کے آخر میں لکھا ہے۔

”نویں رمضان شریف ۱۲۹۶ھ کو لکھنا شروع کیا تھا، اور

بمحمد الشہ ۲۱ ماہ مذکور بروز سہ شنبہ ختم کیا۔“ ۵۹

جس کا مطلب یہی ہوا کہ سیدنا الامام الکبیر کی وفات کی تاریخ ۴ جمادی الاول ۱۲۹۵ھ
سے کم و بیش چھ سات مہینے پہلے یہ کتاب ختم ہوئی، گو یا اس بنیاد پر سمجھنا چاہئے کہ
میسر ٹھ میں پنڈت جی کے تعاقب میں آپ کی تشریف آوری بحالت مرض و تقاہت تقریباً

اسی زمانہ میں ہوئی۔ پھر اسی کتاب میں پنڈت جی کے نام یہ چیلنج بھی ملتا ہے، یعنی لالہ اسدلال جن کے مضمون کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ ان ہی کو مخاطب کر کے لکھا گیا تھا کہ

”آپ پنڈت جی سے کہہ دیجئے، ہزار منتیں کرو گے، تب بھی مباحثہ کی طرح مباحثہ پر مولوی محمد قاسم صاحب کے مقابلہ میں آمادہ ہو جائیں تو ہم جھوٹے تم سچے“ ۳

جیسا کہ معلوم ہے، پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں، کتاب ”جواب ترکی بہ ترکی“ لفظی حیثیت سے سیدنا الامام الکبیر کی تصنیف نہ ہو، لیکن معنًا آپ ہی کی تصنیفات میں یہ کتاب شمار ہوتی ہے، کم از کم اتنی بات تو بہر حال مسلم ہے، خود لوح کتاب پر بھی لکھا ہوا ہے، سیدنا الامام الکبیر کے ایسا، سے یہ کتاب لکھی گئی، ایسی صورت میں نہ کورہ بالا چیلنج کے متعلق اگر یہ سمجھا جائے کہ پنڈت جی کے نام سیدنا الامام الکبیر ہی کی طرف سے یہ چیلنج تھا تو اس کے سوا آخر اور کیا سمجھائے۔

اور یہی میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرٹھ کے تعاقب کا قصہ اگر دفات سے چھ سات مہینے پہلے پیش آیا تھا تو ای پر قصہ ختم کہاں ہوا تھا، بلکہ اسکے بعد بھی پنڈت جی سے بلا واسطہ برلہ راست مباحثہ و مکالمہ کی کوششوں کا سلسلہ جاری ہی رہا، تا انیکہ دل کی حسرت سیدنا الامام الکبیر نور الشرفہ کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔

حق تو یہ ہے کہ ”عاقلانہ“ داند کے الفاظ سے پنڈت جی کے طرز عمل کے جس پہلو کی طرف حضرت والا نے اشارہ کیا ہے، اگر کسی کی سمجھ میں آیا ہو، یا نہ آیا ہو، لیکن خود ان کی عقل و دانش سے پنڈت جی کے طریقہ کار کا یہ پہلو کیسے مخفی رہ سکتا تھا، اور اس سے واقف ہونے کے بعد حساس دلوں میں قلق اور بے چینی، اضطراب اور بے کلی کی جو کیفیت بھی پیدا ہو، تو اسے پیدا ہی ہونا چاہئے۔

۱۵ اور تو اور لالہ لاجپت رائے جیسے لوگوں نے کہا ہے کہ لاہور میں دیانند اینگلو ویدک کے نام سے جو کالج قائم کیا گیا تھا، گو ویدک کا لغو اس کے آخر میں بڑھا دیا گیا تھا جس سے نظارہ عام پر یہ اثر ڈالا جاتا تھا کہ ویدک دھرم کی تعلیم کا خاص اہتمام اس کالج میں کیا گیا ہے لیکن یہ بیان کرتے ہوئے کہ اگر یہ بالڈی امین ریخی وغیرہ یورپ کے مشہور سیاسی خطیبوں کی (باقی اگلے صفحہ پر)

کہنے والوں سے میں نے جو یہ سنا ہے، کہ بالآخر یہی قصہ عالم اسباب میں میدان الامام الکبیر کے لئے جان لیوا ثابت ہوا، تو اس پر کم از کم مجھے تو تعجب نہ ہوا۔ بہر حال ہم تو مؤمن ہیں۔ ظاہر اسباب خواہ کچھ ہی ہو، لیکن ہم سے منزیا گیا ہے، اور اسی کو ہم مانتے ہیں کہ

ماکان لنفس ان تموت الاباذن | ماکان لنفس ان تموت الاباذن
اللہ کتاب مؤجلہ | اللہ کتاب مؤجلہ

ایک کم پچاس یعنی (۴۹) سال کی نوشتہ عمر کے ساتھ زمین کے اس خاک کے پروردگار امام الکبیر بھیجے گئے تھے اور اسی کتاب مؤجلہ کے مطابق جس کے حکم سے آئے تھے، اسی کے اذن سے ”الحیۃ الدنیا“ (یست زندگی) کو چھوڑ کر خیر و البقی دلی زندگی سے سرفراز ہوئے، بلکہ جس ظاہری سبب کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، اس کے ماننے کی گنجائش بھی ایمان ہی کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے، لیکن صحیح طور پر تفصیلات ہی کا علم نہ ہو سکا، اور نہ کوئی کتابی شہادت ہی اس سلسلہ میں مجھے مل سکی۔ مگر ذکر کرنے والے جو نکتہ کبھی کبھی اس کا ذکر کرتے ہیں،

(گذشتہ صفحہ سے) سوانح عمروں اور کارناموں سے طلبہ میں سیاسی ذہنیت کو ابھارا جاتا تھا۔ لادجی لکھتے ہیں کہ
ویانند دیک کا لچ کے حسابات کی جانچ پڑتال اگر کی جائے تو یہ بات معلوم ہوگی
کہ اس کے کل اخراجات کا سوال حصہ بھی مذہبی تعلیم یا دیک تعلیم کی اشاعت کے لئے
خرچ نہیں ہوتا۔ (اخبار ہندے ماترم مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۲۱ء)

جس کا مطلب یہی ہے، کہ سیاسی کامیابیوں کے لئے مذہب کے نام کو استعمال کیا جاتا تھا، اور جس قسم کی سیاست پنڈت جی کے پیش نظر تھی۔ علاوہ ان کی کتابوں، امدان کے پیر و کاروں کی شہادتوں کے اس کا تماشا متھرا میں خود اس ملک کے ان ہندوؤں نے کیا، جو آریہ سماجی خیالات نہیں رکھتے تھے۔ شتابدی کے نام سے پنڈت جی کی صد سالہ برسی متھرا میں ۱۹۲۵ء میں منائی گئی تھی۔ اخباروں میں شائع ہوا تھا کہ پنڈت جی کے ماننے والے متھرا پہنچ کر بجلتے تھے۔ لاٹھیاں لے کر سندھوں میں زبردستی گھستے تھے، دیواروں پر دیانند جی کی جے لکھتے تھے، کرشن کی مورتی پر تاج رکھا ہوا تھا، جسے لاٹھی سے ڈھکیل دیا گیا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے سوامی دیانند جی اور ان کی تعلیم ملک) باوجود ہندو نام سے موسوم ہونے کے جب ان کی درگت یہ بنائی گئی، تو اس ملک کے جو باشندے ہند نہیں ہیں ان بیچاروں کی خودی سوچئے، اس قسم کی تنگ ذہنیت میں کتنی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ ۱۲

اس لئے اجالی اشارہ اس کتاب میں بھی اس کی طرف مناسب معلوم ہوا۔

اب ہم اس قصہ کو ختم کرتے ہیں، ادھر ادھر سے معلومات جو کچھ بھی اس سلسلہ میں فراہم ہو سکیں وہ پیش کر دی گئیں، کچھ طول بیانی سے کام ضرور لینا پڑا، جس کی ضرورت اس لئے تھی، کہ عام طور پر اس قصہ کو سیدنا الامام الکبیر کی زندگی، اور زندگی کے کارناموں میں وہ اہمیت نہیں دی گئی، جس کا وہ واقعی مستحق تھا، میں خیال کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا شہادتوں کی روشنی میں انشاء اللہ واقعہ کی اصل حقیقت سامنے آجائے گی اور جیسا کہ غرض کر چکا ہوں آپ کی حیات طیبہ کی آخری منزل سچ پوچھتے تو اسی قصہ پر ختم ہوئی، اور عین ان ہی دنوں میں جب اس راہ میں آپ کی جدو جہد کا سلسلہ جاری تھا، کتاب "موجل" کی رو سے آپ کا وقت ہو چکا تھا، اور اب درو کی اسی داستان میں ہم مشغول ہوتے ہیں جس کے ذکر کا وعدہ ذاتی جملات کو ختم کرتے ہوئے کیا گیا تھا۔

ربیع الاول سوانح قاسمی جلد ثانی تمام ہوئی

اب براہ راست حضرت والا کے فضیلت فرزند سعید مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم سے خاکسار نے یہ روایت کی ہے، کہ مرض الموت مالی بیماری کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ سیدنا الامام الکبیر مدظلہ کے گھبراہٹ سے متاثر ہوئے گا عقیدہ اسلامی روایات کا قیام اقتضائے خود ختمی آب رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم تک کے متعلق صحیح بخاری میں اس کا ذکر کیا گیا ہے، بعد کو بھی بڑے بڑے اکابر اولیاء اللہ رحمہمنا ہندوستان کے خواجگانِ حشمت میں حضرت بابا فرید اور سلطان جی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہما کے متعلق مستند کتبوں میں ہم یہ پاتے ہیں، مگر دونوں بزرگوں پر محسوس کیا گیا۔ جس سے کافی تکلیف اٹھانی پڑی۔ کرماتی کی سیر الاولیاء میں جس کی تفصیل آپ پڑھ سکتے ہیں، خاکسار نے بھی اپنی کتاب مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت میں ان قصوں کا ذکر کیا ہے۔ سچ پوچھتے تو مصنوعی روحانیت جس کا ترجمہ آج کل اسپر پیچوریزم کیا جاتا ہے، اور نفسیاتی درزش کے جو قدرتی نتائج ہیں، روحانیت کی اس مصنوعی اور جعلی شکل میں اور وہ روحانیت جو براہ راست تعلق باللہ سے پیدا ہوتی ہے۔ دونوں میں رومری امتیازی وجود کے ساتھ بڑی مدد اس قسم کے واقعات سے ان لوگوں کو مل سکتی ہے جو آسمانی دیرمائی دونوں میں فرق نہیں کر سکتے اپنے سرچشمہ کے لحاظ سے روحانیت کی یہ دونوں راہیں ایک دوسرے سے قطعاً الگ ہیں۔ عین ممکن ہے کہ مصنوعی روحانیت والے اپنے نفسیاتی کوششوں کو تعلق باللہ والی روحانیت رکھنے والوں کو متاثر کر دیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ کوئی پہلوان کشتی گیر ٹکڑیوں کو کسی خدا پرست آدمی کو لگا دے، لیکن پہلوانی کے فن کو وہ اپنی ہی اس لئے ترجیح تو حاصل نہیں ہوتی ۱۲